پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ

ڈاکٹر انور سدید

اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ

(ابتدا تا ۱۹۸۸ء)

پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ

(ابتدا تا ۱۹۸۸ء)

ڈاکٹر انور سدید

اکادمی ادبیاتِ پاکستان اسلام آباد

نگران اعلیٰ	:	غلام ربانی آگرو
مہتمم	:	افتخار عارف
تزئین و اشاعت	:	طارق شاہد
اشاعت اول	:	جنوری ۱۹۹۲ء
تعداد	:	ایک ہزار
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان ایچ/۱/۸، اسلام آباد
کمپوزنگ	:	دی پلی ایڈز کمپوزنگ سینٹر
طباعت	:	رمنا پرنٹرز، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد -/۱۵۰ روپے پیپر بیک -/۱۰۰ روپے

فہرست

پیش نامہ

ادبی رسائل اپنے عہد کے تخلیقی سفر کے اہم ترین دستاویزات شمار ہوتے ہیں۔ جہاں وہ ایک طرف اہل قلم کے متنوع نگارشات سے قارئین کو استفادہ کا موقع دیتے ہیں وہاں ناقدین' مورخین اور محققین کے لئے بھی ایسا مواد فراہم کرتے ہیں جس سے کسی مخصوص عہد کے ادبی رجحانات و میلانات کا اندازہ اور احساسات و جذبات کی تفہیم کی جا سکتی ہے۔

اردو زبان میں ادبی رسائل انیسویں صدی میں شائع ہونے شروع ہوگئے تھے۔ اردو اخبارات کا دائرہ چونکہ خبروں تک محدود تھا اس لئے تخلیقی اور تنقیدی ادب کی اشاعت کے لئے ادبی رسائل کا اجراء ناگزیر ہوگیا۔ بیسویں صدی میں لاتعداد ادبی رسائل ادب کے افق پر چمکے اور پھر معدوم ہوگئے طویل عمر پانے والے رسائل کی تعداد نسبتاً" کم ہے تاہم کمی کے باوجود ان رسائل نے جہاں کہنہ مشق ادیبوں کی تحریریں قارئین تک پہنچائیں وہاں ایسے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جن میں جوہر قابل موجود تھا' یہی اہل قلم اب نامور ادیبوں کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور ہمارے ادب کی آبرو ہیں۔

ادیبوں کو شہرت و عظمت دینے والے بیشتر ادبی رسائل اب گوشہ گمنامی میں چھپ گئے ہیں اور نئی نسل کے لوگ ان کے نام اور خدمات سے بھی آشنا نہیں۔ افسوس ناک بات یہ بھی ہے کہ ہم نے ایسی کوئی کتاب بھی مرتب نہیں کی کہ جو ادبی رسائل کے اجراء' ارتقاء' تحقیقی' تنقیدی اور تجرباتی کام کو منظر عام پر لاتی اور تہذیب کی ان دستاویزات کی خدمات کا احاطہ کرتی۔

اکادمی ادبیات پاکستان نے اس کمی کو محسوس کیا اور اس موضوع پر ایک جامع کتاب مرتب کرانے کا منصوبہ بنایا۔ اردو کے ممتاز نقاد اور محقق جناب انور سدید نے اس منصوبے کو محنت اور لگن سے عملی جامہ پہنایا ہے۔ یہ کتاب ادبی رسائل کی ایک تاریخ ہی نہیں بلکہ اس کتاب سے ادب کے ارتقاء کی مختلف منازل اور مدارج بھی ہمارے سامنے آ جاتے ہیں اور یہ اس موضوع پر پہلی قابل قدر کاوش ہے جو اہل علم کے علاوہ ابلاغیات کے طلبہ کے لئے بھی انتہائی ممد و معاون ثابت ہوگی۔

یہ کتاب مرتب کرنے میں ڈاکٹر انور سدید کی محنت اور کاوش قابل تحسین ہے اس کی اشاعت کے لئے ہمیں جناب غلام ربانی آگرو چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ مقبول عامر (مرحوم) نے اس منصوبے کی ابتدا کی تھی' اس کی تکمیل ان کے قائم مقام پبلیکیشن آفیسر طارق شاہد نے بے حد دلچسپی اور لگن سے کی۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔

افتخار عارف

پیش لفظ

اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ادبی رسائل نے ہمیشہ بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ ادبی رسالہ عوام کی ذہنی تربیت میں ایک مؤثر اور فعال قوت کے طور پر کام کرتا ہے۔ اس کا حلقۂ قرات جتنا وسیع ہو ادب کا عمل اتنا ہی زود اثر ثابت ہوتا ہے۔ ادبی جریدے کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں ممتاز ادبا کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو چھپنے کا موقع ملتا ہے۔ کلاسیکی روایات کے ساتھ نئی رومانی تحریکات کو فروغ دینے اور پرانی اصناف میں تخلیق کاری کے علاوہ نئے تجربات کو منظرِ عام پر لانے کی کاوش بھی کی جاتی ہے۔ ادبی رسالہ بیک وقت مکتب بھی ہے اور مخزن بھی۔ یہ اپنی ایک ادبی شخصیت بھی رکھتا ہے اور اسے ایک انجمن کا درجہ بھی حاصل ہے۔ ادبی رسالہ نئے لکھنے والوں کو پروان چڑھاتا ہے اور ایک نسل کی میراث آنے والی نسلوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ ادبی رسالہ محض حال کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ آج کا ادب جب ماضی کا حصہ بن جاتا ہے تو ادبی رسالہ ہی اس خزینے کو تحفظ عطا کرتا ہے اور یہ تنقید و تحقیق کے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ کسی قوم کی تہذیبی رفعت کا اندازہ کرنا ہو تو صرف یہ دیکھنا ہی کافی ہو گا کہ اس میں کس معیار کے ادبی رسائل شائع ہوتے ہیں، ان رسائل کا حلقۂ قرات کتنا وسیع اور عرصۂ حیات کتنا طویل ہے۔

برصغیر میں ادبی رسائل انیسویں صدی میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ادبی صحافت کی طرف پہلا قدم مولوی محمد باقر نے اٹھایا تھا جو مولانا محمد حسین آزاد کے والد گرامی اور "دہلی اردو اخبار" کے مدیر تھے۔ لیکن ادبی جریدہ نگاری کو فروغ ماسٹر رام چندر اور سرسید احمد خان نے دیا جو ادیب بھی تھے اور قوم کے معلم بھی۔ رسالہ "فوائد الناظرین" ماسٹر رام چندر کی روشن خیالی کا اور "تہذیب الاخلاق" سرسید کی کشادہ فکری کا نقیب تھا۔ اس بامعنی ابتدا کو میر ناصر علی دہلوی، عبدالحلیم شرر اور حسرت موہانی نے فکر انگیز اور مثبت جہت دی۔ انہوں نے "صلائے عام" "دل گداز" اور "اردوئے معلیٰ" جیسے رسائل سے نہ صرف ادب کو مائل بہ ارتقاء کیا بلکہ ان سے قوم کی ذہنی، فکری تہذیبی اور ادبی رہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔

بیسویں صدی میں ارتقاء کی اس لکیر پر "مخزن" کے مدیر شیخ عبدالقادر، "ستارۂ صبح" کے مدیر مولانا ظفر علی خان "زمانہ" کے مدیر دیا نرائن نگم "الہلال" کے مدیر ابوالکلام آزاد، "ادبی دنیا" کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد "ساقی" کے مدیر شاہد احمد دہلوی، "شاہکار" کے مدیر تاجور نجیب آبادی "ہمایوں" کے مدیر میاں بشیر احمد اور

مولانا حامد علی خان اور "نگار" کے نامور مدیر نیاز فتح پوری ظاہر ہوئے اور ان سب نے ادبی رسالے سے فکری تحریکیں برپا کرنے کا کام کمال دانشمندی سے لیا۔ ادبی رسائل کے اس روشن ماضی پر ہی آزادی کے بعد ایک عظیم قصر پاکستان میں تعمیر کیا گیا۔ اس دور میں "سویرا" "نقوش" "نیا دور" "سیارہ" "سیپ" "فنون" اور "اوراق" جیسے نئے ادبی رسائل منظر عام پر آئے اور ادب کے فروغ و ارتقاء اور معاشرے کی علمی ترقی میں اپنا مثبت کردار ادا کرنے لگے۔

ادب کے ایک قاری کی حیثیت میں گزشتہ نصف صدی کے دوران ادبی رسائل کے ساتھ میرا تعلق بہت قریبی رہا ہے۔ میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے ذوق کی پرورش اور لکھنے کی ابتدائی رغبت "ہمایوں" "ادبی دنیا" "ساقی" اور "ادب لطیف" جیسے رسائل کے مطالعہ سے ہوئی۔ یہ رسائل ہمارے سکول اور کالج کی لائبریری میں باقاعدگی سے آتے تھے' ان کے مطالعے کا شوق اساتذہ پیدا کرتے تھے۔ وہ کمرۂ جماعت میں تازہ رسائل کا ذکر کچھ ایسے دلکش انداز میں کرتے کہ طلبہ خالی پیریڈ میں لائبریری پر ٹوٹ پڑتے اور سب سے پہلے متذکرہ رسالہ پڑھنے کی کوشش کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں ایک پرچے کو کم از کم پانچ طلبہ بیک وقت پڑھا کرتے تھے اور پھر مندرجات پر بحث کا سلسلہ شروع ہو جاتا' جو مہینہ بھر تک جاری رہتا۔ اس سے مجھے رسائل کی ذاتی لائبریری بنانے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے اپنے پاس بہت سے نایاب رسائل جمع کر لئے۔ دسمبر ۱۹۶۹ء میں "افکار" نے جوبلی نمبر شائع کیا تو صہبا لکھنوی نے مجھے "پچیس سال کے ادبی رسائل" کا جائزہ لینے کی دعوت دی۔ اس مطالعے کے دوران مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ ادبی رسائل کی تاریخ تو گمنامی میں ڈوب چکی ہے۔ مولانا امداد صابری' ڈاکٹر عبدالسلام خورشید' عتیق صدیقی اور بدر شکیب نے اردو صحافت اور اخبارات کی تحقیق میں تو بڑی محنت کی ہے لیکن ان کی ضخیم کتابوں میں ادبی رسائل کا ذکر واجبی سا ہے۔ اس سے میرے دل میں ادبی رسائل پر کام کرنے کی آرزو پیدا ہوئی اور یہ بیج آہستہ آہستہ جڑ پکڑ تا گیا۔

۱۹۸۸ء میں پروفیسر پریشان خٹک اور برادرم مقبول عامر صاحب نے اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام اس موضوع پر ایک جامع اور مستند کتاب معرض تحریر میں لانے کی تجویز منظور کی تو میرا خیال ہے کہ ماہنامہ "افکار" میں میرا متذکرہ بالا مقالہ ان کی نظر میں تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر تحقیق' تنقید اور تجزیہ کا کام مجھے سونپا گیا۔ بالفاظ دیگر اکادمی ادبیات پاکستان کی تجویز میرے ایک خواب کو روبہ عمل لانے میں معاون بن گئی' میں نے یہ کام کم و بیش ایک سال کی مدت میں ختم کیا لیکن ذہنی طور پر میں اس منصوبے پر ۱۹۶۹ء سے عمل کر رہا تھا اور اب یہ کام مکمل ہو گیا ہے تو محبت کی اس محنت پر میں بے پایاں مسرت محسوس کر رہا ہوں۔

اس کتاب کا بنیادی موضوع "پاکستان کے ادبی رسائل کا تحقیقی' تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ" ہے میں نے اس کتاب کو خود کفیل' مفید اور بامعنی بنانے کے لئے بحث کو اردو صحافت کے نقطہ آغاز سے ابھارا ہے اور ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک کی ادبی صحافت اور رسائل کا ذکر اجمالی طور پر کیا ہے۔ اس پس منظر کے بغیر پاکستان کے

ادبی رسائل کی تاریخ اور پیش منظر پوری طرح اجاگر کرنا شاید ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس حصے میں صحافت، مجلاتی صحافت اور ادب کے موضوعات اور ان کے مابہ الامتیاز کو بھی واضح کیا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں پاکستان میں چھپنے والے ادبی رسائل کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ میں نے اس کے مختلف ابواب میں زمانی ترتیب کو قائم رکھا ہے۔ ادبی رسالے کی اشاعت بالعموم کسی منصوبہ بندی کے بغیر عمل میں آتی ہے اور بہت سے رسائل دو چار اشاعتوں کے بعد دم توڑ جاتے ہیں یا غیر موثر ذمی کی صورت میں چھپتے رہتے ہیں' چنانچہ اس قسم کے رسائل کے قطع اشاعت کی تاریخ متعین کرنا ممکن نہیں' میں نے زمانی ترتیب کو ابتدائے اشاعت کے ماہ و سال کے ساتھ منسلک کیا ہے اور دستیاب پرچوں سے مزاج متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ المناک حقیقت یہ بھی ہے کہ ہمارے قومی کتب خانوں میں ادبی رسائل کی مکمل فائلیں دستیاب نہیں' اس تحقیقی کام کے لئے مجھے قومی لائبریریوں سے کہیں زیادہ معاونت نجی کتب خانوں سے میسر آئی' میں اپنے ان دوستوں کا ممنون ہوں جنہوں نے اپنے کتب خانے کے دروازے مجھ پر وا کر دیئے۔ میں نے اس کتاب میں زمانی اعتبار سے ۱۹۸۸ء تک چھپنے والے رسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ واضح رہے کہ ادب کی حقیقی خدمت ان مدیران جرائد نے کی ہے جو ادب کو زندگی کی سب سے بامعنی سرگرمی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادبی رسالہ تہذیب و آگہی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے رسائل نے قارئین کے فکر و نظر کو متاثر کیا اور عہد سازی کا فریضہ سرانجام دیا۔ زیر نظر کتاب میں اساسی اہمیت ایسے رسائل ہی کو دی گئی ہے اور تنقید و تجزیہ سے ہر اہم رسالے کا مزاج اور بنیادی عطا متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ بہت سے رسائل منظر ادب پر جگنوؤں کی طرح ظاہر ہوئے اور پھر روشنی کی ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گئے۔ ان رسائل کی خدمات روایتی قسم کی ہیں اور عرصہ حیات مختصر ہے۔ میں نے اس قسم کے رسائل کا تذکرہ ایک علیحدہ باب میں "راہ نوردان شوق" کے تحت کیا ہے۔ "خواتین کے رسائل" "طنزیہ و مزاحیہ رسائل" اور "ممتاز تعلیمی اداروں کے ادبی مجلّے"۔۔۔ اگرچہ ذیلی عنوانات ہیں لیکن ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ میں نے ان موضوعات پر بھی شاید پہلی دفعہ اس کتاب میں خاطر خواہ مواد جمع کر دیا ہے۔ ڈائجسٹ رسائل اور روزانہ اخبار کے ادبی ایڈیشنوں نے ادبی صحافت اور رسائل کو باندازِ دگر متاثر کیا ہے۔ اردو زبان و ادب کا قاری ان میں دلچسپی کا اظہار کر رہا ہے۔ میں نے ان دو موضوعات کو بھی کتاب کے مدار عمل میں شامل کر کے کتاب کو ہمہ جہت بنانے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کے آخر میں "حاصل مطالعہ" کے طور پر میں نے نتائج اخذ کرنے کی جسارت بھی کی ہے۔ اس کا اجمال یہ ہے کہ ادبی رسالہ کی اشاعت منفعت بخش عمل نہیں' اس کی اشاعت ادبا کے ذوق و شوق اور مشنری جذبے کا نتیجہ ہے۔ ادبی رسالہ چونکہ تہذیب و ادب کا سرچشمہ اور فکر و نظر کے نقیب ہے اس لیے اس کی اشاعت کو باقاعدہ اور طویل العمر بنانے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں میری تجویز یہ ہے کہ سکولوں اور کالجوں

کے لئے اعلیٰ پائے کے ادبی رسائل کی براہ راست خریداری لازمی قرار دی جائے اور طلبہ کے استفادۂ عام کے لئے ادبی رسائل کو دار المطالعہ میں کھلی میز پر اخبارات کے ساتھ رکھا جائے۔ ادب کے اساتذہ ممتاز تخلیقات کا ذکر کمرہ جماعت میں کریں تاکہ طلبہ میں مضامین پڑھنے کا شوق پیدا ہو سکے۔ ادب سے شعوری تغافل کا نتیجہ سماجی بے راہ روی کی صورت میں سامنے آرہا ہے اور قوم کو اس کی گراں قیمت مسلسل پریشانی اور پشیمانی کی صورت میں ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ اس صورت حال کے تدارک و اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ طلبہ میں ادب کا ذوق تعلیم کے ابتدائی درجوں میں پیدا کیا جائے اور ادبی رسالے کے ساتھ عام قاری کا ٹوٹا ہوا رشتہ بحال کیا جائے۔

زیر نظر کتاب کا منصوبہ اکادمی ادبیات پاکستان نے بنایا تھا۔ اکادمی نے اس کی تکمیل میں گہری دلچسپی لی اور مجھے مناسب وقفوں سے اتنی دفعہ یاددہانی کرائی کہ میں کسی مرحلے پر اس کتاب کے تالیفی فریضے سے غافل نہ ہو سکا۔ اس کتاب کی تکمیل کے لئے میرا زیادہ وقت لاہور کے کتب خانوں کی خاک چھاننے میں صرف ہوا۔ میں ان کتب خانوں کے منتظمین کا شکر گزار ہوں۔ میرے احباب میں سے جناب مشفق خواجہ، خلیل الرحمٰن داؤدی، محمد اکرام چغتائی اور حفیظ الرحمٰن احسن نے نہ صرف بہت سے مواد کی نشاندہی کی بلکہ میری عملی معاونت بھی کی۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، سجاد نقوی اور ڈاکٹر انور محمود خالد نے اس کتاب کے ہر مرحلے پر میری حوصلہ افزائی کی اور محرک قوت کے طور پر کام کیا۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔

یہ کتاب اپنی نوعیت کی شاید پہلی کتاب ہے۔ اس موضوع پر میرے متعین کردہ زاویوں سے پہلے کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ ادبی رسائل پر تا حال کوئی کتاب برصغیر پاک و ہند میں چھپ کر منظر عام پر نہیں آئی۔ مجھے یقین ہے کہ "اردو ادب کی تحریکیں" "انشائیہ اردو ادب میں" "اردو ادب میں سفر نامہ" اور "اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش" کی طرح میری اس کتاب کو بھی تحسین کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ میں نے حتی المقدور نایاب مواد تک رسائی حاصل کرنے اور کتاب کو ۱۹۸۸ء تک مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میں اسے "حرف آخر" شمار نہیں کرتا۔ یہ موضوع اتنا زرخیز ہے کہ اس پر مزید کام ہونا چاہئے۔ میں حسب سابق آپ کے ارشادات اور حرف اختلاف سننے کا مشتاق ہوں۔

اکادمی ادبیات پاکستان نے یہ کتاب لکھوائی اور یہ قومی ادارہ ہی اس کا بار اشاعت اٹھا رہا ہے۔ میں اس ادارے کا شکر گزار ہوں۔ اس کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کے مختلف مراحل میں پروفیسر پریشان خٹک، غلام ربانی آگرو اور مقبول عامر نے گہری دلچسپی لی۔ میں ان اصحاب کا بے حد شکر گزار ہوں۔

انور سدید

پس منظر

ادبی جریدہ نگاری

ابتداء تا ۱۹۴۷ء

پہلا باب

صحافت اور ادبی صحافت کیا ہے؟

صحافت بنیادی طور پر اخبار نویسی اور رسالہ نگاری کا عمل ہے۔ کالیرز انسائیکلو پیڈیا کے مطابق۔

"تازہ خبریں جمع کرنے اور انھیں ایک معینہ وقفے سے شائع کرنے کا نام صحافت ہے" (۱)

صحافت کی یہ بے حد مجمل تعریف اس عمل کا کما حقہ' احاطہ نہیں کرتی جس نے موجودہ دور میں بے پناہ وسعت اختیار کر لی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں اس تعریف کی مزید توضیح کی گئی ہے اور دوسرے متعدد صحافتی شعبوں کو بھی صحافت کے مدارفن میں شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا گیا ہے کہ:

"صحافت سے مراد۔ خبر اور خبر سے متعلقہ مواد کا حصول' جمع کاری' ترتیب و تدوین' تنقید و تبصرہ اور فیچر نگاری کے بعد اخبار' رسالہ' پمفلٹ' ریڈیو' ٹیلی ویژن' فلم یا کتاب کے وسیلے سے اشاعت اور اس کی تقسیم ہے" (۲)

علم الانسان ظاہر کرتا ہے کہ انسان نے جب شعور کی آنکھ کھولی اور اسے گرد و پیش کی اشیا اور مظاہر کے بارے میں تجسس پیدا ہوا تو اس نے اپنے ہم جنسوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں بھی دلچسپی لی۔ انسانی شعور کے فروغ و ارتقاء کے ساتھ تلاش اور تجسس کے جذبے کو بھی مہمیز لگتی چلی گئی اور نتیجہ اخذ کیا گیا کہ:

"انسان جب سے پیدا ہوا ہے تجسس و تلاش اس کی فطرت ثانیہ بنی ہوئی ہے" (۳)

اس نتیجے سے انسان کی خبر میں دلچسپی کے ابتدائی آثار نظر آتے ہیں۔ اس سے ایک انسان کا دوسرے انسان کے بارے میں معلومات جمع کرنے اور ان کے تجربات سے استفادہ کرنے کا رجحان بھی سامنے آتا ہے اور یہ کہنا درست ہو گا کہ خبر کا حصول انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

قدیم صحافت

قدیم زمانے میں اگرچہ ذرائع آمد و رفت دشوار تھے۔ سفر طویل، مشکل اور صبر آزما تھا، لیکن ان سب کے باوجود دنیا میں اس وقت بھی ایسے جرات مند لوگ پیدا ہوئے جو صعوبتوں کو درخور اعتنا نہ سمجھتے اور اپنے ذوق تجسس کی تسکین کے لئے آمادۂ سفر ہو جاتے۔ اس قسم کے سیاح اور سیر و تفریح کے دل دادہ لوگ ہی دوسرے ملکوں اور ان ملکوں کے باشندوں کے بارے میں ابتدائی خبر رساں تھے۔ یہ لوگ آنکھوں دیکھا احوال بیان کرتے اور خبر یا واقعہ کو عینی شہادت فراہم کر دیتے، ان سیاحوں کو اگر اولیں صحافی شمار کیا جائے تو یہ ایسے صحافی ہوں گے جو خبروں کی ترسیل زبانی کرتے تھے۔

قدیم زمانے میں حکومت کے فرامین اور سرکاری ہدایات عوام الناس تک پہنچانے کے لئے بھی صحیفہ نگاری کا طریق اختیار کیا گیا تھا۔ اس قسم کے فرامین عام گزر گاہوں اور عبادت خانوں پر لٹکا دیئے جاتے تھے۔ مقامی لوگ اور دور دراز کے باشندے ان مقامات سے گزرتے تو فرامین اور احکامات ساتھ لے جاتے اور دوسرے لوگوں تک پہنچا دیتے۔ قدیم مصر میں اس قسم کے مسودے تصویروں کی صورت میں معبدوں کے دروازوں پر کندہ کئے جاتے تھے، رومی حکمرانوں نے بھی اس طریق نشریات کو مفید سمجھ کر کثرت سے استعمال کیا۔ عراق میں حمورابی نے اور ہندوستان میں اشوک نے اس مقصد کے لئے کتبے بنوائے اور ان پر فرامین کندہ کیے۔ یہ کتبے اس قدیم دور کے بہترین ماخذات شمار ہوتے ہیں۔

قدیم زمانے میں اگرچہ خبروں میں دلچسپی کا رجحان موجود تھا لیکن خبر رسانی کے وسائل محدود تھے۔ خبر ایک کان سے دوسرے کان تک اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچتے پہنچتے نہ صرف خبریت کا عنصر کھو بیٹھتی بلکہ اکثر اوقات اس کا مفہوم بھی تبدیل ہو جاتا تھا اور اس کی صداقت بھی متاثر ہو جاتی تھا۔ چنانچہ خبر رسانی کے لئے زبان کے بجائے تحریر کو عمل میں لانے کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس کے لئے اخباری خطوط (News Letters) کا طریق اختیار کیا گیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کے مطابق رومائے قدیم میں ۵۹ قبل مسیح میں اس قسم کے قلمی اخبارات نمایاں مقامات پر آویزاں کر دئے جاتے تھے انہیں ایکٹا ڈائی ارنا (Acta Diurna) یعنی کارروائی کہا جاتا تھا۔ (۴) چین میں سرکاری حکم نامے جاری کرنے کا یہ طریق تانگ عہد میں استعمال کیا گیا۔ انہیں "پاؤ" (PAO) یا رپورٹ کہا جاتا تھا اور یہ سرکاری حکام ہی جاری کرتے تھے۔ یہ سلسلہ مختلف ناموں سے ۱۹۱۱ء تک جاری رہا۔ ہندوستان میں چندر گپت موریہ نے مکتوبات کا یہ سلسلہ خفیہ معلومات جمع کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اس قسم کی معلومات تین مختلف ذرائع سے جمع کی جاتی تھیں تا کہ صحیح نتیجہ اخذ کرنا آسان ہو۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے کہ:

"چندر گپت جس جاسوس یا نامہ نگار کے بیان میں غلطی دیکھتا اسے شدید سزا دیتا تھا۔" (۵)

چندر گپت کے عہد میں جاسوسی کے لئے صحیفہ نگاری کا یہ نظام کوٹلیہ نے وضع کیا تھا جو ایک عیار سیاست دان اور چندر گپت موریہ کا وزیر اعظم تھا۔ اشوک کے عہد میں نامہ نگاروں کو "پلسانی" کہا جاتا تھا۔ یہ نامہ نگار خفیہ زبان میں خبریں لکھا کرتے تھے اور پیغام رسانی کے لئے نہ صرف کبوتروں کو استعمال میں لاتے بلکہ خفیہ سیاسی راز حاصل کرنے کے لئے فاحشہ عورتوں سے بھی معاونت حاصل کرتے تھے۔ (۶)

ایران میں خبروں کی ترسیل کا یہ نظام اسلام کی آمد سے پہلے جاری ہو چکا تھا۔ اس قسم کی خبریں مرتب کرنے والوں کو اخبار نویس کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی تحقیق کے مطابق ایران میں "روزنامہ" کی اصطلاح قبل از اسلام کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ حضور نبی اکرم نے مکتوبات کا طریق دین اسلام کی تبلیغ کے لئے استعمال کیا' ان کے وصال کے بعد حضرت عمر نے خبر رسانی کے نظام کو مزید تقویت دی۔ امیر معاویہ نے "البرید" یعنی ڈاک کا آغاز کیا جس میں سرکاری احکام مختلف مقامات پر گھوڑا سوار پہنچاتے اور ان کے قیام اور آرام کے لئے مناسب فاصلوں پر چوکیاں بنائی گئی تھیں۔ صاحب البرید کی ذمہ داری تھی کہ وہ سرکاری مکتوبات کی ترسیل کا انتظام و نگہداشت کرے اور مقامی حالات اور واقعات سے خلیفہ کو با خبر رکھے۔ فلپ۔ کے۔ ہٹی نے ان فرائض کی مناسبت سے لکھا ہے کہ اس عہدہ دار کو پورا نام "صاحب البرید والا خبار" تھا۔

ہندوستان میں سلاطین دہلی (۲) نے خبر رسانی کے نظام کو مزید وسعت دی اور اس سے نظم و ضبط قائم رکھنے کے علاوہ سماجی اور معاشرتی امور کی انجام دہی میں بھی مدد لی۔ سرکاری ڈاک لے جانے والے ہر کارے کی چھڑی کے ساتھ گھنگرو بندھے ہوتے تھے جو اس کی آمد و رفت کا پتہ دیتے تھے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ "ملتان میں اس کی آمد کی خبر دلی میں برید کے ذریعے پہنچی تھی اور اس میں صرف پانچ روز لگے تھے۔ حالانکہ ملتان سے دلی کا فاصلہ بہت طویل ہے۔"

عہد مغلیہ میں وقائع نگاری کے علاوہ روز نامچہ نگاری کو بھی مستحکم کیا گیا۔ دور دراز کی ریاستوں کے باج گزار راجے مہاراجے اپنے اپنے روزنامچے شاہی دربار میں باقاعدگی سے بھیجتے تھے' خبروں کے محکمے کی نگرانی بادشاہ کرتے تھے اور ہمیشہ با اعتماد لوگوں کو خبر رسانی پر مامور کیا جاتا تھا۔ اس نظام کو اکبر نے تحفظ اور وسعت دی اور یہ نظام عالمگیر کے عہد تک بڑی کامیابی سے استعمال کیا جاتا رہا۔ چنانچہ ہندوستان میں ایک مضبوط مغلیہ سلطنت کی تشکیل اور اس کے طویل قیام میں خبر رسانی کے اس پختہ اور با اعتماد نظام کا بھی بڑا حصہ ہے۔

اورنگزیب کی وفات کے بعد جب مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا تو خبر رسانی کا نیا نظام

بھی کمزور پڑ گیا۔ مغلوں کے آخری دور میں انگریزں نے ہندوستان میں اپنے سیاسی پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے' انہوں نے متوازی طور پر ایک نیا نظام بھی جاری کیا جس میں خبر رسانی کا یہ اہم کام یورپ کے جدید طریقوں کے مطابق سر انجام دیا جاتا تھا۔ منوچی اور جان فرائیر کی وقائع نگاری موخر الذکر طریق سے خبریں حاصل کرنے کی ہی ایک کاوش تھی اور اس میں کوچہ و بازار کی غیر مصدقہ باتوں اور افواہوں کو اہمیت دینے کا رجحان نمایاں ہے۔ چنانچہ واقعات کو حسب مطلب و ضرورت توڑنے مروڑنے' صداقت کو مسخ کرنے اور غلط تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی اور اکثر اوقات ہندوستانی وقائع نگاروں کو رشوت اور انعام کا لالچ دے کر ان سے معلومات حاصل کرنے' بادشاہ تک غیر مصدقہ خبریں پہنچانے یا سچی خبروں کو رکوانے کی کوشش بھی کی جاتی۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ابتدا میں صحافت کا بنیادی مقصد احکام کی ترسیل اور خبر رسانی تھا اور اس پر حکام نے اپنی گرفت مضبوط کر رکھی تھی۔ صحیفہ نگاری کے فرائض سر انجام دینے والوں کی حیثیت اگرچہ سرکاری غلاموں سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کے باوجود یہ طبقہ مراعات یافتہ شمار ہوتا تھا اور اکثر شاہان وقت سے بہتر خدمات کی بنا پر انعام و اکرام بھی پاتا تھا۔ یورپ میں سترھویں صدی کے اوائل میں پہلا باقاعدہ اور مطبوعہ اخبار جرمنی سے ۱۶۰۹ء میں اور انگلستان سے انگریزی اخبار "ویکلی نیوز" ۱۶۲۲ء میں نکلا' لندن سے "ڈیلی کورنٹ" (The Daily Cornaut) کے نام سے ایک روزانہ اخبار ۱۷۰۲ء میں جاری ہوا اور اس کے بعد نہ صرف صحافت کے ارتقاء کو مہمیز لگ گئی بلکہ اخبارات نے قارئین کی ذہنی اور فکری راہنمائی کا فریضہ بھی سنبھال لیا ہے۔

ادب اور صحافت کا امتیاز

ٹی' ایس' ایلیٹ نے تو لکھا ہے کہ "صحافت اور ادب کے درمیان امتیاز بالکل بے کار سی بات ہے۔ تاوقتیکہ ہم ان دونوں میں ایسا مقابلہ نہ کر رہے ہوں جیسے گبن کی تاریخ میں اور آج شام کے اخبار میں کیا جاتا ہے" (۷) لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ رائے دیتے وقت ایلیٹ کے ذہن میں جن صحافیوں کی تابندہ مثالیں موجود تھیں ان میں جانسن' ڈیفو اور سوفٹ کے نام بہت اہم ہیں۔ ایلیٹ نے صحافت اور ادب کے درمیان امتیاز کو بے کار سی بات قرار دیا ہے تو اس کی وجہ خود ایلیٹ کے بقول یہ ہے کہ "ہم صحافت اور ادب کے درمیان کوئی مفید امتیاز صرف ادبی اقدار کے ترازو میں ان دونوں کو رکھ کر نہیں کر سکتے۔" چنانچہ اس نے لکھا کہ: "ایک دوسرے درجے کا ناول صحافت نہیں لیکن یقیناً اسے ادب بھی قرار نہیں دیا جا سکتا"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف ادب اور صحافت میں مابہ الامتیاز موجود ہے بلکہ ادب میں بھی درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ خود ایلیٹ دوسرے درجے کے ناول کو ادب تسلیم کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ ادب اور صحافت کے امتیاز کو ایلیٹ نے کلیتہً رد نہیں کیا بلکہ اسے کڑے محاسبے اور مقابلے سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ مقابلہ اگر گبن کی تاریخ اور شام کے اخبار میں ہو تو یہ امتیاز نمایاں ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے دو مختلف رجحانات کا مسئلہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ادبی اور صحافتی رجحانات میں بڑا فرق ہے اور یہ جب کسی فن پارے کی تشکیل میں بیک وقت صرف ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کی نفی کر دیتے ہیں" (۸)

اٹھارویں صدی میں انگلستان کے اخبارات جب بیک وقت روز مرہ کی خبریں اور ادبی مضامین شائع کرتے تھے تو اس وقت ادب اور صحافت میں امتیاز پیدا کرنا اگرچہ مشکل تھا لیکن ناممکن نہیں تھا وجہ یہ کہ اس دور کے صحافی کو واقعات حاضرہ ہی سے زیادہ دلچسپی تھی اور وہ خبر کو اطلاع، غیر تخلیقی اور میکانکی انداز میں اپنے قارئین تک جلد سے جلد پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ خبر باسی یا پرانی ہو جاتی تو اس میں صحافی کو دلچسپی کم ہو جاتی لیکن ڈیفیو، جانسن، اور سٹیل نے جب صحافت میں شمولیت کی تو انہوں نے خبر کی ترسیل میں دلچسپی نہیں لی۔ یہ ادبا واقعہ کو جذبے کے لمس سے وقتی یا ہنگامی نہ رہنے دیتے بلکہ اس کے اثر و عمل کو حدود وقت سے بھی متجاوز کر دیتے چنانچہ اس دور کے پیریا ڈیکلز (Periodicals) میں چھپنے کے باوجود ان کے مضامین کی ادبی حیثیت قائم رہتی اور یہ روز مرہ کی خبروں میں ضم نہیں ہوتے تھے۔ بالالفاظ دیگر اٹھارویں صدی میں بھی ادب اور صحافت کی حدود مختلف تھیں اور ان کی امتیازی خطوط کی نشان دہی کی جا سکتی ہے

ان دونوں کا مابہ الامتیاز حسب ذیل پیش کیا جاتا ہے۔

صحافت کا بنیادی فریضہ خبر رسانی ہے اس میں خبر فراہم کرنے، خبر کو قابل مطالعہ انداز میں تحریر کرنے اور پھر بلا تاخیر قارئین تک پہنچانے میں سب سے زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے۔ بالالفاظ دیگر صحافی کا تعلق حالات حاضرہ اور ان کی ترسیل سے ہے اس قسم کے خارجی حقائق کے ساتھ اس کا تعلق پیشہ وارانہ اور میکانکی ہے لیکن یہ جذباتی وابستگی سے عاری ہوتا ہے۔ صحافی معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی نشان دہی کرتا ہے اور واقعات و حادثات کی مختلف کڑیاں جوڑ کر حقائق کی ٹھوس صداقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ صحافی کا یہ عمل ہنگامی اور عارضی نوعیت کا ہے۔ ہر نئی ساعت کے ساتھ اس کی دلچسپی ظہور میں آنے والے نئے واقعات میں بڑھ جاتی ہے۔ گزشتہ دنوں کے

واقعات پرانے ہو کر اس کی توجہ سے محروم ہو جاتے ہیں' آخری بات یہ کہ صحافت پیشہ ہے اور اس کا شعوری عمل کسی داخلی آمد یا نوائے سروش کا انتظار نہیں کرتا۔ صحافت کے لئے ذہن کا ایک ایسا مخصوص ڈھب اختیار کرنا ضروری ہے جو خبر ملتے ہی متحرک ہو جائے اور دیکھے ہوئے واقعے کی کہانی اخباری ضرورت کے مطابق مرتب کر دے۔

صحافت کی طرح ادب بھی اپنا خام مواد زندگی کے خارج ہی سے حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس کا رد عمل فوری' ہنگامی یا عارضی نہیں ہوتا۔ "ادب بنیادی طور پر ادیب کے اظہار ذات کی ایک صورت ہے اور یہ اظہار باطن کا وہ نغمہ ہے جو مزاجاً اشارے 'کنائے' استعارے اور تمثیل کی اساس پر قائم ہے اور جذبے کی تہذیب کر کے قاری کو جمالیاتی حظ بہم پہنچاتا ہے۔"(۸) بے شک ادب لمحے کو بھی گرفت میں لیتا ہے لیکن جب یہ لمحہ تخلیقی وجود میں سما جاتا ہے تو لازماں ہو جاتا ہے اور اس کی اقدار دائم حیثیت اختیار کر جاتی ہیں' صحافت "آج" یا "اب" کو بلا واسطہ اور شعوری انداز میں موضوع بناتی ہے اور اس کا مقصد معروضی ہے۔ ادب میں تینوں زمانے تماشاگاہ بن جاتے ہیں اور ہر دور کے قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ ادب کی اقدار کو دوام حاصل ہے۔ ایک انسان کا تجربہ بنی نوع انسان کا تجربہ بن جاتا ہے اور نہ صرف ایک لطیف اور نفیس انبساط پیدا کرتا ہے بلکہ اس سے ذہنی تشنج بھی دور ہو جاتا ہے اور فرد سماج اور سب سے عظیم تخلیق کار خدا کے درمیان ایک مضبوط تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ آخری بات یہ کہ ادب فنون لطیفہ میں سے ہے اور اس کا پراسرار تخلیقی عمل دوسرے لطیف فنون کی طرح ہمیشہ داخلی آمد کا اور زیر سطح تحرک کا محتاج ہوتا ہے۔ صحافت کا معیار بلند بھی ہوجائے تو اسے ادب شمار نہیں کیا جاتا لیکن ادب میں اگر پروپیگنڈے کا عنصر شامل ہو جائے تو یہ نہ صرف اپنا ادبی معیار کھو دیتا ہے بلکہ اس قسم کے ادب کو بالعموم صحافت میں بھی شامل کر دیا جاتا ہے۔

جریدہ نگاری کیا ہے؟

گذشتہ اوراق میں خبر' کے پس منظر اور خبر سے متعلقہ مواد کی پیش کش کو صحافت کے مدار تعریف میں شامل کیا گیا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کی ضرورت ہے کہ اخبار کا پورا عمل ادب سے براہ راست استفادہ کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ خبروں کی ترتیب و تسوید میں بلا شبہ ادب کے قواعد اور اسالیب وسیلے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ صحافی خبر کی تدوین میں اپنا ذاتی اسلوب اور تخلیقی انداز بھی روبہ عمل لاتا ہے۔ لیکن اس کا بنیادی مقصد ادب تخلیق کرنا یا ادبی تقاضوں کو پورا کرنا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ادبی صحافت میں بنیادی اہمیت ادب' تخلیقی اصناف' ادب کے مسائل اور مباحث کو

حاصل ہے۔ سترھویں صدی میں اخبارات میں جو مضامین شامل ہوتے تھے ان سے علوم نو کے فروغ اور افکار و نظریات کے ابلاغ کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ اٹھارویں صدی میں اس انداز کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ "ٹیٹلر" "سپکٹیٹر" "جنٹلمین میگزین" جیسے رسائل کا اثر و عمل تہذیبی نوعیت کا تھا اور یہ ہنگامی باتوں کے ساتھ ایسے موضوعات کا مظہر بھی بنتے تھے جن سے ادبا کی تخلیقی سرگرمیوں کا اظہار ہوتا تھا۔ انیسویں صدی کے امریکی رسائل میں مختلف اصناف کے تخلیقی ادب پارے زیور طبع سے آراستہ ہونے لگے اور یوں ادیب اور شاعر کے تجربے کو تخلیقی صورت میں عوام تک پہنچانے اور بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر ان کے ذہنی کتھارسس میں شریک ہونے لگے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ہی اخبارات نے ہر ہفتے اور بالعموم تعطیل کے دن اخبار کے ساتھ میگزین پیش کرنا شروع کر دیا اور اس میں ایسے مضامین کو جگہ دی جاتی جن پر قارئین آئندہ سات دنوں میں غور و فکر کر سکیں۔ اس ہفتہ وار میگزین میں بالعموم ادبی حصہ الگ مرتب کیا جاتا تھا۔

ادبی صحافت میں تخلیقی ادب کی پیش کش' تعارف اور فروغ کو فوقیت حاصل ہے۔ اس نوع کی صحافت کا دوسرا بڑا مقصد علوم' افکار اور نظریات ادب کی اشاعت و ترویج ہے ادبی جریدہ نگاری جہالت اور لاعلمی کا زنگ اتار کر عوام اور خواص کے ذہن کو نئی روشنی سے منور کرتی ہے۔ اس کا مقصد ادبا کی تخلیقی اور ذہنی کروٹوں کو محفوظ کرنا بھی ہے اس سے نئے لکھنے والوں کی ذہنی تربیت ہوتی ہے اور پرانے لکھنے والوں کے ذہن کو جلا اور مزید غور و فکر کی دعوت ملتی ہے چنانچہ ادبی جریدہ چند مطبوعہ اوراق کا پلندہ نہیں ہوتا بلکہ اسے ادبا' فضلا اور علماء کی ایسی انجمن کا درجہ حاصل ہے جس سے تہذیب کی نشاۃ ثانیہ برپا ہو سکتی ہے اور معاشرے کو فکری اور نظری طور پر مائل بہ ارتقاء رکھا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے رسائل میں سائنس' فلسفہ' مذہبیات' اسطور اور دیگر علوم کے مضامین کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ تخلیقی ادب سے پیدا ہونے والے مباحث اور ان اصناف کی نئی بوطیقا وضع کرنے کے لئے بھی رسائل مفید مطلب خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ادبی صحافت میں ایک طرف مختلف تخلیقی اصناف کے فن پاروں کو پیش کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اس قسم کی صحافت ادبی مسائل پر بحث استوار کرتی ہے اور یہ عقل و خرد کی جوہر آزمائی کا منظر بھی سامنے لاتی ہے۔ اخبار قارئین کی سماجی ضرورتیں پوری کرتا ہے' اس کے برعکس ادبی جریدہ قارئین کی ذہنی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے اور انہیں مستقبل کی طرف پیش قدمی کرنے میں مدد دیتا ہے۔ چنانچہ ادبی صحافت کے اثر و عمل کا دائرہ وسیع ہے اور رسائل و جرائد میں مختلف ادوار کی ذہنی اور فکری تاریخ ہی محفوظ نہیں ہو جاتی بلکہ ہر دور میں پروان چڑھنے والی تحریکوں اور رجحانات کا احوال بھی رقم ہوتا چلا جاتا ہے' جس سے مستقبل میں سماجی تجزیہ' اور تہذیبی تحلیل میں معاونت ملتی ہے۔ اس زاویے سے ادبی جریدے کو ایک ایسا اہرام سمجھئے جس

کے باطن میں ایک دور کی سماجی' معاشرتی فکری اور تخلیقی کروٹیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ آخری بات یہ کہ ادبی جریدہ فعال اور کہنہ مشق ادیبوں کے فکر کی جولاں گاہ ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ نئے ادیبوں کی تربیت کا گہوارا بھی ہے۔ چنانچہ ادبی رسالہ انجمن ادب بھی ہے اور یہ ادب کی قوت بھی ثابت ہوتا ہے

ادبی صحافت کی طرف پیش قدمی

اٹھارویں صدی کے اوائل میں انگلستان کے اخبارات کو ادب کی طرف راغب کرنے میں انگریزی ایسے (ESSAY) نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس زمانے میں اخبار اور ادبی جریدہ میں واضح حد امتیاز موجود نہیں تھی۔ اخبار میں بالعموم ایسے ادبی مضامین بھی شامل کر لئے جاتے تھے جن سے رائے عامہ ذہنی' فکری اور تہذیبی طور پر متاثر ہوتی اور حالات حاضرہ اور سیاست مدن کے علاوہ ادبی' ثقافتی اور نظریاتی امور پر بھی روشنی پڑتی تھی۔ یہ مضامین لکھنے والے چونکہ اعلیٰ پائے کے ادبا ہوتے تھے۔ اس لئے ان کا طویل مطالعہ' فکر انگیز تجزیہ اور منظم سوچ ایسے اسلوب میں سامنے آتی جس کی ادبی لطافت' پیشکش کی رعنائی اور دلیل کی قوت پڑھنے والوں کو متاثر کرتی اور اکثر اوقات لوگ محسوس کرتے کہ ان ادبا کے دل نشین اظہار و ابلاغ اور مسحور کن انشا میں قدیم یونان کے حکمائے دانش بول رہے ہیں۔

ایسے (ESSAY) کی بنا اگرچہ سولھویں صدی میں فرانس میں مونتین (۱۵۹۲-۱۵۳۳) نے ڈالی تھی۔(۱۰) لیکن اسے فروغ انگلستان میں حاصل ہوا۔ سترھویں صدی میں اس نئی صنف اظہار کو جس کے آثار پلوٹارک اور سینکا کے خطوط میں بھی بکھرے ہوئے تھے بیکن' آربری' بن جانسن' جان ارل اور ابرہم کاؤلے جیسے مفکر ادیبوں نے اوج کمال تک پہنچادیا۔ اٹھارویں صدی فروغ صحافت ہی کی صدی نہیں تھی بلکہ اسے رچرڈ سٹیل' جوزف ایڈیسن اور جانسن کی صدی بھی شمار کیا جاتا ہے۔ سید احمد خان نے ان انگریزی ادبا کو تہذیب کے پیغمبر شمار کیا ہے۔ ان کی انشائیہ نگاری اس دور کا ایک اہم تہذیبی واقعہ ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ خصوصیت اس حقیقت کو حاصل ہے کہ ان لوگوں نے "ٹیٹلر" "سپیکٹیٹر" اور "جنٹلمین میگزین" جیسے رسائل جاری کیے جن میں ایسے کی اشاعت کا اہتمام بالا التزام کیا جاتا تھا۔ عورتوں کی دلچسپی کے فیچروں کے علاوہ گپ شپ پر مبنی بہجت آفرین مضامین کو مناسب جگہ دی جاتی تھی۔ ان رسائل نے عوام اور خواص کی تہذیبی مزاج سازی میں اہم کردار ادا کیا اور ادب اور خبر کے درمیان مابہ الامتیاز کو بھی نکھار دیا۔ یہ رسائل عوام میں ایک خاص

نوعیت کا داخلی رد عمل پیدا کرنے میں بھی سرگرم تھے۔ چنانچہ ڈینیل ڈیفیو نے اپنے رسالہ "ریویو" میں کلیسائے انگلستان پر ایک تنقیدی مضمون لکھا تو اس کی پاداش میں اسے پس زنداں جانا پڑا۔ تاہم اس سزا اور تعزیر کے باوجود اس حقیقت کو امتیاز حاصل ہے کہ تہذیبی اور سماجی امور پر "سپیکٹیٹر" اور "ٹیٹلر" میں لوگ ایڈیسن اور سٹیل کے بالواسطہ اظہار خیال کو نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ ان کے ایسے، اسلوب کی شائستگی اور دلیل کے پر اثر دھیمے لہجے اور نادر نکتہ آفرینی کی وجہ سے بہت پسند کئے جاتے تھے۔ ڈاکٹر جانسن اس عہد کی ایک موثر ترین شخصیت تھی۔ وہ زندگی کا بے رحم نقاد تھا لیکن وہ فطری انشائیہ نگار بھی تھا۔ اس کا رسالہ "جنٹلمین میگزین" اگرچہ اٹھارویں صدی کا رسالہ ہے لیکن یہ آج کے ترقی یافتہ دور کے رسائل سے کسی طور بھی کم نظر نہیں آتا۔ جانسن نے ایک بلند پایہ ادیب کے مقام، مرتبے اور وقار کو قائم رکھتے ہوئے اپنی تحریروں سے معاشرے کے خس وخاشاک کو صاف کرنے کی سعی کی اور رسالہ "ریمبلر" اور "جنٹلمین میگزین" کو اس دور کے انسان کی ذہنی ضرورت بنا دیا۔ یہاں آلیور گولڈ سمتھ کا ذکر بھی ضروری ہے جو اخبار "بی" کے صفحات سے ابھرا تھا اور جس کے بارے میں ڈاکٹر جانسن نے لکھا تھا کہ "گولڈ سمتھ جس موضوع کو بھی مس کرتا ہے۔ اس کی تزئین ہو جاتی ہے۔"(۱۱)

چنانچہ گولڈ سمتھ نے عوام کی ادبی ضرورتوں اور جمالیاتی تقاضوں کو ایسے کے وسیلے سے پورا کیا اور انہیں رفعت خیال سے ہم کنار کر دیا۔ متذکرہ بالا بحث سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اخبار کو ادبی جریدے کا روپ دینے میں انگلستان کے ان ادیبوں کا زیادہ حصہ ہے جو ایک نئے تہذیبی آفاق کو روشن کرنے کے آرزو مند تھے اور اس مقصد کے حصول کے لئے اخبار کو وسیلے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے، ان ادبا کا چونکہ واسطہ عوام سے بھی تھا اس لئے باور کیا جا سکتا ہے کہ ادبی مقاصد کے لئے علیحدہ رسالے جاری کرنے اور ان رسائل کو تعلیم یافتہ اور اہل ذوق طبقے تک محدود رکھنے کے بجائے ان ادیبوں نے اخبار کے ذریعے وسیع طبقے تک پہنچنا مناسب سمجھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں اخبارات کے ساتھ مستند ادبا وابستہ ہوئے تو انہوں نے اخبار کو محض خبریں ڈھالنے کی مشین نہیں بننے دیا بلکہ اخبار کو ادب کے بلند تر مقام کی طرف لانے کی سعی کی۔ تیسری بات یہ کہ علوم کے فروغ سے قارئین کے تقاضوں کی نوعیت آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی جا رہی تھی اور وہ محض خبروں کی فراہمی پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ خبروں کے پس منظر، حال اور مستقبل پر ان کے اثرات اور تہذیبی اور تمدنی موضوعات کا مطالعہ کرنے کے خواہش مند بھی تھے۔ اس ضرورت کے تحت اخبارات میں کالم نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ پیریا ڈیکل ایسے یعنی صحافتی انشائیہ کو فروغ ملا اور اسی عہد کے بڑے بڑے ادبا نے یہ فریضہ سنبھالا تو اخباری دنیا کا جھکاؤ بتدریج ادب کی طرف ہوتا چلا گیا۔

واضح رہے کہ ادب کو خبر سے علیحدہ کرنے اور دونوں کی فنی حدود میں مابہ الامتیاز قائم کرنے کا کام انگلستان نے سرانجام نہیں دیا۔ ادبی رسالے اور اخبار میں اولیں حد فاصل امریکہ میں پیدا ہوئی' امریکی اخبارات نے ابتدا ہی میں صحافتی مدار میں صرف خبر رسانی کے شعبے کو داخل ہونے کی اجازت دی اور تہذیبی' فکری اور ادبی موضوعات پر اظہار خیال کے لئے رسائل و جرائد علیحدہ مختص کیے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں امریکہ اپنا تہذیبی تشخص انگلستان کے مزاج سے الگ ہو کر قائم کرنے میں کوشاں تھا۔ چنانچہ ہر شعبۂ حیات کی تجدید کی جا رہی تھی اور اسے نئے زاویوں سے پیش کرنے کی جد و جہد جاری تھی۔ صحافت کے شعبے میں بھی انگلستان کی مروجہ اخبار نویسی کی تقلید کرنے کے بجائے امریکہ نے اپنی ضرورتوں کو ترجیح دی اور اخبارات و رسائل کے لئے نئے ڈھانچے وضع کیے اور یوں انیسویں صدی کے اوائل میں ادبی جریدہ نگاری کو ایک علیحدہ حیثیت مل گئی جس پر دوسرے ممالک میں بھی عمل کیا گیا۔ اس دور میں اگر کوئی ادبی مضمون اخبار میں راہ پا جاتا تو یہ امر محض اتفاقی یا موضوع کی سماجی اہمیت کے پیش نظر ہوتا اور اخبارات اپنے بنیادی مقاصد یعنی خبروں کی ترسیل کو فوقیت دیتے تھے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ادبی مضامین اگرچہ اٹھارویں صدی کے اوائل میں اخبارات میں مناسب مقام حاصل کر چکے تھے اور نامور ادبا اخبارات سے وابستہ ہو کر ایک فکری انقلاب بھی روبہ عمل لا رہے تھے تاہم خالص ادبی صحافت کو فروغ انیسویں صدی میں حاصل ہوا۔ ادب کو روز مرہ کی سیاسی و سماجی صحافت سے علیحدہ کرنے کی ضرورت سب سے پہلے امریکہ میں محسوس کی گئی اور مختلف موضوعات پر مبنی ایسے مخصوص رسائل معرض حیات میں آ گئے جن کا وجود اس سے قبل ادبی صورت کا مظہر نہیں تھا۔

○
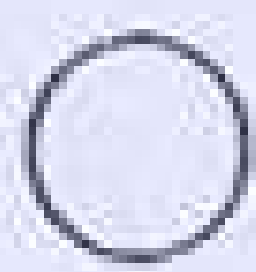
حوالہ جات

۱۔ "کالیرز انسائیکلو پیڈیا" ص ۶۴۲۔ لندن ۱۹۷۸ء

۲۔ "انسائیکلو پیڈیا برٹینکا" ص ۶۳۷ ۔ لندن ۱۹۸۶ء

۳۔ عبدالسلام خورشید "صحافت پاکستان و ہند میں" ص ۱ ۔ مکتبہ کاروان' لاہور (ت ۔ ن)

۴۔ "انسائیکلو پیڈیا برٹینکا" ص ۶۳۷

۵۔ عبدالسلام خورشید " صحافت پاکستان و ہند میں" ص ۲ ۔

۶۔ ایضاً "

۷۔ ٹی ایس ایلیٹ ۔ "ایلیٹ کے مضامین" ۔ ص ۵۳۵ ۔ ترجمہ : ڈاکٹر جمیل جالبی ' کراچی ۱۹۷۱ء

۸۔ وزیر آغا "تنقید اور احتساب" ص ۲۷۵ ۔ لاہور ۱۹۶۸ء

۹۔ ڈاکٹر وزیر آغا "تنقید اور احتساب" ص ۲۷۵

۱۰۔ "انشائیہ اردو ادب میں" ص ۱۱۵ ۔ لاہور ۱۹۸۵ء

۱۱۔ بحوالہ " پچاس بہترین ا سیز" مرتبہ: پیٹرسن

دوسرا باب

برصغیر میں اردو رسائل کی ابتدا؟

چھاپہ خانہ اور اردو صحافت کی ابتدا

ہندوستان میں صحافت کو انیسویں صدی میں فروغ ملنا شروع ہو گیا تھا' اس وقت طباعت واشاعت کی مشینی سہولتیں ہندوستان میں دستیاب ہو چکی تھیں ' مشنری (MISSIONARY) ضرورتوں کے لئے پریس درآمد کیا گیا تو اس سے ادبی کتابوں کی اشاعت کا کام بھی لیا گیا اور لیتھوطباعت کے ساتھ نستعلیق ٹائپ کی طباعت کو فروغ دینے کی کاوش بھی کی گئی' مغلوں کے عہد میں اگرچہ علوم و فنون کے فروغ میں مشین کو ایک اہم وسیلے کی حیثیت مل چکی تھی' لیکن مشینی طباعت کو اس زمانے میں مناسب ترقی نہ دی گئی' کہا جاتا ہے کہ جلال الدین اکبر کے سامنے مشینی طباعت کا جو نمونہ پیش کیا گیا وہ اتنا بدزیب تھا کہ مغل اعظم کی جمالیاتی حس اسے قبول نہ کر سکی' وقائع نویسی بیشتر مقامی حالات' امرا اور خواص کی سرگرمیوں اور منڈیوں کے تجارتی نرخوں کی اطلاع یابی کے لیے وقف تھی' چنانچہ ہماری مطبوعہ صحافت برطانوی دور اقتدار کی پیداوار ہے۔ (۱) انگریزوں نے اپنے اقتدار کی طنابیں مضبوط کیں تو انہیں ہندوستانی رعایا میں ذہنی انقلاب لانے کی ضرورت بھی محسوس ہوئی اور اس حکمت عملی کے خطوط لارڈ میکالے کی حکمت عملی میں ظاہر ہوئے تھے۔ ۱۷۸۰ء میں جیمز آگسٹس ہکی (۲) نے "بنگال گزٹ" یا "کلکتہ ایڈورٹائزر" جاری کیا تو اس میں نامہ نگاروں کے مراسلے اور یورپ کی خبروں کے خلاصے بھی پیش کئے۔ (۳) انیسویں صدی کی ابتدا میں برصغیر پاک و ہند میں صحافت کا مقصد قارئین تک خبریں پہنچانا بھی تھا لیکن اس سے بھی بڑا مقصد علوم نو کا فروغ تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے کہ:

"علم کے فروغ سے مراد یہ تھی کہ قارئین کو سائنس اور مغربی علوم کی ترقیات سے آشنا کیا جائے۔"

یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر اخبار میں خبروں کے علاوہ مضامین کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا جاتا

تھا۔ "جب اخبارات میں "خبریت" زیادہ بڑھ گئی تو ضرورت محسوس کی گئی کہ علمی اور ادبی صحافت کو بھی معرض وجود میں لایا جائے" (۴) اور اب جو اخبارات معرض عمل میں آئے ان کا انداز اٹھارویں صدی کے یورپی رائے ساز رسائل "ٹیٹلر" اور "سپیکٹیٹر" جیسا تھا۔ اس دور میں خبری صحافت اور ادبی صحافت میں کوئی حد فاصل نظر نہیں آتی۔

ہندوستان میں پہلا چھاپہ خانہ پرتگیزوں نے ۱۵۵۰ء میں قائم کیا۔ (۵) انگریزوں نے ایک مطبع ۱۶۷۴ء میں بمبئی میں نصب کیا۔ اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں ایک بنگال دستکار پنچانن کرمکار نے قلعی ڈھال کر حروف کی سربیاں تیار کیں جن کو پہلی دفعہ انگریزی اخبار "بنگال گزٹ" بابت ۴ مارچ ۱۷۸۴ء میں استعمال کیا گیا۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے آگرہ پر قبضہ کیا تو وہاں ایک طباعتی مشین پہلے سے موجود پائی، جس پر قرآن مجید چھاپا جاتا تھا۔(۶) اخبار "بنگال گزٹ" میں ایک کالم سرورق پر فارسی ٹائپ میں چھپتا تھا جس پر "خلاصہ اخبار دربار معلی بر دارالخلافہ شاہجہان آباد" چھپا ہوتا تھا۔ (۷) ہندوستان میں لیتھو طریق طباعت ۱۸۲۲ء میں آیا تو طباعت و اشاعت کی دنیا میں انقلاب آگیا اور اب نہ صرف کتابوں کی چھپائی آسان ہو گئی بلکہ مختلف شہروں سے اخبارات و رسائل بھی نکلنے لگے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ لیتھو طریق طباعت سے پہلے صحافت کی جڑیں ہندوستانی مٹی میں اتر چکی تھیں۔ دہلی کا بنگال گزٹ ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو جاری ہوا۔ نومبر ۱۷۸۱ء میں بی میسنک (B. MESSNIC) اور پیٹر ریڈ (PETER READ) کا انگریزی اخبار "انڈین گزٹ" نکلا۔ انگریزی حکومت نے ۱۷۸۴ء میں سرکاری اخبار "کلکتہ گزٹ" شائع کیا "دی بنگال جرنل" فروری ۱۷۸۵ء میں اور ماہنامہ اخبار "اورینٹل میگزین" یا "کلکتہ اموزمنٹ" اپریل ۱۷۸۵ء میں جاری ہوئے۔

انگریزی صحافت کے اس رخ کو راجہ رام موہن رائے نے مذہبی تبلیغ کے لئے استعمال کیا۔ انہوں نے دسمبر ۱۸۱۱ء میں "سمباد کمبودی" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ بنگالی زبان کا ایک اور ماہنامہ "ڈگ درشن" اپریل ۱۸۱۸ء میں شائع ہوا جو عیسائیت کی تبلیغ میں پیش پیش تھا اور یہ اتنا موثر ثابت ہوا کہ ڈاکٹر ولیم کری نے ایسے اخبار کو جس میں مہذب اور سبق آموز مضامین شائع ہوں انجن سے زیادہ موثر اور طاقت ور تسلیم کیا۔ ماہنامہ "ڈگ درشن" نے ہفتہ وار "سماچار درپن" کی اشاعت کی راہ ہموار کی۔ یہ تبلیغی رسالہ مسٹر مارش مین (MARSHMAN) کی ادارت میں ۲۳ مئی ۱۸۱۸ء کو جاری ہوا اور اسے دیکھ کر لارڈ وارن ہیسٹنگز اتنا خوش ہوا کہ اس پرچے کی ترسیل پر ڈاک خرچ کی پچھتر فی صد رعایت دے دی۔ یعنی دوسرے رسائل کی ترسیل پر اگر چار پیسے کے ٹکٹ لگتے تھے تو "سماچار درپن" صرف ایک پیسے کے خرچ پر جاتا تھا۔ (۸) بکی کے انگریزی اخبار "بنگال گزٹ" کے ساتھ فارسی خبروں کی اشاعت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو ہندوستانی صحافت نے اردو کی طرف

پیش قدمی کی اور کلکتہ سے ہفتہ وار "جام جہاں نما" اردو زبان میں جاری کیا گیا۔

اردو زبان کا پہلا اخبار "جام جہاں نما"

ہفتہ وار "جام جہاں نما" کی زندگی جزر ومد کا مرقع ہے۔ اس کی ابتدا اردو زبان کے صحیفے کے طور پر ہوئی تھی۔ لیکن صرف چھ شمارے چھپنے کے بعد کلکتہ جرنل میں یہ اعلان شائع ہوا کہ "اس کی زبان میں ایک اہم تبدیلی ہونے والی ہے" اور ۱۶ مئی ۱۸۲۲ء سے "جام جہاں نما" کی زبان فارسی کر دی گئی۔ (۹) ۱۸۲۳ء میں "جام جہاں نما" نے فارسی خبروں کے ساتھ اردو ضمیمے کا اضافہ کر دیا اور اب یہ اخبار ذولسانی شمار ہونے لگا۔ مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ "فارسی کا پرچہ بھاری بھر کم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا پرچہ بددلی سے نکالا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شان یا جان نہیں تھی" (۱۰)

"جام جہاں نما" ایک طویل العمر اخبار تھا۔ اس نے کم و بیش ۵۵ سال کی عمر پائی اور ۱۸۷۶ء تک جاری رہا۔ مرزا غالب نے عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں اس اخبار کا ذکر کیا ہے۔(۱۱) اردو خبروں کا ضمیمہ یکم مارچ ۱۹۲۶ء تک جاری رہا اور اس کے بعد بند کر دیا گیا۔ اس اخبار کی مجموعی کارکردگی کو پیش نظر رکھا جائے تو اسے فارسی زبان کا اخبار درست تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی ایک تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس کی ابتدا اردو زبان میں ہوئی تھی اور پانچ سال تک فارسی کے ساتھ اردو ضمیمہ بالالتزام چھپتا رہا۔ اس اعتبار سے "جام جہاں نما" کو اردو کا پہلا اخبار بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

"جام جہاں نما" کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ اس میں انگریزی اور فارسی مضامین کے تراجم شائع کئے جاتے تھے' ادبی زاویے سے اس میں شاعری کا حصہ بھی شامل تھا۔ ۱۸ اپریل ۱۸۲۷ء کے "جام جہاں نما" میں ایک ہندوستانی شاعر مسٹر ڈی کاسٹا کی غزل شائع ہوئی۔ اس کا مطلع اور مقطع حسب ذیل ہے:

کل ہم تمہارے کوچہ میں آئے ' چلے گئے
ہے ' ہے ' ہزار اشک بہائے چلے گئے
کل اس پری کی بزم میں سب مل کے برملا
تیری غزل ڈی کاسٹا گائے چلے گئے (۱۲)

"تاریخ انگلستان" اور "تاریخ عالمگیری" کی سلسلہ وار اشاعت بھی "جام جہاں نما" کے ادبی زاویے ہی کو پیش کرتی ہے۔(۱۳)

"مراۃ الاخبار" کلکتہ

"جام جہاں نما" کے ساتھ ہی ۲۰ اپریل ۱۸۲۲ء کو فارسی زبان میں راجہ رام موہن رائے نے کلکتہ سے ہفت روزہ "مراۃ الاخبار" جاری کیا۔ (۱۴) راجہ رام موہن رائے روشن خیال مدیر تھے انہوں نے مراۃ الاخبار سے سماجی اصلاح اور فروغ علوم کا کام لینے کی سعی کی اور اسے معلوماتی اخبار بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی' گمان غالب ہے کہ "جام جہاں نما" نے بھی اردو زبان سے فارسی زبان کی طرف مراجعت "مراۃ الاخبار" کی ابتدائی اٹھان سے متاثر ہو کر ہی کی ہو گی۔ راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۳ء میں نافذ ہونے والے پریس قوانین کی مخالفت کی اور ان کی اپیل نا منظور ہو گئی تو انہوں نے بطور احتجاج "مراۃ الاخبار" بند کر دیا۔ (۱۵) ہندوستانی اخبارات کے حقوق کی آزادی کے لئے کسی ہندوستانی کا یہ پہلا اقدام تھا اور یہ بے حد قابل تحسین ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انیسویں صدی کے اول میں اردو صحافت کو نمایاں فروغ حاصل نہیں ہوا اور عوام کا رجحان فارسی زبان کی طرف زیادہ تھا' چنانچہ اس دور میں فارسی زبان کے اخبارات کی اشاعت کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی گئی' اور جو اخبارات مطلع صحافت پر جلوہ گر ہوئے ان میں "شمس الاخبار" کلکتہ (۱۸۲۳ء تا ۱۸۲۷ء) "اخبار سی رام پور" (۱۸۲۶ء تا ۱۸۲۸ء) "آگرہ اخبار" جسے بعد میں "زبدۃ الاخبار" کا نام دیا گیا (۱۸۳۳ء تا ۱۸۵۳ء) "آئینہ سکندر" کلکتہ (۱۸۳۳ء تا ۱۸۳۶ء) "ماہ عالم افروز" کلکتہ (۱۸۲۳ء تا ۱۸۳۶ء) "لدھیانہ اخبار" (۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۷ء) "سلطان الاخبار" کلکتہ (۱۸۲۵ء تا ۱۸۶۲ء) "مہر منیر" کلکتہ (۱۸۴۱ء) خاصے معروف و ممتاز ہیں۔ "سراج الاخبار" (۱۸۴۱ء تا ۱۸۵۷ء) کو بہادر شاہ ظفر کے "کورٹ گزٹ" کی حیثیت حاصل تھی۔ اس میں قلعہ معلیٰ کی فارسی زبان میں شاہ ظفر کا روز نامچہ چھپتا تھا۔ جنگ آزادی سے قبل "سراج الاخبار" میں اردو خبریں بھی درج کی جانے لگی تھیں' "صادق الاخبار" ۱۸۴۴ء میں دہلی سے فارسی میں نکلا تھا لیکن بعد میں اسے اردو زبان کا اخبار بنا دیا گیا۔ اس قسم کے اخبارات سے ہندوستانی صحافت کی فارسی زبان سے اردو کی طرف پیش قدمی کی نشان دہی ہوتی ہے۔

"دہلی اردو اخبار"

اردو زبان میں صحافت کا جو تجربہ "مراۃ الاخبار" نے کیا تھا اس تجربے کو ۱۸۳۶ء میں مولانا محمد باقر نے "دہلی اردو اخبار" میں کامیابی سے ہم کنار کر دیا۔ یہ اخبار ۱۸۳۶ء میں جاری ہوا۔ ۱۸۵۴ء میں

مولانا محمد حسین آزاد نے اس کی ادارت سنبھالی' ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے کہ "آزاد کی آمد سے یہ اخبار فنی لحاظ سے پہلے سے کہیں بہتر ہو گیا۔ زبان نکھر آئی' تحریر کے اسلوب اور بے ساختگی کے عناصر نے اخبار کو قارئین کے لئے زیادہ پر کشش بنا دیا" (۱۶)

۱۸۵۷ء کے دوران اس اخبار کا نام "اخبار ظفر" کر دیا گیا۔ ناکام جنگ آزادی کے بعد مولوی محمد باقر کو مسٹر ٹیلر کے قتل کے الزام میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ مولانا آزاد بمشکل جان بچا کر دلی سے نکل گئے۔ "دہلی اردو اخبار" کا آخری پرچہ ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو چھپا تھا۔

" دہلی اردو اخبار " کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاشرتی اور سیاسی خبروں کے علاوہ غالب' ذوق' مومن' بہادر شاہ ظفر اور نواب زینت محل کے کلام کی اشاعت بھی ہوتی تھی' تعلیمی اداروں کی خبروں کے ساتھ ادبی مضامین بھی شائع کئے جاتے تھے' ادیبوں کے بارے میں خبروں کو اہمیت دی جاتی تھی۔ دلی کے ادبی مناقشے میں "اخبار اردو" استاد ذوق کا طرفدار اور مرزا غالب کا کھلا مخالف تھا۔(۱۷) ۸ ستمبر ۱۸۵۲ کے اخبار میں دہلی کے ایک طرحی مشاعرے کی جو روداد چھپی ہے اس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

لو دعائیں مستجاب شاہ مرداں ہو گئیں
شکر ہے سب مشکلیں شاہی کی آساں ہو گئیں

مرزا نورالدین شاہی

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

غالب

چار آنکھیں تیری ہائے آفت جاں ہو گئیں
تیر سے اس کی ' جگر سے پار مژگاں ہو گئیں

بہادر شاہ ظفر

۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کے "دہلی اردو اخبار" میں مولانا محمد حسین آزاد کی معرکہ آرا نظم "تاریخ انقلاب عبرت افزا" شائع ہوئی جس کا ایک شعر حسب ذیل ہے۔

عبرت کے لئے خلق میں یہ سانحہ بس ہے
گر دیوے خدا عقل سلیم و دل ہشیار (۱۸)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے " دہلی اردو اخبار " کو علمی اور ادبی مباحث کا مخزن قرار دیا

ہے۔(۱۹)

" دہلی اردو اخبار " کی متذکرہ بالا خصوصیات کو پیش نظر رکھیں تو اسے انگلستان کے ان اخباروں کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے جن میں خبروں کے ساتھ علمی اور ادبی مضامین کی اشاعت کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ محمد حسین آزاد چونکہ دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے اس لئے قیاس غالب ہے کہ انہوں نے اس اخبار کا یہ ترقی پسندانہ انداز بھی اس کالج کے اساتذہ سے ہی سیکھا ہو گا' اس کا مزاج ادبی تھا اور دلی اخبار کو بجا طور پر اردو میں ادبی صحافت کا پہلا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اردو صحافت میں سید محمد خان کے " اخبار سید الاخبار " کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں سر سید احمد خان کے ابتدائی مضامین شائع ہوئے۔(۲۰) یہ ہفت روزہ دہلی سے ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا اور ۱۸۵۰ء تک چھپتا رہا اس اخبار سے مرزا غالب کو بھی خصوصی انس تھا۔

برصغیر میں جریدہ نگاری کی ابتدا

ہندوستان میں جریدہ نگاری کی ابتدا انگریزی رسائل سے ہوئی تھی' چنانچہ "ایشیا ٹک مسے لینی اینڈ بنگال رجسٹر" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ ۱۷۸۵ء میں جاری کیا گیا جس میں اخلاقی' تاریخی اور فکاہیہ مضامین کے علاوہ شاعری بھی شائع کی جاتی تھی' اس رسالے کے مدیران مسٹر گارڈن اور مسٹر جے تھے' اٹھارویں صدی کے اواخر میں ایک ماہانہ رسالہ "کلکتہ میگزین اینڈ اور ینٹل میوزیم" کے نام سے مسٹر جے وائیٹ نے جاری کیا۔ تبلیغی ضرورتوں کے لئے جو رسائل جاری ہوئے ان میں "ڈگ درشن" "سما چار درپن" کے علاوہ "فرینڈ آف انڈیا" بھی اہم ہے اور یہ رسائل علمی مضامین کی اشاعت میں بھی پیش پیش تھے' ادبی لحاظ سے "ڈبلن سے ہولی ہڈ تک مسٹر مڈلر کا ہوائی سفر" ایک دلچسپ سفر نامہ ہے جو "ڈگ درشن" میں شائع ہوا۔ راجہ رام موہن رائے نے اہل ہند میں بیداری کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے حصول مقصد کے لئے رسالہ " تحفتہ الموحدین" فارسی زبان میں پیش کیا اور اس کا دیباچہ عربی میں لکھا۔ تاہم ان کا ایک بڑا اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے "مراۃ الاخبار" سے ہندوستانی عوام کی سماجی' ذہنی اور فکری تربیت میں گراں قدر حصہ لیا۔

اردو کا پہلا ماہانہ جریدہ

اردو کا پہلا ماہانہ رسالہ "خیر خواہ ہند" ہے جو عیسائی مذہب کی تبلیغی ضرورتوں کے لئے مرزا پور

سے پادری ایف جی برایت نے جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر آر' سی ماتھر تھے "خیر خواہ ہند" میں پہلی دفعہ علمی اور تبلیغی قسم کے مضامین کو خبروں پر فوقیت دی گئی۔ یہ رسالہ ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا لیکن ۱۸۵۷ء میں ہنگاموں کے ایام میں کچھ عرصے کے لئے بند کر دیا گیا۔ انگریزی راج قائم ہوا تو یہ رسالہ دوبارہ نکل آیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس رسالے کے بعض مفید مضامین کا انتخاب کتابچوں کی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔(۲۱) قاضی عبدالغفار کے مطابق "خیر خواہ ہند" کے نام سے ایک رسالہ بنارس سے بھی چھپتا تھا۔ (۲۲) اس کے مہتمم پادری تھامس تھے۔

۱۸۴۵ء میں مسٹر اشپرنگر دلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تو انہوں نے پینی میگزین (PENNY MAGZINE) کی طرز پر ایک ہفتہ وار اردو رسالے "قران السعدین" کی بنیاد ڈالی۔ گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ

"قران السعدین" ایک باتصویر اخبار ہے جس میں سائنس ادب اور سیاست پر بحث ہوتی ہے' اس کا مقصد ہم وطنوں میں مغربی خیالات کی اشاعت ہے۔"

رسالہ "قران السعدین" کے مقاصد تعلیمی تھے' اس نے دلی کالج کے طلبہ کے علمی اور ادبی ذوق کی تربیت کی' ان کے فکر و نظر کو تبدیل کرنے اور انگریزی حکومت کے بعض مخصوص مقاصد حاصل کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی' حتیٰ کے بقول عتیق صدیقی ان "اندوہ ربا خیالات" نے اس دور کے "پرانے لوگوں" کے دلوں میں بھی گھر کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کی ایک روشن مثال مفتی صدر الدین آزردہ تھے" (۲۳)

ماسٹر رام چندر کی ادبی صحافت

اٹھارویں صدی کے وسط میں دلی کالج علوم نو کا سرچشمہ تھا۔ ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی جو نسل اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر فکر و مذاق کے لحاظ سے انگریزوں جیسا ہو۔ (۲۴) دلی کالج ان مقاصد کے حصول میں پیش پیش تھا اور ادبی رسائل و جرائد کے ذریعے طلبہ اور پرانی نسل کے لوگوں کے اذہان پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس کالج کے نامور استاد ماسٹر رام چندر مغربی علوم سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ہندو دھرم چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ صحافت کے زاویے سے ماسٹر رام چندر کی منفرد عطا یہ ہے کہ انہوں نے غیر ملکی رسائل کے نمونے پر اردو میں ماہانہ ادبی صحافت کا تجربہ کیا اور ماہ نامہ "خیر خواہ ہند" جاری کیا جو طبیعیات' ہیئت اور اخلاقیات جیسے مضامین کے لئے وقف تھا۔ اس رسالے کے اجرا سے قبل انہوں

نے ۱۸۴۵ء میں ایک بیش قیمت تجربہ پندرہ روزہ اخبار "فوائد الناظرین" کی صورت میں کیا تھا اور قوم پرستانہ جذبات کی افزائش و ترویج کی کوشش کی تھی، (۲۵) بظاہر نظر آتا ہے کہ "فوائد الناظرین" کو عام خریداروں کی توجہ حاصل نہ ہو سکی تاہم جب ماسٹر رام چندر نے ۱۸۴۷ء میں ماہوار علمی رسالہ "خیر خواہ ہند" جاری کیا تو اس کے علمی اور ادبی مقاصد "فوائد الناظرین" سے مختلف نہیں تھے، یکم ستمبر ۱۸۴۷ء کے پرچے میں اس کی حکمت عملی یوں سامنے آتی ہے:

"اس میں مضامین مدام ایسے چھپیں گے جو خلقت ہند کو مفید ہوں گے اور تاریخ ہر دیار کے مثل ہندوستان، فرنگستان، ایران، افغانستان وغیرہ کے اور مضامین پند و نصائح درج ہوں گے ... عجیب و غریب حالات و اشعار آبدار بڑے بڑے استادوں کے حتی المقدور معہ تصویرات ان کی لکھی جائیں گی۔"

ماسٹر رام چندر کا خیال تھا کہ اخبار کی حیثیت دریا نہیں اور یہ ایک دفعہ دیکھے جانے کے بعد کام کا نہیں رہتا۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایسا رسالہ جاری کرنے کا ارادہ کیا جو اپنی حیثیت تا دیر قائم رکھے۔ انہوں نے "خیر خواہ ہند" کے بارے میں لکھا کہ:

"یہ ایک مثل نایاب کتاب کے رہے گا"

اس سے دو باتوں کا اکتساب باسانی کیا جا سکتا ہے۔

اول۔ ماسٹر رام چندر اخبار کی حیات مختصر اور رسالہ کی کتابی اور دوامی حیثیت سے آشنا تھے۔ چنانچہ انہوں نے اخبار اور رسالہ کے مابہ الامتیاز کو قائم رکھنے کی بھی سعی کی۔

دوم۔ انہوں نے دریا حیثیت کا رسالہ "خیر خواہ ہند" (۲۶) جاری کیا تو پندرہ روزہ اخبار "فوائدالناظرین" کی افادی حیثیت ختم ہو گئی اور ماسٹر رام چندر نے زیادہ توجہ نئے رسالے پر صرف کرنا شروع کر دی۔

گمان غالب یہ بھی ہے کہ "فوائد الناظرین" کے دائرہ اثر میں نسبتاً کم تعلیم کے لوگ تھے جو ماسٹر رام چندر کے تصورات و نظریات کی تحسین مناسب طور پر نہیں کر سکتے تھے۔ "خیر خواہ ہند" سے ان کا روئے سخن تعلیم یافتہ طبقے کی طرف ہو گیا اور اس پرچے نے ان کے معینہ مقاصد کے حصول کی راہ ہموار کر دی۔

ماہنامہ "خیر خواہ ہند" ستمبر ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا نومبر ۱۸۴۷ء سے اس کا نام تبدیل کر کے "محب ہند" کر دیا گیا۔ (۲۷) وجہ یہ تھی کہ "خیر خواہ ہند" کے نام سے ایک اور رسالہ مرزا پور سے بھی نکل رہا تھا۔ "محب ہند" میں تاریخی نوعیت کے جو نادر ادبی مضامین شائع ہوئے ان میں یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامہ کے علاوہ بہادر شاہ ظفر اور شاہ نصیر کی غزلیں بہت اہم ہیں۔ ان میں سے

چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

میں امور عاشقی میں اے ظفر ہشیار ہوں
لوگ دیوانہ مجھے کہتے ہیں، دیوانہ دروغ

○

دل جن کا ہے روشن وہ ظفر صورت خورشید
یکساں ہیں سدا باعث تنویر پس و پیش

بہادر شاہ ظفر (۲۸)

ہم رہان سفر اسباب سفر باندھے ہیں
چست عاقل کہیں، اب یار کمر باندھے ہیں

کھیلتا ہے ساقیا، گر توبط ...
تو لب دریا بنا، موج مے احمر ...

شاہ نصیر (۲۹)

"محب ہند" کی نوعیت علمی تھی لیکن اس نے فروغ ادب میں بھی اہم کردار ادا کیا' ماسٹر رام چندر نے فروری ۱۸۴۹ء کے پرچے میں بہادر شاہ ظفر کی چھ غزلیں ایک ساتھ شائع کیں۔ یہ ایسا اجتہاد تھا جسے بیسویں صدی کے ادبی پرچوں نے بھی قبول کیا "محب ہند" عقلی تحریک کا نمائندہ تھا رام چندر دلی کالج کی تحریک احیاء العلوم کے ایک سرکردہ رکن تھے' ان کے رسائل نے خرد افروزی کو فروغ دیا' عملی موضوعات کو اہمیت دی' بعض شعرا مثلاً فردوسی کی شاعری پر تنقیدی محاکمہ پیش کیا' سفرنامے کی صنف کے ابتدائی نقوش ابھارے اور علمی موضوعات میں استدلال اور شائستگی کو فروغ دیا۔ (۳۰) چنانچہ ماسٹر رام چندر کو ہم بجا طور پر اردو کی ادبی صحافت کے ہراول دستے کا قافلہ سالار کہہ سکتے ہیں۔

"محب ہند" کی اشاعت کے بعد ادبی صحافت کو ایک نئی کروٹ مل گئی۔ چنانچہ جنوری ۱۸۵۳ء میں منشی دیوان چند نے لاہور سے رسالہ "ہمائے بے بہا" جاری کیا۔ محمد حسن احسن کلانوری نے جولائی ۱۸۵۴ء میں ماہنامہ "معلم ہند" کی بنا لاہور میں ڈالی۔ منشی ہر سکھ رائے کا علمی و ادبی ماہ نامہ "خورشید پنجاب" جنوری ۱۸۵۶ء میں مطلع ادب پر نمودار ہوا۔ جنوری ۱۸۵۶ء میں سیالکوٹ سے رسالہ "نور علیٰ نور" اور آگرہ سے منشی شیونرائن آرام کی ادارت میں ادبی ہفت روزہ "مفید خلائق" (۳۱) جاری ہوئے "مفید خلائق" کی ادبی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ منشی آرام اس میں دوسرے شعرا کے علاوہ مرزا غالب کا کلام بالالتزام چھاپتے تھے۔

"گل دستہ"۔۔ ادبی جریدہ نگاری کا ایک روپ

انیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں فروغ ادب کی ایک مئوثر صورت "گل دستہ" کی اشاعت سے رونما ہوئی' یہ اصطلاح ان رسالوں کے لئے استعمال کی جاتی تھی جن کا واحد مقصد شعرو شاعری کی اشاعت اور ترویج تھا۔ (۳۲) اس قسم کا پہلا "گل دستہ" جاری کرنے کا سہرا مولوی کریم الدین پانی پتی کے سر ہے (۳۳) جنھوں نے ۱۸۴۵ء میں ہفتہ وار "کریم الاخبار" اور ایک گل دستہ "گل رعنا" نکالا۔ (۳۴) اس زمانے میں مولوی کریم الدین اپنے مکان پر مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے ان مشاعروں میں پیش کیا جانے والا کلام "گلدستہ گل رعنا" میں شائع کیا جاتا تھا۔ مولوی صاحب یہ گلدستہ اپنے ذاتی مطبع رفاہ عام میں چھاپتے تھے(۳۵)مولوی کریم الدین احمد نے اپنے "تذکرہ طبقات الشعرا" میں بھی ان مشاعروں کا ذکر کیا ہے ۔ چنانچہ "گل دستہ"' "گل رعنا" اس دور کے مشاعروں کا نہایت قیمتی ماخذ ہے اور اس میں اس عہد کے متعدد ایسے شعرا کا کلام بھی دستیاب ہے جو قعر گمنامی میں گم ہو چکے ہیں ' ساحل احمد نے درست لکھا ہے کہ "اس رسالے یا گلدستے کی جدت کو دیکھ کر ہندوستان کے دوسرے شہروں سے بھی گلدستے جاری ہوئے۔" (۳۶) اس کی ایک مثال "گلدستہ معیار الشعرا" ہے جو آگرہ سے ۱۸۴۸ء میں شروع ہوا۔ محمد اکرام چغتائی کی تحقیق کے مطابق آگرہ کے علاوہ دیگر نواحی شہروں میں جو معروف شعرائے کرام تھے ان سے بھی کلام بھیجنے کی فرمائش کی جاتی تھی۔ (۳۷) ان کی بھیجی ہوئی غزلیں بھی مشاعروں میں پڑھ کر سنائی جاتیں اور گلدستے میں شائع بھی ہوتیں یہ گلدستہ ۱۸۵۹ ء کے بعد تک چھپتا رہا۔

۱۸۵۷ ء تک گل دستوں کی روائت شعر و صحافت کی زمین میں گہری نہ اتر سکی اور ان کی تعداد زیادہ نہیں ۔ چنانچہ ۱۸۴۹ء میں بنارس سے "گلدستہ گلزار ہمیشہ بہار" منظر عام پر آیا۔ "معیارالشعرا" کے نام سے ایک گلدستہ منشی شیونرائن آرام کے نام سے بھی منسوب ہے لیکن یہ وہی گلدستہ ہے جو مولوی ابوالحسن مرتب کرتے تھے اور مطبع اسعد الاخبار کے بعد شیونرائن آرام کے مطبع مفید الخلائق سے چھپتا رہا تھا (۳۸) ۔ ۱۸۵۴ء میں "کوہ نور" لاہور میں طرحی مشاعروں کی روداد چھاپنے کا سلسلہ گلدستوں کے انداز میں شروع کیا گیا۔ گلدستوں کی روایت کو ۱۸۵۷ء کے بعد زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ (۳۹)

۱۸۵۷ء سے پہلے کی ادبی جریدہ نگاری

مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں ۱۸۵۷ء سے ماقبل ادبی جریدہ نگاری کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں اس کی کوئی واضح جہت نظر نہیں آتی۔ ابتدا میں ہفتہ وار اخبارات ہی کو ادبی مضامین اور شعری تخلیقات کی اشاعت کے لئے استعمال کر لیا جاتا تھا۔ اخبارات کا مقصد خبر رسانی تھا۔ اس دور میں ادبا اور شعرا چونکہ معاشرے کے اہم افراد شمار ہوتے تھے اس لئے ان کے بارے میں خبروں کی اشاعت کو نمایاں جگہ اور اہمیت دی جاتی تھی۔ ادبی محفلوں کی روداد اور دربار مغلیہ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات عوام الناس کی دلچسپی کا باعث بنتے تھے (۴۰)۔ ماہانہ ادبی صحافت کو سی رام پور کے مشنری اداروں نے فروغ دیا اور ان سے تبلیغ مذہب کا کام لیا۔ دلی کالج کے رسائل و اخبارات "فوائد الناظرین" اور "محب ہند" نے ہندوستانی مزاج کو منقلب کرنے اور جریدہ نگاری کو فروغ دینے کی کاوش کی۔ مولوی کریم الدین احمد اور مولوی ابوالحسن نے ادبی صحافت میں گلدستوں کی ترویج کی اور ان کی مدد سے شعرو شاعری کے فروغ عام میں سرگرم حصہ لیا۔

اس دور میں رسائل کی اشاعت اگرچہ محدود تھی لیکن ان کا حلقہ اثر خاصہ وسیع نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایک پرچہ متعدد ہاتھوں میں گردش کرتا اور اکثر اوقات دوسرے شہروں سے منگوا کر بھی پڑھا جاتا۔ مرزا غالب کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں کوئی خبر چھپتی تو وہ اپنے شاگردوں سے رسالہ منگوا لیتے۔ منشی شیونرائن کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"میاں ! یہ کیا معاملہ ہے۔ ایک خط اپنی رسید کا بھیج کر پھر تم چپکے ہو رہے۔ نہ "معیار الشعرا" نہ میرے خط کا جواب۔"

اس اقتباس سے رسائل اور جرائد میں مرزا غالب کی دلچسپی نمایاں ہوتی ہے۔

اس دور کے ادبی رسائل میں اہل علم کی دلچسپی تو نظر آتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں عوام کی سرگرم اعانت حاصل نہیں تھی، اس سب کے باوجود یہ کہنا درست ہے کہ اس دور کے رسائل نے مستقبل کی ادبی صحافت کے لئے زرخیز زمین تیار کی اور ۱۸۵۷ء کے بعد جو ادبی رسائل منظر عام پر آئے انکے برگ و بار اسی زمین سے پھوٹے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "صحافت پاکستان و ہند میں" ص ۷۱

۲۔ JAMES AUGUSTUS HICKY

۳۔ محمد عتیق صدیقی "ہندوستانی اخبار نویسی" ص ۶۴۔ کراچی ۱۹۸۰ء

۴۔ "صحافت پاکستان و ہند میں" ص ۷۱

۵۔ ایضاً "

۶۔ عتیق صدیقی " گلکرسٹ اور اس کا عہد" ص ۲۷۲

۷۔ محمد سلیم "اردو رسم الخط" ص ۴۴

۸۔ ایک روایت کے مطابق ٹیپو سلطان نے بھی ایک سرکاری مطبع قائم کیا تھا اور سرکاری اور فوجی خبروں کی نشرو اشاعت کے لیے فوجی اخبار جاری کیا۔ جو سقوط سرنگا پٹم کے بعد بند ہو گیا ("میسور میں اردو" ص ۷۵۔ از محمد سعید عبدالخالق)

۹۔ امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" ص ۵۳۔ جلد اول۔ دہلی ۱۹۵۳ء

۱۰۔ حامد اللہ افسر "اردو کا پہلا اخبار" رسالہ " مشرق "۔ "تاریخ ادب اردو نمبر" ص ۲۵۲

۱۱۔ امداد صابری۔ حوالہ ایضاً۔ ص ۶۳

۱۲۔ " میں نے کلکتہ میں مہتمم مطبع "جام جہاں نما" کو لکھ بھیجا ہے اور ترک سعی کیا ہے۔ آپ بھی فکر نہ کیجئے۔ اگر کہیں سے آپ کے پاس آ جائے تو مجھ کو بھیج دیجئے" (غالب بنام سرور)

۱۳۔ بحوالہ "ہندوستانی اخبارنویسی" ص ۱۶۱۔ کراچی ۱۹۸۰ء

۱۴۔ عتیق صدیقی نے لکھا ہے کہ " جام جہاں نما " ۱۹۲۸ء میں بند ہو گیا تھا۔ در حقیقت ۱۹۲۸ء میں اس اخبار کا اردو ضمیمہ بند ہوا تھا۔ "نصرت الاخبار" دہلی یکم اگست ۱۸۷۶ء کے مطابق یہ اخبار ۱۸۷۶ء تک جاری رہا۔

۱۵۔ امداد علی صابری "تاریخ صحافت اردو" ص ۵۵ (جلد اول)

۱۶۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "صحافت پاکستان و ہند میں" ص۔ ۲۸

۱۷۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "کاروان صحافت" ص ۱۰۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی ۱۹۶۴ء

۱۸۔ امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" جلد اول۔ ص ۱۲۷

۱۹۔ عتیق صدیقی "۱۸۵۷ء اخبار اور دستاویزیں" دہلی ۱۹۶۶ء

۲۰۔ عبدالسلام خورشید "کاروان صحافت" ص ۹

۲۱۔ مولانا امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" جلد اول۔ ص ۲۲۲

۲۲۔ عتیق صدیقی "ہندوستانی اخبار نویسی" ص ۲۸۰

۲۳۔ بحوالہ ایم ایس ناز "اخبار نویسی کی مختصر تاریخ" ص ۱۸۷۔ لاہور ۱۹۸۰ء

۲۴۔ عتیق صدیقی۔ حوالہ ایضاً "۔ ص ۳۳۰

۲۵۔ "اردو ادب کی تحریکیں" ص ۳۱۰۔ کراچی ۱۹۸۵ء

۲۶۔ محمد عتیق صدیقی "ہندوستانی اخبار نویسی" ص ۳۴۲

۲۷۔ امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" ص ۲۱۲

۲۸۔ محمد عتیق صدیقی۔ حوالہ ایضاً "۔ ص ۳۴۴

۲۹۔ ماہنامہ " محب ہند "۔ فروری ۱۸۴۹ء

۳۰۔ "محب ہند" دہلی۔ مئی و جولائی ۱۸۵۰ء

۳۱۔ انور سدید "اردو ادب کی تحریکیں" ص ۳۰۹

۳۲۔ "مفید خلائق" کا ہندی ترجمہ " سروپ کارک " کے نام سے چھپتا تھا۔

۳۳۔ عبدالسلام خورشید "صحافت پاکستان و ہند میں" ص ۷۷

۳۴۔ محمد اکرام چغتائی "ایک نادر مجموعہ مکاتیب" رسالہ "اردو" شمارہ ۱۹۸۸ء ص ۴۵۳

۳۵۔ امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" جلد اول۔ ص ۲۶۵

۳۶۔ ساحل احمد " اردو میں گلدستوں کی روایت " ص ۱۹۔ الہ آباد ۱۹۸۸ء

۳۷۔ ساحل احمد۔ حوالہ ایضاً "

۳۸۔ محمد اکرام چغتائی۔ حوالہ ایضاً "۔ ص ۴۵۳

۳۹۔ امداد صابری۔ حوالہ ایضاً "۔ ص ۳۴۲

۴۰۔ فارسی اخبار "احسن الاخبار" میں ۲۵ جون ۱۸۴۷ء کو یہ خبر چھپی:

"مرزا اسد اللہ خان بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔"

(ترجمہ)

تیسرا باب

عہد سرسید کے ادبی رسائل

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد انگریزی حکومت نے اردو اخبارات پر سب سے بڑا الزام یہ عائد کیا کہ وہ بغاوت کے شعلوں کو ہوا دینے میں شریک عمل تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کو اردو صحافت سے بے دخل کر دیا گیا اور ان کی جگہ بیشتر ہندو صحافیوں کو دے دی گئی' نٹ راجن کی مرتبہ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۸۵۳ء میں اردو اخبارات کی تعداد ۳۵ تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد صرف چھ اردو اخبار باقی رہ گئے۔ ۱۸۵۸ء میں چھ نئے اخبارات جاری ہوئے اور اردو اخبارات کی کل تعداد بارہ ہو گئی۔ لیکن ان میں سے صرف ایک اخبار کی ادارت ایک مسلمان صحافی کے پاس تھی۔ (۱) اردو کے قدیم ادبی رسائل کے آثار اب دستیاب نہیں۔ رسائل کے اجرا کے بارے میں کچھ معلومات مل جاتی ہیں لیکن ان کے بند یا ختم ہونے کا مصدقہ ریکارڈ دستیاب نہیں ہوتا۔ دتاتریہ کیفی' محمد عتیق صدیقی' مولانا امداد صابری' اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اردو صحافت پر قابل قدر تحقیق کی اور تالیفات پیش کیں. لیکن ان کتب میں بھی رسائل و اخبارات کے بند ہو جانے کا زمانہ بیشتر غیر متعین ہے۔(۲) ۱۸۵۷ء کے معرکہ دار و گیر سے کچھ عرصہ پہلے لارڈ کینگ نے اخبارات و رسائل کی آزادی سلب کرنے کے لئے ایک نیا صحافتی قانون نافذ کیا تو گمان غالب یہ ہے کہ اردو کے جرائد جو محض شوق اور خدمت ادب کے جذبے سے جاری کئے جاتے تھے انقطاع اشاعت پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ زمانی اعتبار سے ۱۸۵۷ء کا سال ایک ایسی حد امتیاز ہے جہاں ادبی صحافت کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد یہ حقیقت بالخصوص قابل غور ہے کہ اب اخبارات اور رسائل کا مزاج اور رویہ نمایاں طور پر تبدیل ہو گیا۔ ہندو پریس نے نئی ہوا کا رخ پہچان لیا اور مصلحت وقت کے مطابق فرماں برداری میں عافیت محسوس کی۔ اس دور میں اخبارات کا لہجہ نرم تھا' تنقید کے لئے پھول کا قلم استعمال ہوتا۔ اظہار میں عرضداشت کا رویہ اور غلامی کی خو نمایاں تھی۔ قومی سیاست پر اظہار خیال ڈرے ہوئے انداز میں پیش کیا جاتا اور مغربی علوم و فنون کے علاوہ انگریزی راج کی برکتوں کو روشن کرنے میں زیادہ روشنائی صرف ہوتی تھی۔

"اودھ اخبار" ۔ لکھنؤ

خوف، وحشت اور سراسیمگی کی اس فضا میں جنوری ۱۸۵۹ء میں "اودھ اخبار" کا لکھنؤ سے اجرا ہوا کے تازہ جھونکے کے مترادف تھا۔ یہ اخبار اس وقت جاری ہوا جب انگریزی فوج "باغیوں" کی بیخ کنی میں مصروف تھی۔ (۳) اس اخبار کا ادبی پہلو بہت مضبوط تھا۔ اس کے ادارۂ تحریر میں ملک کے نامور ادبا، شعرا اور انشاء پرداز مثلاً مولوی ہادی علی اشک، مفتی فخر الدین فخر، مولوی غلام بخش تپش، امجد علی اشہری، مولانا عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا جالب دہلوی، پیارے لال شاکر، مرزا محمد عسکری، مرزا حیرت دہلوی، اور احمد حسن شوکت جیسے اہم نام شامل تھے "اودھ اخبار" کی جہت ادبی تھی، اور یہ اپنی مرنجاں مرنج پالیسی اور کشادہ نظری کی وجہ سے اتنا مقبول ہوا کہ سر سید احمد خان اور گارساں دتاسی نے بھی اس کی تعریف و تحسین کی۔

"اودھ اخبار" ہفتہ وار چھپتا تھا۔ ۱۸۷۳ ء میں یہ اخبار پہلے سہ روزہ اخبار بنا، ۱۸۷۶ء میں دوسرے روز نکلنے لگا اور ۱۸۷۷ء میں روز نامہ بن گیا۔ نئی صورت میں "اودھ اخبار" کے صحافتی تقاضوں میں معتدبہ تبدیلی آگئی، لیکن اس کی ادبی حیثیت روز افزوں ترقی کرتی گئی چنانچہ اس کی ایک بڑی ادبی عطا یہ ہے کہ اس کے صفحات پر رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد قسط وار چھپتا تھا۔ مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ:

"یہ اخبار اپنے عہد کی ادبی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ کی مستند اور باوقار دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔"(۴)

اس دور میں "اودھ اخبار" نے عوام کی ادبی مزاج سازی میں گراں قدر حصہ لیا اور "تہذیب" "وضع اور اس کی پابندی" "امیر زادے اور صحبت بد کا خراب اثر" "ہندوستان اور یورپی مزاج" "مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے مشاغل" جیسے مضامین شائع کئے جن میں بحث کو دلائل اور ادبی اسلوب میں ابھارا گیا ہے۔ "اودھ اخبار" اردو کی ادبی اور تہذیبی تاریخ کا ایک بنیادی ماخذ ہے۔ یہ انگریزوں کا حامی اخبار تھا لیکن انگریزی معاشرے کی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنانے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ قومی مقاصد پر اس کی نظر قائم رہتی تھی اور مندرجات سے ادبیت جھلکتی تھی۔ (۵)

"اودھ اخبار" کے اثرات اتنے دور رس ہیں کہ اب یہ کہنا درست ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ادبی صحافت نے اپنی آنکھ روزانہ صحافت کے گہوارے میں کھولی اور اسے پروان چڑھانے میں منشی نو لکشور نے جو اس اخبار کے ناشر تھے ایک تاریخی کردار ادا کیا۔

"اودھ اخبار" کا رد عمل تمام تر مثبت نہیں تھا۔ اس کے دور عروج میں سستے قسم کے مزاح، پھبتی اور ضلع جگت کی اساس پر مقبولیت حاصل کرنے والے پنچ رسائل کا اجرا ہوا جن کا ایک مقصد طعن و تضحیک، کردار کشی اور دشنام طرازی تھا۔ المیہ یہ ہوا کہ اس وقت اقوام ہند اور بالخصوص مسلمان احساس شکست کا سامنا تو کر رہے تھے۔ لیکن خوف کی مروجہ فضا میں وہ حقیقت سے آنکھ چرانے کی سعی کرتے تھے، پنچ رسائل نے انہیں استہزائیہ قہقہہ لگانے کا موقعہ فراہم کیا۔ چنانچہ سنجیدہ رسائل کے مقابلے میں پنچ رسالوں کو جن میں "اودھ پنچ" سب سے نمایاں تھا زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

"اودھ پنچ"

"اودھ پنچ" کا اجرا ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ (۶) اس کے مدیر منشی سجاد حسین تھے، وہ فوج میں اردو پڑھاتے تھے لیکن تدریس کے سنجیدہ کام سے بھاگ کر غیر سنجیدہ صحافت کی طرف راغب ہو گئے۔ اس دور میں انہیں اکبر الہ آبادی، رتن ناتھ سرشار، منشی جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق، مچھو بیگ ستم ظریف، نواب مرزا آزاد اور تربھون ناتھ ہجر جیسے مزاح نگاروں کا تعاون حاصل ہو گیا اور اودھ پنچ میں لطیفے مزاحیہ نظمیں، پھبتیاں اور تمسخر و تضحیک پر مبنی مضامین چھپنے لگے تو اس رسالے کی منفی شہرت دور دور تک پھیل گئی، اس اخبار نے اردو کے متعدد مزاح نگاروں کو روشناس کرایا لیکن ادبی اعتبار سے "اودھ پنچ" کی ظرافت بلند پایہ نہیں تھی۔(۷) یہ سستے قسم کے ہزل اور پھکڑپن کے زیادہ قریب ہے۔(۸)

"اودھ پنچ" کی غیر معمولی مقبولیت سے متاثر ہو کر متعدد مزاحیہ رسائل منظر عام پر آگئے، ان میں سے "سرپنچ ہند" لکھنؤ (ستمبر ۱۸۷۷ء) "پنجاب پنچ" لاہور (۱۸۷۸ء) "کلکتہ پنچ" (۱۸۷۹ء) "دہلی پنچ" (۱۸۸۰ء)، "باوا آدم پنچ" بنارس (۱۸۸۱ء) "سرپنچ سید پور" (۱۸۸۲ء) "ظریف ہند" (۱۸۸۵ء) "تیس مار خان" لاہور (۱۸۸۶ء) "شریر" لاہور (۱۸۸۷ء) چند ایسے رسائل ہیں جن میں طنز و مزاح کو حریفانہ انداز میں دامن کھینچنے کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ رسائل عوام کو دوسروں کی قیمت پر سستی تفریح فراہم کرتے تھے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ "اودھ پنچ" نے نہ صرف معاشرتی ناہمواریوں پر براہ راست نشتر چلانے کی طرح ڈالی بلکہ کٹیلی تنقید کا انداز بھی رائج کیا، معاشرے میں حزب اختلاف کا کردار ادا کیا اور اردو ادب کو نہ صرف چند اچھے مزاح نگار دیئے بلکہ اردو کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کو بھی متاثر کیا۔

سر سید احمد خان کی ادبی صحافت

منشی نو لکشور نے "اودھ اخبار" میں صحافت کو تجارتی خطوط پر استوار کیا تھا۔ اسکے برعکس سر سید احمد خان نے صحافت کو قومی اور تہذیبی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی طرح ڈالی۔ سر سید نے عقلی، سائنسی اور عملی مسائل کو اہمیت دی اور عوام کو بلند تہذیبی سطح پر لانے کے لئے ادب کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ منشی نو لکشور نے "اودھ اخبار" میں پیشہ ور صحافیوں کی جماعت پروان چڑھائی تھی، سر سید احمد خان نے اپنے گرد و پیش میں چند ایسے نامور ادبا جمع کئے جو بیک وقت ادیب بھی تھے اور مصلح قوم بھی۔ یہ ادبا سر سید کے قومی مقاصد کے ہم نوا تھے، (۹) مسائل کا تجزیہ فکری زاویوں سے کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ادب سے مادی فوائد حاصل کرنے کے بجائے قومی فلاح و بہبود کو فوقیت دیتے تھے، چنانچہ "اخبار سائنٹفک سوسائیٹی" جس کا دوسرا نام "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ہے مارچ ۱۸۶۶ء میں منصۂ شہود پر آیا (۱۰) تو اس نے قومی اور ملکی مقاصد کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی، اس میں سیاسی، سماجی، علمی اور اخلاقی مضامین کو اہمیت دی گئی، یہ اخبار کم اور ادبی رسالہ زیادہ تھا۔ اس کی آواز موثر تھی۔ چنانچہ مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں لکھا کہ:

"یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچہ کے اجرا سے شروع ہوئی .. اس کی آواز عام دیسی اخباروں کی طرح معمولی آواز نہیں تھی بلکہ جن معاملات پر وہ بحث کرتا تھا اور دخل دیتا تھا ہمیشہ اس کی آواز پر کان لگائے جاتے تھے اور اس کو غور سے سنا جاتا تھا۔"

سر سید احمد خان ۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپس آئے تو انہیں احساس ہوا کہ خبروں کے جلو میں مضامین کی اشاعت چنداں مفید نہیں، ان کے پیش نظر انگلستان کے علمی و ادبی اخبارات "ٹیٹلر" اور "سپیکٹیٹر" تھے (۱۱) جن کے مدیران تہذیب کے پیغمبر تھے اور ایک علمی نشاۃ ثانیہ برپا کر چکے تھے۔ سر سید نے اسی قسم کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا اور پہلے پرچے میں سر سید نے فرمایا:

"اس پرچہ کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے، .. بذریعہ اس پرچے کے جہاں تک ہم سے ہو سکے ان کے دین و دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقص ہم میں ہیں گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں ان کو بخوبی دیکھتی ہیں ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں ان میں ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلائیں۔"(۱۲)

رسالہ "تہذیب الاخلاق" صرف مضامین کے لئے وقف تھا۔ بظاہر اس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو نئی تہذیب کے مفید مطلب مظاہر کی طرف راغب کرنا تھا لیکن در حقیقت اس رسالے نے زندگی کے تمام موضوعات کا احاطہ کیا اور سنجیدہ علمی مباحث کے لئے اردو کو استعمال کر کے اس زبان کی فعالیت کو نمایاں کر دیا۔ "تہذیب الاخلاق" کی منفرد عطا یہ بھی ہے کہ اس نے زندگی کے معمولی مظاہر اور اشیا پر غیر رسمی نظر ڈالنے کی طرح ڈالی اور انشائیہ جیسی شائستہ اور نرم خو صنف ادب کے ابتدائی نقوش فراہم کر دیئے "تہذیب الاخلاق" کے صفحات سے متعدد مسلمان مفکر اور ادیب ابھرے۔ ان میں سر سید احمد خان، محسن الملک، مولوی پیر بخش، مولوی فارقلیط اللہ، مولوی نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولوی چراغ علی، وقار الملک، وحید الدین سلیم، مرزا عابد علی، منشی مشتاق حسین اور مہدی علی کے اسماء معروف اور ممتاز ہیں۔

"تہذیب الاخلاق" کی ادبی زندگی تین ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلا دور دسمبر ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۶ء تک، دوسرا ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۲ء تک اور تیسرا دور ۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۸۹۸ء کے عرصے پر محیط ہے۔ اس تمام عرصے میں سر سید نے "تہذیب الاخلاق" میں سب سے زیادہ لکھا۔ انہیں "اودھ پنچ" کی بے جا تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔(۱۳) لیکن سر سید نے کسی مشکل کے آگے سپر نہ ڈالی۔ وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کی ادبی صحافت کے روشن خیال، فعال اور حوصلہ مند فرد وحید تھے، انہوں نے ادبی صحیفہ نگاری کو فکر و نظر کی روشنی عطا کی، موضوعات میں تنوع پیدا کیا۔ مباحث کو دلیل پر استوار کرنے اور مخالفانہ نقطہ نظر کو خنک مزاجی سے سننے کا جذبہ پیدا کیا۔ انہوں نے ادیبوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جس کے لئے ادب زندگی کی با معنی سرگرمی تھا۔ اس جماعت نے ادب کو پیشے کے بجائے مشن کے طور پر قبول کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے کہ:

"علمی مضامین میں سر سید کی مخصوص معقولاتی سپرٹ اور حیات قومی کی تشکیل جدید اور زندگی کی تمدنی اساس کا پورا پورا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ عقلی اور تجزیاتی اصول صحافت سر سید کی اخبار نویسی کے خاتمے کے بعد آج تک اردو اخبار نویسی میں پیدا نہیں ہو سکا۔"(۱۴)

ادبی صحافت کا نیا مرکز۔۔ لاہور

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد دلی کالج کا شیرازہ بکھرا تو انگریزی حکومت نے علم کی اس شمع کو لاہور منتقل کر دیا، (۱۵) چنانچہ چند سال کے بعد پنجاب میں علم و ادب کا چرچا زور شور سے شروع ہو گیا اور لاہور کو ایک ایسے مرکزی مقام کی حیثیت حاصل ہو گئی جہاں علمی اور ادبی سرگرمیاں سب سے زیادہ

تیز اور مؤثر تھیں ۔ السنۂ شرقیہ کی ایک نامور شخصیت ڈاکٹر لائیٹنز کی صدارت میں "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" قائم کی گئی جس کے زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی کالج قائم کیا گیا۔ (۱۶) ۱۸۶۵ء میں اس انجمن کے تحت "رسالہ انجمن" جاری کیا گیا جس کے مدیر مولانا محمد حسین آزاد مقرر ہوئے۔

مولانا آزاد دلی کے ٹوٹے ہوئے ستارے، نامور ادیب اور تربیت یافتہ صحافی تھے، انہوں نے اوائل شباب میں اپنے والد مولوی محمد باقر کے "دہلی اردو اخبار" میں ادارت کے فرائض سرانجام دیئے تھے ۔ سقوط دہلی کے بعد جان بچا کر جگراؤں پہنچے تو مولوی رجب علی کے اخبار "مجمع البحرین" میں ملازمت اختیار کر لی ۔ (۱۷) لیکن ۱۸۶۰ء میں لاہور آ گئے اور سر رشتہ تعلیم میں خدمات سرانجام دینے لگے ۔ رسالہ انجمن میں علمی و ادبی مضامین کی اشاعت کا سلسلہ مولانا آزاد ہی نے شروع کیا تھا۔ انہوں نے اس رسالے کی ادبی جہت کو تقویت دی ۔ آغا باقر بنبیرہ آزاد نے لکھا ہے کہ

" انجمن پنجاب کے اکثر رسالوں میں دوسرے رسالوں کے مضامین افادہ عام کے لئے شائع ہوئے۔ انشاء اور املا کی وہ عام غلطیاں اور انکی تعلیم جو اکثر انشا پردازوں سے سر زد ہوتی تھیں متعدد رسائل میں چھپی ہوئی نظر آتی ہیں ۔" (۱۸)

انجمن پنجاب کے جلسے کے بعد مشاعرے کا اضافہ مولانا آزاد ہی کی اختراع تھا۔ ابتداء میں یہ مشاعرہ روایتی قسم کا تھا لیکن بعد میں اسے موضوعی مناظمے کی صورت دے دی گئی جس سے نئی نظم کی تحریک پھوٹ نکلی' ان مشاعروں میں "برسات" "حب وطن" "انصاف" "امید" "امن" "قناعت" "تہذیب" "اخلاق" اور "زمستان" جیسے موضوعات پر نظمیں پڑھی گئیں اور ان مشاعروں میں مولانا حالی' محمد حسین آزاد' انور حسین' مظہر دہلوی' ذوق کاکوروی' الٰہی بخش رفیق جیسے نامور شعرا کے علاوہ متعدد دوسرے شعرا نے بھی نظمیں پیش کیں۔ یہ نظمیں "رسالہ انجمن" میں شائع ہوتی تھیں' اس لحاظ سے "رسالہ انجمن" کو شاعری کے گلدستے کی حیثیت حاصل ہے۔

رسالہ انجمن صرف پانچ سال تک زندہ رہا۔ (۱۹) ۱۸۷۰ء میں لاہور سے رسالہ "ہمائے پنجاب" نکالا گیا اور اس کا اہتمام اشاعت پنڈت مکند رام اور گوپی ناتھ کے سپرد ہوا۔ علمی مضامین کی اشاعت کے لیے جنوری ۱۸۷۰ء میں "اتالیق پنجاب" جاری کیا گیا جس کے مدیر پیارے لال آشوب اور نائب مدیر مولانا آزاد تھے' گارساں و تاسی نے لکھا ہے کہ "اس میں ادبی رنگ زیادہ غالب ہے" سرکاری اخبار ہونے کے باوجود لالہ سری رام نے خم خانہ جاوید میں رائے دی ہے کہ : "اس کے مضامین کی خوبی عبارت برجستگی و خوش اسلوبی نے اسے ہر دل عزیز بنا دیا۔" امداد صابری صاحب کے مطابق " پانچ چھ سال کے بعد یہ پرچہ بند ہو گیا ۔" (۲۰) "اتالیق پنجاب " کی کامیابی اور مقبولیت کی بڑی وجہ بقول لالہ سری رام یہ تھی کہ: "اس کے ایڈیٹر (پیارے لال آشوب) اور مددگار (محمد حسین آزاد) دونوں

نہایت قابل اور یگانہ روز گار تھے۔" اس پرچے کے خلاف رد عمل اس بنا پر ہوا کہ مقامی رسائل معیاری مضامین کے اعتبار سے "اتالیق پنجاب" کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ لاہور کو مرکز صحافت بنانے اور صحافت کا رتبہ بلند کرنے میں مولانا آزاد کی خدمات زیادہ اور نتائج دور رس ہیں۔

عبدالحلیم شرر کی صحافت

انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے ربع اول کی ادبی صحافت میں عبدالحلیم شرر کا شمار اس دور کے نامور صحافیوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ابتدائی تربیت "اودھ اخبار" کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ (۲۱) وہ اس اخبار میں مٹیا برج کلکتہ سے خبریں بھیجا کرتے تھے' ۱۹ سال کی عمر میں لکھنؤ واپس آئے تو "اودھ پنچ" میں مضامین لکھنے لگے۔ ۱۸۸۱ء میں شرر نے ہفتہ وار ادبی رسالہ "محشر" جاری کیا۔ (۲۲) تاہم ادبی صحافت میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ جنوری ۱۸۸۷ء میں جاری ہونے والا رسالہ "دلگداز" ہے (۲۳) جو ادبی حالات اور تاریخی مضامین کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔ مولانا شرر نے "دلگداز" ہی میں اپنے شہرہ آفاق تاریخی ناولوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا اور حسن انجلینا' منصور موہنا' فلورا فلورنڈا' جیسے ناول پیش کئے۔ "دل گداز" معمولی تعطل کے باوجود ۱۹۲۶ء تک چھپتا رہا۔ مولانا شرر نے ۱۸۹۰ء میں ایک ادبی ہفت روزہ "مہذب" بھی جاری کیا جس میں سیاست' معاشرہ اور تہذیب و ادب میں آمیزش پیدا کرنے کی سعی کی گئی۔ "مہذب" کا مزاج قدرے شوخ تھا۔ چنانچہ اس میں سر سید اور شبلی سے قلمی بحث اور نوک جھونک کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔(۲۴) "اودھ پنچ" اور "دل گداز" میں بھی ایک ادبی مجادلہ "مثنوی گلزار نسیم" پر چھڑا تھا جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

ادبی صحافت میں عبدالحلیم شرر کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے رسائل میں مسلسل ناول پیش کرنے کا سلسلہ جاری کیا۔ مقالہ نگاری میں استدلال و توازن کو فروغ دیا۔ انشائی ادب میں نئی راہیں تراشیں اور فکر و تخیل کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ (۲۵)

ماہنامہ "تیرھویں صدی"

آگرہ سے میر ناصر علی کا رسالہ "تیرھویں صدی" اکتوبر ۱۸۷۹ء کو مطلع ادب پر طلوع ہوا۔ (۲۶) اس کا ایک مقصد تو الہیات قدیم کی تخلیق تھا لیکن یہ پرچہ ادب و انشا کا اعلیٰ نمونہ بھی تھا۔ فکر

و نظر کے اعتبار سے اس نے علی گڑھ تحریک کی مخالفت کی اور سرسید اور حالی کے نظریات پر شدید نکتہ چینی کی۔ "تیرھویں صدی" کے حصہ نثر کے مدیر میر ناصر علی تھے اور حصہ نظم کی ادارت حافظ رحیم اللہ صابری اکبر آبادی کے سپرد تھی ' انہوں نے مسدس حالی کے مقابلے میں ۳۷۹ بند کی اپنی ایک مسدس لکھی جو مقبول نہ ہو سکی۔ میر ناصر علی کی دوسری عطا ان کا رسالہ "صلائے عام" ہے۔ میر ناصر علی کی زبان شبنم سے دھلی ہوئی ہے۔ ان کی نثر کی شان تخلیقی ہے۔ انہوں نے ادبی مسائل اور علمی موضوعات کے علاوہ انشائیہ نگاری کے چند ابتدائی نمونے بھی پیش کئے اور "تیرھویں صدی" اور "صلائے عام" کو ادبی خزینوں سے مالال کر دیا۔ میر ناصر علی نے اخبار نویسی کو زبان اردو کی خدمت کے طور پر قبول کیا تھا ' انہوں نے اوائل میں ایک رسالہ "زمانہ" بھی جاری کیا لیکن انہیں زیادہ شہرت "صلائے عام" سے ملی جو آخری دور میں ان کی وفات تک جاری رہا۔

جریدہ "شحنۂ ہند"

میرٹھ سے ہفتہ وار جریدہ "شحنۂ ہند" کا اجرا جنوری ۱۸۸۳ء میں ہوا۔ (۲۷) اس کے مدیر سید احمد حسن شوکت شعر و ادب کا عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے "شحنۂ ہند" کو "اردو لٹریچر کا ریفارمر اور دیسی انشا پردازی اور نظم و نثر کا استاد" قرار دیا اور سیاسی امور کے ساتھ ساتھ علمی' ادبی' تاریخی اور معلوماتی مضامین پیش کرنے کی کاوش بھی کی۔ فارسی اور اردو کے قدیم و جدید شعرا کے کلام پر تنقید اس ادبی ہفت روزے کی اہم خدمت شمار ہوتی ہے۔

"محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین"

یہ رسالہ جسے "علی گڑھ میگزین" بھی کہا جاتا ہے جنوری ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ سے جاری ہوا اور انگریزی اور اردو دو زبانوں میں چھپتا تھا۔ حصہ اردو کے مدیر مولانا شبلی نعمانی تھے' اس میں کالج کی خبروں کے علاوہ مسلمانوں کے علوم و فنون ' تاریخ اور ادب کے بارے میں مفید مضامین شامل کئے جاتے تھے۔ مولانا حالی ' نواب محسن الملک ' مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ اس کے مستقل مضمون نگاروں میں شامل تھے ' "علی گڑھ میگزین " مدرستہ العلوم کے فکری زاویوں کا ترجمان تھا۔ (۲۸) اس نے بر صغیر ہند میں بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیا اور علمی ' ادبی تہذیبی و تمدنی تبدیلیوں کا خیر مقدم خندہ پیشانی سے کیا اب یہ رسالہ کالج میگزین کے طور پر شائع ہوتا ہے۔ تاہم اس کی علمی اور ادبی جہت اور

معیار متعدد دوسرے رسائل کے لئے اب بھی مشعل راہ ہے۔ یہ رسالہ علی گڑھ سے ابھرنے والے نئے ادیبوں کا گہوارہ بھی ہے اور اردو ادب کا خزینہ بھی۔ اس کا حال اس کے ماضی کی طرح روشن ہے۔(۲۹)

"حسن"

سر سید احمد خان کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" نے جس اصلاحی روش کو فروغ دیا تھا اسے حیدر آباد دکن کے رسالہ "حسن" نے مزید وسعت دی' ماہنامہ "حسن" اگست ۱۸۸۰ء میں حسن بن عبداللہ عماد نواز جنگ کی ادارت میں جاری ہوا۔ (۳۰) سید علی بلگرامی' حبیب الرحمن شیروانی' سید حسین بلگرامی' یوسف علی قزلباش' مہاراجہ کشن پرشاد اس کے مضمون نگاروں میں شامل تھے۔ "حسن" میں لکھنے والوں میں اچھے مقالے پر ایک اشرفی پیش کی جاتی تھی۔ (۳۱) "حسن" نے یورپ کے علمی رسالوں کی پیروی کی اور ادبی معیار ہمیشہ بلند رکھا۔(۳۲)

ماہنامہ "افسر" حیدر آباد دکن

ماہنامہ "افسر" ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد دکن سے محب حسین کی ادارت میں جاری ہوا۔ دو سال کے بعد "افسر" کی ادارت پر مولوی عبدالحق مقرر ہوئے اور بہت جلد اس نے ایک علمی و ادبی پرچے کی شہرت حاصل کر لی۔ افسر کے قلمی معاونین میں مولانا حالی' مولوی عزیز مرزا' چراغ علی' ذکاء اللہ' اکبر خان' ظفر علی خان' عماد الملک' مولوی غلام الثقلین' مولانا گرامی جیسے ادبا شامل تھے' اس پرچے کی ایک خصوصی اہمیت کتابوں پر تبصروں کی وجہ سے بھی تھی' ہر ماہ بہترین مقالے پر مضمون نگار کو نقد انعام دیا جاتا تھا۔ "افسر" مولوی عبدالحق بابائے اردو کی روشن مزاجی اور آزاد خیالی کا مظہر تھا۔ یہ رسالہ کم و بیش پانچ سال تک چھپتا رہا۔

اس دور میں حیدر آباد دکن کو علم و ادب کے ایک بڑے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اس کے ادبی وقار میں "رسالہ مخزن الفوائد" "دبدبہ آصفی" "ہزار داستان" "فنون" "رفیق دکن" "جوہر سخن" "گل و بلبل" جیسے رسائل نے بہت اضافہ کیا "مخزن الفوائد" کے مدیر حسین بلگرامی تھے اور "دبدبہ آصفی" کی ادارت پنڈت رتن ناتھ سرشار کرتے تھے' ان کا ناول "چنچل نار" اس پرچے میں شائع ہونا شروع ہوا لیکن مکمل نہ ہو سکا۔ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے مولوی وحید الدین سلیم نے ماہنامہ

"معارف" اور لاہور سے مولوی سید ممتاز علی نے ہفتہ وار رسالہ "تہذیب نسواں" جاری کیا۔ "معارف" سر سید کے رسالہ "تہذیب اخلاق" کا خلف صالح تھا لیکن یہ چار سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا "تہذیب نسواں" نے خواتین میں تعلیم پھیلانے اور علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے میں اعلیٰ خدمات سر انجام دیں۔ مولوی بشیر الدین نے "البشیر" کے نام سے ایک رسالہ ۱۸۹۹ء میں اٹاوہ سے جاری کیا۔ فیروز آباد ضلع آگرہ کا رسالہ "ادیب" علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے وقیع اور ممتاز شمار ہوتا ہے۔

"ادبی گلدستے"

انیسویں صدی کی نویں دہائی میں شعر و شاعری کے اتنے گلدستے شائع ہوئے کہ پورے ادب پر ان کا غلبہ نظر آتا ہے اور یہ دہائی گلدستوں کی دہائی شمار کی جا سکتی ہے، مولانا امداد صابری اور ساحل احمد نے کم و بیش ایک صد کے قریب گلدستوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان گلدستوں میں صرف شعرا کا کلام ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ علمی و ادبی مباحثے، شعراء کے کلام پر کڑی تنقیدیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ یہ گلدستے اس دور کے شعرا کے بنیادی ماخذات میں شمار ہوتے ہیں اور تاریخ کے لئے مستند مواد فراہم کرتے ہیں ان میں سے "پیام یار" (لکھنؤ۔ ادارت: محمد نثار حسین) "ریاض سخن" (مارہرہ۔ ادارت: احسن مارہروی) "پروانہ" (میرٹھ۔ ادارت: احمد حسین شوکت) "محبوب الکلام" (حیدر آباد۔ طابع: راجہ کشن پرشاد) "گلشن داغ" (رتلام - ادارت: عبدالرحیم صبا) "دامن گل چیں" (ادارت: اختر۔ مینائی) "گل کدۂ ریاض" (خیر آباد۔ ادارت: ریاض خیر آبادی) "معیار" (لکھنؤ۔ ادارت: صفی لکھنوی) "ارمغان" (شاہجہان پور۔ ادارت: محمد احسان علی خان) چند معروف گلدستے ہیں جن میں اس دور کے ممتاز شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا۔

عہد سرسید کی ادبی رسالہ نگاری پر عمومی تبصرہ

۱۸۵۷ء کے بعد انیسویں صدی کے آخری چار عشروں کی ادبی صحافت میں تجدد اور تفکر کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ تاہم علم اور تہذیب کی نئی روشنی کے خلاف رد عمل کی لہر بھی اس دور میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد پورا ملک اضمحلال، بے بسی اور کسمپرسی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ سر سید احمد خان نے قوم کو وقت کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کا مشورہ دیا اور علی گڑھ سے عقلی تحریک کو فروغ دیا۔ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" اسی تحریک کے

نقیب تھے۔ اس کے خلاف رد عمل "اودھ پنچ" میں اکبر الہ آبادی اور منشی سجاد حسین اور "تیرھویں صدی" میں میر ناصر علی کی تحریروں میں ہوا۔ رتن ناتھ سرشار نے "اودھ اخبار" میں اس تہذیب کے مزاحیہ کیری کیچر بنانے کی سعی کی، عبدالحلیم شرر نے "دلگداز" "محشر" اور "مہذب" کے ذریعے شوکت رفتہ کے نقوش کی تجدید تاریخی ناولوں میں کی۔ لاہور کے نئے ادبی مرکز نے مولانا محمد حسین آزاد کے صحافتی تجربے اور ادبی اسلوب سے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر لائنیز اور کرنل ہالرائیڈ نے آزاد سے معاونت کی اور انجمن پنجاب سے اردو نظم کی نئی تحریک پیدا ہو گئی، اس دور میں بہت کم رسائل نے ادب کے خالص مسائل پر توجہ دی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی امور کی فوقیت اگرچہ نمایاں ہے تاہم ان سب پر ادبی اسلوب میں تنقید کرنے کا انداز نمایاں ہے۔ روایتی شاعری کے فروغ میں گلدستہ صحافت کا حصہ زیادہ تھا۔ مشاعرہ اس دور میں تہذیب ادب کے فروغ کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ نئے شعرا کی تربیت کا گہوارہ بھی تھا۔ شعری تنقید میں فنی مباحث اور عروضی و لفظی غلطیوں کی اصلاح کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ ادبی گلدستوں میں ایسے صدہا شعرا کا کلام محفوظ ہے جو اس دور میں شاعری کی ابتدا کر رہے تھے لیکن بعد میں اردو ادب کے روشن ستاروں میں شمار ہوئے۔

اس دور میں ادب کی پیشکش میں سہ روزہ اور ہفت روزہ اخبارات نے گراں قدر حصہ لیا ہے۔ تاہم ماہانہ ادبی صحافت کی طرف بھی پیش قدمی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد معاشرہ جب اعتدال کی روش پر گامزن ہوا اور سقوط دہلی کے سیاسی اثرات کو قبول کر لیا گیا تو عمل اور رد عمل کی لہریں زیادہ موجزن ہوئیں اور ان پر تنقید و تبصرہ کے لئے سہ روزہ صحافت زیادہ معاونت کرتی تھی، روزانہ صحافت کے فروغ کے بعد ادبی رسائل کا وقفہ اشاعت بتدریج بڑھتا گیا اور بیسویں صدی میں ماہانہ ادبی صحافت کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

اس دور میں ادبی رسائل کی اشاعت میں باقاعدگی کا شدید فقدان ہے۔ اکثر رسائل مدیران کے ذاتی ذوق و شوق کی بنا پر ظہور میں آتے اور مالی مشکلات کا شکار بن جاتے، ان رسائل کے پس منظر میں منصوبہ بندی نظر نہیں آتی، یہی وجہ ہے کہ ادبی رسائل کی اشاعت کا علم تو ہو جاتا ہے لیکن انقطاع اشاعت کا پتہ تک نہیں چلتا اور ان کے اثر و عمل کا اندازہ بھی اب ان کی تاریخی حیثیت اور مدیر کے ادبی رجحانات سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اس سب کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ادبی رسائل نے قوم کی فکری اور ادبی آبیاری اور ذہنی تربیت میں اپنے مقدور کے مطابق حصہ لیا اور قابل تعریف خدمت سرانجام دی۔

حوالہ جات

۱۔ بحوالہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "صحافت پاکستان و ہند میں" ص ۹۷

۲۔ امداد صابری صاحب نے ایک قدیم ادبی رسالہ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"ہم نے "گلدستہ گل رعنا" کی شکل تک نہیں دیکھی ۔ اگر اس کا پہلا شمارہ ہماری نظر سے گزر جاتا تو شاید اس کے مطالعے سے پتہ چل جاتا... کہ مولوی صاحب کو اس کے جاری کرنے کا خیال کس طرح آیا ---. بحوالہ "گل دستہ صحافت" ۔ ص ۱۸ ۔ دہلی ۱۹۸۴ء

۳۔ عبدالسلام خورشید "کاروان صحافت" ص ۱۵۹

۴۔ بحوالہ "اودھ اخبار" ۲ جنوری ۱۸۷۴ء

۵۔ "تاریخ صحافت اردو" جلد دوم ۔ ص ۶۰

۶۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی "تاریخ ادبیات پاکستان و ہند" جلد چہارم ۔ ص ۵۲۹

۷۔ "اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ" ایم ایس ناز ۔ ص ۲۱۴

۸۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی "تاریخ ادبیات پاکستان و ہند" جلد چہارم۔ ص ۵۳۴

۹۔ ڈاکٹر وزیر آغا "اردو ادب میں طنز و مزاح" ص ۱۳۹

۱۰۔ انور سدید "اردو ادب کی تحریکیں" ص ۳۲۶

۱۱۔ امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" جلد دوم ۔ ص ۲۴۷

۱۲۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر "تاریخ ادب اردو" ص ۲۴۳ ۔ لاہور ۱۹۷۹ء

۱۳۔ بحوالہ " داستان تاریخ اردو " از حامد حسن قادری ۔ ص ۳۴۴

۱۴۔ رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اردو" حصہ نثر۔ ص ۴۱

۱۵۔ ڈاکٹر سید عبداللہ "تہذیب الاخلاق کی اہمیت" رسالہ "برگ گل" کراچی "سر سید نمبر" ص ۱۷

۱۶۔ "اردو ادب کی تحریکیں" ص ۳۶۸

۱۷۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "صحافت پاکستان و ہند میں" ص ۱۳۷

۱۸۔ ڈاکٹر محمد صادق "محمد حسین آزاد (احوال و آثار)" ص ۳۷ ۔ لاہور ۱۹۷۶ء

۱۹۔ آغا محمد باقر مرحوم انجمن پنجاب " انتخاب اور نیٹل کالج میگزین۔ ص ۱۴۲

۲۰۔ الف۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء تک کے متفرق پرچے موجود ہیں ۔

۲۱۔ مولانا امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" جلد دوم۔ ص ۳۲۷

۲۲۔ مسکین علی حجازی "تاریخ ادبیات پاکستان و ہند" جلد چہارم۔ ص ۵۴۴

۲۳۔

۲۳۔ الف ۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی ' عبدالحلیم شرر ' لکھنؤ ۱۹۸۶ء

۲۴۔ " شرر نے یہ رسالہ صرف پانچ روپے کے ابتدائی سرمائے سے جاری کیا تھا جو انہیں مولوی بشیر الدین مدیر "البشیر" نے دیئے تھے " (بحوالہ علی احمد فاطمی' عبدالحلیم شرر ص۔ ۱۵۴)

۲۵۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "کاروان صحافت" ص ۷۳

۲۶۔ حامد حسن قادری "تاریخ داستان اردو" ص ۹۴۳

۲۷۔ مولانا امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" جلد سوم۔ ص ۱۷۰

۲۸۔ ایضا " ۔ ص ۲۵۶

۲۹۔ یہ میگزین ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ منتھلی کی صورت میں سید ولایت حسین کی ادارت میں انگریزی اور اردو زبان میں شائع ہوتا رہا ہے ۔

۳۰۔ اس کا ذکر مناسب مقام پر آگے بھی آئے گا ۔

۳۱۔ "تاریخ صحافت" جلد سوم ۔ ص ۵۳۵

۳۲۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی "ظفر علی خان بحیثیت صحافی" ص ۵۱

چوتھا باب

بیسویں صدی کے ادبی رسائل

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو سقوط دہلی کا واقعہ اگرچہ ذہنوں میں تازہ تھا لیکن اس پر ۴۳ برسوں کی گرد پڑ چکی تھی ' اور اب نہ صرف ایک نئی تعمیر کی کوشش شروع ہو چکی تھی بلکہ حصول آزادی کی تحریک پیدا کرنے اور ادب کے ذریعے ذہنوں کا منقلب کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ بیسویں صدی فروغ فکر و نظر کی صدی ہے۔ اس صدی کے اوائل میں " اودھ پنچ " جیسے اخبارات کی دھند کمتی ہوئی اور تجدد کا آفتاب ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ خوش قسمتی سے اس دور میں سید امیر علی ' شیخ عبدالقادر اور علامہ اقبال جیسے تعلیم یافتہ لوگوں کا ظہور ہوا جو اجتہاد فکر نظر کے نقیب تھے ' (۱) مولانا حالی ' شبلی اور اکبر الہ آبادی نے تہذیبی اقدار کے تحفظ اور فروغ کا جو زاویہ ابھارا تھا اسے عقلی زاویوں سے مضبوط بنانے اور اسلام کی نشاہ ثانیہ برپا کرنے کی کوشش کی گئی ' کانگریس کی فرقہ وارانہ جہت کے علی الرغم مسلمانوں کو اپنی سیاسی جدو جہد کے لئے نئی جماعت کی تشکیل کی ضرورت محسوس ہو چکی تھی اور مسلم لیگ کو معرض وجود میں لایا جا چکا تھا۔ اس سب نے ادب کو شدت سے متاثر کیا اور نہ صرف نئے موضوعات پیدا ہوئے بلکہ نئی تخلیقی اصناف ' اظہار کی نئی ہیئتیں اور شاعری کی نئی تحریکیں رونما ہوئیں ' چنانچہ اب ایسے رسائل کی ضرورت محسوس کی جانے لگی جنہیں کتاب کی طرح پڑھا اور محفوظ رکھا جا سکے۔ ان رسائل کا ادبی وجود اخبارات سے علیحدہ ہو اور یہ قوم کو نئے سوالات سے آشنا کر سکیں۔ اس نوع کی فضا میں " مخزن " کا اجرا اس دور کا ایک اہم ادبی واقعہ ہے۔

"مخزن"

شیخ عبدالقادر کی ادارت میں "مخزن" کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۰۱ء کا کو منصۂ شہود پر آیا۔ (۲) اس وقت برطانوی حکومت صوبجات متحدہ کے لیفٹیننٹ گورنر میکڈانل کے ذریعے اردو پر ضرب کاری لگا رہی تھی ' لیکن " مخزن " کا مقصد سیاسی انداز میں اردو زبان کا تحفظ نہیں تھا۔ شیخ عبدالقادر نے

اردو زبان و ادب کی داخلی توانائیوں کو ان سطور پر استوار کرنے کی کوشش کی جن سے خود انگریزی زبان نے ترقی کی تھی۔ وہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" اور رسالہ "حسن" کی ادبی اختراعات کے معترف تھے (۳) اور اسالیب شعر و نثر کے علاوہ اصناف ادب کو بھی عالمی ادب کے ہم پلہ بنانے کے آرزو مند تھے۔ چنانچہ انہوں نے "مخزن" کے پہلے اداریے میں تقلیدی رویوں کی، مذمت کی، تصنع نگاری کے خلاف آواز اٹھائی اور ادبا و شعرا کو فطرت کی زبان میں تخلیق کاری کی دعوت دی۔ "مخزن" کا ایک مقصد مذہبی اور سیاسی طبقوں سے الگ رہ کر اردو ادب کی خدمت کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے مروجہ ڈگر سے علیحدہ روش اختیار کی اور جذبے اور تاثر کو ملکوتی زبان میں پیش کیا تو اس عہد کے بیشتر نئے لکھنے والے "مخزن" کی طرف راغب ہو گئے۔ (۴) سید عبداللہ صاحب نے درست فرمایا ہے کہ "مخزن" سے اس زمانے کے سب ادبا متاثر تھے۔" اس کے پہلے پرچے کی ایک تاریخی حیثیت یہ بھی ہے کہ اس میں علامہ اقبال کی معرکہ آرا نظم "ہمالہ" شائع ہوئی، مولوی احمد دین کا نادر مضمون "مطالعہ الفاظ" شیخ عبدالقادر کا مقالہ "بناوٹ اور سادگی" لالہ سری رام کا تاریخی مضمون "دہلی غدر سے پہلے" کے علاوہ ظفر علی خان، غلام بھیک نیرنگ، اور خوشی محمد ناظر کی نظمیں بھی اس پرچے میں شامل ہیں۔(۵)

"مخزن" کا دائرۂ اثر بہت وسیع تھا۔ (۶) شیخ عبدالقادر کے بلند سماجی رتبے، انگریزی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم، خوش ذوقی اور کشادہ نظری نے بھی اس پرچے کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ چنانچہ اس کے قلمی معاونین میں علامہ اقبال، غلام بھیک نیرنگ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، یگانہ چنگیزی، حافظ محمود شیرانی، مولانا حالی، مولانا شبلی، محمد حسین آزاد، سجاد حیدر یلدرم، آغا حشر کاشمیری، راشد الخیری، برج زائن چکبست، اکبر اللہ آبادی، ریاض خیر آبادی۔ حسرت موہانی، طالب بنارسی، نادر کاکوروی، شوق قدوائی، شاد عظیم آبادی اور متعدد دوسرے ادبا کے اسمائے گرامی شامل ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ادبا کی اتنی بڑی تعداد اور اتنی روشن کہکشاں شاید اس دور کے کسی ادبی پرچے کو میسر نہیں آ سکی۔

"مخزن" کی ادارت میں شیخ محمد اکرام بطور مدیر معاون شامل تھے، ۱۹۰۴ء میں شیخ عبدالقادر لندن گئے تو "مخزن" کی ادارت شیخ محمد اکرام نے سنبھال لی، ستمبر ۱۹۰۷ء میں "مخزن" شیخ عبدالقادر کے ساتھ دہلی منتقل ہو گیا اور ادارت میں ان کا ہاتھ راشد الخیری بٹانے لگے (۷) ۱۹۰۹ء میں "مخزن" واپس لاہور آ گیا، ۱۹۱۰ء میں اسے مولوی غلام رسول نے خرید لیا مگر اس کے بعد بھی شیخ عبدالقادر کا نام سرورق پر اعزازی مدیر کے طور پر چھپتا رہا۔ ۱۹۱۷ء میں مولوی غلام رسول فوت ہو گئے تو اس کے معاون مدیر تاجور نجیب آبادی مقرر ہوئے (۸) "مخزن" کا ایک اور تابندہ دور مارچ ۱۹۲۷ء میں شروع ہوا، اس دور کے مدیر حفیظ جالندھری اور معاون مدیر ہری چند اختر تھے۔ (۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ " مخزن " کو اشاعت کے سب ادوار میں ادارت کے لئے اردو کی نامور شخصیتوں کا تعاون حاصل رہا۔ تاہم اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ اس کا تابندہ ترین دور ۱۹۱۰ء میں ختم ہو گیا تھا۔ اس دور میں " مخزن " نے اردو ادب کو فکر و نظر کے نئے سرچشموں سے روشناس کرایا ' طاقتور متخیلہ کو تخلیقات کی اساس بنایا ' بحث و نظر میں جدید علوم کی اساس پر عقلی رویئے کو پروان چڑھایا اور رومانیت کے ان نقوش کو مجتمع کیا جو انیسویں صدی کے ربع آخر میں بکھرے ہوئے تھے ' (۱۰) چنانچہ " مخزن " کی ادبی عطا سے پورے ایک عہد نے استفادہ کیا اور اسے بیسویں صدی کی ادبی صحافت کا ایک مینارۂ نور تسلیم کیا گیا۔

" زمانہ "

فروری ۱۹۰۳ء میں ماہنامہ " زمانہ " نے اپنا سفر اشاعت شروع کیا (۱۱) تو اس کا بنیادی مقصد " اردو زبان میں مغربی اور مشرقی خیالات کے اتحاد کی تصویر پیش کرنا تھا۔ (۱۲) اس جریدے نے ایسے مضامین کی اشاعت میں گہری دلچسپی لی جو معاشرے کو منقلب کرنے میں معاونت کر سکتے تھے ' " زمانہ " کے پہلے ایڈیٹر منشی شیوبرت لال درمن تھے ' نومبر ۱۹۰۳ء میں اس کی ادارت دیا نرائن نگم نے سنبھال لی اور اس کے مزاج میں ملکی سیاست کا عنصر بھی شامل کر دیا۔ " زمانہ " کی ایک عطا یہ بھی ہے کہ اس نے اردو زبان کو ملک کی مقبول زبان اور موثر ذریعہ اظہار کے طور پر قبول کیا اور ہندوؤں کو اس کے قریب لانے کی کوشش کی۔ اس کی دوسری خوبی سائنسی موضوعات پر اعلیٰ پائے کے ادبی مضامین کی اشاعت بھی ہے۔ اس نے تنقید میں اختلاف کو عالی ظرفی سے قبول کرنے کی طرح ڈالی ' اور دبستان سر سید کی مقصدی نثر کو پروان چڑھایا۔ زمانہ کے صفحات پر منشی ذکاء اللہ ' اکبر الہ آبادی ' دتاتریہ کیفی ' ڈپٹی نذیر احمد ' مولانا شبلی ' منشی پریم چند ' تلوک چند محروم ' عشرت لکھنوی ' علامہ اقبال ' امجد علی اشہری ' وجاہت جھنجھانوی ' ثاقب کانپوری ' پیارے لال شاکر جیسے نامور ادبا باقاعدگی سے جلوہ گر ہوتے تھے۔

" زمانہ " اردو زبان و ادب کا ایک طویل العمر ادبی ' فکری اور سیاسی ماہ نامہ تھا۔ دیانرائن نگم کی وفات تک یہ رسالہ چھپتا رہا (۱۳) لیکن ۱۹۴۲ء کے بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ " زمانہ " کا شمار عہد ساز رسائل میں ہوتا ہے۔ اس نے ان گنت ادبا ہی کی تربیت نہیں کی بلکہ دیانرائن نگم کو بھی حیات دوام عطا کی۔ نگم اچھے ادیب تھے لیکن اب ان کا نام اس لئے زندہ ہے کہ وہ " زمانہ " کے کشادہ نظر ' شیریں کلام ' حاضر دماغ اور بے تعصب مدیر تھے ' رام بابو سکسینہ نے جریدہ نگاری میں انہیں نوجوانوں کے لئے خضر طریقت شمار کیا ہے۔ (۱۴)

"اردوئے معلیٰ"

مولانا حسرت موہانی نے جولائی ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے ماہنامہ "اردوئے معلیٰ" جاری کیا۔(۱۵) تو اس میں بیک وقت ادب اور سیاست کو پیش کرنے کا نرالا تجربہ کیا۔(۱۶) حسرت موہانی شاعر بھی تھے اور سیاستدان بھی "اردوئے معلیٰ" ان کے سیاسی تصورات کا نقیب بھی تھا اور ان کے ادبی مزاج کا آئینہ دار بھی۔ چنانچہ اس پرچے میں مولانا کی سیاسی تنقید بھی چھپتی تھی اور قدیم شعرا کے حالات حیات اور ان کے دوادین کو بھی نمایاں جگہ ملتی تھی " اردوئے معلیٰ " نے تنقید میں حق گوئی ' بے باکی اور راست فکری کی روایت کو فروغ دیا ۔ مولانا حسرت موہانی نے اس رسالے کو سیاسی ادبی تاریخی اور تنقیدی معلومات کا خزینہ بنا دیا ۔ اس کا بیشتر حصہ مولانا حسرت خود لکھتے تھے ' ادبی کتب ' رسائل اور گلدستوں پر فنی اور بے لاگ تنقید " اردوئے معلیٰ " کی ایک نمایاں خصوصیت تھی ۔

مولانا حسرت کی عملی سیاست نے " اردوئے معلیٰ " کو بھی شدت سے متاثر کیا ۔ چنانچہ وہ اگست ۱۹۰۸ ء میں جب پابند سلاسل کر دیئے گئے تو رسالہ جاری نہ رہ سکا اور دوبارہ اکتوبر ۱۹۰۹ ء میں جاری ہوا لیکن ۱۹۱۳ ء میں ضمانت طلب کر لی گئی جو ادا نہ ہو سکی اور رسالہ بند ہو گیا ۔ "اردوئے معلیٰ" آخری بار جنوری فروری ۱۹۲۵ء میں جاری ہوا اور اب مولانا نے اس رسالے کو اردو دوادین اور ایسے مستقل نوعیت کے مضامین کے لئے وقف کر دیا جن سے بعد میں مستقل نوعیت کی کتابیں مرتب کی جا سکیں ۔ (۱۷)

" اردوئے معلیٰ " کا مزاج کلاسیکی تھا ۔ ڈاکٹر مسکین حجازی کی رائے میں " حسرت نے روزنامہ کے صحافتی انداز کو "اردوئے معلیٰ" میں ادبی سطح پر پیش کیا اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا کامیاب تجربہ تھا۔"(۱۸)

" مخزن " ' " زمانہ " اور "اردوئے معلیٰ" نے بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ادبی صحافت کو صحت مند کروٹ دی اور متعدد ایسے ادبی جریدے منظر عام پر آ گئے جن کا مقصد زبان و ادب کا فروغ، علمی و ادبی مذاق کی تشکیل نو اور مسائل کو تنقیدی انداز میں دیکھنے کا رجحان مرتب کرنا تھا۔ ان میں سے مولانا ابوالکلام آزاد کا ماہنامہ "لسان الصدق" نومبر ۱۹۰۳ء میں کلکتہ سے جاری ہوا۔(۱۹) اس پرچے کی اٹھان اچھی تھی، شیم امروہوی' امجد علی اشہری ' محمد سعید بلگرامی' ابو النصر آہ دہلوی' عبدالحلیم شرر' وحید الدین سلیم جیسے ادبا اس کے مضمون نگاروں میں شامل تھے' اس پرچے کے مضامین ملک کے دوسرے اخبارات و جرائد میں بھی اقتباس ہوتے تھے۔ لیکن اسے مناسب تعداد میں خریدار نہ مل سکے'

چنانچہ کچھ عرصہ بے قاعدہ اشاعت کا شکار رہنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں بند ہو گیا۔ "لسان الصدق" کی ایک بنیادی عطا یہ ہے کہ اس رسالے کے ذریعے مولانا ابوالکلام آزاد علمی و ادبی دنیا سے وسیع پیمانے پر متعارف ہوئے۔

جولائی ۱۹۰۳ء میں مولانا ظفر علی خان نے دکن سے رسالہ "افسانہ" جاری کیا (۲۰) ۴ جنوری ۱۹۰۴ء کو انہوں نے "دکن ریویو" کی ابتداء کی تو رسالہ "افسانہ" اس میں ضم ہو گیا۔(۲۱) "دکن ریویو" ۱۹۰۹ء تک چھپتا رہا۔ یہ علمی و ادبی حلقوں میں دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ مولوی عزیز مرزا' علی حیدر طباطبائی' مولوی جواد علی خان عالی' مولوی عبدالحق' محفوظ علی' اجمل خان' عبدالحلیم شرر' مولوی محمد اختر' شبلی نعمانی اور قاضی کبیر الدین کے مضامین "دکن ریویو" میں نمایاں نظر آتے ہیں' اس پرچے کے "اسلام نمبر" اور "ہندو نمبر" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی تھی لیکن ریاستی سازشوں کی وجہ سے ظفر علی خان کو ریاست بدر کیا گیا تو "دکن ریویو" کی اشاعت بھی بند ہو گئی۔ لیکن ظفر علی خان نے اسی سال کرم آباد سے "پنجاب ریویو" جاری کیا جو اعلیٰ درجے کا علمی و ادبی رسالہ تھا۔

ندوۃ العلما کی مذہبی اور ادبی سرگرمیوں کی اشاعت کے لیے شاہجہان پور سے جولائی ۱۹۰۴ء میں رسالہ "ندوہ" نکالا گیا۔ ادارہ ترتیب میں مولانا شبلی نعمانی' مولوی عبدالحی اور مولانا حبیب الرحمن شیروانی شامل تھے ۔ (۲۲) "ندوہ" نے عربی کی نادر کتابوں ' اکابر سلف اور مذہب اسلام کے بارے میں دقیق علمی و ادبی مضامین کی اشاعت کی ۔ منشی محمد دین فوق نے جنوری ۱۹۰۶ء میں لاہور سے "کشمیری میگزین" نکالا (۲۳) جس کا مقصد کشمیری عوام کو زیور علم اور ذوق ادب سے آراستہ کرنا تھا' اس پرچے میں تاریخی مضامین کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ "کشمیری میگزین" نے لاہور میں ہاف ٹون بلاک کی تصویریں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کا "ایڈیٹر نمبر" تاریخی حیثیت کا پرچہ شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں "کشمیری میگزین" نے ہفتہ وار اخبار کی صورت اختیار کر لی اور اب اس کا رخ سیاست کی طرف زیادہ ہو گیا ۔ محمد دین فوق با ذوق صحافی تھے ' انہوں نے " طریقت " اور " نظام " دو ماہانہ رسالے بھی جاری کئے (۲۴) جن میں تصوف کے مضامین کو نمایاں طور پر چھاپا جاتا تھا ۔ ان رسائل کو تین چار سال سے زیادہ عمر نہیں ملی ۔

خواجہ فہمید حسین نازک رقم اکبر آبادی کا رسالہ " زبان " دہلی سے ۱۹۰۵ء میں جاری ہوا' یہ ندرت فکر و اظہار کا داعی تھا ۔ بشن نرائن در' حامد اللہ افسر' محوی لکھنوی' نظام الدین دلگیر' حامد حسن قادری ' جگن ناتھ شوق اس پرچے میں باقاعدگی سے لکھتے تھے ۔ اس پرچے کے مدیر ہی اس کے کاتب بھی تھے ' زبان کو اس دور کے علمی و ادبی پرچوں میں بلند مقام حاصل ہے ۔ اسی نام سے ایک اور رسالہ ۱۹۰۸ء میں دہلی سے مائل دہلوی کی ادارت میں نکلا ' جس کے لکھنے والوں میں آغا شاعر

قزلباش، خواجہ حسن نظامی، برق دہلوی اور ذاکر حسین اختر شامل تھے۔

راشد الخیری کی مضمون نگاری اور کہانی نویسی کو پروان چڑھانے میں "مخزن" کا بہت حصہ ہے، شیخ عبدالقادر کے مشورے پر ہی انہوں نے عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لئے جون ۱۹۰۸ء میں رسالہ "عصمت" جاری کیا۔ اس رسالے میں ان کے معاون مدیر شیخ محمد اکرام تھے "عصمت" کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے عورتوں میں تعلیمی اور تہذیبی ترقی کی لہر پیدا کر دی اور اپنے صفحات پر خواتین کی ایک ایسی جماعت کو پروان چڑھایا جو نظم و نثر میں خوبی اور خوبصورتی سے اظہار کر سکتی تھیں۔ راشد الخیری اس پرچے میں اصلاح نسواں کے زاویوں کو خود بھی اجاگر کرتے اور اس دور کے نامور لکھنے والے ادبا مثلاً نذیر احمد دہلوی، فرحت اللہ بیگ، منشی پریم چند، ملا واحدی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، عبدالماجد دریا آبادی، اعظم کریوی، اور متعدد دوسرے ادبا سے عام فہم، سادہ اور سہل زبان میں مضامین لکھوا کر شائع کرتے، "عصمت" اردو کا سب سے طویل العمر پرچہ ہے۔(۲۵)

لکھنؤ سے ظفرالملک علوی کے ماہنامہ " الناظر " کا طلوع جولائی ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ مستند اہل علم اس کے مضمون نگاروں میں شامل تھے، یکم جنوری ۱۹۱۰ء کو رسالہ "ادیب" نوبت رائے نظر کی ادارت میں الہ آباد سے جاری ہوا۔ کچھ عرصہ کے لئے اس کی ترتیب و تدوین کے فرائض پیارے لال شاکر میرٹھی نے سرانجام دیئے۔ جنوری ۱۹۱۳ء میں میسر خسر عظیم آبادی مدیر مقرر ہوئے۔ تاہم ادیب کی شہرت کو مستحکم بنیاد نوبت رائے نظر کی ادارت اور مولوی سید محمد فاروق، مولوی محمد یحیٰ تنہا۔ ناطق لکھنوی، شبلی نعمانی، نظم طباطبائی، ندرت میرٹھی، درگا سہائے سرور، علامہ اقبال، مولوی ذکاء اللہ، احمد علی شوق قدوائی اور تیرتھ رام فیروز پوری جیسے ادبا نے فراہم کی۔ "ادیب" اپنے عہد کے ممتاز اور مئوقر پرچوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے اردو ادب کو نئے راستوں پر چلانے میں گراں قدر خدمات سر انجام دی ہیں۔

مولانا تاجور نجیب آبادی کی ادبی صحافت

بیسویں صدی کے ربع اول میں مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی کو ادبی جریدہ نگاری کے فروغ میں بے حد اہم حیثیت حاصل ہے۔ تاجور بلند پایہ ادیب اور کہنہ مشق شاعر تھے دیو بند میں تعلیم پانے کے بعد انہوں نے مشرقی علوم کی تحصیل کی اور زندگی کے آخری لمحے تک ادب کی مختلف شمعوں کو رسائل کے ذریعے روشن کرتے رہے۔ شمع کی لو بھڑک اٹھتی تو مولانا تاجور یہ شمع کسی دوسرے دل دادۂ اردو کے سپرد کر دیتے اور خود نیا رسالہ نکال لیتے۔

مولانا تاجور نجیب آبادی نے ۱۹۱۱ء میں لدھیانہ سے رسالہ "آفتاب اردو" جاری کیا، ۱۹۱۴ء میں نجیب آباد سے "تاج الکلام" نکالا۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں "مخزن" کے لئے مولانا تاجور کا عملی تعاون حاصل کر لیا گیا "مخزن" کے مدیر اعزازی شیخ عبدالقادر تھے لیکن اس کی ادارت تاجور کرتے تھے، انہوں نے یہ خدمات پانچ سال تک سرانجام دیں۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں "ہمایوں" جاری ہوا تو مولانا تاجور اس پرچے کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ ان کی سب سے بڑی عطا رسالہ "ادبی دنیا" ہے جو انہوں نے ۱۹۲۹ء میں لاہور سے جاری کیا اور ۱۹۳۳ء میں مولانا صلاح الدین احمد کے پاس فروخت کر دیا۔ ۱۹۳۴ء میں مولانا تاجور نے اردو کا ایک اور ممتاز رسالہ "شاہکار" نکالا۔ بچوں کے رسالہ "پریم" کی ادارت کا اعزاز بھی مولانا تاجور نجیب آبادی کو حاصل ہے۔

مولانا تاجور مشرقی زبانوں کے استاد تھے اور شعر و ادب کا رچا ہوا کلاسیکی مزاج رکھتے تھے۔ انہوں نے جریدہ نگاری سے شعر و ادب کے ذوق کو پروان چڑھانے کی کوشش کی اور اردو ادب کو بہت سے اچھا لکھنے والے ادبا عطا کئے۔ ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت میں انہوں نے نہ صرف شعر و انشاء کو چمکایا بلکہ شاگردوں کی ایک ایسی جماعت بھی پیدا کی جو ان کے اصولوں کی پیروی کرتی تھی، مولانا صابری نے لکھا ہے کہ:

"علامہ نے پنجاب میں اردو شاعری اور اردو انشا پردازی کا کچھ اس شان سے صور پھونکا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خوابیدہ جذبات بیدار ہو گئے، لکھنؤ اور دہلی میں ادیبوں کی تحریروں کا جو رنگ تھا اس کے سانچے میں پنجاب کے ادیبوں کی تحریریں ڈھلنے لگیں۔" (۲۶)

مولانا تاجور نجیب آبادی کی صحافت بنیادی طور پر زبان و ادب کی صحافت تھی، ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی، جن کے ادب پاروں کی اصلاح کے علاوہ ان کی اشاعت کا اہتمام بھی تاجور کرتے تھے، چنانچہ ادبی رسالہ ان کے لئے فروغ ادب ہی کا نہیں اپنے شاگردوں کو شہرت عطا کرنے اور انہیں عمر بھر اپنے حلقہ غلامی میں محبوس رکھنے کا وسیلہ بھی تھا۔(۲۷) یہی وجہ ہے کہ مولانا تاجور نے زندگی بھر رسائل کے ساتھ ناتہ قائم رکھا اور ایک حلقہ ادب پیدا کیا جو ہمیشہ ان کے زیر نگیں رہا۔ مولانا تاجور چونکہ شعر و انشا کے ایک کڑے ناقد تھے اس لئے ان رسائل نے زبان و ادب کی بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔ مولانا تاجور کی صحافت کا زاویہ شیخ عبدالقادر اور دیا نرائن نگم سے مختلف تھا، وہ ادب برائے ادب کے نمائندہ ادیب تھے اس لئے انہوں نے "مخزن"، "ہمایوں"، "ادبی دنیا" اور "شاہکار" جیسے رسائل میں بھی فن کے جمالیاتی زاویوں کو زیادہ اہمیت دی اور خیال کی پیشکش میں صحت زبان کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا، مولانا تاجور ادیب گر اور شاعر ساز تھے، ان کے رسائل نے اس کار خیر میں ان کی گراں قدر معاونت کی اور ان سے کئی مستقبل ساز

ادبا پیدا ہوئے۔

”الہلال“

سرسید احمد خان رسالہ ” تہذیب الاخلاق “ کا تصور لندن سے لائے تھے، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے ”الہلال“ کا بنیادی خاکہ مصری صحافت سے اخذ کیا تھا۔ مولانا آزاد صحافت کو ایک ایسا مؤثر وسیلہ سمجھتے تھے جس سے وہ تاریخی شعور اور تہذیبی تسلسل کی تحریک کو فروغ دے سکتے تھے، ۱۹۱۲ء میں ”الہلال“ جاری کرنے سے قبل انہوں نے رسالہ ”الصباح“ اور ”احسن الاخبار“ کی ادارت کی، مولوی محمد یوسف جعفری کے ساتھ مل کر ”لسان الصدق“ جاری کیا ”تحفہ محمدیہ“ اور ”فرنگ نظر“ کے علاوہ رسالہ ”الندوہ“ اور ”وکیل“ کے ساتھ وابستہ رہے لیکن ”الہلال“ ان کے تصورات کا زیادہ نقیب ثابت ہوا اور اس میں شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، سلیمان ندوی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، نیاز فتح پوری جیسے اکابر ادب نے بھی سرگرم شرکت کی۔

”الہلال“ کی جہت سیاسی، تہذیبی اور مذہبی تھی، اس نے اظہار کے لئے ایک مخصوص اسلوب کو پروان چڑھایا اور اپنی فکری دعوت میں ادبی استدلال کو اہمیت دی، چنانچہ ”الہلال“ کے مباحث میں ادب کو داخلی روح کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی ایک عطا یہ بھی ہے کہ اس نے اردو زبان و ادب کو بالواسطہ طور پر زندگی کے متعدد مسائل سے ہم آہنگ کر دیا۔ ان وجوہ کی بنا پر ”الہلال“ کو ایک ہفت روزہ ادبی جریدہ شمار کرنا بھی بجا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ ”الہلال“ میں کشاف اور نقاد کے نام سے جو منظومات شائع ہوئی تھیں ان کے خالق خود مولانا آزاد تھے۔ ”الہلال“ انقلابی نوعیت کا جریدہ تھا، انگریزی حکومت نے نومبر ۱۹۱۴ء میں ضمانت ضبط کر لی اور یوں ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو ”الہلال“ کا پہلا دور ختم ہوگیا۔ اس کے ایک سال بعد مولانا آزاد نے ”البلاغ“ جاری کیا لیکن مولانا آزاد چونکہ تاجر نہیں بلکہ داعی تھے، اس لئے یہ پرچہ بھی زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکا ” البلاغ “ کی جہت تبلیغی تھی، اسے علامہ اقبال، حسرت موہانی، سلیمان ندوی، شمس اللہ قادری، عبدالسلام ندوی، وصی بلگرامی، مولوی اسمٰعیل پانی پتی، خواجہ عبدالحی جیسے ادبا کا تعاون حاصل تھا۔ لیکن ” البلاغ “ ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء کے بعد جاری نہ رہ سکا۔ اس کے صرف سات یا آٹھ پرچے ہی شائع ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ستمبر ۱۹۲۱ء میں تبلیغ و ہدایت کے لئے کلکتہ سے اخبار ” پیغام “ جاری کیا اور اس میں علمی مضامین کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا۔ یہ اخبار بھی دسمبر ۱۹۲۱ء سے آگے سلسلہ اشاعت برقرار نہ رکھ سکا۔ مولانا آزاد بلاشبہ ایک بہت بڑے ادیب تھے، لیکن بطور مصلح اور داعی ان کی سیاسی مصروفیات کو ترجیحی مقام

حاصل تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے زیرادارت جاری ہونے والے اخبارات و رسائل مؤثر ہونے کے باوجود دوام و تسلسل اشاعت حاصل نہ کر سکے، حتیٰ کہ ۱۹۲۷ء میں "الہلال" کی تجدید اشاعت کی گئی تو نمایاں مقبولیت کے باوجود چند ماہ کے بعد ہی پرچہ بند ہو گیا۔

"ہمدرد"

سیاسی راہنماؤں میں سے مولانا محمد علی جوہر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے ادب کو روزانہ صحافت کے وسیلے سے پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے اخبار "ہمدرد" کے خاکے میں زیادہ اہمیت مطالعے کے مواد کو دی اور خواہش ظاہر کی کہ سجاد حیدر یلدرم، عنائت اللہ دہلوی، علامہ اقبال، محفوظ علی بدایونی، شیخ عبدالقادر، مولوی عبدالحق اور خواجہ غلام الثقلین جیسے لوگ اس کے رکن ادارہ تحریر ہوں۔ (۲۸) مولانا محمد علی جوہر نے "ہمدرد" فروری ۱۹۱۲ء میں جاری کیا، اس کے ادارتی عملے میں محفوظ علی بدایونی، ہاشمی فرید آبادی، عبدالحلیم شرر، قاضی عبدالغفار اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی شامل تھے، لیکن اس اخبار کو بھی مولانا محمد علی کی سیاسی سرگرمیوں کی نذر ہو جانا پڑا۔ اس کا پہلا دور اگست ۱۹۱۵ء کو ختم ہو گیا۔ آخری دور میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے "ہمدرد" کی ادارت سنبھالی لیکن ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء کو صرف ایک سال کی اشاعت کے بعد ہمدرد بند ہو گیا۔

"ہمدرد" کی بنیادی عطا یہ ہے کہ اس نے ادب کے فروغ میں روزانہ صحافت کو وسیلہ بنایا اور اس دور کے نامور ادبا کے تعاون سے ادب کو ایک مؤثر تحریک کے طور پر ابھارا، ادبی اور علمی مباحث میں استدلال کو اہمیت دی اور بحث کو خنک اسلوب میں پیش کرنے کی سعی کی، چنانچہ "ہمدرد" نے سیاسی مزاج کو ایک مخصوص نہج پر ڈھالنے کی کوشش کی اور اس کے لئے بھی ادبی اسلوب استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ "ہمدرد" بند ہوا تو اس کا سب سے زیادہ دکھ ادبی حلقے میں محسوس کیا گیا۔

اردو کے چند اہم جرائد

مولانا عبدالمجید سالک نے جون ۱۹۱۴ء میں پٹھان کوٹ سے "فانوس خیال" جاری کیا تو اس کے بنیادی مقاصد میں تخلیقی ادب کی سب اصناف، تراجم اور متصوفانہ، اخلاقی، تمدنی اور فلسفیانہ مضامین کی اشاعت کے علاوہ گورنمنٹ عالیہ کے احسانات کا شکر گزار رہنا اور ابنائے ملک کو وفاداری کی تعلیم دینا بھی تھا۔ مولانا سالک کا ذہن اختراعی تھا، انہوں نے اداریے کو "مقدمتہ المدیری" کا عنوان دیا اور

"فانوس خیال" کے لئے ناصر نذیر فراق دہلوی، طالب بنارسی، احمد میاں اختر جونا گڑھی، راشد الخیری، سیماب اکبر آبادی، ندرت میرٹھی، عشرت لکھنوی اور رشک بلند شہری کا قلمی تعاون حاصل کیا، اس پرچے نے مختصر افسانے کے فروغ میں بالخصوص نمایاں کردار ادا کیا۔ "فانوس خیال" اعلیٰ پائے کا ادبی پرچہ تھا لیکن بہت جلد اسے مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور یہ پرچہ اشاعت کا تسلسل برقرار نہ رکھ سکا۔ اس سال شوق لاہوری نے بازار حکیماں لاہور سے ماہنامہ "شوق" جاری کیا۔ مولانا حسرت موہانی نے علی گڑھ سے "تذکرۃ الشعرا" کتابی صورت میں جاری کیا، جو ہر تین ماہ کے بعد شائع ہوتا تھا، اس میں شعرا کا کلام اور ان کا تذکرہ چھپتا تھا، دہلی سے ملا واحدی نے رسالہ "خطیب" اور محمد دین فوق نے لاہور سے "طریقت" جاری کیا، جو تصوف کے مضامین کے لئے معروف و ممتاز ہوئے۔ "جہان اسلام" کے نام سے ایک سہ لسانی رسالہ ۱۹۱۴ء میں استنبول سے جاری کیا گیا جو ترکی، عربی اور اردو میں چھپتا تھا، ایک پنجابی ابو سعید صاحب اس پرچے کے اردو حصے کے مدیر تھے، تیرتھ رام فیروز پوری کے رسالہ "ترجمان" (لاہور) کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مدیر سارا پرچہ خود لکھتے تھے چنانچہ اس پر یکسانیت کی گہری چھاپ لگ گئی۔

اگست ۱۹۱۷ء میں کرم آباد سے "ستارۂ صبح" طلوع ہوا تو اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے مدیر مولانا ظفر علی خان تھے، جن کی تربیت علی گڑھ اور حیدر آباد کے علمی و ادبی گہواروں میں ہوئی تھی۔ وہ اعلیٰ پائے کے شاعر اور بلند ظرف ادیب تھے، انہوں نے ۱۹۰۳ء میں ماہ نامہ "افسانہ" جاری کیا، ۱۹۰۴ء میں "دکن ریویو" کو ایک علمی و ادبی ماہنامے کی صورت دی، جو ۱۹۰۹ء تک اردو زبان کی خدمت کرتا رہا۔ دکن سے جبری اخراج ہوا تو ظفر علی خان نے کرم آباد آکر "زمیندار" کی ادارت سنبھالی اور صحافت کو ادب کا ہم پایہ بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے "ستارہ صبح" میں سیاست کو عمل دخل سے خارج قرار دیا اور عوام کے علمی، ادبی اور تہذیبی ذوق کی ذمہ داری قبول کی، اس پرچے کے ادارہ تحریر میں وحید الدین سلیم، عبداللہ العمادی، وجاہت جھنجھانوی، خواجہ عبدالحی اور اختر علی خان شامل تھے۔ اس پرچے کے ذریعے صحافت سے بد مذاقی کے عناصر کو رفع کرنے اور علم و ادب کو فروغ دینے کی کامیاب سعی کی لیکن یہ پرچہ بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ "ستارہ صبح" ۱۹۱۸ء میں غروب ہو گیا۔

رسالہ "معارف" جولائی ۱۹۱۶ء میں مولانا سلیمان ندوی کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ترجمان تھا اور اس کا مقصد مذہب و فلسفہ و فکر کی ترجمانی اور نئی تحقیق اور تازہ خیالات کا فروغ عام تھا۔ اس رسالے نے علوم مذہبی کے ارتقا کو منظر پر لانے، اکابر سلف کی سوانح عمریوں کو مرتب کرنے اور حکمت اسلامی پر تحقیقی مضامین پیش کرنے میں فوقیت حاصل کی، مباحث و

انتقادات ادب میں اپنے بلند معیار کو برقرار رکھا اور حلقہ قرات کم ہونے کے باوجود اس رسالے کی روشنی اب تک قائم ہے۔ مولانا حالی' عبدالسلام ندوی' پروفیسر نواب علی' شیخ عبدالقادر ' عبدالماجد دریا آبادی' اقبال احمد سہیل' ڈاکٹر اقبال اور نیاز فتح پوری جیسے زعما اس کے مقالہ نگاروں میں شامل تھے' ڈاکٹر نکلسن نے اس رسالے کے ناقدانہ مباحث اور علمی معیار کی تحسین کی ہے۔ معارف کی ادبی خدمات اس دور کے متعدد رسائل سے زیادہ ہیں۔

ستمبر ۱۹۱۸ء میں امتیاز علی تاج نے لاہور سے ماہنامہ " کہکشاں " اور پنڈت برج نرائن چکبست نے لکھنؤ سے اکتوبر ۱۹۱۸ء میں " صبح امید " جاری کیا ۔ ان دونوں پرچوں کو ملک کے نامور لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا ' علمی اور ادبی معیار بلند تھا ' نادر مضامین کی پیش کش کا انداز منفرد تھا ۔ لیکن زمانے کی بد مذاقی کی وجہ سے یہ پرچے بھی زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے ' وحید احمد زیدی کا ماہنامہ " نقیب " بدایوں ۔ حکیم احمد شجاع کا رسالہ " ہزار داستان " لاہور ۔ محمد دین فوق کا رسالہ " نظام " لاہور مولوی عبدالحق کا ماہنامہ " الواعظ " حیدر آباد دکن ۔ مولوی عبدالسلام کا رسالہ " انتخاب " جاورہ ' ناصر نذیر فراق دہلوی کا رسالہ " یادگار درد " دہلی اور صغریٰ بیگم حیا کا نسوانی رسالہ " النساء " حیدر آباد ۱۹۱۹ء کے دوران مطلع ادب پر نمودار ہوئے ' اور مختصر سے عرصے کے لیے ادب کی بہار جاں فزا دکھا کر رخصت ہو گئے ' ان میں " ہزار داستان " کی یہ اہمیت ہے کہ اس میں تخلیقی اصناف نثر بالخصوص افسانہ اور ڈرامہ کو فوقیت دی گئی ' حکیم احمد شجاع نے اسے " مخزن " کے خطوط پر چلانے اور تجدد فکر و نظر کا نقیب بنانے کی سعی کی علی گڑھ میگزین جس نے ۱۹۲۰ء میں باقاعدہ ماہنامے کی حیثیت اختیار کر لی تھی کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے کالج میگزین ہونے کے باوصف گراں قدر علمی اور ادبی خدمات سرانجام دیں ' ہرچند یہ " محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین " ہی کی توسیع تھا لیکن اسے رشید احمد صدیقی ' خواجہ منظور حسین ' آل احمد سرور ' جان نثار اختر ' ابواللیث صدیقی ' مختار الدین احمد ' خلیل الرحمن اعظمی ' قمر رئیس اور شہریار جیسے ادبا کی ادارت حاصل ہوئی ' اس رسالے نے اقبال ' فانی بدایونی ' غالب ' اکبر الہ آبادی ' اور مجاز پر مستقل نوعیت کے خاص نمبر شائع کئے ' جو اب حوالے کی کتابوں کی طرح استعمال ہوتے ہیں ۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اسی دور میں لاہور سے رسالہ " خیالستان " جاری کیا جس کے چند شمارے چھپے ۔ اس جریدے کو علامہ اقبال اور ظفر علی خان کی سرپرستی حاصل تھی " خیالستان " کے ابتدائی ادارتی تجربے نے ہی بعد میں مولانا صلاح الدین احمد کو " ادبی دنیا " جیسا عہد ساز ادبی جریدہ مرتب کرنے اور اسے تادیر جاری رکھنے کا حوصلہ عطا کیا۔ "شباب اردو " مصور ادبی رسالہ تھا جو ۱۹۲۰ء میں لاہور سے خان محمد حسین نے جاری کیا اس رسالے کو شیخ عبدالقادر' خواجہ دل محمد اور خان عبدالعزیز کا تعاون حاصل تھا "مخزن " اور "ہزار داستان " کی طرح "شباب اردو " نے بھی

تخلیقی اصناف ادب کی گراں قدر خدمت سرانجام دی'

۱۹۲۱ء میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام سہ ماہی رسالہ "اردو" جاری ہوا تو اس کی ادارت کے فرائض مولوی عبدالحق نے سے انجام دیئے۔ "اردو" کا مقصد زبان و ادب کے ان خزینوں کو منظر عام پر لانا تھا جو نظروں سے اوجھل تھے' چنانچہ ابتدا ہی سے اس رسالے کا مزاج تحقیقی قرار پایا اور اسے پورے استقلال و استقامت سے قائم رکھا گیا۔ "اردو" اب انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے اس کا ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا۔

مولانا نیاز فتح پوری نے ۱۹۲۲ء میں بھوپال سے "نگار" جاری کیا تو قصص و حکایات کے اس دور میں ان کا مقصد ادب' تاریخ اور علوم نو کا فروغ تھا' تحقیقی و تنقیدی مضامین اور شعری تخلیقات کو بھی مدار اشاعت میں شامل کیا گیا "نگار" کی خوبی یہ ہے کہ اس نے مختلف ادوار میں اپنے اس عہد کو نبھایا۔ پیشکش کے معیار کو قائم رکھا اور خرد افروزی کی ایک ایسی تحریک برپا کر دی جس نے پورے ملک کے زیرک اذہان کو متاثر کیا۔ "نگار" کا سالنامہ اس پرچے کی قابل ذکر خصوصیت ہے اور اس میں کسی ایک موضوع پر ضخیم رسالہ پیش کیا جاتا تھا۔ ان خاص نمبروں کے ذریعے کئی شعرا کی تعیین قدر از سر نو ہوئی۔ اس ضمن میں مومن' بہادر شاہ ظفر' نظیر اکبر آبادی' ریاض خیر آبادی' اور غالب نمبر کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ "نگار" آزادی کے بعد کراچی منتقل ہو گیا' نیاز کی وفات کے بعد اس کی ادارت ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے سنبھال لی۔ اس کا ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا۔

۱۹۲۲ء میں لاہور سے جاری ہونے والے رسائل میں سے "ہمایوں" کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس نے ادبی جریدہ نگاری میں شائستگی اور تہذیبی شان پیدا کی' اس کے مدیر مسئول میاں بشیر احمد تھے لیکن اس کے ادارتی فرائض مولانا تاجور نجیب آبادی' منصور احمد اور مولانا حامد علی خان نے سر انجام دیئے' یوسف ظفر' مظہر انصاری' شیر محمد اختر اور ناصر کاظمی اس کے آخری دور کے مدیران تھے' ہمایوں جسٹس شاہ دین ہمایوں کی یاد میں جاری کیا گیا تھا جن کی زندگی کا نصب العین اس شعر سے عیاں ہے۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی　　　　دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ہمایوں نے اس شعر کو تا زندگی طرۂ امتیاز بنائے رکھا اور ادب' تہذیب معاشرت اور اخلاقیات کے موضوعات پر کشادہ نظری کا مظاہرہ کیا' ہمایوں کو اس دور کے اعلیٰ پائے کے لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا اور اس نے شاعری اور نثر کی تمام اصناف کی گرانقدر خدمت سرانجام دی' ہمایوں اردو زبان کے فروغ کا حامی اور مسلم سیاست میں آزادہ نظری کا حامی تھا' چنانچہ یہ ایک وسیع حلقے میں پڑھا جاتا تھا۔ اس رسالے کا مفصل ذکر آزادی کے بعد کے رسائل کے حصے میں آئے گا۔ رسالہ "جامعہ" کا

مقصد اشاعت ادب کے علاوہ فلسفہ، تاریخ، مذہب اور معاشرت کا تجزیہ کرنا بھی تھا' یہ رسالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے ۱۹۲۳ء میں جاری کیا' ڈاکٹر یوسف حسین خان کے عہد ادارت میں "جامعہ" کی فکری اور نظری جہت مضبوط بنیادوں پر استوار ہوئی۔ حکیم یوسف حسن کا رسالہ "نیرنگ خیال" نیاز مندان لاہور کا جن میں پطرس، تاثیر، سالک، مجید ملک، چغتائی شامل تھے ترجمان تھا' یہ رسالہ علمی اور فنی مضامین کے علاوہ اپنے عہد ساز سالناموں اور مصوری کے شاہکاروں کی وجہ سے اپنے عہد کا مقبول ترین رسالہ تھا' اور اب بیسویں صدی کا سب سے طویل العمر رسالہ شمار ہوتا ہے۔ حکیم یوسف حسن کی زندگی میں ہی اس کی ادارت سلطان رشک نے سنبھال لی تھی' اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ "اورینٹل کالج میگزین" علوم مشرق کا تحقیقی رسالہ ہے۔ اس کی ادارت کے فرائض ڈاکٹر محمد شفیع اور پروفیسر محمد اقبال نے آزادی سے قبل سرانجام دیئے' اس دور میں مطلع شعر پر اختر شیرانی نمودار ہوئے۔ انہوں نے ادبی جریدہ نگاری میں بھی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک کے عرصے میں "انتخاب" "بہارستان" "خیالستان" اور "رومان" جیسے رسالے جاری کئے جو ہلکی پھلکی تخلیقات نظم و نثر کے لئے ممتاز اور معروف شمار کئے گئے۔ یہ رسالے نئے لکھنے والوں کی ابتدائی تربیت گاہیں تھے اختر شیرانی کی لاابالی طبیعت نے انہیں تا دیر زندہ نہ رہنے دیا۔

بیسویں صدی کا ربع ثانی علمی اور ادبی رسائل کا ایک تابندہ دور ہے "ہمایوں" اور "نیرنگ خیال" کے بعد جو تابندہ ادبی جرائد منظر عام پر آئے ان میں "ادبی دنیا" "ساقی" "سہیل" "ہندوستانی" اور "ادب لطیف" بالخصوص قابل ذکر ہیں' "ادبی دنیا" ۱۹۲۹ء میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے جاری کیا' لیکن کچھ عرصے کے بعد اسے مولانا صلاح الدین احمد کے پاس فروخت کر دیا۔ منصور احمد' حفیظ ہوشیارپوری اور ڈاکٹر عاشق بٹالوی کے مختصر دور ادارت کے بعد مولانا صلاح الدین احمد نے میرا جی اور ڈاکٹر وزیر آغا کی معاونت سے اس پرچے کو جدیدیت اور روایت کا سنگم بنا دیا اور عہد ساز خدمات سرانجام دیں۔ "ساقی" ۱۹۳۰ء میں شاہد احمد دہلوی کی ادارت میں جاری ہوا' یہ دہلوی تہذیب کا ترجمان تھا لیکن اس نے ادب کے نئے تجربوں کا خیر مقدم بھی کیا۔ شاہد احمد دہلوی نے "ساقی" میں تخلیقی اصناف کو سب سے زیادہ فوقیت دی' مغربی تراجم سے اردو زبان و ادب کا دامن مالا مال کر دیا اور اس سلسلے کو آزادی کے بعد کراچی میں بھی جاری رکھا۔ رشید احمد صدیقی نے ۱۹۲۷ء میں علی گڑھ سے "سہیل" کا اجرا کیا اور اسے اپنی خوش ذوقی سے نکھار دیا۔ لیکن "سہیل" طویل العمر ادبی جریدہ ثابت نہیں ہوا۔ ہندوستانی اکادمی الہ آباد نے ۱۹۳۱ء میں اصغر گونڈوی کی ادارت میں رسالہ "ہندوستانی" جاری کیا۔ اس کا بنیادی مقصد ادب و انشا کے علاوہ لسانیات' تاریخ اور آثار قدیمہ پر تحقیقی و تنقیدی مضامین پیش کرنا تھا' مولانا سعید انصاری' محمد اجمل خان اور سید عبدالباسط کے زیر ادارت ان مقاصد کے

حصول میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی گئی۔ ڈاکٹر تاراچند' ڈاکٹر عبدالستار صدیقی' مسعود حسن رضوی ادیب اور دیا نرائن نگم اس کے ادارہ تحریر میں رہ چکے ہیں۔

"ادب لطیف" کے بانی پنجاب بک ڈپو لاہور کے مالک چودھری برکت علی تھے' ادب لطیف ترقی پسند نظریات کا علمبردار اور اس تحریک کا ترجمان تھا' اس کی ادارت کا طویل ترین اور عظیم الشان دور مرزا ادیب سے منسوب ہے۔ درمیان کے چھوٹے چھوٹے وقفوں میں فیض احمد فیض' راجندر سنگھ بیدی' ممتاز مفتی' عارف عبدالمتین' احمد ندیم قاسمی' فکر تونسوی اور قتیل شفائی نے بھی اس کی ادارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ "ادب لطیف" زمانی اعتبار سے ایک طویل العمر اور مؤثر ادبی رسالہ ہے جو اب صدیقہ بیگم کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی نے شاعری کے فروغ کے لئے "قصرالادب" کی بنیاد ڈالی تو اس کی اشاعتی سرگرمیوں کے لئے اگست ۱۹۲۶ء میں لاہور سے رسالہ "پیمانہ" جاری کیا' اس کی ادارت میں ساغر نظامی ان کے معاون تھے' "پیمانہ" نے اردو شاعری کے فروغ میں نمایاں خدمات سرانجام دیں اور زبان کے ان ضابطوں کی پیروی کی جو آگرہ کے دبستان کے مجوزہ تھے۔ علامہ سیماب لاہور سے آگرہ منتقل ہوئے تو انہوں نے نیا رسالہ "شاعر" جاری کیا' اس کا بنیادی مقصد بھی زبان و ادب کی خدمت اور قصر الادب سے منسلک شعرا کا تعارف تھا۔ "شاعر" اردو کا واحد ادبی جریدہ ہے جس کا سلسلہ اشاعت اب تیسری نسل میں پہنچ چکا ہے۔ علامہ سیماب کراچی منتقل ہوئے تو "شاعر" کی ادارت اعجاز صدیقی کے سپرد کر دی گئی۔ اب "شاعر" کی ادارت افتخار امام صدیقی سرانجام دے رہے ہیں۔ "شاعر" کی منفرد خوبی یہ ہے کہ اس نے ہر عہد میں ادب کے نئے تقاضوں کو سمجھا' نئے تجربوں کا خیر مقدم کیا اور قدیم و جدید شعرا اور نظریات کو پیش کرنے میں سرگرم عمل رہا۔ رسالہ "عالمگیر" لاہور کا مزاج کلاسیکی تھا۔ حافظ محمد عالم نے "عالمگیر" ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ جاری کیا' لیکن اس کے ادارتی امور اظہر امرتسری سرانجام دیتے تھے' آخری دور میں اس کی ترتیب و تدوین کا فریضہ شبلی بی کام اور نجمی نگینوی نے ادا کیا۔ حافظ محمد عالم کے پریس سے ایک اور ادبی ہفت روزہ "خیام" بھی نکلتا رہا ہے۔ یہ دونوں پرچے حافظ محمد عالم کی وفات کے بعد بند ہو گئے۔ "خیام" کا مزاج نیم ادبی تھا اور اس میں سیاست کے ساتھ فلم کو بھی اہمیت حاصل تھی۔

بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں جن رسائل نے علم و ادب کی شمع روشن کی ان میں ساغر نظامی کا رسالہ "ایشیا" میرٹھ سے شائع ہوتا تھا۔ عبدالقدوس ہاشمی اور ریاست علی ندوی نے ماہنامہ "ندیم" پٹنہ سے جاری کیا' محمد امین زبیری کا رسالہ "ظل سبحانی" بھوپال سے چھپتا تھا' یہ پہلے پندرہ روزہ تھا لیکن بعد میں اسے ماہ نامہ بنا دیا گیا۔ عبدالقادر سروری نے اسی دور میں حیدر آباد دکن سے ماہنامہ "مکتبہ" جاری کیا۔ فصیح الدین اور ملا واحدی کی ادارت میں "ادیب" دہلی سے چھپتا تھا' سالنامہ کی

صورت میں " کاروان" کے دو پرچے ڈاکٹر تاثیر اور مجید ملک کی ادارت میں لاہور سے شائع ہوئے ' صوری اور معنوی لحاظ سے " کاروان " کو ایک عہد ساز مصور جریدہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کلیم الدین احمد کا رسالہ " معاصر " پٹنہ ہندوستانی ادب حیدر آباد دکن ۔ جوش ملیح آبادی کا رسالہ " کلیم " ۔ سعید احمد اکبر آبادی کا " برہان " دہلی ۔ ترقی پسند تحریک کا رسالہ " نیا ادب " لکھنؤ ۔ قدوس صہبائی کا ہفت روزہ " نظام " بمبئی ۔ صہبا لکھنوی کا " افکار " بھوپال ۔ آغا سرخوش قزلباش کا " چمنستان " دہلی محمد تقی کا " مشہور " دہلی ۔ کاظم علی دہلوی کا " کہکشاں " دہلی ۔ پندرہ روزہ " آجکل " دہلی اس دور کے چند ممتاز ادبی جرائد ہیں ۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک آزادی کی منزل سر کر رہا تھا تو لاہور سے دو ماہی " سویرا " جاری ہوا ۔ " سویرا " ترقی پسند نظریات کا ترجمان تھا ۔ تاہم اس نے صوری اور معنوی لحاظ سے ایک نیا انداز اختیار کیا اور مستقبل کی ادبی ادارت پر دور رس اثرات مرتب کئے ۔ اسی قسم کا ایک منفرد رسالہ صمد شاہین اور ممتاز شیریں نے " نیا دور " کے نام سے بنگلور سے جاری کیا ۔ رسالہ " نرگس " کا ایک خوبصورت نظم نمبر بھی اسی دور کی یادگار ہے ۔

آزادی سے پہلے کی ادبی جریدہ نگاری ۔ عمومی تبصرہ

آزادی سے قبل یعنی بیسویں صدی کے ابتدائی ۴۷ برس کی ادبی جریدہ نگاری کا تجزیہ کیا جائے تو اولاً یہ بات واضح ہوتی ہے کہ " مخزن " ' " زمانہ " ' " دل گداز " اور " اردوئے معلیٰ " جیسے رسائل کے مدیران نہ صرف تعلیم یافتہ اور علوم نو سے شناسا تھے بلکہ وہ خود بھی ادیب تھے ' ادبی جریدہ ان سب کے لئے ادب کے اظہار و ابلاغ کا وسیلہ بھی تھا اور وہ اس سے عوام کی تہذیبی اور ادبی تربیت کا کام بھی لینا چاہتے تھے ۔ اس دور کے رسائل نے اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا میں بھی خصوصی دلچسپی لی اور تراجم کے ذریعے اس زبان کا دامن مالا مال کر دیا ۔ اس دور میں مدیران جرائد روشن خیال اور کشادہ نظر لوگ تھے ' وہ نہ صرف کہنہ مشق ادبا کا تعاون حاصل کرتے بلکہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے اور یوں ادب کی کہکشاں کو نئے ستاروں کے شمول سے ہمہ وقت منور رکھتے ' اس دور کی صحافت میں ہمیں نئی اصناف بالخصوص مختصر افسانہ کے فروغ کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں ۔

بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں " ہمایوں " ' " نگار ساقی " ' " نیرنگ خیال " ' " ادبی دنیا " اور " ادب لطیف " جیسے طویل العمر رسائل منظر عام پر آئے اور ان کے ساتھ ہی مدیران جرائد کی نئی جواں حوصلہ جماعت بھی روشناس ادب ہوئی ' چنانچہ اب نئے نئے تجربات کرنے

اور ادب کو مائل بہ ارتقا رکھنے کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ اردو افسانے کے ساتھ آزاد نظم کو متذکرہ بالا جرائد نے بالخصوص اہمیت دی، اور ان اصناف میں نئی کروٹوں کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ تنقید میں بحث کے مدار کو دلیل سے روشن کرنے کا رجحان ملتا ہے، وجدان کے ساتھ عقل و خرد کی کار فرمائی نظر آتی ہے اور ادبی جریدے کے مدیر کو ادب اور تہذیب کے پیغامبر کی حیثیت حاصل ہے جو معاشرے میں بلند مقام رکھتا ہے اور افکار نو سے اپنے قارئین کے ذہن کو روشن کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آزادی سے پہلے کے سترہ سال بے حد ہنگامی تھے، آزادی کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں، دوسری طرف ایک اور عالمگیر جنگ کے بادل پوری دنیا پر چھا چکے تھے، مغرب اور مشرق کے فاصلے آہستہ آہستہ کم ہو رہے تھے، لندن سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک قافلہ وارد ہند ہو چکا تھا اور اب نئے تصورات کا بیج ہندوستانی مٹی میں بو رہا تھا۔ اس دور کے ادبی رسائل میں بھی بحث و نظر کی افراط زیادہ نظر آتی ہے۔ رومانی افسانے نے اب زمین کے لمس کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا اور حقیقت نگاری کا رجحان روز افزوں ترقی پر نظر آتا ہے۔ تصدق حسین خالد، راشد اور میرا جی نے نظم جدید کی تحریک کو اس دور کے رسائل ہی میں فروغ دیا تھا، دوسری طرف ترقی پسند رسائل نے اپنی مخصوص نظریاتی جہت کی حامل تخلیقات پیش کیں جن کی خارجیت میں معاشرے کی دھڑکنیں موجود تھیں اور آواز کا لہرا اونچا تھا۔ ان دونوں رویوں کے خلاف بعض ادبی جرائد نے جن کا مزاج کلاسیکی تھا شدید ردعمل کا اظہار بھی کیا۔ چنانچہ اس دور کے رسائل میں تصادم کی فضا نمایاں نظر آتی ہے۔ نشرو اشاعت کے نئے ذرائع نے ادبی رسائل کی صوری حالت میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی۔ بیشتر رسائل نے نہ صرف سرورق کو دیدہ زیب بنانے کی کوشش کی بلکہ نامور مصوروں کی رنگین تصویریں شائع کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ سال بھر کی معمول کی اشاعتوں کے بعد ایک ضخیم سالنامہ پیش کیا جاتا تھا۔ اس دور میں ادبی رسائل کے قارئین ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے اور ادبی رسالہ ذہنی اور فکری انقلاب کا نقیب سمجھا جاتا تھا۔ ادبی رسائل کی اس کامیابی نے متعدد لوگوں کو نئے رسائل جاری کرنے پر مائل کیا۔ چنانچہ اب ہر چھوٹے بڑے شہر سے ادبی رسالے شائع ہونے لگے۔ مولانا امداد صابری نے "تاریخ صحافت اردو" کی پانچویں جلد میں جو ۱۹۱۱ء تا ۱۹۳۰ء تک کے بیس سالوں پر محیط ہے کم و بیش تین صد رسائل کا احوال درج کیا ہے لیکن اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ ان میں سے زیادہ رسائل کی زندگی بے حد مختصر تھی اور یہ اقتصادی کمزوری کے علاوہ اپنے مدیر کی شخصیت کی بے جہتی کا بھی شکار ہو گئے، ادبی سطح پر صرف وہی رسائل محرک قوت ثابت ہوئے جن کی ادارت کی زمام نیاز فتح پوری، شاہد احمد دہلوی اور مولانا صلاح الدین احمد جیسے بالغ نظر لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور جو ادب کو منفعت کا وسیلہ بنانے کے بجائے اس کے لئے ایثار کر سکتے اور قربانی دے سکتے تھے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی "تاریخ ادبیات پاکستان و ہند" جلد چہارم ۔ ص ۴۶

۲۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی "صحافت" حوالہ ایضاً" ۔ ص ۵۴۴

۳۔ اداریہ "مخزن" اپریل ۱۹۰۱ء

۴۔ "اقبال کے کلاسیکی نقوش" ص ۹۳ ۔ لاہور ۱۹۷۷ء

۵۔ "مخزن" شمارہ اول ۔ اپریل ۱۹۰۱ء

۶۔ شیخ عبدالقادر نے "میگزین" سے لفظ "مخزن" اختراع کیا جو ترجمہ ہے ۔ (ملاحظہ کیجئے اداریہ "مخزن" اپریل ۱۹۰۱ء)

۷۔ مولانا امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" جلد چہارم ۔ ص ۱۲۳

۸۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" جلد ۴ ۔ ص ۵۴۴

۹۔ کتابیات "پاکستان کے اخبارات و رسائل" ابو سلمان شاہجہان پوری ۔ ص ۹۷

۱۰۔ آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد "مخزن" مولانا حامد علی خان کی ادارت میں ادارہ "نوائے وقت" سے جاری ہوا ۔ اسی کا ذکر آگے آئے گا ۔

۱۱۔ "زمانہ" فروری ۱۹۰۳ء ۔ اداریہ

۱۲۔ "تاریخ ادبیات پاک و ہند" جلد چہارم ۔ ص ۵۴۸

۱۳۔ امداد علی صابری "تاریخ صحافت اردو" چہارم۔ ص ۳۵۵

۱۴۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی "مولانا ظفر علی خان بحیثیت صحافی" کراچی ۱۹۸۵ء

۱۵۔ رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اردو" (حصہ نثر) ص ۸۸

۱۶۔ "تاریخ صحافت اردو" چہارم ۔ ص ۳۹۵

۱۷۔ ایضاً"

۱۸۔ "تاریخ ادبیات مسلمانان..." چہارم ۔ ص ۵۴۶

۱۹۔ "تاریخ صحافت" ص ۴۴۲

۲۰۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی "مولانا ظفر علی خان بحیثیت صحافی" ص ۵۴

۲۱۔ ایضاً"

۲۲۔ "تاریخ صحافت" (چہارم) ۔ ص ۴۷۶

۲۳۔ محمد عبداللہ قریشی "تذکار اقبال" (محمد دین فوق) ۔ ص ۳۴

۲۴۔

۲۳۔ محمد عبداللہ قریشی "تذکار اقبال" (محمد دین فوق) ۔ ص ۳۴

۲۴۔ ایضاً " ۔ ص ۳۵

۲۵۔ "عصمت" کا ذکر مناسب مقام پر آگے بھی آئے گا۔

۲۶۔ مولانا امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" جلد پنجم ۔ ص ۱۵۸

۲۷۔ مولانا تاجور نجیب آبادی کا ایک خط میرے پاس محفوظ ہے ۔ جس میں مولانا نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی ہے کہ: "میں اپنے شاگردوں کو اپنا ایک ایسا فرزند تصور کرتا ہوں جو ایک غلام کی طرح میرا فرماں بردار ہو ' ادبی مشوروں میں بالکل میرے نقش قدم پر چلے ' میں اپنے شاگردوں کو اس وقت رسالوں اور اخبارات میں کلام شائع کرانے کی اجازت دیتا ہوں جب اسے اس قابل بنا دیتا ہوں کہ اس کی آمد دنیائے ادب میں ایک مستقبل نگار ادیب کی حیثیت حاصل کرلے ۔ مختصر یہ کہ میرا شاگرد اپنے شوق شہرت کو بالکل میرے حوالے کر دے۔"

۲۸۔ بحوالہ اخبار "کامریڈ" ۲۷ اپریل ۱۹۱۲ء

پیش منظر

پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ

پانچواں باب

اردو ادب کے عہد ساز رسائل

پاکستان میں ادبی صحافت کے پیش رو جرائد

۱۹۴۷ء سے قبل ادبی رسائل کے مراکز لاہور، دہلی، لکھنؤ، حیدر آباد، بمبئی، اور بھوپال تھے، نئی مملکت پاکستان وجود میں آئی تو اس کے حصے میں صرف ایک اہم ادبی مرکز لاہور آیا۔ کراچی، پشاور، راولپنڈی، حیدر آباد، اور ملتان کو بڑے شہروں کی حیثیت تو حاصل تھی اور ان شہروں سے ادبی جرائد بھی شائع ہوتے تھے لیکن ان میں سے کسی رسالے کو عہد ساز یا جہت نما شمار کرنا ممکن نہیں، چنانچہ ان شہروں میں ادبی صحافت خاصی کمزور تھی اور لاہور سے شائع ہونے والے ادبی جرائد ہی نہ صرف پاکستان کے مختلف صوبوں کے لوگوں کی ذہنی آبیاری کرتے تھے بلکہ ان کا حلقہ اثر بھی پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ ادبی جرائد کے اہم مراکز سے کٹ جانے کے بعد اگرچہ خلا تو پیدا ہوا اور کچھ عرصے کے لئے ادبی جرائد کی اشاعت میں تعطّل بھی واقع ہوا لیکن جلد ہی اس خلا کو پر کرنے کا عمل شروع ہو گیا اور متعدد ایسے رسائل جو آزادی سے قبل لاہور سے چھپ رہے تھے دوبارہ شائع ہونا شروع ہو گئے، آبادیوں کے تبادلے کے بعد سب سے پہلے کراچی کو ایک اہم ادبی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ برصغیر سے ہجرت کر کے آنے والے رسائل نے اس شہر سے تجدید اشاعت کی تو ادب کا مطلع ایک بار پھر منوّر نظر آنے لگا۔ اس اجمال کی روشنی میں اب یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہو گا کہ پاکستان میں ادبی صحافت کو جو تسلسل نصیب ہوا ہے اس میں سابقہ ادوار میں شائع ہونے والے ادبی رسائل کا حصہ زیادہ ہے۔ اس دور کے کئی عہد ساز رسائل کا ذکر ہم نے سابقہ اوراق میں بے حد اجمال سے کیا ہے۔ اس باب میں نئے رسائل کے تذکرے سے قبل پاکستان کی ادبی صحافت کے پیش رو جرائد کا تذکرہ تفصیل سے کرنا ضروری ہے۔

"اردو" - کراچی

سہ ماہی رسالہ "اردو" اورنگ آباد سے جنوری ۱۹۲۱ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے جاری کیا تھا۔ اس کی اشاعت انجمن ترقّی اردو ہند کے ایک اہم مقصد کی تکمیل کے علاوہ ادب اور متعلقات ادب کا فروغ تھا۔ مولوی صاحب کو احساس تھا کہ اردو زبان و ادب کے بہت سے خزانے پردۂ اخفا میں پڑے ہیں اور انہیں ابھی ہوا تک نہیں لگی' اردو کے بہت سے الفاظ اور محاورے تحقیق طلب ہیں۔ ان کے مصنّف اور کتابیں محروم تعارف ہیں۔ اردو زبان کی املا' انشا اور رسم الخط کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت بھی پیدا ہو چکی تھی' اردو کی تاریخ اور اسکے نشوونما کا سلسلہ وار جائزہ لینے اور تاریخ ادب مرتّب کرنے کی طرف بھی توجہ دینا ضروری تھا۔ تنقید جو ادب کی جان اور ذوق سلیم کی روح رواں ہے اس وقت ابتدائی مرحلے میں تھی۔ مولوی عبدالحق اسے صحیح رنگ میں پیش کرنے کے آرزو مند تھے' ان سب امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے رسالہ "اردو" کے مقاصد کا اجمال ان الفاظ میں پیش کیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ رسالہ "اردو" زبان و ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالا مال ہو تاکہ شائقین ادب اسے غور و شوق سے پڑھیں اور اہل ملک کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو... ہم اپنی بساط کے موافق کوشش کریں گے کہ زبان کی خصوصیت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں' پاک' صاف اور شائستہ زبان استعمال کریں اور ذوق سلیم کے پیدا کرنے میں طرح طرح سے مدد دیں۔" (۱)

مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" کو جو ادبی مقاصد تفویض کیے تھے ان کے حصول میں اس رسالے نے قابل رشک کامیابی حاصل کی۔ مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ: سہ ماہی رسالہ "اردو" پرانے مذاق اور جرائد کو دیکھتے ہوئے اپنی شان کا ایک الگ' خاص اور روشن نمونہ تھا۔ اس نے ابتداء میں انجمن کی ترجمانی کے فرائض بھی انجام دیئے اور ساتھ ساتھ علمی' تحقیقی مضامین اور اعلیٰ پائے کی انشا چھاپنے کا اہتمام بھی کیا... یہاں تک کہ بہت جلد منشی پریم چند نے کہا رسالہ "اردو"--- اردو رسالوں کا سالار کارواں ہے۔" (۲)

رسالہ "اردو" ابتدا سے ۱۹۳۶ء تک اورنگ آباد سے چھپتا رہا اس کے بعد انجمن کا دفتر منتقل ہو گیا اور ۱۹۴۷ء تک اس کی اشاعت دہلی سے ہوتی رہی اور اس کے ساتھ ہی متحدہ ہندوستان میں رسالہ "اردو" کا ایک طویل اور درخشاں دور ختم ہو گیا۔ اس دور میں اگرچہ اردو کو اورنگ آباد سے دہلی کی طرف نقل مکانی کرنی پڑی لیکن یہ صرف ایک انتظامی تبدیلی تھی۔ اس کی ادارت مولوی صاحب کے ہاتھوں میں تھی اور انہوں نے اردو کی جو تحقیقی' تنقیدی اور ادبی جہت قائم کی تھی یہ قائم

رہی۔ " اردو " نے اظہار کا علمی انداز پیدا کیا، تحقیق میں طلب صداقت اور تلاش حق کو اہمیت دی اور اختلافی امور کو صبر و تحمل سے قبول کرنے کی طرح ڈالی۔ اس کے ابتدائی دور میں جن مضمونوں نے ادبی دنیا میں ایک غلغلہ برپا کر دیا ان میں عبدالرحمٰن بجنوری کا غالب پر معرکہ آرا مقالہ، حافظ محمود شیرانی کی تنقید شعرا لعجم، فرحت اللہ بیگ کا "دلی کا یادگار مشاعرہ"۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کا "سنسکرت کے عربی اور فارسی تراجم" خواجہ احمد فاروقی کا "معرکہ قتیل و غالب" سید ظہیر الدین مدنی کا "دلی کی علمی استعداد اور فارسی شعرا" شوکت سبزواری کا "اردو الفاظ عامہ کی آپ بیتی" محمد عمر نور الٰہی کا مقالہ "مثنوی حجاب زناں" ڈاکٹر مسعود حسین خان کا "اردو کی ابتدا سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کے لسانی نظریے پر تنقید" محمد داؤد رہبر کا "فارسی اور اردو میں پیروڈی کا تصور" غلام دست گیر نامی کا "دیوان مراد" اور محمد حسن کا مقالہ "مرثیہ خوانی کا اثر مرثیہ گوئی پر" شامل ہیں، رسالہ "اردو" کو ایک مخزن المخازن کی حیثیت حاصل تھی، اس کے مضامین نوادارت کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور اب اردو زبان کے ان گنت موضوعات پر بنیادی حوالے کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ اردو نے کتابوں پر تبصروں کو بھی مبسوط تنقید کی صورت دی، تعریف و تحسین اور سرسری رائے کے اظہار کے بجائے کتاب کو اس کی معنویت اور مواد کی اساس پر پرکھنے کی طرح ڈالی۔

"اردو" کا پاکستانی دور

مولوی عبدالحق نے مارچ ۱۹۴۸ء میں ہندوستان چھوڑا تو کراچی آتے ہی انجمن ترقی اردو پاکستان کے استحکام و ترقی کے کاموں میں مصروف ہو گئے، جون ۱۹۴۸ء میں " قومی زبان " اور جولائی ۱۹۴۹ء میں رسالہ " اردو " جاری کر دیا جو اٹھائیسویں جلد کا پہلا شمارہ تھا۔ اس پرچے کے لئے جو مجلس ادارت تشکیل دی گئی اس میں مولوی عبدالحق کے علاوہ شیخ محمد اکرام، ممتاز حسن، فضل احمد کریم فضلی، ہاشمی فرید آبادی، عندلیب شادانی، سید عبداللہ اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے نام شامل ہیں (۳)۔ اردو اگرچہ دلی سے اکھڑ کر آیا تھا اور نامساعد حالات کا سامنا کر رہا تھا تاہم اس نے نقل مکانی کی مشکلات کا واویلا نہیں کیا اور پہلے پرچے میں ہی چند ایسے مضامین پیش کر دئے جن سے "اردو" کی سابقہ روایت کو استحکام مل جاتا تھا۔

رسالہ "اردو" کا پاکستانی دور اس کے سابقہ دور کی طرح تابناک ہے۔ اس نے زبان و ادب کے گم شدہ خزینوں کی تلاش میں گہری دلچسپی لی۔ شعرا کے فن اور نظریات کو نئے علوم کی روشنی میں پرکھا، ان کے حالات حیات کی صحت مندانہ جانچ پڑتال کی، پرانے صحائف کے متون کی درستگی پر توجہ

صرف کی، الفاظ و بیان کے مباحث کو صحت مند خطوط پر استوار کیا اور مختلف زبانوں کے درمیان تراجم کے ذریعے لین دین کا سلسلہ جاری کیا اس دور میں جو گراں قدر مقالات اردو میں شائع ہوئے ان کی فہرست طویل ہے۔ تاہم ان میں سے چند ایک کے عنوانات یہاں حوالے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ "اردو میں دخیل الفاظ" از ڈاکٹر مولوی عبدالحق "اردو زبان کی ابتدا" از عندلیب شادانی "سب رس کے ماخذات اور مماثلات" از عزیز احمد "مولانا محب علی سندھی" از سید حسام الدین راشدی "پنچ تنتر کے گجراتی ترجمے" از سید باقر علی ترمذی "بابلی زبان و ادبیات" از مالک رام "ہندی ادب" از پروفیسر غضنفر "شاہ نصیر دہلوی" از سخاوت مرزا "عربی کا جدید افسانوی ادب" از رشید احمد رشید "حالی کی اردو غزل" از غلام مصطفےٰ خان "کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کا جائزہ" از نصیرالدین ہاشمی "جاپانی زبان کی خصوصیت" از پروفیسر کے دوئی "مرزا حیدر علی گرم لکھنوی" از سخاوت مرزا "دیوان ولی کا قدیم ترین مخطوطہ" از اختر جوناگڑھی "بغداد کی وجہ تسمیہ" از عبدالستار صدیقی "سرسید کے ادبی مضامین" از سید شاہ علی "فانی" از خالدہ شوکت۔ ۱۹۵۳ء میں "اردو" کا جوبلی نمبر یک موضوعی تھا۔ اس میں انجمن ترقی اردو کی تاریخ ہاشمی فرید آبادی نے پیش کی۔

رسالہ "اردو" ۱۹۶۰ء میں انجمن کے مسائل کا شکار ہوگیا۔ اس سے قبل مولوی عبدالحق کی علالت طبع نے بھی اس کے اشاعتی پروگرام اور باقاعدگی کو متاثر کیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں انجمن ترقی اردو نے تنظیم نو کے بعد رسالہ "اردو" کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور اسکا پہلا پرچہ "بابائے اردو نمبر" شائع کیا جس کے مدیر سید وقار عظیم تھے۔ اس پرچے میں بابائے اردو کی شخصیت کا ایک پائیدار نقش ابھارنے کے علاوہ ان کی خدمات کا پر خلوص جائزہ لینے کی کوشش بھی کی گئی، شخصیت کے باب میں پروفیسر احمد خان، ڈاکٹر طاہر فاروقی، ظہیر الدین مدنی، دیوان سنگھ مفتون، حامد اللہ افسر، مبارزالدین رفعت اور محمد حسن کے مضامین اہم ہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ "مولوی عبدالحق کا اسلوب تحریر" ڈاکٹر عبادت بریلوی کا "مقدمات عبدالحق" اسلوب احمد انصاری کا "بابائے اردو کی مرقع نگاری" ڈاکٹر ریاض الحسن کا "بابائے اردو جدید تنقید کے بانی" ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کا "بابائے اردو کی اردو" اور سید وقار عظیم کا "مولوی صاحب کی سیرت نگاری" ان کے فکر و فن کے مختلف گوشوں کو روشن کرتے ہیں۔

۱۹۶۲ء کے بعد اردو کی ادارت جمیل الدین عالی اور مشفق خواجہ کے سپرد ہوئی، مجلس ادارت کے نئے صدر اختر حسین تھے، مشفق خواجہ انجمن سے ذاتی مجبوریوں کی بنا پر رخصت ہوئے تو ان کی جگہ پروفیسر شبیر علی کاظمی نے سنبھال لی۔

متذکرہ بالا تغیر و تبدل خالصتاً انتظامی نوعیت کا ہے اور یہ اردو کے تحقیقی مزاج پر کسی دور

میں بھی اثر انداز نہیں ہوا۔ مشفق خواجہ صاحب کے دور میں اگرچہ مولوی عبدالحق کی بنا کردہ تحقیق کی روایت ہی فروغ پذیر نظر آتی ہے تاہم خواجہ صاحب نے خصوصی اشاعتوں کا سلسلہ بھی شروع کیا انہوں نے جنوری ۱۹۶۹ء میں ایک شمارہ خصوصی بیاد غالب پیش کیا۔ اس نمبر میں صمد حسین رضوی کا "غالب کی صحیح تاریخ پیدائش" قاضی عبدالودود کا "مجموعہ دہلی اور غالب" پروفیسر ممتاز حسین کا "غالب کا آئینہ فن" ڈاکٹر وحید قریشی کا "غالب اور اس کا ماحول" فاضل لکھنوی کا "غالب اور تفتہ" وزیر آغا کا " وہ زندہ ہم ہیں " اور مخمور اکبر آبادی کا " غالب کا مزاج شعری" چند نوادرات تحقیق و تنقید کا درجہ رکھتے ہیں، " اردو " کی میر انیس اور اقبال پر خاص اشاعتیں بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہیں، مشفق خواجہ نے اشاریہ مضامین " اردو " چھاپنے کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی لغت کبیر کی مسلسل اشاعت " اردو " ہی میں عمل میں آئی۔ شبیر علی کاظمی نے اس روایت کو اپنے عہد ادارت میں مزید توسیع دی اور ڈاکٹر سہیل بخاری کی لغت اور محمد اکرام چغتائی کی کتاب بابت اسپرنگر، ڈاکٹر یونس حسنی کا مقالہ اختر شیرانی " اردو " میں پیش کیا۔

شبیر علی کاظمی اور اختر حسین صاحب کی وفات کے بعد اب صدر مجلس ادارت نورالحسن جعفری صاحب ہیں، اراکین مجلس جمیل الدین عالی، ڈاکٹر اسلم فرخی اور مدیر اعزازی ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری ہیں۔ رسالہ "اردو" اب بھی تحقیق ادب کی خدمات اعلیٰ پیمانے پر سرانجام دے رہا ہے۔(۳) لیکن اب یہ بے قاعدگی اشاعت کا شکار ہے

"ہمایوں"۔ لاہور

میاں بشیر احمد نے جنوری ۱۹۲۲ء میں لاہور سے " ہمایوں " جاری کیا تو ان کے پیش نظر اپنے والد ہمایوں کا یہ شعر تھا۔

ہمایوں! تیرے مدفن پر بنائیں مقبرہ کیوں ہم
یہاں حسن عمل ہے سب سے بہتر یادگاروں میں

اور انہوں نے اپنے والد گرامی کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے " ہمایوں " کے پہلے پرچے میں آرزو کی:

"حضرت ہمایوں کی نکتہ آفرینی اک ننھی ہستی کو اپنے اعجاز نفس سے شگفتہ و معطر کر دے۔"(۴)

" ہمایوں " جسٹس شاہ دین کی یادگار بھی تھا اور میاں بشیر احمد کی کاوش ذوق بھی۔ تاہم اس

کے اجرا سے پہلے دسمبر ۱۹۲۱ء میں انہوں نے علامہ اقبال سے مشورہ کیا تو انہوں نے اس شوق کو عارضی قرار دیا اور انہیں گارساں و تاسی کی کوئی تصنیف اردو میں ترجمہ کرنے کی صلاح دی۔ میاں بشیر احمد اس یادگار کو قائم کرنے کا عزم کر چکے تھے، اس لئے اقبال نے "ہمایوں" کے پہلے پرچے کے لئے ایک نئی نظم عطا کی، جس کا مطلع ہے۔

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی تیری چنگاری چراغ انجمن افروز تھی

"ہمایوں" کا مقصد عظمت شناسی تھا' اس نے جہد للبقا میں زندہ رہنے کے لئے زندہ دلی کو آزمانے اور ادب کی خدمت میں دوسروں کو شامل کرنے کا منصوبہ بنایا' ادب میں اس نے دوسروں کے محاسن سے فیض اٹھانے کی طرح ڈالی اور "مخزن"' "شباب اردو"' "زمانہ"' "کہکشاں" اور "نقاد" جیسے رسائل کی موجودگی میں محفل اردو میں ہم عصری کے تمنا کی' "ہمایوں" ان معدودے چند رسائل میں سے تھا جنہیں پہلے پرچے کی اشاعت پر ہی قبول عام کی سند حاصل ہو گئی اور علامہ اقبال' شیخ عبدالقادر' نیاز فتح پوری' خواجہ حسن نظامی' غلام بھیک نیرنگ' مولانا گرامی' تلوک چند محروم' عبدالحلیم شرر' تیج بہادر سپرو' سجاد حیدر یلدرم' علامہ طباطبائی' شوزائن شمیم' مولوی ممتاز علی' منشی پریم چند' میلا رام وفا' پنڈت سدرشن' جوش ملیح آبادی' رضا علی وحشت لکھنوی' یاس یگانہ چنگیزی' پنڈت کیفی' عبدالعزیز فلک پیما اور خلیقی دہلوی جیسے نامور ادبا کا تعاون حاصل ہو گیا اور جوں جوں راہوار وقت آگے بڑھتا گیا "ہمایوں" کے اہل قلم اور حلقہ قرات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

"ہمایوں" کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اسے میاں بشیر احمد نے جاری کیا تھا اور جب مذاق زمانہ میں معتدبہ تبدیلی آ گئی تو انہوں نے متعدد تجربات کرنے کے بعد۔۔۔ خود ہی اسے بند بھی کر دیا۔ چنانچہ "ہمایوں" پر میاں بشیر احمد کی وضعدار اور تہذیبی شخصیت کی چھاپ ہمیشہ قائم رہی' "ہمایوں" نے ادب کو اخلاقیات کے مخصوص مشرقی مزاج کا پابند بنانے کی کوشش کی اور اسے ایک مخصوص معیار سے گرنے نہیں دیا۔ تاہم "ہمایوں" کی ادبی شخصیت جامد نہیں تھی اس نے ادب کی فکری اور صنفی تحریکوں کے اثرات قبول کئے اور اپنے جائنٹ ایڈیٹروں کے نظریات ادب کو سمیٹنے کی کوشش بھی کی۔ اس ضمن میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک کے دور ادارت میں "ہمایوں" کا مزاج کلاسیکی خطوط پر مرتب کیا' (۵) اصلاح زبان اور تحقیق الفاظ کو اہمیت دی' تہذیبی اور تعلیمی امور کو فوقیت دی۔ "ہمایوں" کے مستقل عنوانات "جہاں نما"' "علمی شعاعیں"' "نسوانی دنیا" اور "محفل ادب" تھے۔ ان سب کا اسلوب تعلیمی تھا اور اہم بات یہ کہ مولانا تاجور نے ثقہ اور کہنہ مشق ادبا پر انحصار زیادہ کیا لیکن نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو "ہمایوں" کے قریب نہیں آنے دیا۔ "ہمایوں" کے دوسرے معاون مدیر منصور احمد تھے' ۱۹۲۸ء میں ان کے ساتھ حامد علی خان نے شمولیت اختیار کی۔ اس

دور میں مضامین نثر میں ایک عجب نوع کی کشادگی کا احساس ہوتا ہے، نظموں میں جذبہ زیادہ پر افشاں دکھائی دیتا ہے۔ تخلیقی ادب پر لطافت اور نکہت چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ میاں بشیر احمد نے "ہمایوں" کی چھٹی سالگرہ پر لکھا کہ:

"خدا کا شکر ہے کہ ہمایوں اپنی عمر کے تیسرے اور چوتھے سال میں ذرا خشک مزاج ہو گیا تھا، اپنے پانچویں اور چھٹے سال میں پھر شگفتہ رو ہو گیا ہے اور اس کامیابی کا سہرا میرے جائنٹ ایڈیٹر مولوی حامد علی خان کے سر ہے جن کی قابلیت، شرافت اور مروّت کا گہرا نقش ہمایوں کے صفحات پر ثبت ہے۔"(۶)

مولانا حامد علی خان ہمایوں کے ساتھ ۱۹۴۲ء تک منسلک رہے، انہوں نے ادب و جمالیات کے ایک مخصوص معیار کو قائم رکھتے ہوئے "ہمایوں" کا دائرہ عمل وسیع کر دیا۔ "ہمایوں" سیاسی رسالہ نہیں تھا لیکن اس نے اہل ادب کو سیاسی واقعات سے باخبر رکھنے کے لئے "جہاں نما" کا سلسلہ شروع کیا اور سالنامے میں پورے سال کے واقعات کا ملخص پیش کر دیا جاتا تھا، عالمی تمدن میں رونما ہونے والے تغیرات کا عکس بھی "ہمایوں" میں نمایاں جگہ حاصل کرتا تھا، مضامین کے حصے میں حامد علی خان نے تنوع اور بوقلمونی پیدا کی اور فنی، تنقیدی، فلسفیانہ اور نفسیاتی موضوعات پر گراں قدر مضامین پیش کئے۔ طنز و مزاح میں شائستگی کو ملحوظ خاطر رکھا، ادب کی تمام اصناف بالخصوص افسانہ، نظم، ڈرامہ، سفرنامہ کو فوقیت دی، اس دور میں ہمیں آزاد نظم کی طرف پیش قدمی کے آثار بھی نظر آتے ہیں اور کہنہ مشق ادبا کے پہلو بہ پہلو متعدد نئے ادبا بھی "ہمایوں" کے صفحات سے ابھرتے ہیں۔ ان میں سے چند ادبا جو بعد میں اردو ادب کے آفتاب و ماہتاب بن کر روشن ہوئے یہ ہیں: کرشن چندر، دیویندر ستیارتھی، ریاض قادر، شفیق الرحمن، اسعد گیلانی، فیاض محمود، الطاف گوہر، آغا بابر، امجد حسین، عطا اللہ پالوی، راجندر سنگھ بیدی، اے حمید، ظفر واسطی، صادق الخیری، احمد ندیم قاسمی، راما نند ساگر، حمید نظامی، عظیم بیگ چغتائی، سید علی عباس، راجہ مہدی علی خان، ز۔ب صاحبہ، ایوب سرور، شیر محمد اختر۔ اس دور میں ان گنت ایسے ادبا بھی ہیں جو ہمایوں کے صفحات پر ابھرے اور شعلہ مستعجل کی طرح غائب ہو گئے، حامد علی خان نے "ہمایوں" کا سالنامہ چھاپنے کی روایت مستحکم کی اور اگست ۱۹۳۴ء میں "افسانہ نمبر" مئی ۱۹۳۵ء میں "روسی ادب نمبر" اور ستمبر ۱۹۳۵ء میں "فرانسیسی ادب نمبر" شائع کئے جن کی ترتیب و تدوین میں سعادت حسن منٹو بھی ان کے ساتھ شریک تھے، مولانا حامد علی خان کا دور ادارت سب سے طویل اور تابندہ ترین شمار کیا جا سکتا ہے۔

جنوری ۱۹۴۴ء میں "ہمایوں" کی معاون ادارت میں یوسف ظفر شامل ہو گئے، ان کا عرصہ ادارت نومبر ۱۹۴۷ء تک پھیلا ہوا ہے اس دور میں دنیا نے فاشسٹ قوتوں کو شکست خوردہ اور دوسری

عالمگیر جنگ کو سمٹتے ہوئے دیکھا' ترقی پسند تحریک ایک فعال اور طغیانی تحریک بن چکی تھی' ہندوستان آزادی کی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور ہندی تنازعہ نے سیاسی صورت اختیار کر لی تھی' "ہمایوں" نے اپنے اخلاقی ضابطوں کو قائم رکھا لیکن ادب کے نئے تجربات کا خیر مقدم کیا۔ میاں بشیر احمد نے بزم ہمایوں میں لکھا کہ:

"مدیر "ہمایوں" کا نقطہ نگاہ بالطبع قدامت پسندانہ ہے لیکن حقیقت سے آنکھیں پھیرنا ہو گا اگر وہ نئی دنیا کے مفہوم کو سمجھنے سے انکار کر دے .. نوجوانوں کی انتہا پسندی ہمیں کبھی پسند نہ آئے گی' اس کی روک ہمارا فرض ہے .. لیکن اس کے ساتھ جدید ادب کی نئی اور اچھوتی جدتوں سے منہ پھیرنا صریح تنگ نظری ہے ۔ ایک نیا تجربہ ہے' 'ہونے دیجئے' نئے ادب میں اگر پانچ فی صد بھی کام کی چیزیں نکل آئیں تو وہ کار آمد ثابت ہو گا ۔ " (۷)

یوسف ظفر نے اپنے دور ادارت میں ادب میں نئے تجربات کے لیے "ہمایوں" کا سینہ کشادہ کر دیا اور ایسی نظمیں اور افسانے زیادہ شائع کئے جن میں داخل کی آواز اپنے اظہار کے لئے نئی ہئیتیں اور نئے اسالیب تراش رہی تھی' اور اس عمل میں انہوں نے حلقہ ارباب ذوق کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے شعرا کو بھی ہمایوں میں نمایاں جگہ دی' چنانچہ ظہیر کاشمیری' ساحر لدھیانوی' سعادت حسن منٹو' راجندر سنگھ بیدی' سیف الدین سیف' صلاح الدین احمد' کرشن چندر' علاؤ الدین کلیم' مخمور جالندھری' سہیل عظیم آبادی' قیوم نظر' دیویندر ستیارتھی' شیر محمد اختر' الطاف مشہدی' انجم رومانی' میرا جی' ضیا جالندھری' رفعت سروش' سب "ہمایوں" میں جلوہ گر نظر آتے ہیں' "ہمایوں" کا رجحان واضح طور پر تحریک پاکستان کی طرف جھکا ہوا تھا اس نے تحفظ زبان اردو کا بیڑا بھی اٹھائے رکھا لیکن ادب کے افق پر جو نئے ستارے روشن ہو رہے تھے اور اظہار وہیئت میں جو نئے تجربات کئے جا رہے تھے "ہمایوں" ان کے خیر مقدم میں بھی پیش پیش تھا۔ مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ اس طغیانی اور تجرباتی دور میں بھی "ہمایوں" نے اپنے اخلاق اور تہذیب کی وضع کو قائم رکھا لیکن ادب کی صحت مند تبدیلیوں کو قبول کرنے میں تاخیر نہیں کی۔

"ہمایوں" آزادی کے بعد

آزادی کے بعد "ہمایوں" میں متعدد معنوی اور صوری تبدیلیاں ظہور میں آئیں ۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں یوسف ظفر کی جگہ شیر محمد اختر نے لے لی' دسمبر ۱۹۴۸ء میں مظہر انصاری نے معاون مدیر کی نشست سنبھالی اور ستمبر ۱۹۵۲ء تک اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سر انجام دیتے رہے' وہ رخصت

ہوئے تو اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ناصر کاظمی معاون مدیر مقرر ہوئے اور "ہمایوں" کے آخری شمارے (جنوری ۱۹۵۷ء) تک اس کے ساتھ منسلک رہے۔ ان میں سے شیر محمد اختر مختصر سے دور کے عبوری مدیر تھے لیکن ۱۹۴۸ء کے دوران میاں بشیر احمد ایک فکری اور ذہنی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان سے تقاضا کیا گیا کہ "ہمایوں" کو سیاسی رسالہ بنا دیا جائے۔" (۸) لیکن میاں صاحب نے ادبی رسالے کو سیاسی کشاکش سے علیحدہ رکھنے کا ارادہ کر لیا اور لکھا کہ:

"ایک ایسے ادبی رسالہ کو جو مختلف قسم کے ادبی خیالات کا ذخیرہ ہو اور جس کا مقصد اپنی قوم کی زندگی کو ایک بلند اخلاقی معیار پر پہنچانا ہو وہ روز مرہ کی سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا... ادیب اور غیر ادیب شہری میں یہ فرق ہے کہ ادیب کم از کم تھوڑی دیر کے لئے عام سطح سے بلند ہو کر مسائل حاضرہ پر غیر متعصبانہ نظر ڈالتا ہے۔ وہ ایک قسم کا مبلّغ ہے جو قومی زندگی کی وقتی یا مقامی آلودگیوں سے مبرا ہو کر اسے پاک و صاف کرنا چاہتا ہے۔ پاکستانی ادب کبھی، تنگ دلی اور کم ظرفی اور تعصب کا مظہر نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ اسم با مسمّٰی ہے تو اسے باوجود ہزار کثافتوں کے اوروں سے زیادہ پاک صاف ہو کر رہنا ہے۔" (۹)

مظہر انصاری نے میاں بشیر احمد کے ان تصورات کو راہنما اصولوں کے طور پر قبول کیا اور ہمایوں میں ایسے مضامین اور منظومات کو نمایاں طور پر پیش کیا جن میں قومی نقطہ نظر کو فوقیت حاصل تھی، پاکستانی قوم کے نئے مزاج کی صحت مند ترتیب کی طرف سمت نما ہوتی تھی اور وطن کے تقاضے پورے ہوتے تھے، بزم ہمایوں میں قومی مسائل کو اہمیت دی گئی، "جہاں نما" کے ساتھ ایک نئے باب کا اضافہ "پاکستان میں" کیا گیا، فروغ اردو کو تحریکی صورت میں پیش کیا گیا۔ تفہیم و تشریح اقبال اور پاکستانیات کو اہم موضوعات کی حیثیت دی گئی۔ اس ضمن میں میاں بشیر احمد، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر محمد باقر، فلک پیما، وقار خلیل، جمیل الدین احمد، عزیز احمد، سعید احمد رفیق، رحمٰن مذنب، محمد حسن عسکری اور حامد علی خان کے نام بہت اہم ہیں۔

مظہر انصاری نے ہمایوں کی کشادہ نظری اور عالی ظرفی کی روش کو قائم رکھا اور متعدد نئے لکھنے والوں کو اردو ادب میں روشناس کرایا انہوں نے منور اشرف، ست پرکاش سنگر، رضیہ وقیع، (اب رضیہ فصیح احمد) غلام الثقلین نقوی، مرزا ریاض، نسیمہ اشرف علی، نجمہ انوار الحق، شبیر حسین، رحمٰن مذنب، آشم مرزا، اختر جہاں اور غیاث احمد گدی کی صورت میں افسانہ نگاروں کی ایک نئی کہکشاں بھی مرتب کی۔ (۱۰) چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں جب میاں بشیر احمد ترکیہ کی سفارت پر چلے گئے تھے تو مظہر انصاری نے ہمایوں کو نہ صرف زندہ و تابندہ رکھا بلکہ اس کی پابندی وقت پر شائع ہونے کی روایت کو بھی قائم رکھا اور یوں "ہمایوں" کو پاکستانی دور میں ایک

مضبوط بنیاد فراہم کر دی ' ناصر کاظمی نے اس بنیاد پر ہی آئندہ چند برسوں میں ایک نئی عمارت تعمیر کی ' انہوں نے پاکستان میں نئے ادب ' نئی تہذیب اور نئی نسل کے سوالات کو اہمیت دی ' اور ایسے فکری زاویوں کو ابھارا جن سے بے راہ روی میں رکاوٹ پیدا کی جا سکتی تھی اور مثبت سوچ کا عمل تیز تر ہو سکتا تھا لیکن بد قسمتی سے معاشرے نے بے راہ روی کی طرف تیزی سے قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا ' دولت اور شہرت کی لوٹ میں ادیب بھی شامل ہو چکا تھا اور اب اس کی تخلیق پر بھی منفی زد پڑنے لگی تھی ' اس صورت حال کے پیش نظر میاں بشیر احمد نے " ہمایوں " کی ادبی جہت میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کی اور اسے ایک ایسا اخلاقی صحیفہ بنانے کی کوشش کی جس کے مقاصد کے حصول کا وسیلہ ادب تھا ' جنوری ۱۹۵۵ ء میں "ہمایوں" نے اپنے دور جدید کا آغاز کیا تو مدیر "ہمایوں" اس ولولے سے محروم تھے جو انہوں نے جنوری ۱۹۲۲ ء میں "ہمایوں" جاری کرتے وقت محسوس کیا تھا۔ انہوں نے بے حد تاسف سے حالات کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا کہ:

" پہلے اپنے صوفیوں اور ملاؤں کی پیروی میں اور پھر مغرب کی اندھا دھند تقلید میں ہم اپنا آپ بھول چکے اب ہم میں دین داری باقی ہے اور نہ دنیاداری ' نہ خدا کا خوف ہے نہ قوم کی محبت ' مغرب جسے ہم مادہ پرست کہتے ہیں نرا مادہ پرست نہیں ۔ دیانت داری ' تعاون ' انسانی ہمدردی اگر مذہب اس کا نام ہے تو مذہب مسلمانوں کے ہاں کم ہے اور کافروں کے ہاں زیادہ یہ بات تلخ لیکن درست ہے۔" (۱۱)

" ہمایوں " اپنی نئی وضع میں جنوری ۱۹۵۷ء تک چھپتا رہا۔ اس نے ادب اور اخلاقیات کی جو شمع روشن کی تھی اس کی کرنیں اب گرد و پیش قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ چنانچہ ۴۲۱ پرچے جو ستائیس ہزار پانچ سو بارہ صفحات پر مشتمل تھے۔ چھاپنے کے بعد "ہمایوں" بند ہو گیا۔ میاں بشیر احمد نے لکھا:

"ہمایوں" کا ایک خاص نصب العین تھا۔ یہ حضرت ہمایوں کی یادگار بھی تھا اور میری ایک ادبی کوشش اور مشغلہ بھی ' جب مجھے یقین ہو گیا کہ اگر اسے جاری رکھا گیا تو نہ یہ یادگار اس گرامی قدر ہستی کی شان کے شایاں رہے گی اور نہ اس صورت میں میری ادبی کوشش زیادہ مفید ہو گی تو میں نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا " (۱۲)

میاں بشیر احمد نے احباب اور قارئین کے اصرار پر " ہمایوں " کو سالنامہ کی صورت میں چھاپنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن یہ سلسلہ بھی جاری نہ رہ سکا اور " ہمایوں " کا صرف ایک سالنامہ جنوری ۱۹۵۸ ء میں منظر عام پر آ سکا۔

" ہمایوں " اردو کا ایک جلیل القدر ادبی جریدہ تھا ' اس نے ادب کو معنوی طور پر اور صحافت

کو صوری طور پر متاثر کرنے کی کوشش کی' ابتدا میں ہمایوں نے مضامین پر انعام دینے کا اعلان بھی کیا لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا۔ اردو زبان کا فروغ و ارتقا اس کے مقاصد اولی میں شامل تھا۔ "ہمایوں" نے اردو کو ملکی زبان اور آزادی کے بعد قومی زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا' سماجی اور معاشرتی سطح پر "ہمایوں" نے تعلیم و تہذیب کو فروغ دینے اور عوام کو روشن خیال بنانے کی کوشش کی' "ہمایوں" نے عورتوں کی انشاء پردازی اور تخلیقی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی اور مذہب کی جامد قیود کو نئے علم الکلام سے توڑنے کی سعی کی۔ "ہمایوں" اگرچہ سیاسی رسالہ نہیں تھا لیکن اس نے عوام کو سیاسی امور سے باخبر رکھنے کی اور مسلم لیگی نقطہ نظر اور قائد اعظم اور اقبال کے تصورات کو پھیلانے میں سرگرم حصہ لیا۔ آزادی کے بعد "ہمایوں" نے اسلام اور اردو زبان کو پاکستان کے استحکام کے لئے لازمی قرار دیا اور بلند تر اخلاقی نصب العین کے لئے "ہمایوں" کی جہت تبدیل کر دی' "ہمایوں" نے ابتدائی دور میں صحت زبان کی تحریک کی پیروی کی' وسطی دور میں "ہمایوں" میں تخلیقی اصناف کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ افسانوں میں معاشرتی مسائل کو لطافت احساس سے پیش کیا جاتا تھا اور شاعری میں انسان کے اندر کی آواز کو سننے کی کوشش کی جاتی تھی۔ آزادی سے قبل "ہمایوں" نے اپنا دامن نئے تجربوں کے لئے کشادہ کر دیا اور اس کے صفحات سے نئی تحریکوں کی گونج بھی سنائی دینے لگی' آزادی کے بعد اس نے نئے ملک کے قومی تقاضوں کو فوقیت دی اور شعرا و ادبا کو ایسا ادب تخلیق کرنے کی ترغیب دی جس میں نظریہ تخلیق کی بنت میں شامل ہو۔

ان سب باتوں کو پیش نظر رکھیں تو "ہمایوں" کے صفحات میں ہمیں کم و بیش ۳۵ سال کے احساسات تخلیقی صورت میں اور ان پر اس دور کا رد عمل تنقیدی صورت میں محفوظ نظر آتا ہے اور اس کا انقطاع اشاعت ایک قومی حادثہ محسوس ہوتا ہے۔

"نگار"

بھوپال سے فروری ۱۹۲۲ء میں "نگار" جاری ہوا تو اس کے پس پشت مولانا نیاز فتح پوری کا یہ خیال ایک محرک قوت کے طور پر موجود تھا کہ "امتداد زمانہ کے ساتھ جس طرح انسان کی تہذیب و معاشرہ تغیر پذیر ہوتا جاتا ہے اس طرح اس کے داعیات قلب و دماغ میں بھی انقلاب پیدا ہونا ضروری ہے۔ وہی شخص جو کل صرف قصص و حکایات سے آسودہ ہو جاتا تھا' آج زیادہ کارآمد لٹریچر کا خواہشمند ہو سکتا ہے" (۱۳) انہوں نے مزاج زمانہ کا تجزیہ کیا اور لکھا کہ:

"عہد حاضر کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ اس کا مذاق

زیادہ وزنی ہوتا ہے اور تمام وہ قوتیں جو اب سے قبل سطح پر تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں اب عمق کی طرف مائل ہیں۔" (۱۴)

چنانچہ "نگار" نے ابتدائے اشاعت ہی میں مسائل و افکار کی گہرائی میں اترنے کی طرح ڈالی اور علوم و فنون، ادب، تاریخ اور سیاست کو پیش کرنے کا پرا اعتماد کیا کہ:

"میں "نگار" کو جس کے نام میں ہر چند ادبی پہلو زیادہ روشن ہے خالص ادبی رسالہ نہ بننے دوں گا" اور ادبی مضامین کے لئے گنجائش پیدا کی تو تنقید اور تحقیقی مضامین کو فوقیت دینے کا اعلان کیا، جو افسانوں سے علیحدہ ہیں۔

نیاز فتح پوری رسالہ "نگار" کے اجرا سے پہلے کم و بیش دس سال تک اخبار "زمیندار"، "توحید"، "خطیب" اور "رعیت" میں مختلف حیثیتوں میں قلمی تعاون فراہم کر چکے تھے، ان کا شعری ذوق پختہ ہو چکا تھا، انشائے لطیف اور افسانے میں پوری دسترس حاصل تھی اور سب سے اہم یہ کہ انہیں لطیف اکبر آبادی، ضیا عباس ہاشمی، امام الدین اکبر آبادی اور مخمور اکبر آبادی کا تعاون بھی حاصل تھا، جو خوش ذوقی اور سلاست مزاجی کے لئے ممتاز تھے، خلیقی دہلوی، شاہ دل گیر، مانی جائسی، محمد احمد ہاشمی، عارف ہسوی اور بیدل شاہجہان پوری ان کے احباب تھے اور اس دور میں ہی "یاران نجد" کے نام سے معروف تھے "نگار" ان خوش قسمت رسائل میں سے ہے جسے نہ صرف ایک تجربہ کار اور صاحب نظر ادیب بطور مدیر میسر آگیا بلکہ اسے پختہ فکر اور ایثار صفت ادیبوں کا حلقہ بھی ابتدائے سفر میں ہی مل گیا۔ "نگار" کا پہلا پرچہ بیشتر انہیں ارباب قلم کی تخلیقات سے مزین تھا لیکن اس کا زیادہ حصہ نیاز نے اپنے قلم سے لکھا ہے اور یہ تنقیدی، علمی اور معلوماتی مضامین ۔۔ "شعر۔ عربوں کے نقطہ نظر سے" "کیا مانی واقعی مصور تھا ۔۔" "جرمنی کے حرب و تجارت کا راز" اور "اشتراکیت" کے علاوہ "ہندوستان کا تعلیمی انحطاط"، "حرکت زمینی کا مشاہدہ عینی" "خود نقل کرنے والا آلہ کاتبہ" وغیرہ شذرات پر مشتمل تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پرچے میں لطیف الدین احمد کا افسانہ "سنمستان کی شہزادی" اور نیاز کا افسانہ "نقاش کا راز" بھی شامل ہیں، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ "نگار" کی حکمت علمی و ادبی میں اگرچہ فکری اور معلوماتی موضوعات کو اہمیت حاصل تھی لیکن شعر و نثر کی تخلیقی اصناف سے صرف نظر نہیں کیا گیا اور بعد میں اس کی تخلیقی جہت نے اردو کی رومانی تحریک کو فروغ دینے میں معاونت کی۔

"نگار" منفرد خصوصیات کا ادبی اور علمی جریدہ تھا جس کے مدیر کی اپنی ایک فکری جہت تھی، انہوں نے اپنے پڑھنے والوں کو تفریحی آسودگی فراہم کرنے کے بجائے ان کے ذہنی افق کو بلند کرنے کی کوشش کی اور بعض اوقات مطلوبہ معیار کے مضامین نہ ملتے تو سارا پرچہ نیاز خود لکھ ڈالتے، انہوں

نے " نگار " کے پہلے شمارے سے ہی اس وقیع پرچے میں مدیر کی موجودگی کا احساس دلایا اور چندے بعد انہوں نے اس میں اظہار خیال کے لئے مختلف نوعیتوں کے کالم جاری کر دئے ۔ " ملاحظات " کے تحت حالات حاضرہ پر روشنی ڈالی جاتی اور تبصرہ کیا جاتا تھا ' اس کا غالب موضوع سیاست مدن تھا ' لیکن زندگی کے دوسرے مسائل ' عقل ' وجدان اور مذہب بھی موضوع اظہار بنتے اور نیاز اپنے وسیع مطالعے کی اساس پر جہالت ' تعصب اور تنگ نظری کے اندھیروں کو دور کرنے کی سعی کرتے اور اہم بات یہ کہ "نگار" نے اپنی فکری جہت کو قائم رکھتے ہوئے شاعری ' افسانہ اور انشائے لطیف کی خدمت بھی کی اور جدید شاعری اور افسانہ پر خصوصی اشاعتیں بھی پیش کیں ۔

" نگار " کا ایک اور عنوان " باب الاستفسارات " تھا۔ اس کی نوعیت تعلیمی تھی' اس باب میں قارئین کی تاریخی ادبی اور علمی الجھنوں کو ان کے پیش کردہ سوالات کی روشنی میں حل کیا جاتا تھا ' اس باب کا مقصد بھی روشن خیالی اور عقلیت پسندی کا فروغ تھا ' اور اس کی نوعیت ایک انسائیکلو پیڈیا کی تھی ' نیاز اس باب کے لئے مناسب مواد مختلف حوالوں سے جمع کرتے لیکن جواب لکھتے تو اس پر ان کی ذاتی چھاپ گہری ہوتی تھی ' اور بعض اوقات تو دلچسپ صورت حال بھی پیدا ہو جاتی تھی ' ایک دفعہ ایک خاتون نے عورتوں کی غزل نگاری کے بارے میں پوچھا تو نیاز نے جواب میں لکھا :

" میں یقیناً اس کا مخالف ہوں کہ خواتین ہند غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوں ۔ کیوں کہ انکے عشق حقیقی کو بھی میں نے عشق مجازی میں بہت جلد بدل جاتے دیکھا ہے ۔ اور اس سے دنیا نا آشنا نہیں کہ وہ عورت جو محبت کرنا سیکھ جاتی ہے سوسایٹی کے لئے کچھ مفید نہیں ۔ ... اس وقت ہم کو عشق حقیقی کرنے والی خواتین کی ضرورت نہیں بلکہ ان ماؤں کی ضرورت ہے جو بچوں کی اچھی تربیت کر سکیں " (۱۵)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ " نگار " کے مقاصد میں فکر و نظر کا ارتقا ہی شامل نہیں تھا بلکہ اس نے معاشرتی اصلاح کو بھی پیش نظر رکھا اور اپنی تمام تر آزادہ روی کے باوجود مشرقی اخلاقیات کو بعض معینّات کے ساتھ قبول کیا '

" نگار " کا ایک اور اہم عنوان جو شعری محاسن و معائب کو زیر بحث لاتا تھا "مالہ' وما علیہ" تھا۔ نیاز کا نظریہ بڑا معنی خیز ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں لیکن اگر شاعر اسی نظریہ پر بھروسہ کر کے شعر کہتا رہے تو وہ بگڑ بھی جاتا ہے ۔" دوسری طرف وہ برملا کہتے ہیں کہ " فطری شاعر کا لکھا پڑھا ہونا ضروری نہیں لیکن فطری شاعر لکھا پڑھا بھی ہے تو اسے جاہل فطری شاعر سے یقیناً بہتر ہونا چاہئے۔"(۱۶) وہ کسی شاعر کو خواہ کتنا جلیل القدر فاضل کیوں نہ ہو غلطیوں سے مبرّا قرار نہیں دیتے تھے چنانچہ انہوں نے متعدد ایسے شعرا کی اغلاط کا تذکرہ کیا جو ایک حد تک استادانہ حیثیت اختیار کر چکے

تھے اور مقصد یہ تھا کہ ان کی غلطیاں نو مشق شعرا کے لئے دلیل و سند نہ بن سکیں۔ انہوں نے خصومت اور عناد کو تو دل کے قریب نہیں آنے دیا لیکن انہوں نے بڑے بڑے مشاق شعرا کو جن میں جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، سیماب اکبر آبادی، نخشب جارچوی، ماہر القادری، اثر لکھنوی، اور علی سردار جعفری بھی شامل ہیں، کی بد احتیاطیوں پر متنبہ کیا اور مالہ، وما علیہ میں نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کی۔ "نگار" کے اس کالم نے طغیان بحث بھی پیدا کیا اور اس سے بعض تلخیاں بھی سطح پر ابھر کر آئیں لیکن نگار اور نیاز کا پائے استقلال متزلزل نہ ہوا اور یہ سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ بعد میں کتابی صورت میں بھی پیش کیا گیا۔ اس کتاب میں نیاز کی وہ اصلاحیں بھی محفوظ ہیں جن کا مشورہ انہوں نے بڑے شعرا کو دیا لیکن جو قبول نہیں کی گئیں۔ مثال کے طور پر سیماب کا مصرعہ تھا

"کبھی مدعا سے گریز پا، کبھی مدعا کی تلاش ہے"

اس پر نیاز کو اعتراض تھا کہ لفظ "گریز پا" ناپائیدار کے معنی میں مستعمل ہے۔ انہوں نے مصرعہ یوں تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔

"کبھی مدعا سے گریز ہے، کبھی مدعا کی تلاش ہے"

"مالہ و ماعلیہ" میں نگار نے تاثراتی تنقید کو ذاتی پسند اور ناپسند سے بلند نہیں ہونے دیا اور بعض اوقات نیاز کا لہجہ جارحانہ بھی ہو جاتا تھا۔ جگر کا ایک شعر ہے:

ہم نے سینے سے لگایا، دل نہ اپنا ہو سکا　　　دل کی جانب تم نے دیکھا، دل تمہارا ہو گیا

اس پر مالہ، و ماعلیہ میں لکھا گیا کہ "شعر بالکل طفلانہ ہے اور جگر ایسے کہنہ مشق کے لئے باعث ننگ" (۱۷)

"نگار" کی نمایاں ترین خصوصیت اس کے موضوعاتی خاص نمبر تھے جو سال کی ابتدا میں چھپتے اور سال بھر تک زیر بحث رہتے تھے، ۱۹۲۲ء سے کر ۱۹۶۶ء تک انہوں نے "نگار" کی تاحیات ادارت کی اور اس عرصے میں مومن نمبر (۱۹۲۸ء)، بہادر شاہ ظفر نمبر (۱۹۳۰ء) مصحفی نمبر (۱۹۳۹ء) نظیر اکبر آبادی نمبر (۱۹۴۰ء) ریاض نمبر (۱۹۴۳ء) جدید اردو شاعری نمبر (۱۹۴۴ء) انتقاد نمبر (۱۹۴۶ء) پاکستان نمبر (۱۹۴۸ء) افسانہ نمبر (۱۹۴۹ء) خدا نمبر (۱۹۵۶ء) اور تنقیح اسلام نمبر (۱۹۵۹ء) بہت اہم ہیں، نیاز کو اگر کسی خاص نمبر کے لیے مطلوبہ معیار کے مضامین دستیاب نہ ہوتے تو وہ معیار کو گرنے کی اجازت نہ دیتے اور پورا خاص نمبر خود لکھ ڈالتے، چنانچہ ملاحظات نمبر (۱۹۲۶ء)، ماخذ القران نمبر (۱۹۴۰ء) "ایک مستقبل کی تلاش نمبر" (۱۹۵۱ء)، معلومات نمبر (۱۹۵۸ء)، تنقیح اسلام نمبر (۱۹۵۹ء)، غالب نمبر (۱۹۶۹ء) تمام ان کے اپنے لکھے اور مرتب کئے ہوئے ہیں اور ان خاص نمبروں کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں متعدد شعرا کی تعین قدر نئے زاویوں سے ہوئی۔ ڈاکٹر امیر عارفی کی یہ رائے درست ہے کہ "نظیر،

مصحفی ' ریاض ' داغ ' حسرت کو " نگار " کی بدولت ہی نئے سرے سے جانا پہچانا اور سمجھا گیا۔ (۱۸)
ان نمبروں کو مستقل نوعیت کی تصنیفات کا درجہ حاصل ہے۔ ادبی صحافت میں موضوعات پر خاص خاص اشاعتیں پیش کرنے کی یہ پہلی مثال تھی اور اس اختراع کا سہرا نیاز کے سر ہے۔ " نگار " کا ایک اور اہم کالم " باب الانتقاد " تھا اور اس کے تحت مختلف کتابوں اور رسالوں پر تنقید و تبصرہ کیا جاتا تھا اور یہ تبصرے بالعموم نیاز خود لکھتے تھے۔ یہ رسمی تعارف نہیں ہوتا تھا بلکہ کتاب کی اہمیت کے مطابق اس پر گہری تنقیدی نظر بھی ڈالی جاتی تھی ' اور اس کے داخلی فنی اور موضوعاتی معائب و محاسن کو بھی اجاگر کیا جاتا تھا۔ یہ تبصرے نہ صرف مصنف کو رہنمائی فراہم کرتے بلکہ اکثر اوقات مصنف اور کتاب کی دنیائے ادب میں حیثیت بھی متعین کر دیتے ' لیکن کبھی کبھی نیاز کی رائے کسی ادبی چشمک کا پیش خیمہ بھی بن جاتی ' چنانچہ " نگار " کے صفحات پر متعدد ادبی معرکے پیدا ہوئے اور بہت سی گرد بھی اڑی ' لیکن اس سے " نگار " کا یہ کردار بھی نکھر کر سامنے آگیا کہ وہ حق بات لکھنے کا حوصلہ رکھتے تھے اور ان سے اختلاف تو کیا جا سکتا تھا لیکن ان کی سوچ کی دیانت پر حرف گیری کرنا ممکن نہیں تھا '

" نگار " کی شخصیت میں نیاز کا پورا کردار موجود ہے اسے تنقید و تشنیع ' حتیٰ کہ دشنام تک کا سامنا کرنا پڑا لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ "نگار" میں لکھنا باعث شان اور افتخار تھا ' چنانچہ نیاز و "نگار" کو نئے اور پرانے لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا اور اسے مضامین مانگنے کی شاید کبھی ضرورت نہیں پڑی ' " نگار " کے صفحات جن ادبا کے رشحات قلم سے جگمگا رہے ہیں ان میں حسرت موہانی ' احسن مارہروی ' عزیز لکھنوی ' رشید احمد صدیقی ' شاد عظیم آبادی ' امتیاز علی تاج ' آزاد انصاری ' ملا رموزی ' محی الدین قادری زور ' آل احمد سرور ' احتشام حسین ' ابو الخیر کشفی ' ظفر دہلوی اور متعدد ایسے ادبا و شعرا بھی شامل ہیں جنہوں نے " نگار " میں اشاعت سے اعتماد اظہار حاصل کیا اور اب اردو ادب کے افق کو تابندہ بنا رہے ہیں اور ان ادبا نے ادب کی سب اصناف ' شاعری ' افسانہ ' طنز و مزاح اور انشائے لطیف کو محیط کر رکھا ہے۔

" نگار " ان خوش قسمت رسائل میں سے ہے جسے اپنی زندگی میں ہی لائق وارث مل گیا ' میری مراد ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے ہے جو نیاز کے نیاز مند اور " نگار " کے مقالہ نگار تھے ' اور تعلقات بڑھے تو یہ خون کے رشتوں سے زیادہ پائیدار اور مضبوط ہو گئے۔ آزادی کے کچھ عرصہ بعد نیاز کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب " نگار " کو پاکستان سے بھی چھپنا چاہئے ' جولائی ۱۹۶۲ء میں نیاز پاکستان منتقل ہو گئے تو نگار کا پاکستانی دور شروع ہوا اس کا نام " نگار پاکستان " کر دیا گیا۔ (۱۹) پہلا پرچہ نومبر ۱۹۶۲ء میں چھپا تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی ادارہ نگار میں شامل تھے ' " نگار " حسب معمول صوری لحاظ سے سادہ مگر معنوی لحاظ سے فکر انگیز اور خیال افروز تھا۔ لیکن نیاز صاحب کے قویٰ اب مضمحل ہو چکے

تھے' بیماری جلدی آتی اور دیر سے جاتی اور جب رخصت ہوتی تو اپنے اثرات چھوڑ جاتی ' نیاز صاحب نے اپنی علالت طبع کے باوجود " نگار " کے خاص نمبر چھاپنے کی روایت کو زندہ اور قوی رکھا ' پاکستانی دور میں جو خاص نمبر چھپے ان میں "تذکروں کا تذکرہ نمبر" (۱۹۶۴ء) "جدید شاعری نمبر" (۱۹۶۵ء) "اصناف ادب نمبر" (۱۹۶۶ء) اور دو جلدوں میں " نیاز نمبر " بہت معروف ہیں ان کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا غالب عملی اشتراک موجود ہے ۔

" نگار " کے تیسرے دور کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادارت کا دور شمار کرنا چاہئے اور یہ تا حال جاری ہے اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ فرمان صاحب نے " نگار " کو نیاز کے روحانی سائے سے محروم نہیں ہونے دیا ۔ انہوں نے " نگار " کے صفحات پر ایسے مضامین کو نمایاں طور پر پیش کیا جو اردو ادب کو نئے پانیوں سے سیراب کر سکتے تھے اور جن سے بحث و نظر کا نیا در وا ہو سکتا تھا ' انہوں نے برصغیر سے نئے لکھنے والوں کے ساتھ اساتذہ فن کو بھی " نگار " میں نمایاں جگہ دی اور ادب کی ایک نئی کہکشاں مرتب کی ۔ اس کہکشاں میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ' بلراج کومل ' صدیق الرحمٰن قدوائی ' پروفیسر سہیل اختر ' اقبال منہاس ' زہیر کنجاہی ' ضیا شبنمی ' سجاد باقر رضوی ' وقار احمد رضوی ' غلام حسین اظہر ' شہزاد منظر ' امجد کندیانی ' حسرت کاسگنجوی ' افتخار اجمل شاہین ' ریاض صدیقی ' سعادت نظیر چند ایسے نام ہیں جو اردو ادب میں اب ممتاز اور معروف شمار ہوتے ہیں ۔ فرمان فتح پوری کی ادارت میں "نگار" کے جو خاص نمبر شائع ہوئے ان میں "مسائل ادب نمبر" (۱۹۶۸ء) "اصناف شاعری نمبر" (۱۹۶۷ء) "غالب نمبر" (۱۹۶۹ء) "میر انیس نمبر"۔۔ بہت معروف ہیں۔ اس دور میں وزیری پانی پتی جیسے ایثار پیشہ ادیب ان کے معاون تھے۔

فرمان فتح پوری " نگار " کے سابقہ معیار کو ہر صورت میں قائم رکھنا چاہتے تھے لیکن اب انہیں مطلوبہ معیار کے تنقیدی مضامین اس مقدار میں نہیں ملتے تھے کہ " نگار " کی معینہ ضخامت کو پورا کر سکتے ۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۸ء میں ہی یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ :

" نگار " کی موجودہ یا آئندہ زندگی کا تعلق جتنا نگار کے قارئین اور قلمی معاونین سے ہے اتنا مجھ سے نہیں "

لیکن ان کی شاخ نہال آرزو پوری طرح ثمریاب نہ ہو سکی چنانچہ فرمان صاحب نے پہلے "نگار" کو ڈیمائی سائز میں اور مختصر ضخامت میں پیش کیا اور اب "نگار" کی ہر اشاعت میں مخصوص موضوعات پر سابقہ ادوار کے مضامین اور نایاب کتابیں پیش کر رہے ہیں' دوسری طرف ان کی ایک بڑی خدمت یہ بھی ہے کہ انہوں نے نیاز اور "نگار" دونوں کی یاد کو زندہ رکھا ہے وہ ہر سال دسمبر میں کراچی میں ایک سیمینار منعقد کرتے ہیں جس میں نیاز اور "نگار" کے فکر و نظر' حریت پسندی اور تجدد

کو نئے علوم اور افکار کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ (۲۰)

اردو کی ادبی صحافت اور جریدہ نگاری پر " نگار " کے اثرات انمٹ ہیں ' اس پرچے نے تجدد کا آفتاب روشن کیا ' اور فکر و نظر کی کرنوں کو دور دور تک پھیلانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں ' " نگار " ابتدا میں رومانی تحریک کا معاون اور محرک تھا ' ترقی پسند تحریک آئی تو اس نے اشتراکی نقطۂ نظر کی توضیح و تشریح میں بھی سرگرم حصہ لیا لیکن ایسی تخلیقات کو قبول نہیں کیا جو ادب کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں۔ " نگار " نے تنقید کو برداشت کرنے کے لئے حوصلہ بھی پیدا کیا ' اس نے طغیان فکر کو بیدار کیا اور اٹھتے ہوئے طوفانوں کو استدلال توازن سے مائل بہ سکون بھی کیا " نگار " کا ظاہر سادہ لیکن باطن روشن تھا چنانچہ اسے ایک ایسا عہد ساز جریدہ شمار کیا گیا جس نے لکھنے والوں کے ہر طبقہ کو ہر دور میں متاثر کیا۔ اس پرچے کی کرنیں اب بھی مطلع ادب کو روشن کر رہی ہیں۔

"عالمگیر"

ماہ نامہ " عالمگیر " لاہور سے حافظ محمد عالم کی ادارت میں جون ۱۹۲۴ء میں منصۂ شہود پر آیا تھا۔ ابتدائی دور میں ظفر ہاشمی ۔ " عالمگیر " کے نائب مدیر تھے ' تاہم عالمگیر کی ادارت میں میرزا ادیب کے مشورے بھی شامل نظر آتے ہیں ' (۲۱) وہ " گرد و پیش " کے عنوان سے ادب کی مجموعی صورت حال پر کالم لکھا کرتے تھے اور یہ شاید میرزا ادیب کی ابتدائی تنقیدی تحریریں ہیں ' " عالمگیر " کو ابتدا میں ہی قبول عام حاصل ہو گیا تھا ' اس کے خاص نمبروں کو جو جہازی سائز میں شائع ہوتے تھے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا ' " عالمگیر " کی ایک منفرد خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جو تصویریں شائع کی جاتی تھیں ان کے ساتھ منظوم تاثر بھی چھپتا تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۵ء کے خاص نمبر میں مصوّر عبدالعزیز کی تصویر پر حکیم نیر واسطی نے نظم لکھی تھی ' ایک اور تصویر جس کا عنوان " محبت کی بازی " ہے اختر شیرانی کے تخلیقی عمل کو متحرک کر گئی " عالمگیر " کو خاص نمبروں کا پرچہ شمار کیا جاتا تھا۔

" عالمگیر " اساتذہ کا کلام ' تزک و احتشام اور عزت و احترام سے شائع کرتا تھا ' ان کے نام کے ساتھ تعظیمی القابات بالا التزام چھپا کرتے تھے ' اور ان کی غزل کو پورے صفحے پر جلی قلم سے پیش کیا جاتا تھا ' جلیل مانک پوری ' ریاض خیر آبادی ' سیماب اکبر آبادی ' مولانا محمود اسرائیلی ' طالب باغپتی ' ماسٹر باسط بسوانی ' نوح ناروی ' آرزو لکھنوی ' درد کاکوروی ' اس دور کے چند ایسے شعرا ہیں جو بڑے التزام سے " عالمگیر " کو اپنا کلام بلاغت نظام بھیجتے تھے۔ " عالمگیر " میں افسانوں اور تنقیدی مضامین کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن اس پرچے کو ادب کے معمول کی حیثیت حاصل رہی

ہے اگرچہ اس کا رد عمل کمزور تھا تاہم ایک دفعہ اس کی معرکہ آرائی رسالہ " الکمال " سے ہو گئی تو " عالمگیر " نے بھی یہ مجادلہ گرم جوشی سے لڑا۔ (۲۲)

" عالمگیر " کی ادبی جدت سازی میں عبدالرحیم شبلی بی کام کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کے عہد ادارت میں " عالمگیر " نے نئے لکھنے والوں کو بڑے پیمانے پر متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا' اور تنقیدی مضامین میں تجزیہ و تحلیل کے زاویوں کو اجاگر کیا۔ شبلی نے " عالمگیر " کو "ادب برائے زندگی" کا ترجمان بنانے کی سعی کی' اور ترقی پسند فکر کو "عالمگیر" کے صفحات پر ابھرنے کا موقع دیا' سید احتشام حسین کا مقالہ " ترقی پسند ادب " مسیح الزمان جائسی کا " نئی شاعری کا آغاز " ' " دور حاضر کی عمرانی لہریں " از مرزا محمد حسین اس سلسلے میں بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں' شبلی بی کام " عالمگیر " میں " حقائق و معارف " کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے تھے اور " رفتار زمانہ " کے تحت حالات حاضرہ کا تذکرہ ہوتا تھا' " عالمگیر " کے صفحات پر شبلی بی کام نے نئے افسانہ نگاروں کو متعارف ہونے کا نادر موقعہ بھی فراہم کیا اور ان کے ابتدائی افسانے پیش کر کے انہیں اعتماد عطا کیا۔ اس قسم کے افسانہ نگاروں میں ظہور الحسن ڈار' طفیل ملک' ڈاکٹر نصیر الدین' اختر ملیح آبادی' شوکت صدیقی' قرۃ العین حیدر' عبدالقدیر رشک' منیر انجم' ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے نام اہم ہیں۔ احسان بی اے کا ناول " در یتیم " عالمگیر نے قسط وار پیش کیا اور " چچا چھکن " کے مقبول سلسلے کو بادشاہ حسین سے لکھوایا۔ " عالمگیر " کی مقبولیت میں ان اداروں کے اشتہارات کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی جو اپنا کاروبار ڈاک کے ذریعے چلاتے تھے' آزادی کے بعد ان اداروں کے خریدار ہندوستان میں رہ گئے' " عالمگیر " نے ادب کے نئے تقاضوں کو سمجھنے میں تعجیل کا مظاہرہ نہیں کیا' حافظ محمد عالم کی صحت گرنے لگی تھی' شبلی بی کام کا تعاون بھی انہیں حاصل نہ رہ سکا چنانچہ " عالمگیر " زوال آمادہ ہو گیا۔ اس کے آخری دور کے مدیر نجمی نگینوی تھے' جو پرچے کو غیر معمولی نہ بنا سکے اور جب " عالمگیر " کا جوبلی نمبر چھاپنے کا منصوبہ بنا تو اس کے لئے مولانا عبدالمجید سالک کی خدمات سے استفادہ کیا گیا۔ " عالمگیر " کا آخری قابل ذکر کارنامہ جوبلی نمبر ہے۔ جس میں ڈاکٹر تاثیر' ڈاکٹر سید عبداللہ' امتیاز' علی تاج' یوسف سلیم چشتی' خلیفہ عبدالحکیم' غلام رسول مہر' سری نواس لاہوتی۔ جوش' حفیظ' جگر' عابد' عبدالعزیز فطرت' میرزا ادیب' شوکت تھانوی' کنہیا لعل کپور' خدیجہ مستور' آثم مرزا اور ابوالفضل صدیقی جیسے ادبا و شعرا نے شرکت کی' اس نمبر میں " چند گزارشیں " کے تحت عبدالمجید سالک نے بھی ایک خیال انگیز مقالہ پیش کیا جس میں انہوں نے اپنے ادبی نظریات کا برملا اظہار کیا۔

ماہ نامہ " عالمگیر " اس دور کی یادگار ہے جب ادبی رسالے کا مطالعہ گہری دلچسپی سے کیا جاتا تھا' آزادی کے بعد یہ ذوق زوال آمادہ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی " عالمگیر " کی اشاعت بھی منقطع ہو

گئی ۔ " عالمگیر " نے تاریخی ناول نگاری کا ذوق پروان چڑھانے کی کوشش کی ' اسلامی تاریخ پر متعدد مضامین کی اشاعت اس کا امتیاز خاص ہے ۔

"نیرنگ خیال"

ماہ نامہ " نیرنگ خیال " کو ادبی رسائل میں ایک مجتہد کی حیثیت حاصل ہے ۔ جولائی ۱۹۲۴ء میں نیرنگ خیال کا پہلا پرچہ شائع ہوا تو اس کا مقصد " قوم کے احاطہ نظر کو وسعت دینا " اور مہذب دنیا کے ہر شعبہ خیال کو ادبی لباس میں پیش کرنا تھا ۔ (۲۳) لیکن اس سے حکیم یوسف حسن ' ڈاکٹر تاثیر اور عبدالرحمٰن چغتائی کا جو اتحاد سہ گانہ وجود میں آیا اس نے " نیرنگ خیال " کو معنوی اور صوری لحاظ سے خوبصورت اور انتظامی اعتبار سے مضبوط اساس فراہم کی ۔ " نیرنگ خیال " نے ابتدائی اشاعتوں ہی میں نیاز فتح پوری ' حفیظ جالندھری ' علم الدین سالک ' امتیاز علی تاج ' علامہ اقبال ' حشر کاشمیری ' اقبال احمد سہیل ' مرزا فہیم بیگ ' حامد اللہ افسر ' پنڈت مالک رام ' اور فانی بدایونی جیسے ادبا اور شعرا سے تخلیقات حاصل کیں ۔ اس کا سرورق جاذب نظر بنوایا اور پرچے کو چغتائی کی تصویروں سے مزین کیا ۔ چنانچہ " نیرنگ خیال " کی شہرت چار دانگ ہند میں پھیل گئی ۔ علامہ اقبال نے پہلے پرچے کے بارے میں لکھا:

" اس کے مضامین میں پختگی اور متانت پائی جاتی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ پنجاب میں صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے میں مفید ثابت ہو گا ' جناب عبدالرحمٰن چغتائی کی " تحفئی لیلیٰ " بہت خوب ہے ' دیکھ کر مسرت ہوئی ' دیکھئے اب " تحفئی قیس " کب نکلتا ہے "

" نیرنگ خیال " کی دوسری اہم اختراع اس کے خاص نمبر تھے جو بڑے اہتمام سے شائع کئے جاتے تھے ۔ سال بھر کے بعد جو خاص نمبر شائع ہوتا اس کے لئے " سالنامہ " کی اصطلاح بھی حکیم یوسف حسن کی وضع کردہ تھی ۔ (۲۴) " نیرنگ خیال " نے ایک مخصوص نظریاتی نوعیت کے مضامین لکھنے والوں کا حلقہ پیدا کیا ' ان میں سالک ' امتیاز علی تاج ' پطرس بخاری ' ڈاکٹر تاثیر ' ہری چند اختر بہت معروف تھے اور یہی لوگ بعد میں نیاز مندان لاہور کے نام سے معروف ہوئے اور ادبی معرکوں اور مجادلوں میں کارہائے نمایاں دکھاتے اور لوگوں کو تفنن طبع کا سامان فراہم کرتے رہے ' حکیم یوسف حسن سالنامے کے لئے بڑی کاوش سے مضامین لکھواتے اور ہر سال کوئی نہ کوئی مضمون ایسا ہوتا کہ "نیرنگ خیال" موضوع بحث بن جاتا ۔ "نیرنگ خیال" نے ادبا کو ادبی خطابات عطا کرنے کا طریق بھی رائج کیا تھا ۔ " نیرنگ خیال " کے معرکے کے مضامین میں شوکت تھانوی کا " سودیشی ریل " قاضی

عبدالغفار کا سلسلہ " لیلیٰ کے خطوط " عظیم بیگ چغتائی کا ظریفانہ افسانہ " انگوٹھی کی مصیبت " ڈاکٹر تاثیر کا ترجمہ " سلومی " بہت مشہور ہیں ' خاص نمبروں کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی نے لکھا ہے :

" عام روش سے بچنے کے لئے حکیم صاحب نے خاص نمبروں کا سائز بڑھانا شروع کر دیا یہاں تک کہ ان کا ایک خاص نمبر گز بھر لمبا نکلا " (۲۵) سالناموں کے علاوہ " نیرنگ خیال " کی ایک اور جدت یک موضوعی نمبر بھی تھے ' اس سلسلے میں حکیم یوسف حسن نے " مصر نمبر " ' " افغانستان نمبر " ' " ایڈیٹر نمبر " ' " رام نمبر " ' " فلم نمبر " ' " خواتین نمبر " ' " مشرق نمبر " ' اور " افسانہ نمبر " وغیرہ متنوع موضوعات پر مستقل نوعیت کی اشاعتیں پیش کیں ۔ ان سب میں اہم ترین " اقبال نمبر " ہے جو ۱۹۳۲ء میں اقبال کی زندگی میں شائع ہوا اور اب تاریخی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس نمبر کی اشاعت کے پس پشت حکیم صاحب کا یہ خیال جاگزیں تھا :

" ہندوستان میں اقبال کو جاننے والوں کی تعداد کروڑوں سے تجاوز ہو گی لیکن اقبال کو سمجھنے والوں کی تعداد ہزاروں سے زیادہ نہ ہو گی اور یہ حال دنیا کے ہر بڑے شاعر کا ہوتا ہے ۔ لیکن اقبال نمبر کی اشاعت کے بعد توقع ہے کہ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ جو ان مضامین کو غور و فکر سے پڑھے گا ' اقبال کے پیغام کو سمجھنے لگے گا " (۲۶)

" نیرنگ خیال " کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور بقول مدیر نقوش " یہی وہ چراغ تھا جس سے بعد میں بہت سے چراغ جلے " اور فکر و فن اقبال کے متعدد گوشوں کو روشنی ملی ' حکیم محمد یوسف کے نزدیک " اقبال کے متعلق کچھ لکھنا اور اسے شائع کرنا ایک ملی خدمت " تھی ۔ انہوں نے اس خدمت کو خلوص اور محنت سے عمر بھر جاری رکھا اور اپنی اقبال دوستی کی روایت کو زندہ رکھا ۔ چنانچہ مطالعات اقبال میں جو نام نمایاں نظر آئے ہیں ان میں سر تیج بہادر سپرو ' عبدالرحمن بجنوری ' مولانا محمد اسلم جے راج پوری ' ڈاکٹر نکلسن ' نذیر نیازی ' ممتاز حسن ' خلیفہ عبدالحکیم ' مولوی عبدالحق یوسف حسین خان ' الیگزنڈر بوسانی ' محمد سرور جامعی ' نجیب اشرف ندوی اور سہا مجددی شامل ہیں ۔

یہاں " نیرنگ خیال " کا " ایڈیٹر نمبر " بھی خصوصی تذکرے کا مستحق ہے ۔ ڈاکٹر تاثیر نے لکھا ہے کہ " ادبی رسالے کے ایڈیٹر کے لئے ادیب ہونا لازمی نہیں ' کئی ایسے رسالے موجود ہیں جن کے ایڈیٹر خود ایک سطر بھی نہیں لکھتے نہ لکھ سکتے ہیں ۔ لیکن میں اسے کوئی عیب تصور نہیں کرتا ۔ ایڈیٹر کا کام ہے اچھے برے کی پرکھ اور صحیح ذوق ادب رکھنا " (۲۷) لیکن حکیم یوسف حسن ایک ایسے ایڈیٹر تھے جو تخلیق و تنقید دونوں پر قدرت رکھتے تھے ' انہیں اچھے برے کی تمیز تھی اور ان کا ذوق ادب شائستہ تھا چنانچہ ان کے تخلیقی ' جمالیاتی اور تنقیدی زاویوں کو " ایڈیٹر نمبر " میں پیش کیا گیا ' ان خاص

شماروں کے سب مضامین حکیم یوسف حسن نے اپنے قلم سے لکھے اور ادبی دنیا میں اپنی صلاحیتوں کی دھاک بٹھا دی '" نیرنگ " خیال نے اس قسم کے تین خاص نمبر وقفوں وقفوں سے پیش کئے ۔ ڈاکٹر تاثیر نے انہیں داد دی کہ :

" حکیم صاحب کہنہ مشق لکھنے والے ہیں ' ہر صنف میں پورا دخل رکھتے ہیں ' سیاسیات ' ظرافت ' افسانہ ' ڈرامہ ' تنقید غرض ۔۔۔ " ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا " ۔۔ کے پورے پورے مصداق ہیں ۔ " (۲۸)

" نیرنگ خیال " اپنے عہد کا ایک بے حد فعال پرچہ تھا ۔ اس کے صفحہ اوّل پر یہ اعلان چھپتا تھا کہ " ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا " ۔۔ اس سے بعض معاصرین کو ٹھیس لگی تو اس اعلامیے کو ترک کر دیا گیا ۔ تاہم ادبی معاشرے کو متحرک رکھنے اور ادبی ہنگاموں میں پیش پیش رہنے میں " نیرنگ خیال " نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ اس قسم کے ادبی معرکوں میں نیاز مندان لاہور اور بالخصوص ڈاکٹر تاثیر پیش پیش رہتے تھے ۔ ان کے مضامین میں سے " شارحین غالب " (جولائی ستمبر ۱۹۲۶ء) " حضرت اصغر گونڈوی اور ادب آموز " (ستمبر ۱۹۲۶ء) " داستان اردو کا ایک باب " (ستمبر ۱۹۳۳ء) " جوش کی شاعری اور نیاز کی لغزشیں " (اکتوبر ۱۹۳۳ء) کا حوالہ محض مشتے نمونہ از خروارے ہے ' ۱۹۲۶ء میں ایک ادبی معرکہ " نیرنگ خیال " اور ساغر نظامی کے ماہ نامہ " پیمانہ " کے درمیان بھی ظہور میں آیا اور وجہ یہ تھی کہ " پیمانہ " نے اختر شیرانی کے رسالہ " انتخاب " کے بارے میں تبصرے میں لکھ دیا تھا کہ " جتنا روپیہ " انتخاب " کی ترتیب و توسیع میں صرف ہو رہا ہے اگر انجمن حمایت اسلام میں دے دیا ہوتا تو بڑا ثواب ہوتا " (۲۹)

" نیرنگ خیال " ہندوستان کا کثیر الاشاعت رسالہ تھا ' اس کے ہزاروں خریدار پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے جو " نیرنگ خیال " ڈاک سے منگواتے تھے اور اس کے مضامین سے متاثر ہوتے تھے '" نیرنگ خیال " کی یہ مقبولیت ۱۹۴۷ء تک قائم رہی ۔

" نیرنگ خیال " آزادی کے بعد

آزادی کے بعد " نیرنگ خیال " کے خریداروں کی بہت بڑی تعداد ہندوستان میں رہ گئی ' ۱۹۴۷ء کے اوائل میں " نیرنگ خیال " نے " دنیائے اسلام نمبر " شائع کیا تھا ' لیکن یہ تقسیم نہ ہو سکا اس کے وی پی اور اور منی آرڈر سرحد سے پار نہ جا سکے ' نتیجہ یہ نکلا کہ " نیرنگ خیال " کو ناقابل برداشت مالی نقصان اٹھانا پڑا ۔ حکیم یوسف حسن نے اس خسارے کو طبابت کی آمدنی سے پورا کرنے کی

کوشش کی۔ لیکن اب "نیرنگ خیال" کا دور عروج ختم ہو چکا تھا، نئے رسائل معرض وجود میں آ چکے تھے، اور جدت کے نئے قرینوں کو آزما رہے تھے، "نیرنگ خیال" کو اب تاثیر جیسے فعال ادیب کا تعاون حاصل نہیں تھا، "نیرنگ خیال" کی ادبی حکمت عملی نئے دور کے ادبی تقاضوں سے پیچھے رہ گئی تھی، چنانچہ بقول شاہد احمد دہلوی "نیرنگ خیال کا پہلا دور جتنا درخشاں تھا دوسرا دور اتنا ہی ضعیف اور مردہ تھا" حکیم یوسف حسن اسے ایک دفعہ راولپنڈی لے گئے، (۳۰) انہیں محسن شمسی کا تعاون حاصل ہوا تو واپس لاہور آ گئے لیکن تھوڑے سے عرصے کے بعد پھر راولپنڈی منتقل ہو گئے۔ نومبر ۱۹۷۶ء میں انہوں نے ڈیکلریشن سلطان رشک کے نام منتقل کر دیا۔ راولپنڈی کے ادبا میں سے محمود اختر کیانی، غلام رسول طارق، وحید نسیم اور افضل منہاس نے انکے ساتھ بھرپور تعاون کیا لیکن یہ تجربہ کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء میں "نیرنگ خیال" کا دوسرا دور جو ضعیفی اور ناتوانی کا دور تھا ختم ہو گیا۔ پانچ سال کے بعد ۳۱ جنوری ۱۹۸۱ء حکیم یوسف حسن دنیا سے رخصت ہو گئے گویا "خاموش ہو گیا یہ چمن بولتا ہوا"

"نیرنگ خیال" کا تیسرا دور سلطان رشک کی ادارت میں شروع ہوا اور یہ تا حال جاری ہے۔ حکیم یوسف حسن نے دوسرے دور کے اواخر میں جو ادارتی اور انتظامی تجربات کئے تھے ان میں سے یہ آخری تجربہ کامیاب ثابت ہوا۔ حکیم صاحب نے اس کا اجمال یوں پیش کیا ہے۔

"ایک دن سلطان رشک اور پروفیسر محمد صدیق چیمہ ایک نئی سکیم کے ساتھ میرے پاس آئے، اس سلسلے میں قریبا ایک ماہ تک تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ دونوں پارٹیاں اس پروگرام کے حسن و قبح پر غور کرتی رہیں، اس سکیم سے مجھے تو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ لیکن "نیرنگ خیال" کو پورا فائدہ پہنچنے کی توقع تھی۔۔ چنانچہ باہمی اتحاد عمل سے "نیرنگ خیال" کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کی جو سکیم بنائی گئی اس کی پہلی کوشش سالنامہ ۱۹۶۷ء ہے۔" (۳۱)

۱۹۶۷ء میں جو تبدیلی معرض عمل میں لائی گئی تھی اس کے مطابق حکیم یوسف حسن "نیرنگ خیال" کے مدیر اعلیٰ اور سلطان رشک مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء کے سالنامہ پر محمد صدیق کا نام مدیر اعزازی کے طور پر درج ہے۔

سلطان رشک نے بوڑھے "نیرنگ خیال" کو تازہ خون دیا وہ مستعد اور فعال انسان ہیں۔ انہوں نے "نیرنگ خیال" کے لئے ہمدردوں کا ایک مؤثر طبقہ پیدا کیا، مضبوط تعلق عامہ کی فضا استوار کی اور اسے مالی طور پر استحکام عطا کیا۔ سلطان رشک نے ادبی زاویے سے بھی "نیرنگ خیال" کی تابندہ روایت کی تجدید کی، ماہ نامے کی اشاعت کو باقاعدہ بنایا اور خاص نمبروں اور سالناموں کی روایت کو دوبارہ قائم کر دیا۔ سلطان رشک کا مرتب کیا ہوا ۱۹۶۷ء کا پہلا سالنامہ اس دور کے نامور

لکھنے والوں کی نمائندہ تحریروں کا مرقع ہے ' مقالہ نگاروں کی فہرست میں میاں بشیر احمد ' عبدالرحمٰن چغتائی ' وزیر آغا ' صفی حیدر دانش ' سجاد باقر رضوی 'گوپی چند نارنگ 'کسریٰ منہاس اور مالک رام جیسے ممتاز ادبا موجود ہیں ' ڈراما ' افسانہ ' شاعری اور طنز و مزاح کے ابواب الگ الگ قائم کئے گئے ہیں ۔ شذرات میں اساتذہ فن کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کی نمائندگی اور اشاعت کا عزم بھی کیا گیا ہے ۔ (۳۲) " نیرنگ خیال " کے خاص نمبر شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے اور سالنامہ ۱۹۶۷ء میں " تاثیر نمبر " اور " نیرنگ خیال " کے نایاب " اقبال نمبر " کی دوبارہ اشاعت کی نوید دی گئی ہے ۔

" نیرنگ خیال " نے ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۸ء تک اس معمول کو حتی الوسع قائم رکھا اور ایک ضخیم " غزل نمبر " دو جلدوں میں ' "گولڈن جوبلی نمبر " ' " چینی افسانہ نمبر " ' " خصوصی پانچ سوواں نمبر " کے علاوہ متعدد خاص نمبر ' " اردو کانفرنس نمبر " اور سالنامے پیش کئے ۔ حکیم یوسف حسن نے تشفی کا اظہار کیا اور لکھا :

" سلطان رشک نے اس عرصہ میں " نیرنگ خیال " کی ساکھ اور شہرت کو برقرار رکھنے کی قابل قدر کوشش کی .. ان کے ساتھ چند سالوں کی خوشگوار معاونت ہمارے لئے مسرت و اطمینان کا باعث ہے ۔ " (۳۳)

" نیرنگ خیال " کی تاریخ اردو کے ادبی رسائل کی مثالی تاریخ ہے ۔ اس پرچے کے نادر مضامین ' خوبصورت تصاویر اور پیشکش کے عمدہ انداز نے قبول عام حاصل کیا ' نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے گرد اعلیٰ پائے کے ادیبوں اور خوش ذوق قارئین کا حلقہ پیدا ہو گیا ۔ " نیرنگ خیال " میں لکھنا ایک اعزاز تھا اور اسے پڑھنا اس دور کا فیشن تھا ۔ " نیرنگ خیال " نے عمل اور رد عمل سے بھی قاری کو متاثر کیا ' یہ نئے لکھنے والوں کا گہوارا تھا اور اسے بڑے ادیبوں کی سرپرستی حاصل تھی ' "نیرنگ خیال" کے مدیر حکیم یوسف حسن کا مزاج کلاسیکی تھا لیکن وہ نئی تحریکوں کے ساتھ چلنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے نیاز مندان لاہور نے اس پرچے کی فعالیت اور تخلیقیت کے علاوہ اسے مؤثر اور محرک قوت بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ' آزادی کے بعد " نیرنگ خیال " کو یہ سب سہولتیں میسر نہ آ سکیں ' پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہو گیا ' اور ان کا مزاج تبدیل ہو گیا جس سے " نیرنگ خیال " کا مزاج بھی متاثر ہوا اور کچھ عرصے تک تو یہ تاریخی پرچہ محض ضابطے کی کارروائی پورا کرنے کے لئے ہی شائع کیا جاتا رہا ' سلطان رشک نے نیرنگ خیال کو عزم نو سے چلانے کی کوشش کی لیکن اسے غیر معمولی بنانے کے لئے ان جہانوں تک رسائی ضروری ہے جو ستاروں سے آگے ہیں ۔

"اورینٹل کالج میگزین" ۔ لاہور

علوم مشرقیہ کی تحقیق کا نامور جریدہ "اورینٹل کالج میگزین" فروری ۱۹۲۵ء میں لاہور سے جاری ہوا ۔ (۳۴) پروفیسر محمد شفیع اس کے مدیر اول تھے ۔ اغراض و مقصد کے تحت لکھا گیا کہ اس پرچے کا مقصد طلباء میں شوق تحقیق پیدا کرنے کے علاوہ علوم مشرقیہ کی تحریک اور تقویت بھی ہے ۔ چنانچہ ایسے مضامین کو فوقیت دینے کا اعلان کیا گیا جن میں مضمون نگاروں نے اپنی ذاتی تحقیق سے نتائج اخذ کئے ہوں ۔ (۳۵) اس ضمن میں مفید قلمی رسائل کی اشاعت میں بھی دلچسپی کا اظہار کیا گیا اور جریدے کے اس مزاج کو زمانہ حال تک قائم رکھنے میں کامیابی حاصل کی گئی ہے ۔

اوائل میں "اورینٹل کالج میگزین" چار ماہی رسالہ تھا اور سال میں تین مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ ابتدائی زمانے میں اس کے دو حصے تھے ۔ ایک حصے میں عربی ، فارسی ، اردو، پنجابی کے تحقیقی مضامین اردو حروف میں پیش کئے جاتے اور دوسرے حصے میں سنسکرت ، ہندی اور پنجابی کے مضامین گور مکھی حروف میں شائع ہوتے ۔ ہندی اور پنجابی کے دو حصوں کے لئے ڈاکٹر لکشمن سروپ ، اور بھائی بے انت سنگھ خدمات ادارت سرانجام دیتے تھے ۔ اردو عربی اور فارسی حصے کی ادارت مولوی محمد شفیع صاحب کے سپرد تھی ، انہوں نے یہ خدمات فروری ۱۹۴۳ء تک حسن و خوبی سے ادا کیں ۔ مولوی محمد اقبال کا عہد ادارت ۱۹۴۳ء سے فروری ۱۹۴۸ء تک کے عرصے پر محیط ہے ۔ اس کے بعد برکت علی قریشی مدیر مقرر ہوئے ۔ شمارہ مئی ۱۹۵۰ء کی تدوین ایم عباس شوستری صاحب نے کی ۔ لیکن شمارہ اگست ۱۹۵۰ء سے ڈاکٹر سید عبداللہ جو اورینٹل کالج کے نئے پرنسپل تھے یہ خدمات سرانجام دینے لگے ، ان کے عہد میں یہ روایت مستحکم ہو گئی کہ اورینٹل کالج کا پرنسپل ہی میگزین کا مدیر بھی ہوتا تھا ۔ اس حیثیت میں بعد میں ڈاکٹر محمد باقر ، ڈاکٹر عبادت بریلوی ، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر سید محمد اکرم نے یہ خدمات سرانجام دیں ، لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ اس کے تحقیقی مزاج میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی ، "اورینٹل کالج میگزین" ایک سال میں تین معینہ اشاعتوں کا سلسلہ تو برقرار نہ رکھ سکا ۔ تاہم اسے ایک خاموش خدمت گزار ادب کی حیثیت اب بھی حاصل ہے اور یہ ان نوادرات ادب کو منظر پر لانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے جو ماضی کی گود میں کہیں مستور پڑے ہیں "اورینٹل کالج میگزین" نے انہیں حیات تازہ دی ۔

۱۸۷۰ء میں اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی گئی تو اس ادارے کے ساتھ مولانا فیض الحسن سہارن پوری ، مولانا عبدالحکیم کلانوری ، قاضی ظفر الدین ، مولانا محمد حسین آزاد ، ڈاکٹر آرنلڈ ۔ مولوی محمد شفیع ، مولوی عبداللہ ٹونکی ، اولاداں حسین شاداں بلگرامی اور حافظ محمود شیرانی وقتاً" فوقتاً" منسلک ہوتے

چلے گئے ، یہ اصحاب ادب ، تاریخ اور لسانیات کے ماہر تھے ، انہیں عتیقیات علم و ادب کے ساتھ گہری دلچسپی تھی ۔ چنانچہ اس کالج نے ابتدا ہی میں لسانی مسائل اور تاریخی حقائق کو بنیادی حیثیت دی۔

۱۹۲۵ء میں "اورینٹل کالج میگزین" جاری ہوا تو ان کے ثمرات تحقیق کو منظر عام پر لانے میں بڑی مدد ملی ۔ اس رسالے نے الجھے ہوئے مباحث کو حل کرنے میں دلچسپی لی اور بعض نئے مباحث پیدا بھی کیے ۔ ڈاکٹر محمد باقر نے لکھا ہے کہ :

" اس کالج کے استادوں نے تحقیق کے علاوہ ادب میں بھی اہم کارنامے سرانجام دیئے ۔ اس اعتبار سے تحقیق اور تنقید کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا اہم فرض بھی میرے رفقاء نے ہی سر انجام دیا ۔ "

اورینٹل کالج کی تحقیق میں صداقت تک استقلال سے پہنچنے کا رجحان نمایاں ہے ۔ داخلی شہادت کو خارجی شہادت کے ساتھ منطبق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور فوری فیصلے سے گریز کیا جاتا ہے ۔ اس کے ابتدائی پرچوں میں پروفیسر محمد اقبال کا مقالہ " شاہ نامہ اسلام کے ماخذ " حافظ محمود شیرانی کا " رابعہ بن کعب " پروفیسر عبدالعزیز میمن کا مقالہ " ابوالعلا اور ابوالمنصور خازن "پ محمد نورالحق علوی کا " دائرۃ الوجود " مولوی محمد شفیع کا " فارسی تذکرے " ، عبدالرحمٰن دہلوی کا " محمد شاہ بن تغلق " حافظ محمود شیرانی کا " منیر لاہوری " چند اعلیٰ پائے کے تحقیقی مقالے ہیں ۔

مارچ ۱۹۷۲ء میں کالج کے جشن صد سالہ تاسیس کے موقع پر ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ایک خصوصی شمارہ مرتب کیا اور اورینٹل کالج کی تحقیق کی قدیم روایت کا رشتہ زمانہ جدید کے ساتھ قائم کر دیا ۔ اس پرچے میں جو خصوصی مضامین شامل ہوئے ان میں محمد حمید اللہ کا " زبان اور اللہ کا کلام " ڈاکٹر محمد وحید مرزا کا " برصغیر پاک وہند میں علوم مشرقیہ کی بقا اور انگریز " ڈاکٹر سید محمد اکرم کا " فکر غالب میں ارتقائی رجحان " ڈاکٹر جمیل جالبی کا " ولی کا سال وفات " تبسم کاشمیری کا " مصحفی کی شخصیت " افتخار احمد صدیقی کا " اقبال اور نذیر احمد کے فکری روابط " سید معین الرحمٰن کا " قطعہ غالب " اور امین اللہ وثیر کا " ملا محمد باقر لاہوری " بے حد اہم مقالات ہیں ۔ (۳۶)

۱۹۸۲ء میں جامعہ پنجاب کا جشن صد سالہ منعقد ہوا تو " اورینٹل کالج میگزین " کا ایک شمارہ خاص ڈاکٹر وحید قریشی نے مرتب کیا ۔ یہ خاص نمبر پانچ حصوں میں منقسم ہے ۔ ایک حصہ تحقیقی مباحث کے لیے دوسرا اساتذہ کے تحقیقی مقالات کے لئے ، ایک پنجاب یونیورسٹی کی تاریخ تحقیق کے لئے وقف کیا گیا ۔ چوتھے میں طلبائے قدیم کے نوادرات پیش کئے گئے ، اقبالیات کے لئے ایک حصہ الگ وقف کیا گیا ہے ۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس خاص نمبر کو بالکل جدید خطوط پر مرتب کیا ہے اور کالج کی تحقیق کی روایت کو بھی قائم رکھا ہے ۔ (۳۷) ڈاکٹر محمد باقر کے عہد ادارت میں اس پرچے میں قدیم نوادرات

پیش کرنے کا طریق اختیار کیا گیا تھا ۔ چنانچہ ڈاکٹر عبادت بریلوی لندن سے محمد خلیل علی خان رشک کی کتاب " گلزار چین " کا نسخہ تلاش کر لائے تو اس کا پورا متن " اورینٹل کالج میگزین " میں اگست نومبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا ' سید میر حسین الحسینی شیرازی کی کتاب " زبدۃ المعاصرین " کو بھی اسی پرچے میں دریافت نو کا اعزاز حاصل ہوا ۔ اس روایت کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے عہد ادارت میں زیادہ تقویت دی اور " نقلیات " مولفہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ ' " افسانہ عشق " مولفہ الٰہی بخش شوق ' کے علاوہ متعدد دوسری کتابیں شائع کیں ۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے عہد ادارت میں " اورینٹل کالج میگزین " میں تحقیقی مضامین کی اشاعت کو فوقیت دی اور متعدد نئے تحقیقی کارناموں کو منظر عام پر لانے کی سعی کی ۔ چنانچہ " گل رعنا " نسخہ مالک رام پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی بحث " دستاویزی تحقیق " پر " تبسم کاشمیری " کا مقالہ اقبال اور ایک واقعاتی مغالطہ از صدیق جاوید " ذخیرہ شیرانی کا جائزہ " از عارف نوشاہی اسی قسم کے مضامین ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب نے قدیم ادبا کی نوادر تحریریں اور خطوط کو منظر عام پر لانے کی کاوش بھی کی ۔ افضل حق قرشی نے محمد حسین آزاد کے ' سلطان محمود حسین نے سرسید احمد خان کے خطوط ' نور محمد قادری نے پطرس کی تحریریں ' معین الدین عقیل نے شبلی کے نوادر ' اور مشفق خواجہ نے بیاض ثاقب کی دریافت کا فریضہ سرانجام دیا ۔ " اورینٹل کالج میگزین " کا ایک اور کارنامہ رسالہ " ہمایوں " کا مکمل اشاریہ ہے ۔ اس اشاریہ کی اشاعت سے ہمایوں اور اس کے عہد پر کام کرنے والوں کو سہولت مل گئی ہے ۔

" اورینٹل کالج میگزین " بظاہر ایک کالج میگزین ہے لیکن اسے طلبہ کی دستبرد سے ہمیشہ آزاد رکھا گیا ہے اور اس کے قلمی معاونین میں یونیورسٹی کے نامور اساتذہ ' محقق اور نقاد شامل رہے ہیں ۔ اس کا ماضی تابندہ ہے اور یہ ایک روایت کا امین ہے ۔ اورینٹل کالج میگزین کی اشاعت اگرچہ باقاعدہ نہیں ۔ تاہم اس کی روشنی کبھی مدہم نہیں پڑی اور اس نے گرد و پیش کے علاوہ ماضی کو بھی منور کیا ہے ۔ حالیہ دور میں اس کی مجلس ادارت میں سید محمد اکرم کے علاوہ شہباز ملک ' خواجہ محمد زکریا ' سہیل احمد خان اور رفیع الدین ہاشمی شامل ہیں ۔

"ادبی دنیا"

آزادی سے قبل کے رسائل میں سے "ادبی دنیا" کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس نے اپنی سابقہ اٹھارہ سالہ زندگی میں ادب کے ایک مضبوط اور مؤثر دبستان کی حیثیت اختیار کر لی تھی ' محمد عبداللہ قریشی نے اس کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"کہنے کو تو "ادبی دنیا" ایک ماہنامہ تھا لیکن یہ محض ایک رسالے ہی کا نام نہیں، ایک روایت کا نام ہے، ایک ادارے اور ایک مشن کا نام ہے، جو اب ادب کی ایک علامت کے طور پر زندہ ہے۔" (۳۸)

اس عہد ساز رسالے کی ابتدا ۱۹۲۹ء میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے کی تھی اور اختراع یہ کی کہ اس کا سائز عام رسائل کی نسبت بڑا رکھا، تاجور صاحب نے اس کے لئے "جہازی سائز" کی اصطلاح وضع کی تھی، چکدار کاغذ اور عکسی تصویروں سے اس کی آرائش کی اور مضامین نظم و نثر کا معیار بلند رکھا، مولانا تاجور نے اسے اردو کا ایک مکمل پرچہ بنانے اور متنوع موضوعات پر مضامین پیش کرنے کی پوری کوشش کی، حال و قال، آئینہ عالم، مشرق اور اہل مشرق جیسے عنوانات کے علاوہ معیاری مختصر افسانہ، اعلیٰ شاعری اور بلند پایہ نظریاتی و تنقیدی مضامین کی اشاعت کا اہتمام کیا اور بہت جلد پنڈت کیفی، خواجہ حسن نظامی، وحید الدین سلیم، جوش ملیح آبادی، احسن مارہروی، وحشت کلکتوی، فراق گورکھ پوری، اور عبدالرزاق ملیح آبادی کے علاوہ متعدد نوجوان ادیبوں کا تعاون بھی حاصل کر لیا۔ شیخ عبدالقادر کی سرپرستی "ادبی دنیا" کو ابتدا سے ہی حاصل تھی۔ چنانچہ "ادبی دنیا" کو مملکت ادب میں پذیرائی حاصل کرنے میں دیر نہ لگی، اسے عمائدین ادب نے "مخزن" کا ہم پلّہ، ہم پایہ اور جہانِ ادب کا تابندہ ستارہ تسلیم کیا۔

مارچ ۱۹۳۲ء میں تاجور نجیب آبادی نے "ادبی دنیا" کو مولانا صلاح الدین احمد کے ہاتھ فروخت کر دیا اور اس کے ساتھ ہی "ادبی دنیا" کا ایک دور ختم ہو گیا۔ "ادبی دنیا" کے دوسرے دور میں منصور احمد مدیر مقرر ہوئے، (۳۹) ان کے زمانہ ادارت میں تخلیقی اصناف کے علاوہ مغرب کے افسانوں اور نظموں کے تراجم کو خصوصی اہمیت دی گئی، "ادبی دنیا" کا مزاج کلاسیکی تھا، منصور احمد کے حسن نظر نے اس کا دائرہ اظہار پھیلا دیا اور اس رسالے نے نوجوان لکھنے والوں کی پوری ایک جماعت کو نکھارنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ منصور احمد مئی ۱۹۳۷ء میں فوت ہوگئے تو کچھ عرصے کے لئے "ادبی دنیا" کی ادارت حفیظ ہوشیار پوری اور عاشق حسین بٹالوی نے سرانجام دی، جنوری ۱۹۳۸ء میں مولانا صلاح الدین احمد "ادبی دنیا" میں بطور مدیر رونما ہوئے، اب اس رسالے کا وہ دور شروع ہوا جسے عہد ساز کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور ۱۹۴۷ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دور میں ہر ماہ دوسرے رسائل کے چیدہ چیدہ مضامین کا ملخص چھاپنے اور ہر سال ایک شاندار سال نامہ پیش کرنے کی روایت مستحکم نظر آتی ہے۔

"ادبی دنیا" کے اس تیسرے دور میں اردو کے جدید شاعر اور نقاد میرا جی، مولانا صلاح الدین احمد کے شریک مدیر تھے، اس دور میں ادب کی کلاسیکی رو کی نگہبانی مولانا نے کی اور جدیدیت کی لہر کو

میراجی نے روشناس خلق کرایا " ادبی دنیا " نے فرد کے بنیادی جذبات کو داخلی زاویوں سے تخلیقی طور پر ظاہر کرنے اور نا معلوم جزیروں تک رسائی حاصل کرنے کی کاوش کی ' اس سے اردو نظم کی جہت یکسر تبدیل ہو گئی ۔ ادبی دنیا نے اردو شعرا کو مشاعرہ کی داد پسند فضا سے نکالنے میں بھی کامیابی حاصل کی اور اہل اردو کو مشرق اور مغرب کے ایسے نغموں سے متعارف کرایا جن کو دوام ابد حاصل تھا ' میراجی کے فعال ذہن نے اردو نظم اور نثر دونوں کو متاثر کیا " اس نظم میں " کے تجزیے اور سیفو ' بودلیر ' چنڈی داس ' اور امارو جیسے قدیم شعرا پر ان کے مضامین ادبی دنیا ہی میں شائع ہوئے (۴۰) اور مجلسی طور پر " ادبی دنیا " کو حلقہ ارباب ذوق کے اشاعتی معاون کی حیثیت حاصل ہو گئی ۔ " ادبی دنیا " نے جدید اردو افسانے کے اولیں معماروں ' کرشن چندر ' راجندر سنگھ بیدی ' ممتاز مفتی ' عصمت چغتائی ' بلونت سنگھ ' قدرت اللہ شہاب ' شمس آغا کی تربیت کی اور تنقید میں کشادہ نظری کی فضا کو استوار کیا ۔ تقسیم ہند سے کچھ عرصہ قبل میراجی لاہور اور " ادبی دنیا " سے رخصت ہو گئے تو تھوڑے سے عرصے کے لئے قیوم نظر نے بھی مولانا کا ہاتھ بٹایا لیکن ادارت کا زیادہ بوجھ مولانا صلاح الدین احمد کے کندھوں پر ہی رہا ' اس عرصے میں پاکستان کی تشکیل کے آثار نمایاں ہو چکے تھے " ادبی دنیا " نے اب تحفظ زبان اردو کا بیڑا اٹھا لیا اور " اردو بولو تحریک " کو موثر طور پر اپنے رسالے کے صفحات سے ابھارا ۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مولانا صلاح الدین احمد کا گھر اور کتب خانہ جلا دیا گیا ' یہ ایک صدمہ جاں کاہ تھا جسے مولانا نے پامردی اور حوصلے سے برداشت کیا اور اس کے ساتھ ہی " ادبی دنیا " کا بے حد فعال تیسرا دور ختم ہو گیا ۔

" ادبی دنیا " کا پاکستانی دور

مولانا صلاح الدین احمد کے کتب خانے کے جلا دئے جانے کے واقعہ نے ان پر عجیب نوع کے مثبت اثرات مرتب کیے ' مولانا کا ادارک یہ تھا کہ جو قوم کتاب کی اہمیت کو نہیں سمجھتی وہ دنیا میں ترقی نہیں کر سکتی ۔ چنانچہ انہوں نے کتاب کا خزینہ ارزاں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا اور " ادبی دنیا " کو ایک نئی صورت دے دی ' دسمبر ۱۹۴۸ء میں ۱۶ ماہ کے تعطل کے بعد " ادبی دنیا " کے چوتھے دور کا آغاز ہوا تو انہوں نے پرچے کی ضخامت دوگنی کر دی (۴۱) اور اس میں "مباحث امروز" "آئینہ عالم" "ادبیات خارجہ" "دفتر پارینہ" اور "مکتوبات" جیسے عنوانات کا اضافہ کر دیا ۔ سابقہ دور میں "کہنے کی باتیں" کا عنوان جس کے تحت ادبی معائب پر نکتہ چینی کی جاتی تھی بند کر دیا گیا تھا اور وجہ یہ تھی کہ مولانا اپنے مخاطبین کو حریف بذلہ نہ بنا سکے تھے اور مخاطب انہیں حریف دشنام بنانے پر تلے ہوئے تھے

لیکن اب یہ باب "ادبی دنیا" کا مایہ افتخار شمار ہونے لگا تھا ۔ اس لیئے "کہنے کی باتیں" کی تجدید کا اعلان بھی کیا گیا ۔ اس دور میں "ادبی دنیا" کی ادارت مولانا صلاح الدین احمد نے تن تنہا کی لیکن مستقل عنوانات کے تحت جملہ مضامین لکھنے کی انہیں فرصت نہ مل سکی چنانچہ "مباحث امروز" اور "آئینہ عالم" کے عنوانات مقالات و مضامین تو ختم ہو گئے اور "کہنے کی باتیں" ادارتی صفحہ "بزم ادب" میں کہی جانے لگیں ، مولانا نے "ادبی دنیا" کو "پاکستان اور ہندوستان کا مشترکہ اردو ماہنامہ" قرار دیا ، "اردو بولو تحریک" کو تیز تر کر دیا۔ حصہ نظم و نثر کو الگ کرنے کے علاوہ مختلف اصناف ادب کے سیکشن بھی علیحدہ کر دیئے گئے ، اقبالیات کو " ادبی دنیا" میں ایک اہم موضوع کی حیثیت دی ۔ اس دور میں مولانا صلاح الدین احمد خود بھی ایک ماہر اقبال شناس کی صورت میں سامنے آئے ۔ مولانا نے انسانی ذہن کو متحرک کرنے کے لئے "ادبی سلوگن" پیش کرنے کا طریق اپنایا اور رائے عامہ کو بانداز دگر بیدار کرنے کی کوشش کی ۔ ان کا ایک " سلوگن " بطور امتثال امر درج ذیل ہے ۔

" ادب زندگی کا آئینہ بردار ہے ، اس سے زیادہ کچھ نہیں ----- اور اس منصب کی موجودگی میں ، اسے کسی اور اعزاز کی ضرورت بھی نہیں ہے "

اہم بات یہ کہ چوتھے دور میں انشائیہ کی طرف پیش قدمی کے آثار بھی " ادبی دنیا " میں نظر آتے ہیں ،

متذکرہ بالا تمام خوبیوں کے باوصف " ادبی دنیا " کا ضخیم پرچہ چھاپنے کا تجربہ کامیاب نظر نہیں آتا ، اکتوبر ۱۹۵۰ ء میں " ادبی دنیا " نے دوبارہ اپنی پرانی صورت و ساخت اختیار کر لی ۔ اب متنوع مضامین نظم و نثر کا ۸۸ صفحات کا پرچہ صرف آٹھ آنے میں پیش کیا جاتا تھا اس دور میں چودھری محمد علی رودلوی ، ڈاکٹر صلاح الدین اکبر ، بلونت سنگھ ، آغا بابر ، امجد الطاف ، قاضی سلطان پوری ، اعجاز حسین بٹالوی جیسے افسانہ نگار اور وزیر آغا ، وجیہ الدین احمد ، ریاض احمد ، داؤد رہبر اور حزب اللہ جیسے نوجوان نقاد منظر ادب پر طلوع ہوئے ، " ادبی دنیا " کا یہ دور کم و بیش بارہ برسوں پر محیط ہے ، لیکن اس عرصے میں " ادبی دنیا " اقتصادی ناہمواریوں اور مالی نقصانات کی زد میں آتا رہا ۔ مولانا صلاح الدین احمد نے متعدد تجربات کئے اور بے قاعدہ اشاعت کے باوجود اس رسالے کی ادبی ساکھ کو مستحکم رکھا ، تا آنکہ ۱۹۵۹ء میں "ادبی دنیا" کا سب سے تابندہ پانچواں دور شروع ہوا جس میں مولانا صلاح الدین احمد کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا بطور شریک مدیر منظر صحافت پر آئے ۔

" ادبی دنیا " کے پانچویں دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اب یہ رسالہ تین ماہ کے بعد شائع ہوتا تھا اور تین صد سے زائد صفحات کا پرچہ صرف ایک روپے میں پیش کیا جاتا تھا ۔ " ادبی دنیا " کو نیا اور تازہ خون ڈاکٹر وزیر آغا نے فراہم کیا ۔ اس دور میں مولانا کا احساس یہ تھا کہ اردو افسانے کا دور

زریں ختم ہو چکا ہے چنانچہ انہوں نے اردو افسانے کو " ادبی دنیا " میں بہت کم جگہ دی ' فکری اور نظری مضامین کے شمول کو اہم تصور کیا ' آزادیات اور اقبالیات کے موضوع کو بالخصوص اجاگر کیا اور مختلف زندہ موضوعات پر مباحث کے علاوہ " آپس کی باتیں " میں قارئین کے رد عمل کو نمایاں طور پر پیش کیا ۔ ڈاکٹر وزیر آغا حصہ نظم کے مدیر تھے ' انہوں نے جدیدیت کے عناصر کو سمیٹنے اور نئی نظم کو متعارف کرانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور جدید شعراو مجید امجد 'بشیر نواز 'کمار پاشی ' محمد علوی ' بلراج کومل ' قاضی سلیم ' عزیز تمنائی ' شکیب جلالی کو وسیع پیمانے پر متعارف کرایا ۔ جدید نظموں پر تجزیاتی مطالعوں کو فروغ دیا (۴۲) اور تنقید میں متعدد نئے علوم سے استفادہ کی طرح ڈالی ' وزیر آغا کی کتاب " اردو شاعری کا مزاج " کا بیج " ادبی دنیا " کے صفحات ہی سے پھوٹا تھا ' ان کے سلسلہ مثال کے مضامین جن میں فیض ' راشد ' مجید امجد ' میرا جی ' قیوم نظر ' یوسف ظفر ' اختر الایمان اور راجہ مہدی علی خان کو اہمیت حاصل ہے اسی دور کے " ادبی دنیا " میں چھپے ۔ " ادبی دنیا " نے جن نئے مباحث کو جنم دیا ان میں " لفظ اور خیال کا رشتہ " ' " حسن کیا ہے " ' " وقت کیا ہے " ' " صبح تہذیب کا انسان " ' " شاعری میں علامتوں کا مسئلہ " اور " وجودیت " کے علاوہ ایک نئی صنف انشائیہ کے بارے میں بحث بھی بے حد اہم ہے ۔ (۴۳) مولانا صلاح الدین احمد کا افسانے کا معیار بہت کڑا تھا ۔ اس دور میں ان کے معیار پر جو افسانہ نگار پورے اترے ان میں رحمٰن مذنب ' غلام الثقلین نقوی ' رام لعل ' پریم ناتھ در ' بلراج کومل ' ہیرا نند سوز ' اور سید خلیل احمد ہیں ۔ انشائیہ کے فروغ کو "ادبی دنیا" کے اس دور میں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی ' ان سب امور کو پیش نظر رکھیں تو "ادبی دنیا" اس دور میں ایک مؤثر اور فعال تحریک کا کردار ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اس کی آواز پورے برصغیر کے ادبی حلقوں میں نفوذ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔ " ادبی دنیا " کا پانچواں دور کم و بیش پانچ سال پر محیط ہے ۔ جون ۱۹۶۴ء میں دماغ کی شریان پھٹ جانے سے مولانا صلاح الدین احمد اچانک انتقال کر گئے تو یہ تابندہ ترین دور اپنے غیر طبعی انجام کو پہنچ گیا ۔

" ادبی دنیا " کے چھٹے اور آخری دور کی ابتدا ۱۹۶۵ء میں مولانا صلاح الدین احمد کے " یادگار نمبر " سے ہوئی ' اب اس پرچے سے وزیر آغا غیر منسلک ہو چکے تھے اور مولانا حامد علی خان بطور مدیر شامل تھے ' انتظامی امور کی باگ ڈور مولانا کے صاحبزادے فصیح الدین احمد کے پاس تھی ' لیکن یہ عارضی انتظام تھا ۔ مئی میں " ادبی دنیا " کی زمام ادارت محمد عبداللہ قریشی صاحب کو سونپ دی گئی ' انہوں نے " بزم ادب " میں لکھا کہ :

" زیر نظر اشاعت (مئی ۱۹۶۵ء) سے " ادبی دنیا " کی ادارت کا قرعہ میرے نام پڑا ہے ۔ میں ادبی حلقوں میں زیادہ معروف نہیں ہوں ۔ لیکن .. میں یہ عرض کر دوں کہ ایک خاموش خادم ادب کی

حیثیت سے گزشتہ چالیس سال سے نہایت خلوص کے ساتھ ' شہرت سے بے نیاز ہو کر علمی اور تحقیقی کام کر رہا ہوں .. اب اتفاقات مجھے گوشہ نشینی سے نکال کر منظر عام پر لے آئے ہیں تو کیا عجب کہ .. میں " ادبی دنیا " کو ماضی کی سیدھی ڈگر پر چلانے میں کامیاب ہو جاؤں ۔" (۴۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد عبداللہ قریشی نے " ادبی دنیا " کو ماضی کی ڈگر پر کامیابی سے چلانے کی پوری کوشش کی اور ایک مخلص ' ادب دوست ' ادیب پرور اور ایثار پیشہ ادیب ہونے کا ثبوت پیش کیا ۔ انہوں نے اپریل ۱۹۷۴ء تک " ادبی دنیا " کی شمع روشن رکھی اور معمول کے پرچوں کے علاوہ " اقبال نمبر " ' " وحشت کلکتوی نمبر " اور " کشمیر نمبر " شائع کیے ' جنہیں مقبولیت بھی حاصل ہوئی ' (۴۵) لیکن اب " ادبی دنیا " مولانا صلاح الدین احمد سے محروم تھا اور محمد عبداللہ قریشی محقق اور ادیب تھے انہوں نے اپنی خودداری کی وضع قائم رکھی اور " ادبی دنیا " کا مالی بوجھ کسی دوسرے پر پڑنے نہیں دیا ۔ مولانا کے ورثا عشق کی اس امانت کو سنبھال نہ سکے ' چنانچہ عبداللہ قریشی صاحب کے قول کے مطابق " " ادبی دنیا " چوالیس برس اعلیٰ ادبی اقدار کی ترجمانی کا حق ادا کرنے کے بعد ایک ناگہانی حادثے کا شکار ہو کر بے آئی موت مر گیا " ۔ (۴۶) لیکن ان کا یہ ارشاد زیادہ صحیح ہے کہ " ادبی دنیا " اب ایک علامت کے طور پر زندہ ہے ۔ یہ ایک روایت کا نام ہے " (۴۷)

" ادبی دنیا " کا پہلا دور جو صرف تین برس پر محیط ہے مولانا تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں گزرا ۔ اس دور میں اس پرچے نے ادبی حلقوں میں اپنا تعارف کرایا اور اعتبار قائم کیا ۔ اس نے قریباً پندرہ سال مولانا صلاح الدین احمد کے تعاون اور ادارت میں متحدہ ہندوستان میں گزارے اور اس عہد کے ادب اور ادیب دونوں کو متاثر کیا ۔ " ادبی دنیا " نے پاکستان میں ۲۶ برس کی زندگی بسر کی ' مولانا صلاح الدین احمد کا دور ادارت سولہ برسوں پر اور مولانا عبداللہ قریشی کا دس برسوں پر محیط ہے ' ابتدائی سولہ برسوں میں " ادبی دنیا " کے اثر و عمل کا گراف مائل بہ فراز ہے اور اس کا پانچواں دور جس میں بارہ ضخیم شمارے شائع ہوئے اس کا نقطہ معراج ہے لیکن مولانا کی وفات کے بعد یہ گراف آہستہ آہستہ صعودی صورت اختیار کر گیا ' مولانا صلاح الدین احمد کے نزدیک ادب تعبیر حیات بھی تھا اور زندگی کی تفسیر بھی ' یہ روشنی اور توانائی بھی فراہم کرتا تھا اور لطافت ' بہجت اور مسرت بھی ' انہوں نے " ادبی دنیا " کو اپنے انہیں تصورات کا نقیب بنایا اور پختگی کردار سے اسے زندہ رکھا ' ہر چند یہ زیاں کا کاروبار تھا لیکن مولانا اسے اپنے عشق سے تعبیر کرتے تھے ' اور زیاں کا معاملہ جانتے ہوئے عمل میں لاتے تھے ' مولانا عبداللہ قریشی نے لکھا ہے کہ : " مولانا صلاح الدین احمد یہ نہیں دیکھتے تھے کہ زندگی سے کیا کچھ حاصل کیا جائے بلکہ وہ یہ دیکھتے تھے کہ زندگی کو کیا کچھ دیا جائے ۔" (۴۸) ماہ نامہ " ادبی دنیا " بھی ان کے خیر کثیر کی تقسیم کا عمل تھا ' اس نے لاکھوں لوگوں میں ادب کا صاف ' ستھرا

اور سچا ذوق پیدا کیا ' ان گنت نوجوانوں میں لکھنے کی تحریک پیدا کی ' پڑھنے والوں کو صحت مند ادب دیا اور ان کے فکر و نظر کو خوبی اور خوبصورتی سے سنوارا ۔ یہی وجہ ہے کہ " ادبی دنیا " کو اردو دنیا میں ایک تہذیب ساز ادارے کی اور مولانا صلاح الدین احمد کو پیمبر ادب کی حیثیت حاصل ہے ۔

"ساقی"

ماہ نامہ " ساقی " ۱۹۳۰ ء میں شاہد احمد دہلوی نے جو ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور مولوی بشیر الدین کے فرزند تھے دہلی سے جاری کیا اور اسے علامہ اقبال کے اس شعر سے سجایا ۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور

اس بزم ادب کے ساقی شاہد احمد دہلوی تھے ' ادب ان کے مے تھی ۔ رسالہ " ساقی " ان کا جام تھا اور انہوں نے اس جریدے کے ذریعے لطف و کرم کی ایک نئی روش کی بنا ڈالی تھی ۔ پیر حسام الدین راشدی نے لکھا ہے کہ :

" یہ شاہد احمد دہلوی ادبی میدان میں یوں ہی ٹپک نہیں پڑے تھے بلکہ خاندانی لحاظ سے ایک طویل اور مؤقر علمی روایت کا پوار انبار اپنی جھولی میں بھر کر لائے تھے اور خود بھی بھرپور ہو کر آئے تھے ۔ میں نے کوئی رسالہ اپنے دور افلاس میں مستقل طور پر خریدنا شروع کیا تھا تو وہ یہی رسالہ (ساقی) تھا"۔(۴۹)

" ساقی " کے مقاصد اولی میں زبان و ادب کا پاکیزہ مذاق پیدا کرنا ' اردو میں شاعری ' نثر اور ادب لطیف کے نمونے پیش کرنا اور ادبا کے ادبی محاسن و کمالات کا تعارف ' اشاعت اور تحسین کو اہمیت حاصل ہے ۔ شاہد احمد دہلوی کے پیش نظر یہ حقیقت بھی تھی کہ " اہل دہلی کی ٹکسالی زبان پر کسمپرسی کی حالت طاری ہے ' اردو کی ترقی کا سہرا پنجاب کے سر ہے اور اس کی قدردانی دکن میں ہو رہی ہے " لیکن معتدبہ ادبی نقصان کے باوجود انہیں احساس تھا کہ دہلی اب بھی اردو کا مرکز ہے (۵۰) انہوں نے " ساقی " کو ایک ایسا جامعہ بنانے کی کوشش کی جس کے مطالعہ سے سب لوگ محظوظ ہوں ۔ "ساقی" کی اٹھان اتنی دلفریب تھی کہ پورا ہندوستان اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور ابتدائی چند پرچوں ہی میں اسے اپنے عہد کے نامور لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہو گیا' جن میں ناصر نذیر فراق دہلوی' قاری سرفراز حسین عزمی' ریاض خیر آبادی' نواب سراج الدین سائل دہلوی' جوش ملیح آبادی' عندلیب شادانی' مظہر انصاری' قاری عباس حسین' آغا محمد اشرف' سید تمکین کاظمی' فرخ بنارسی اور آغا محمد باقر

کے نام اہم ہیں۔

" ساقی " کے مدیر کی حیثیت میں شاہد احمد دہلوی کی ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ادب میں کشادہ نظری کو فروغ دیا، ہر نئے تجربے کے لئے چشم طلب وا رکھی اور اسے بلا تعصب فروغ پانے کا موقع دیا۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ساقی کے لکھنے والوں کا ایک مخصوص حلقہ پیدا کیا اور ان کے ساتھ عمر بھر عہد وفا نبھایا اور اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ بعض ادبا زمانے کی نئی روش سے پیچھے رہ گئے تھے اور " ساقی " کے مزاج سے جو ادب کی نئی کروٹوں کا ساتھ دے رہا تھا پوری مطابقت نہیں رکھتے تھے، لیکن " ساقی " کے دور آخر میں بھی اس کے دور اول کے ادبا کو نمایاں حیثیت دی گئی۔ ایم اسلم، جلال مرزا خانی، امین حزیں، اثر صہبائی، اعجاز الحق قدوسی، ملا واحدی، عنبر چغتائی، نقی محمد خان خورجوی اور متعدد دوسرے ادبا کو شاہد احمد نے ہمیشہ عزت و احترام سے " ساقی " میں چھاپا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے درست لکھا ہے کہ " ساقی کا مزاج شاہد احمد دہلوی کا مزاج تھا، انہوں نے ساقی کو اپنے مخصوص مزاج سے ایک ایسا پلیٹ فارم بنا دیا جس سے لکھنے والے اپنے قارئین تک آسانی سے پہنچ سکتے تھے "۔ (۵۱) " ساقی " کی اس روش کا ہی نتیجہ تھا کہ بہت سے نئے لکھنے والے "ساقی" کے صفحات ہی سے ابھرے اور پھر پوری ادبی دنیا کو جگمگانے لگے۔ شاہد احمد کی نظراتنی جوہر شناس تھی کہ وہ کسی نئے لکھنے والے کی پہلی تحریر کو دیکھ کر ہی اس کے روشن مستقبل کا اندازہ لگا لیتے تھے، ممتاز افسانہ نگار رفیق حسین کو انہوں نے ہی دریافت کیا تھا، عظیم بیگ چغتائی کی ابتدائی شہرت میں ساقی کی خدمات نمایاں ہیں۔ سید انور، فرحت انوار، پروین سرور، وزیر آغا، پریم ناتھ پردیسی، راما نند ساگر، صدیقہ بیگم سیوہاروی کے علاوہ ان گنت نام ہیں جو ساقی کے صفحات سے روشن ہوئے، ان میں پریم پجاری اور طاہرہ دیوی شیرازی بھی شامل ہیں۔ اوّل الذکر کے پردے میں ڈاکٹر عندلیب شادانی سچی کہانیاں لکھتے تھے اور مؤخر الذکر فضل حق قریشی کا نسوانی روپ تھا اور ان سے "ساقی" کا نشاتی کا زاویہ سامنے آتا ہے۔

" ساقی " نے ایک مقناطیسی مدار قائم کر رکھا تھا۔ اس مدار میں فضل حق قریشی، انصار ناصری، تابش دہلوی، ظفر قریشی، صادق الخیری، حبیب اشعر اور انصار ناصری کے علاوہ متعدد دوسرے ادیب ستاروں کی طرح جگمگاتے رہے۔ یہ سب تعلیم یافتہ ادبا تھے، ان کا نصب العین اردو زبان و ادب کے دامن کو وسیع کرنا تھا، ان لوگوں نے مغربی افسانے اور ڈرامے کو اردو دان طبقے سے ترجمے کے ذریعے روشناس کرایا اور بہت سے ترجمے شاہد احمد دہلوی نے خود بھی کئے "ساقی" کے سالنامے، طنز و ظرافت نمبر اور افسانہ نمبر بھی اس کی ادبی جہت کو آشکار کرتے ہیں اور ان سے "ساقی" کا طرۂ امتیاز قائم ہوتا ہے۔

" ساقی " قدیم اور جدید ادب کا نمائندہ تھا۔ اس نے جدید افسانے اور نظم کو متعارف کرانے میں بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا چنانچہ جب عصمت چغتائی ' سعادت حسن منٹو ' کرشن چندر ' راجندر سنگھ بیدی کے افسانے اور میرا جی ' راشد ' سلام مچھلی شہری ' یوسف ظفر ' قیوم نظر ' ضیا جالندھری اور مختار صدیقی کی جدید نظمیں " ساقی " کے صفحات پر جلوہ گر ہوئیں تو اہل دہلی نے " ساقی " کو بڑی حیرت سے دیکھا ' اسے ادبی بے راہ روی قرار دیا اور اس پر ناک بھوں بھی چڑھایا لیکن شاہد احمد نے عزم و ہمت کو قائم رکھا اور نئے ادب کی تحریک کے پروان میں رخنہ اندازی نہیں ہونے دی۔

" ساقی " کے مؤثر تحریری سلسلوں میں فراق گورکھ پوری کی " باتیں " اور محمد حسن عسکری کی " جھلکیاں " کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان سلسلوں کو ان زعمائے ادب کی کالم نگاری کہنا چاہئے ' ان میں ادبی مسائل اور ادیبوں پر رواں دواں اسلوب میں گفتگو ہوتی تھی ' فراق صاحب نے ۱۹۴۳ء میں چند کالم لکھے اور پھر دستکش ہو گئے ' عسکری صاحب کا کالم ۱۹۵۷ء تک چھپتا رہا اور اس کے بعد عسکری صاحب مراقبے میں چلے گئے ' ان کالموں میں مسائل حاضرہ پر خاصی کڑی تنقید ہوتی تھی اور پورے ملک میں دلچسپی سے پڑھی جاتی تھی " ساقی " کی ادبی معرکہ آرائیوں کا زاویہ " نیاز مندان لاہور " کنہیا لعل کپور کے مضمون " اہل زبان " اور مولانا صلاح الدین احمد سے قلمی جنگ سے آشکار ہوتا ہے۔

ماہنامہ " ساقی " کا پاکستانی دور

" ساقی " نے آزادی سے پہلے سترہ سال تک دہلی کے مرکزی مقام سے علم و ادب کے انوار بکھیرے تھے۔ اس نے تازہ موضوعات پر اعلیٰ پائے کے مضامین شائع کیے ' شدید رد عمل کا اظہار بھی کیا اور ادب میں بہجت و ظرافت کے نقوش بھی پیدا کیے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا اور دلّی فسادات کی لپیٹ میں آگیا تو " ساقی " دہلی سے کراچی منتقل ہو گیا۔ " ساقی " کے نئے دور کا پہلا پرچہ ستمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ (۵۲) اس کی وضع سادہ تھی' معیار بلند تھا' لکھنے والوں میں کچھ نئے نام بھی رونما ہو چکے تھے لیکن ساقی کا شیرازہ ادب بکھر جانے کا غم بھی صاف نظر آتا ہے۔ پاکستان اپنی تعمیر کا آغاز کر رہا تھا' شاہد احمد کو اپنے خاندان کے علاوہ "ساقی" چھاپنے کے لئے بھی سرمایہ فراہم کرنا تھا' انھوں نے جان ہار محنت کی' اپنے خاندان کا پیٹ کاٹ کر "ساقی" کی پرورش کی' ادبی لحاظ سے شاندار پرچے مرتب کیے' معرکے کے نمبر چھاپے' لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالات کی نا مساعدت سے کہیں زیادہ مادہ پرستوں کی کور ذوقی نے ساقی کو سنبھالا نہ لینے دیا۔ شاہد احمد دہلوی کو بیماری نے آلیا۔ انھوں نے ۲۷ مئی ۱۹۶۷ء کو وفات پائی' ان کا لکھا ہوا آخری اداریہ "نگاہ اولین" جون ۱۹۶۷ء کے پرچے میں

چھپا تھا' (۵۳) عاصمہ بیگم شاہد احمد ان کی زندگی میں "ساقی" کی مدیر معاون بن گئی تھیں' شاہد احمد دہلوی کی وفات کے بعد انہوں نے "ساقی" کو اپنے نامور خاوند کی یادگار کے طور پر زندہ رکھنے کی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نصیب نہ ہو سکی' ساقی کا آخری کارنامہ "شاہد احمد دہلوی نمبر" ہے جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کیا۔

رسالہ "ساقی" نے اپنی زندگی کے ابتدائی ۱۷ سال ہندوستان میں اور آخری ۲۳ سال پاکستان میں گزارے "ساقی" شاہد احمد دہلوی کی زندگی کا حاصل تھا' انہوں نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ "بیس پچیس سال پہلے ساقی فیشن میں داخل ہو گیا تھا۔ گھر گھر "ساقی" کا چرچا تھا' دنیائے ادب سے متعارف ہونے کے لئے ضروری تھا کہ "ساقی" میں اپنی چیزیں شائع کرائی جائیں" (۵۴) "ساقی" کا پاکستانی دور نامساعد حالات کا دور ہے۔ شاہد احمد "ساقی" کو جاری رکھنے کے لئے ہر روز نیا کنواں کھودتے اور تازہ پانی فراہم کرتے تھے' "ساقی" نے ادبی صحافت کا جو معیار قائم کیا تھا اور جو مقام امتیاز اسے حاصل تھا وہ آزادی کے بعد کچھ عرصے تک قائم رہا۔ دلی میں " ساقی " کو شاہد احمد کی موروثی جائداد کا سہارا حاصل تھا اور وہ نقصان کی پروا نہیں کرتے تھے۔ پاکستان میں انہیں یہ سہارا میسر نہ تھا' مالی کمزوری اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکہ ثابت ہوئی' اور جب "ساقی" اپنی اشاعت کے کروفر سے محروم ہو رہا تھا تو شاہد احمد اس کے صوری زوال کو دیکھ نہ سکے اور دنیا سے منہ موڑ گئے۔

" ساقی " نے پاکستان میں خاص نمبروں کی روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اسے فروغ دینے کی کوشش بھی کی ' خواتین نمبر " ساقی " کی ایک خاص اختراع تھی جسے قبول عام حاصل ہوا ۔ ۱۹۶۵ ء کے بعد " ساقی " نے تین " جنگ نمبر " شائع کیے جن میں الطاف گوہر ' عبدالعزیز خالد ' شوکت صدیقی ' طفیل احمد خان ' عطا حسین کلیم ' شیر افضل جعفری اور حجاب امتیاز علی جیسے نامور ادبا نے شرکت کی اور واقعات جنگ کے ساتھ ساتھ اثرات جنگ کو بھی پیش کیا ' " ساقی " نے اس دور میں " ناولٹ " کو فروغ دینے کے لئے ناولٹ نمبر مرتب کیا ' " جوش نمبر " کی اشاعت کو " ساقی " کے خوشنما دامن پر ایک داغدار دھبے کی حیثیت دی جاتی ہے ۔ لیکن شاید اسے شاہد احمد دہلوی کی خودی اور خودداری کا مظہر قرار دینا بھی نامناسب نہیں ' چنانچہ جب ڈپٹی نذیر احمد کی زبان کو معرض طعن بنایا گیا تو شاہد احمد دہلوی نے اپنا ترکش خالی کر دیا ' اس مجادلے میں ادب کو کم اور ذاتیات کو زیادہ عمل دخل حاصل تھا لیکن ساقی کی خوبی یہ تھی کہ اس نے اپنی زندگی کے تمام ادبی مجادلے منظر عام پر لڑے ۔ شاہد احمد فتح و شکست سے بے نیاز ہو جاتے تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنے ادبی حریفوں پر چھپ کر وار نہیں کیا۔ (۵۵) یہ شاہد احمد دہلوی کا ذاتی کردار تھا اور یہ "ساقی" کی شخصیت میں بھی نفوذ کر گیا تھا۔

"ساقی" کو پاکستان میں ابتدائی سترہ سالوں جیسا حلقہ نصیب نہیں ہوا تاہم اس نے "ساقی" نے

طغیانی مزاج سے ہم آہنگ تھا' اس کے مدیر ایسے لوگ تھے ' جنہوں نے ہمارے ادب میں ایک وقت کے ممتاز رجحانات کی نمائندگی کی ہے ۔ (۶۰) چنانچہ ہر مدیر کی ادارت کا عرصہ کم ہونے کے باوجود " ادب لطیف " میں فکری آہنگ موجود ہے اور آٹھ سال کے اس عرصے میں اس نے زمانہ بعد از جنگ کا تغیر بھی قبول کیا اور اپنی نظریاتی جہت بھی قائم رکھی اور اس رد عمل کا مقابلہ بھی کیا' جو ترقی پسند تحریک کے خلاف ہندوستان میں پیدا ہو رہا تھا ۔ " ادب لطیف " کو اس دور میں خارجی سطح پر سرکاری احتساب کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے بعض افسانوں پر فحاشی کا الزام لگا ' تاہم اس پرچے نے اپنی روش قائم رکھی ' معمولی وقفوں اور جبری تعطّل کے باوجود ماہانہ اشاعتوں کے ساتھ ہر سال ایک ضخیم ' باوقار اور مضامین سے مرصع سالنامہ پیش کرکے برصغیر کے ادبی مزاج کو متاثر کرنے کی جدو جہد کی اور خوبی کی بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کا نمائندہ ہونے کے باوجود "ادب لطیف" نے کسی دوسری تحریک سے وابستہ ادبا پر اشاعتی قدغن نہیں لگائی ۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء کے سالنامے کو اگر پیمانہ شمار کیا جائے تو ہمیں اس میں کرشن چندر' علی سردار جعفری' مخمور جالندھری ' ساحر لدھیانوی ' فکر تونسوی ' عصمت چغتائی ' سلام مچھلی شہری ' خواجہ احمد عباس ' ہاجرہ مسرور ' جان نثار اختر' معین احسن جذبی کے ساتھ ن ۔ م ۔ راشد ' مجید امجد ' میراجی ' حفیظ ہوشیار پوری ' ممتاز مفتی ' کنہیا لعل کپور ' قرۃ العین حیدر ' اختر حسین رائے پوری' سعادت حسن منٹو' اختر اور ینوی اور ابوالفضل صدیقی کے نام بھی نظر آتے ہیں جو ترقی پسند تحریک کے باضابطہ رکن نہیں تھے' اس دور میں ہمیں اثر لکھنوی' اویس احمد ادیب' عندلیب شادانی' انجم رومانی' سید فیضی' ضمیر جعفری' تصدق حسین خالد' ناصر کاظمی' جاوید اقبال' اور شفیق الرحمن کی شرکت کے آثار بھی ملتے ہیں جو زندگی کی ترجمانی میں ادب اور جمالیات کو قدر اول کی حیثیت دیتے تھے' اس دور میں "ادب لطیف" میں ادیبوں کی جماعت بندی کو انجماد سے تعبیر کیا گیا (۶۲) اور اس بات پر احتجاج بھی کیا گیا کہ "ادب لطیف" پر ادب کے پردے میں اشتراکیت کے پروپیگنڈے اور افسانوں میں فحاشی اور عریانی کا الزام لگایا جاتا ہے ۔ (۶۳) چنانچہ اس دور میں " ادب لطیف " ایک ایسی طغیانی ندی کے مترادف تھا جو اپنی تند و تیز موجوں کے ساتھ خس و خاشاک کو بہا لے جانے میں کوشاں تھی ۔ " ادب لطیف " داخلی طور پر بے حد مضبوط نظر آتا ہے اور ادب کی بیشتر نئی لہروں کو اپنے دامن میں سمیٹنے میں مصروف ہے ' دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اس دور کے بیشتر پرچوں پر کسی ممتاز ادیب کا نام بطور مدیر بہت کم نظر آتا ہے ' بیشتر رسائل پر چودھری برکت علی اور چودھری نذیر احمد کا نام چھپا ہوا ہے لیکن پس پردہ ادارت کے فرائض متذکرہ بالا ادبا سر انجام دیتے تھے ۔ شائد عوامی احتساب اور سرکاری مواخذہ کے خوف نے ان ادبا کو سرورق پر طلوع ہونے سے مانع رکھا ' لیکن چودھری برکت علی ہر قسم کے خوف کا سامنا کرتے رہے اور عریانی اور فحاشی کے الزامات میں عدالتوں

میں بھی پیش ہوئے۔

"ادب لطیف" کا پاکستانی دور

۱۹۴۶ء کے وسط میں "ادب لطیف" کی بلند اور مضبوط عمارت میں چند رخنے پیدا ہو گئے، جو داخلی نوعیت کے تھے، چنانچہ "ادب لطیف" کے انتظامی معاون چودھری نذیر احمد اور ادارتی معاونین قتیل شفائی اور فکر تونسوی نے علیحدگی اختیار کر لی۔ ادارت کے فرائض ممتاز مفتی اور عارف عبدالمتین کی نئی ٹیم نے سنبھال لئے (۶۴) لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ادارتی تبدیلی نے "ادب لطیف" کے داخلی مزاج پر کوئی نمایاں اثر نہیں ڈالا، حتی کہ سابق مدیر قتیل شفائی کی غزل کے علاوہ قتیل شفائی پر فکر تونسوی کا خاکہ "بھولا بھالا" فروری ۱۹۴۷ء کے پرچے میں شائع ہوا، لکھنے والوں میں بھی کوئی امتیازی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی دور سے پاکستانی دور کی طرف "ادب لطیف" کی پیش قدمی ہموار اور متوازن تھی۔ لیکن آزادی کے بعد ترقی پسند ادبا میں انتہا پسندی آ گئی تو اس کی لپیٹ میں "ادب لطیف" بھی آ گیا، ایک تند و تیز تبصرے کی اشاعت پر عارف عبدالمتین صاحب کو چودھری برکت علی نے محتاط ہونے کی گذارش کی تو انہوں نے بقول خود تلخ ہو کر کہا "میں احتیاط نہیں کر سکتا میں آپ کے ہاں سے جا رہا ہوں" عارف صاحب نے لکھا ہے کہ "جب میں چلا گیا تو" ترقی پسند مصنفین نے "ادب لطیف" کا "بائیکاٹ کر دیا" (۶۵) اور رسالہ "استقلال" پر عارف صاحب کے متذکرہ تبصرے کی وجہ سے "ادب لطیف" کی اشاعت پر پابندی لگ گئی۔ اس پابندی کے ساتھ ہی "ادب لطیف" کا دوسرا دور جو بے حد فعال، طغیانی اور ہنگامہ خیز تھا، ختم ہو گیا۔

ماہنامہ "ادب لطیف" کا تیسرا دور پھر میرزا ادیب کی ادارت میں شروع ہوا، جو ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۲ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ ہر چند اس دور میں بھی "ادب لطیف" نے ترقی پسند تحریک کی نظریاتی جہت سے روگردانی اختیار نہیں کی، لیکن اسے سابقہ رومانی دور کے برعکس توازن و اعتدال کا کلاسیکی دور شمار کرنا مناسب ہے، میرزا ادیب نے اس دور میں ادب کے طغیانی دھاروں کو کناروں میں سمیٹنے اور "ادب لطیف" کو زمانے کی نئی کروٹوں اور ادب کے نئے دھاروں کو قبول کرنے کی کاوش کی، "ادب لطیف" نے ایک دفعہ پھر اردو ادب کی تابندہ روایات سے اپنا ناتا قائم کر لیا، کلاسیکی شعرا کی دریافت نو کا فریضہ سرانجام دیا، نئے ادب کے معماروں کا ساتھ دیا اور متعدد نئے لکھنے والوں کو "ادب لطیف" کے صفحات سے ادب میں متعارف و ممتاز ہونے کا موقع فراہم کیا۔ اس دور کی تابندگی کو ڈاکٹر

سید عبداللہ ' مولوی عبدالحق ' ایس اے رحمٰن ' شیخ محمد اکرام ' ڈاکٹر وحید قریشی ' فراق گورکھ پوری ' عندلیب شادانی ' فیاض محمود ' مجید امجد ' شان الحق حقی ' راجہ مہدی علی خان ' قاضی عبدالستار ' ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر عبدالغنی جیسے ادبا نے فروغ دینے کی کوشش کی تو ان کے ساتھ ہمیں نئے لکھنے والوں کی ایک پوری جماعت بھی نظر آتی ہے جو ادب کی کہکشاں کو منوّر کر رہی ہے ' اس جماعت میں ڈاکٹر وزیر آغا ' عابد حسن منٹو ' افتخار جالب ' خالدہ اصغر ' عزیز انجم ' تاج سعید ' ریاض انور ' اے حمید ' انیس ناگی ' احمد مشتاق ' ساقی فاروقی ' مسعود مفتی ' وقار احمد ' نسیم شمائل پوری اور احمد ہمیش کے نام بے حد نمایاں ہیں ' ان میں سے بیشتر اب مختلف اصناف ادب کے روشن ستارے بن چکے ہیں ۔ میرزا ادیب اس دور میں بطور افسانہ و ڈرامہ نگار ہی سامنے نہیں آئے بلکہ " پیرایہ آغاز " اور " افکار و مسائل " میں وہ تجزیہ نگار کی صورت میں بھی رونما ہوئے اور بطور مدیر اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتے ' اور اردو کتابوں کے مبصر کی حیثیت میں وہ ایک متوازن نقاد نظر آتے ہیں ۔

" ادب لطیف " نے اس دور میں اردو انشائیہ کے فروغ میں " ادبی دنیا " کی طرح غیر معمولی خدمات سرانجام دیں ۔ اس صنف کے لئے " انشائیہ " کا نام " ادب لطیف " کے صفحات ہی سے ابھرا تھا ' یک بابی ڈراموں کے علاوہ ادب لطیف نے " ڈرامہ نمبر " بھی پیش کیا ' ناولٹ کی صنف میں متعدد اضافے کئے اور اصناف ادب کا ایک سال کا معیاری جائزہ مقالات کی صورت میں مختلف ارباب ادب سے لکھوا کر پیش کیا ۔ مجموعی طور پر اس دور کو " ادب لطیف " کا دور زریں قرار دیا جا سکتا ہے ۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں میرزا ادیب " ادب لطیف " سے علیحدہ ہوئے تو وہ مطمئن تھے کہ انہوں نے " ادب لطیف " کی ترقی پسندانہ روایات کا ساتھ دیا اور اپنے احساسات کو اداریوں میں دیانتداری سے پیش کیا لیکن اپنے ایک پرانے ساتھی " ادب لطیف " سے جس کے ساتھ انہوں نے کم و بیش سترہ برس کا عرصہ گزارا تھا بچھڑ جانے کا قلق بھی تھا ۔ (۶۶)

" ادب لطیف " کے چوتھے دور کی ادارت اکتوبر ۱۹۶۲ء میں انتظار حسین نے سنبھالی تو انہوں نے " پہلا لفظ " میں لکھا

" ادب لطیف " کو ایک معیاری ادبی پرچہ بنانے یا بنائے رکھنے کا میں وعدہ نہیں کروں گا ۔ معیاری ادبی رسالے اردو میں اس وقت بہت نکل رہے ہیں ' جو رسالہ ہمیں چاہیے اور نہیں ملتا وہ ایک غیر معیاری ادبی رسالہ ہے " (۶۷)

انتظار حسین نے " ادب لطیف " کو ایک مخصوص نوع کا تہذیبی رسالہ بنانے کی کوشش کی ' انہوں نے نئی نسل اور نئے ادب کو اپنی وضع کے معانی پہنائے اور انہیں اپنے ساتھ چلانے کی کوشش کی ' انہیں بعض نئے رویے ناپسند تھے ' لیکن وہ ان کے اظہار کے لئے رسالے میں جگہ پیدا کرنے کے

حامی تھے ' چنانچہ اس دور میں " ادب لطیف " ادبی اور تہذیبی رویوں کی تجربہ گاہ بن گیا ' نئے سوال کو اہمیت دی گئی ' نئے مباحث کی طرح ڈالی گئی اور اختلافی نکتے کو بگوش ہوش سننے پر قارئین اور ادبا کو مائل کیا گیا۔ اس دور میں علامتی اور تجریدی افسانہ ' زین شاعری اور فرانسیسی ابہام پرستوں کے نظریات کو " ادب لطیف " میں خصوصی طور پر پیش کیا گیا ' اس دور میں " مذاکرے " زیادہ شائع ہوئے ' ہر ادیب کو بولنے کا جمہوری حق دیا گیا اور ہر ادیب نے اس حق کا پورا فائدہ اٹھایا ' تیز طرار اور اکثر کردار شکن جملوں کا استعمال بھی ہوا جس سے ادب کا مطلع خاصا گرد آلود ہوا آزادہ خیالی کا یہ دور جولائی ۱۹۶۵ء میں آ کر ختم ہو گیا۔ انتظار حسین نے " ادب لطیف " کو ایک بالکل نئی وضع عطا کر دی تھی ' وہ ادارت سے علیحدہ ہوئے تو انتظار حسین کا عطا کردہ جامہ بھی اتر گیا۔ انتظار حسین کا دور ادارت ذہانت اور تخلیقیت کا دور ہے لیکن ان کے بنا کردہ تجربے کسی نئی تعمیر کا پیش خیمہ نہیں بن سکے۔

جولائی ۱۹۶۵ء کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ " ادب لطیف " کا ارتقاء رک گیا ' سید قاسم محمود نے چند نئے تجربات کئے ' ناصر زیدی اور ذکاء الرحمن نے اس کی نئی ساکھ بنانے کی کوشش کی ' صدیقہ بیگم نے "ادب لطیف" کے انتظامی امور سنبھالے تو انہوں نے کشور ناہید ' مسعود اشعر اور ذوالفقار احمد تابش کی معاونت سے اسے ایک دفعہ پھر زندہ اور فعاّل بنانے کا عزم کیا "ادب لطیف" کی عظمت کی تجدید میں اظہر جاوید نے محبّت کے شیریں جذبے سے اپنا خون فراہم کیا اور ۱۹۸۶ء میں ایک معرکہ آرا "گولڈن جوبلی نمبر" اور اس کے بعد ایک شاندار "فیض نمبر" پیش کر کے وہ واپس "تخلیق" کی کُنیا میں چلے گئے۔ (۶۸) "ادب لطیف" اب بھی نکل رہا ہے اور توقع ہے کہ چودھری برکت علی کی اس یادگار کو صدیقہ بیگم تا دیر زندہ رکھیں گی۔

" ادب لطیف " کا شمار ان معدودے چند ادبی پرچوں میں کیا جا سکتا ہے ' جس نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک زمانے کا ساتھ دیا اور ادب کی بیشتر نئی تحریکوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی ' اس پرچے کے انتظامی معاونین خالصتاً کاروباری لوگ تھے اس لئے وہ ادبی امور میں دخل اندازی نہ کرتے ' ادبی امور کے نگران ایسے ادبا تھے جو اس دور میں نئے رجحانات کو تشکیل دے رہے تھے اور مخصوص نظریات کی نمائندگی کرتے تھے ' چنانچہ بعض ادارتی ارکان کی تبدیلی کے ساتھ ہی "ادب لطیف" کی نظریاتی جہت بھی تبدیل ہوتی رہی (۶۹) (مثلاً انتظار حسین اور صدیقہ بیگم کا دور میرزا ادیب اور عارف عبدالمتین کے ادوار ادارت مزاجاً" مختلف ہیں) تاہم اسے ہر دور میں ایک زندہ اور فعال ادبی رسالہ شمار کیا گیا۔ آخری دور میں " ادب لطیف " اکیلے آدمی کا سفر بن گیا ' اس عہد ساز رسالے کو کسی بڑی ادبی شخصیت کی راہنمائی حاصل نہیں تھی ' تاہم " ادب لطیف " چونکہ ابھی

تک زندہ ہے اس لیے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک دفعہ پھر اپنی فعّال ادبی شخصیت کا احساس پیدا کر لے گا۔

"شاہکار"

مولانا صلاح الدین احمد کے ہاتھ "ادبی دنیا" فروخت کر ڈالنے کے بعد مولانا تاجور نجیب آبادی نے "شاہکار" کے نام سے اپریل ۱۹۳۵ء میں ایک نیا پر شکوہ جریدہ جاری کیا تو ن۔ م۔ راشد نے ان کے ساتھ مدیر معاون شامل تھے۔ اس پہلے پرچے ہی میں تبدیلی کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔ مولانا تاجور نے "شاہکار" کے ذریعے "تاریخ ادب اردو"، "تذکرہ معاصرین"، "حریفان کمال کا موازنہ"، ادبی اور فنی سوالات کے جوابات اور بزم تحقیق آراستہ کرنے کا اعلان کیا (۷۰) اور ن۔ م۔ راشد نے لکھا کہ "ادبیات میں رنگینی اور شوخ نگاری کو جس کا تعلق خالص فن اور جذبات سے ہے گوارا کر لینا چاہیے۔" اور خواہش کی گئی کہ "شاہکار" کے ذریعے ایسا ادب پیش ہو جو نوجوانوں کی جمالیاتی تشنگی کی تسکین کا باعث بھی ہو۔ شاعری کے سلسلے میں راشد کا یہ اجتہاد سامنے آیا کہ "صرف وہی غزلیں اشاعت کے قابل سمجھی جائیں گی جن میں رسمیات کو ترک کرنے کی کوشش کے آثار ہوں۔" جدید رنگ میں یہ موسیقانہ الفاظ کی نظموں پر تفکرانہ نظموں کو ترجیح دینے اور بحر اور قافیہ کے خلاف جائز حد تک بغاوت کو قبول کر لینے کا ارادہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔(۷۱) چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا صلاح الدین احمد "ادبی دنیا" میں جدیدیت کے جو تجربات منصور احمد اور میرا جی کے اشتراک سے کر رہے تھے کچھ یہی صورت مولانا تاجور نے ن۔م۔ راشد اور محمود جاوید کا تعاون حاصل کر کے پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"شاہکار" آزادی سے پہلے کے دور میں ایک فعّال اور مؤثر پرچہ نظر آتا ہے۔ مرزا محمد سعید کا طویل مقالہ "مذہب اور باطنیت" "شاہکار" کی کئی اشاعتوں میں چھپا، سعادت حسن منٹو اور راجہ مہدی علی خان بطور مترجم اور امین حزیں بطور ڈرامہ نگار شامل ہوئے، پریم چند کا افسانہ "ڈامل کا قیدی" (نومبر ۱۹۳۵ء) اور ان کا ایک تنقیدی مضمون "نفسیات اور ادب" (سالنامہ ۱۹۳۶ء) بھی اسی پرچے میں شائع ہوا۔ ن۔ م۔ راشد کے چند اداریے "تنقید کا مقصد"، "ادبیات میں اجتہاد" "ادبیات میں ابتذال" اور "تیکنیک کی آزادی اور اس کا مفہوم"۔۔ چند ایسی تحریریں ہیں جن میں ن۔م۔راشد کی ابتدائی فکر کے آثار ملتے ہیں۔ اس دور میں شاہکار جدید اور قدیم شاعری کا سنگم نظر آتا ہے اور نظم آزاد و معریٰ کے نمونے بھی نمایاں ہو رہے ہیں تنقید میں نئے رجحانات کی تلاش میں

بھی کاوش کی جا رہی ہے۔ آغا بیدار بخت کا مقالہ "اردو نظم کی تنقید کا معیار" (۷۲) اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس دور میں "شاہکار" نے سالنامہ پیش کرنے کی روایت پر عمل کیا اور ایک "ترقی پسند ادب نمبر" بھی شائع کیا جس میں اس تحریک کی انتہا پسندی کو شدت سے نشانہ تنقید بنایا گیا۔

آزادی کے بعد شاہکار کے انتظامی امور چودھری فضل حق نے حاصل کر لئے اور اس کی ادارت کے فرائض محمد آصف نے سرانجام دیئے اس دور میں "شاہکار" نے ترقی پسند تحریک پر شدید رد عمل کا اظہار کیا اور مارچ ۱۹۵۰ء کے اداریہ میں لکھا کہ:

"شاہکار" سب سے پہلا ادبی رسالہ ہے جس نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی ادبی فسطائیت، احتساب، سیاست پسندی اور اقتدار پرستی کے خلاف آواز اٹھائی ... اس انجمن کی روش ہمارے ادب کے لئے مہلک اور ضرر رساں ہے.. شاہکار کی آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی.. حساس ادیبوں نے ادب کی مثبت قدروں کو زندہ رکھنے کے لئے ایک ادارہ کی بنیاد بھی رکھ دی ہے" (۷۳)

چنانچہ اب جو "مجلس ترقی پسند مصنفین پاکستان" قیام میں آئی اس میں بقول شاہکار قدوس صہبائی، عبدالسلام خورشید، رحمن مذنب، محمد آصف اور میرزا ادیب کو کنوینگ کمیٹی کے ارکان اور اے حمید کو کنوینر مقرر کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشاعت کے اس دور میں "شاہکار" نے ادب کی سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کے صفحات پر ادب کے علاوہ سیاست کی گرم بازاری بھی نظر آتی ہے۔

"شاہکار" کا یہ دور کچھ زیادہ روشن نہیں، اس کا عملہ ادارت معمولی وقفوں کے بعد تبدیل ہوتا رہا۔ ساحرلدھیانوی، رام پرکاش اشک اور شورش کاشمیری نے اس کے چند پرچے مرتب کئے۔ "شاہکار" کی آخری معقول پیش کش سالنامہ کی صورت میں ۱۹۵۶ء میں پیش ہوئی۔ اس کے بعد چودھری فضل حق نے اسے ایک فلمی پرچے کی صورت دے دی اور "شاہکار" کا روشن دور ختم ہو گیا۔

ماہنامہ "کتاب" لاہور

اردو بک سٹال کے مالک ایم ظہیرالدین نے جنوری ۱۹۴۲ء میں ایک رسالہ "کتاب" کے عنوان سے جاری کیا۔ اس کی ادارت محمد سرور جامعی کرتے تھے، کچھ عرصے کے لئے قیوم نظر نے بھی "کتاب" کے مدیرانہ فرائض سرانجام دیئے، یہ دونوں رخصت ہوئے تو ظفر کانپوری "کتاب" کے مدیر مقرر ہوئے۔ رسالہ "کتاب" کا مقصد اردو بک سٹال سے شائع ہونے والی کتابوں کا تعارف تھا۔ لیکن

قیوم نظر نے اسے ادبی پرچے میں ڈھال دیا۔ ظفر کانپوری نے اس کے ادبی مزاج کو قائم رکھا اور ڈاکٹر عبادت بریلوی، میرزا ادیب، فضا جالندھری، شوکت تھانوی، آغا محمد باقر، مولانا مہر، عشرت رحمانی، علم الدین سالک، اوپندر ناتھ اشک کے مضامین پیش کئے، تنقید و تبصرہ اور رفتار کتب اس کے مستقل عنوانات تھے، کچھ عرصے تک شوکت تھانوی اپنے زیر مطالعہ آنے والی کتب پر تاثراتی تبصرے بھی کتاب میں لکھتے تھے۔ "کتاب" اگرچہ معلوماتی رسالہ تھا لیکن اس کی ادبی جہت مضبوط نظر آتی ہے۔ اس پرچے نے ادبی سراغ رسانی کا کام کرنے کی کاوش بھی کی اور چند ممتاز ادبا کی ادبی چوریوں کو طشت ازبام کیا۔ شبلی کی نفسیاتی زندگی پر ڈاکٹر وحید قریشی کا ایک معرکہ آرا مضمون بھی اس رسالہ میں ہی چھپا تھا "کتاب" بہ قامت معمولی نظر آتا تھا، لیکن قیوم نظر نے اسے ایک بے حد فعالؔ ادبی جریدہ بنا دیا تھا۔

"کتاب" منزل کے نئے انتظامات کے تحت ستمبر ۱۹۵۰ء میں رسالہ "کتاب" کی ادارت عبدالسلام خورشید نے کی، اب اس پرچے کی نوعیت تعارفی تھی۔ اس پرچے نے علاقائی زبانوں کے ادب کو اردو میں فروغ دینے کی کاوش کی اور اپنی مختصر ضخامت میں ہر قسم کی معلومات ادب فراہم کیں۔ ۱۹۵۸ء میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ "کتاب" میں ایک پورا ناول پیش کیا جانے لگا اور ارل سٹینلے گارڈنر کا ایک ناول "دی کیس آف دی فائری فنگرز" فروری مارچ ۱۹۵۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اب اسی رسالے کی نوعیت ادبی کم اور تجارتی زیادہ تھی، اس لئے یہ غیر فعال نظر آتا ہے۔ قومی کتاب مرکز کو اپنے ماہنامے کے لئے نام کی تلاش ہوئی تو ابن انشا نے مالکان "کتاب" سے یہ نام حاصل کر لیا اور اب یہ رسالہ ایک نئے انداز میں قومی کتاب مرکز کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے (اس کا ذکر آگے آئے گا)

"نظام" (بمبئی۔ لاہور)

ہفت روزہ "نظام" کلکتہ سے ۱۹۴۳ء میں چودھری محمد یوسف نے جاری کیا تھا اور وہ اسے تجارتی خطوط پر چلانا چاہتے تھے۔ "نظام" کی ادارت کے لئے ابراہیم ہوش کا انتخاب عمل میں آیا لیکن ۱۹۴۴ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ کی آگ میں جاپان بھی شریک ہو گیا تو "نظام" بمبئی منتقل ہو گیا اور بہت جلد سیاست، فلم اور ادب کا ملغوبہ پرچہ بن گیا۔ قدوس صہبائی نے اسی سال ادارت سنبھالی تو اسے ترقی پسند ادب کا ترجمان بنا دیا۔ (۷۴) اس کی ایک بڑی خصوصیت ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی ہفتہ وار کارروائی تھی جسے حمید اختر لکھا کرتے تھے، کرشن چندر کا رپورتاژ "پودے" اور ابراہیم

جلیس کا "شہر" سب سے پہلے "نظام" میں ہی شائع ہوئے تھے۔ "نظام" کی دوسری خصوصیت بہت سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی تھی، چنانچہ ۱۹۴۴ء میں جن نئے لکھنے والوں کو "نظام" میں اشاعت مل رہی تھی ان میں عاتق شاہ، قمر جمالی، اسد بھوپالی، زینت ساجدہ، محمد علی تاج کے نام میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ (۷۵) نظام کو سجاد ظہیر، کرشن چندر، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور سبط حسن کی سرپرستی حاصل تھی لیکن سعادت حسن منٹو بمبئی میں موجود ہونے کے باوجود "نظام" میں کبھی نہیں چھپے۔ انہیں شکایت تھی کہ "نظام" میں مضامین اور افسانے بعض ترقی پسند ادیبوں کی سفارش پر چھاپے جاتے ہیں۔ وہ اس کی مثال میں عادل رشید کا افسانہ بتاتے جو کرشن چندر کی سفارش پر چھپا تھا۔ قدوس صہبائی نے اس واقعہ کو منٹو کے مزاج کے فطری بانکپن سے تعبیر کیا ہے۔ "نظام" بڑی آب و تاب سے چھپتا تھا، پورے ملک میں دلچسپی سے سے پڑھا جاتا اور شدید ردِعمل پیدا کرتا تھا۔

نظام نے اس دور میں ترقی پسند تحریک کے ادیبوں کو مقام امتیاز حاصل کرنے میں اور اس تحریک کو فروغ دینے میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔

"نظام" کا دوسرا دور جنوری ۱۹۴۸ء میں اے حمید کی ادارت میں شروع ہوا (۷۶) لیکن اب ترقی پسند تحریک کی معاونت "نظام" کے لئے مفید نہیں تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد انتظار حسین نے اس کا ادبی روپ نکھارنے کی کوشش کی۔ ہفت روزہ صحافت میں یہ دور چٹان، قندیل اور اقدام کا تھا۔ ان کے مقابلے میں نظام کا سکہ چل نہ سکا۔ قدوس صہبائی کی پاکستان میں آمد پر نظام کی ادارت ایک دفعہ پھر ان کے سپرد کی گئی لیکن چودھری یوسف "نظام" کی کاروباری حیثیت کو سنبھال نہ سکے اور ۱۹۵۰ء میں "نظام" بند ہو گیا۔ (۷۷) "نظام" اگرچہ خالص ادبی پرچہ نہیں تھا لیکن اس نے اپنے صفحات پر ادب کو اہمیت دی، ادب کو عوام تک پہنچانے اور ان کے ذوق کی تربیت کرنے کا فریضہ عمدگی سے ادا کیا۔ اس پرچے سے دو تین سال کے عرصے میں لکھنے والوں کی کثیر تعداد رونما ہوئی۔ نظام کی اس خدمت کا اعتراف ضروری ہے۔

"افکار" (بھوپال، کراچی)

اپریل ۱۹۴۵ء میں بھوپال سے ماہنامہ "افکار" کا اجرا صہبا لکھنوی اور رشدی بھوپالی نے کیا تو ان کے پیش نظر اقبال کا یہ شعر تھا:

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

"افکار" کا بنیادی مقصد اردو کی خدمت اور بھوپال کے جگمگاتے ہوئے ذروں کو مجتمع کر کے آفتاب بنانا تھا، افکار نے ادب اور زندگی کے تعلّق کو پیش نظر رکھ کر ٹھوس علمی خدمات سرانجام دینے کا ارادہ کیا، مہذب افسانے، بلند معیار شگفتہ نظمیں اور عالمانہ مقالات کے علاوہ دوسری زبانوں کے تراجم پیش کرنے کی نوید بھی دی۔ (۷۸) "افکار" اپنی زندگی کے ۴۳ سال گزار چکا ہے۔ اس کے ۲۲۸ پرچے چھپ چکے ہیں اور اب اردو کے معدودے چند ادبی رسائل میں پابندی وقت پر ہر ماہ شائع ہونے والا رسالہ شمار ہوتا ہے اور یہ سب "افکار" کے بانی مدیر صہبا لکھنوی کے استقلال محنت اور اردو دوستی کا نتیجہ ہے کہ وہ اسے زندگی کے نشیب و فراز اور صبر آزما مراحل سے نکال کر موجودہ منزل تک لے آئے ہیں۔ "افکار" جس زمانے میں جاری ہوا وہ ترقی پسند تحریک کا عروج دور تھا اور اس کا غلغلہ پورے ہندوستان میں برپا تھا۔ "افکار" ترقی پسند تحریک سے متاثر تھا، صہبا لکھنوی اس تحریک کے ایک فعال رکن تھے، انہوں نے ابتدائے اشاعت میں ہی "افکار" کو اردو کے مقاصد اور تحریک کے نصب العین سے وابستہ کر دیا اور ۱۹۴۸ء میں "لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر" ۱۹۴۹ء میں "بھوپال اردو کانفرنس نمبر" اور اسی سال ترقی پسند "بھیمڑی ادبی کانفرنس نمبر" شائع کیا ترقی پسند تحریک کو ادبی سطح پر فروغ دینے میں "ادب لطیف" اور "ساقی" نے جو خدمت لاہور اور دہلی سے سرانجام دی تھی، وہی خدمت اب "افکار" بھوپال سے ادا کر رہا تھا۔ (۷۹) اس پرچے کو کرشن چندر، عصمت چغتائی، اختر انصاری، غلام ربانی تاباں، مسعود اختر جمال، جوش ملیح آبادی، اختر سعید، سلمان الارشد، احسن علی خان جیسے بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہو چکا تھا۔ "افکار" کا پہلا دور ۱۹۵۰ء میں ختم ہوا۔ اس دور میں "افکار" نے اپنی ادبی ساکھ قائم کی اور ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم صحیفہ اشاعت کا کردار ادا کیا۔

"افکار" ۔۔ آزادی کے بعد

آزادی کے بعد صہبا لکھنوی بھوپال سے کراچی منتقل ہو گئے تو ان کے ساتھ "افکار" بھی اس نو آزاد ملک میں پہنچ گیا۔ اس کا دوسرا دور ۱۹۵۱ء سے شروع ہوا اور ہر چند حالات نامساعد تھے، جمی ہوئی بساط بکھر گئی اور نئی فضا تعمیر کے ابتدائی مراحل میں تھی لیکن صہبا لکھنوی نے پورے عزم و عمل سے "افکار" کو اپنے پاؤں پر قائم کر دیا۔ اس دور میں "افکار" نے اپنے سابقہ خاص نمبر کے تجربے سے بھی استفادہ کیا، عام پرچے کو فربہی کی طرف مائل نہیں ہونے دیا لیکن خاص الخاص چیزوں کی اشاعت کے لئے خصوصی نمبر نکالنے کی طرح ڈالی، "افکار" کا پہلا خاص نمبر ۱۹۵۱ میں، دوسرا

۱۹۵۲ء میں " افسانہ نمبر" ۱۹۵۳ء میں ' سالنامہ ۱۹۵۴ء میں چھپا۔ دس سالہ نمبر میں انہوں نے اپنی سابقہ ادبی خدمات کا احاطہ کیا ' دو خاص نمبر منٹو اور مجاز پر شائع کیے ' موخر الذکر دو شخصی اشاعتوں نے صہبا کو یہ احساس دلایا کہ زمانہ زندہ ادیبوں سے اغماض برت رہا ہے اور ان کی خدمات ادب کا جائزہ لینے میں بخل سے کام لے رہا ہے۔ اس سے " افکار " کی زندہ پرستی کی روایت نے جنم لیا۔ " افکار " کے جوش نمبر (۱۹۶۱ء) ۔ حفیظ نمبر (۱۹۶۳ء) ۔ فیض نمبر (۱۹۶۵ء) اور ندیم نمبر (۱۹۷۵ء) زمانے کی سرد مہری کے خلاف رد عمل کا اظہار بھی ہیں اور صہبا لکھنوی کی ادب اور دوست نوازی کا زندہ ثبوت بھی ' ان کا تازہ ترین کارنامہ اختر حسین رائے پر ایک ضخیم اشاعت ہے جو ۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آئی ' ایک موضوعی خاص نمبروں میں "برطانیہ میں اردو" "جنگ اور ادب نمبر" "ڈرامہ نمبر" "غالب نمبر" "اقبال نمبر" کرشن چندر ' امیر خسرو ' حمید احمد خان ' جوش اور فیض پر یادگاری اشاعتوں کی اہمیت اور افادیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ افکار اپنے ۳۷ سالہ پاکستانی دور میں ۴۱ خصوصی اشاعتیں پیش کر چکا ہے۔ "افکار" کا ضخیم ترین اس کا " جوبلی نمبر" تھا جو ۱۹۷۰ء میں چھپا اور یہ ۱۱۶۸ صفحات پر محیط ہے۔ جوبلی نمبر میں جوش ملیح آبادی ' عزیز حامد مدنی ' ادا جعفری ' ظہور نظر ' احمد ظفر ' جمیل ملک ' کوثر چاند پوری ' کرنل محمد خان ' رام لعل ' غیاث احمد گدی جوگندر پال ' حفیظ جالندھری ' احسان دانش ' عارف عبدالمتین ' محسن احسان ' احمد ندیم قاسمی ' حامد سروش ' یونس رمزی جیسے کم و بیش نوے ادبا کے افکار نو اور تازہ ادب پارے پیش کئے گئے ' گذشتہ پچیس سال کے ۱۷۵ ادب پاروں کا انتخاب ظہور نظر نے پیش کیا۔ جوبلی نمبر کا سب سے وقیع حصہ ۲۵ سال کے ادب کے ۱۸ جائزے ہیں جن میں مجنوں گورکھپوری (۲۵ سال کی چند اہم ادبی شخصیتیں) حمید احمد خان (اردو ادب کے ۲۵ سال) ۔ مجتبیٰ حسین (غزل)۔ انجم اعظمی (اردو نظم) سحر انصاری (تنقید) ڈاکٹر وزیر آغا (طنز و مزاح) معروف علی سید (افسانہ) بیگم افضل کاظمی (اردو ناول) انور سدید (اردو رسائل) نے حصہ لیا ' یہ میعادی جائزے گزشتہ پچیس سال کا پینورامائی منظر پیش کرتے ہیں۔

پاکستان میں " افکار " کی ایک بنیادی عطا یہ بھی ہے کہ اس میں علاقائی زبانوں کے ادب کو تراجم سے پیش کرنے کا تجربہ بڑے پیمانے پر کیا گیا ' اس طرح افکار اردو زبان کے علاوہ پنجابی بلوچی سندھی ' پشتو اور بنگالی زبانوں کا سنگم بھی نظر آتا ہے۔ بیرونی دنیا کی تازہ ہوا کو قبول کرنے کے لئے "افکار" نے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں پر بھی اپنی کھڑکی کھول دی اور انگریزی ' روسی ' فرانسیسی ' ترکی ' عربی اور چینی زبان کے شہ پاروں کی اشاعت میں گہری دلچسپی لی۔ اخبارات میں ادبی صفحے کی شمولیت سے بہت عرصہ پہلے " افکار " نے ادبی خبروں کی اشاعت کو بھی اہمیت دی اور " افکار " کا آخری حصہ ادیبوں اور کتابوں کے بارے میں وقف کر کے ادبی صحافت کے فروغ میں سرگرم حصہ لیا ' ادیبوں کو

قارئین کے رد عمل سے باخبر رکھنے کے لیئے " افکار " نے " محفل " کے عنوان سے خطوط کا کالم جاری کیا جو نہ صرف دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے بلکہ لکھنے والوں میں تحریک بھی پیدا کرتا ہے۔

" افکار " کا فطری مزاج ترقی پسندانہ ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں کثرت ایسے لوگوں کی ہے جو موضوع کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ " افکار " ادب کے جمالیاتی زاویوں کو نظر انداز نہیں کرتا اور طغیانی کیفیت پیدا کرنے کے بجائے توازن و استدلال کے فروغ میں ایقان رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ " افکار " کے صفحات سے کبھی کوئی ناگوار بحث نہیں ابھری' اس نے خود نوشت سوانح عمری کی صنف کو گذشتہ بیس سالوں کے دوران خصوصی فروغ دیا ہے اور مجنوں گورکھ پوری' اختر حسین رائے پوری' ڈاکٹر سید عبداللہ' محمد احمد سبزواری' قدوس صہبائی' یونس احمر' عبادت بریلوی اور خلیق ابراہیم کی یاداشتوں کو اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ اب ان سے اس دور کی تاریخ فکر و ادب و تہذیب لکھنے میں مدد مل سکتی ہے اس عمل میں بھی " افکار " نے اظہار تہذیب کو پیش نظر رکھا اور واقعات کا کھردرا زاویہ ابھرنے نہیں دیا۔ (۸۰)

" افکار " کے لکھنے والوں کا طبقہ بہت وسیع ہے اور حقیقت یہ بھی ہے کہ جن نئے لوگوں نے " افکار " میں آزادی سے پہلے لکھنا شروع کیا تھا وہ اب آسمان ادب کے روشن ستارے بن چکے ہیں ' ادیبوں کی متعدد نسلیں افکار کے صفحات سے ابھریں ' " افکار " کو پاک و ہند کے سر کردہ ادیبوں کا تعاون حاصل رہا ' ان میں مولوی عبدالحق ' پنڈت کیفی ' سید نواب علی ' مولانا سلیمان ندوی ' فراق ' سیماب ' جگر ' جوش ' بہزاد اور ارشد تھانوی جیسے یادگار زمانہ لوگ بھی ہیں اور کرشن چندر ' علی سردار جعفری ' ملک راج آنند ' اسرار الحق مجاز ' ابراہیم جلیس ' احمد ندیم قاسمی ' شوکت صدیقی ' ممتاز حسین اور عابد حسن منٹو جیسے ترقی پسند بھی ' " افکار " کے صفحات پر عصمت چغتائی' تسنیم سلیم چھتاری' زینت ساجدہ' صفیہ اختر' اختر جمال' سیدہ حنا' شہناز پروین' عرفانہ عزیز' رشیدہ رضویہ' ماہ طلعت' ادا جعفری' فردوس حیدر' عشرت آفریں' حمیدہ معین' رضوی ترنجن کی صورت میں محو اظہار ہیں' جوگندر پال' محمد خالد اختر' کرنل محمد خان' وزیر آغا' سعید اختر' احمد فراز' سحر انصاری' مختار زمن' شفیع عقیل' ادیب سہیل' شہزاد منظر' حسن اکبر کمال' صبا اکرام' علی حیدر ملک' صلاح الدین ندیم' راشد مفتی' طاہر آفریدی' مقبول عامر' اسلم انصاری' مقصود زاہدی' حسن نعیم' انور زاہدی' نصیر ترابی' محمد فیروز شاہ' گلزار بخاری ' عرفان علی شاد' ممتاز احمد خان' علی حیدر ملک' ماہ طلعت زاہدی' خالد اقبال یاسر' سیما شکیب' نکہت بریلوی' جمال نقوی' سلیمان عبداللہ اور احمد ضیا نے ایک ایسی کہکشاں مرتب کر رکھی ہے جس کے سب روشن ستاروں کو شمار کرنا ممکن نہیں۔

" افکار " کی ادبی تاریخ روشن ہے۔ اس کا ارتقا ہموار ہے ' اس نے ادب کی خدمت خاموشی

سے کی ہے اور حالیہ دور میں ان غریب الدیار ادیبوں کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی ہے جو برطانیہ ' امریکہ 'کنیڈا ' مشرق وسطیٰ میں غم روزگار میں الجھے ہوئے ہیں اور اظہار کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ " افکار " شاید واحد ادبی جریدہ ہے جس نے مستقبل کو محفوظ بنانے کی کوشش کی اور افکار فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالی۔ " افکار " اب اس فاؤنڈیشن کے تحت شائع ہو رہا ہے۔

"نگار"

بھوپال سے فروری ۱۹۲۲ء میں " نگار " جاری ہوا تو اس کے پس پشت مولانا نیاز فتح پوری کا یہ خیال ایک محرک قوت کے طور پر موجود تھا کہ " امتداد زمانہ کے ساتھ جس طرح انسان کی تہذیب و معاشرہ تغیر پذیر ہوتا جاتا ہے اس طرح اس کے داعیات قلب و دماغ میں بھی انقلاب پیدا ہونا ضروری ہے۔ وہی شخص جو کل صرف قصص و حکایات سے آسودہ ہو جاتا تھا ' آج زیادہ کار آمد لٹریچر کا خواہشمند ہو سکتا ہے " (۱۳) انہوں نے مزاج زمانہ کا تجزیہ کیا اور لکھا کہ :

" عہد حاضر کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ اس کا مذاق زیادہ وزنی ہوتا ہے اور تمام وہ قوتیں جواب سے قبل سطح پر تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں اب عمق کی طرف مائل ہیں۔ " (۱۴)

چنانچہ " نگار " نے ابتدائے اشاعت ہی میں مسائل و افکار کی گہرائی میں اترنے کی طرح ڈالی اور علوم و فنون ' ادب ' تاریخ اور سیاست کو پیش کرنے کا پر اعتماد اظہار کیا کہ :

" میں " نگار " کو جس کے نام میں ہر چند ادبی پہلو زیادہ روشن ہے خالص ادبی رسالہ نہ بننے دوں گا "

اور ادبی مضامین کے لئے گنجائش پیدا کی تو تنقید اور تحقیقی مضامین کو فوقیت دینے کا اعلان کیا ' جو افسانوں سے علیحدہ ہیں۔

"سویرا"

۱۹۴۶ء میں چودھری برکت علی اور چودھری نذیر احمد کے درمیان کاروباری اختلافات پیدا ہوئے تو اس کی زد میں ماہنامہ " ادب لطیف " بھی آگیا ' چودھری نذیر احمد نے اپنا " نیا ادارہ " قائم کر لیا اور اس کے تحت نیا رسالہ " سویرا " جاری کیا۔ اس کا پہلا پرچہ جسے جدید فنکاروں کے خیالات کا

سلسلہ شمار کیا گیا تھا جنوری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا اور اس کے مرتبین میں احمد ندیم قاسمی ' فکر تونسوی اور نذیر احمد کے نام شامل تھے ' جو درحقیقت " ادب لطیف " کی کہکشاں کے ٹوٹے ہوئے ستارے تھے ' نذیر احمد چودھری نے ناشر کی حیثیت میں " سویرا " کو اپنی نئی رگ جاں قرار دیا اور لکھا کہ :

" میں اسے فنکاروں کے جدید تجربوں اور اشاعتی محاسن کی جدید ترین قدروں کا وہ یادگار اور مثالی پیکر بنا دوں گا جس کے نقوش ایک مدت تک سرمایہ دارانہ دباؤ نے میرے ذہن کے نہاں خانوں میں بھینچ رکھے تھے " (۸۱)

اداریہ میں کہا گیا کہ " سویرا " کسی خاص گروہ کا نمائندہ نہیں بلکہ یہ ایسی تخلیقات کو اپنے دل میں جگہ دے گا جو نئے تقاضوں سے شناسا ہیں اور سچے شاعر کی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں "سویرا" نے لکھا کہ " یہ ایک ادبی ڈکٹیٹر کی طرح پڑھنے والوں پر اپنے نظریات کو نہیں ٹھونسے گا... اس کی پالیسی نئے ادب کے نظریات سے ہم آہنگ ہو گی "(۸۲)

" سویرا " کے ابتدائی دو پرچوں میں اس ادبی حکمت عملی کے آثار بے حد روشن نظر آتے ہیں ' چنانچہ ان شماروں میں فراق گورکھ پوری ' اختر حسین رائے پوری ' شفیق الرحمن ' ممتاز مفتی ' ظہیر کاشمیری ' سعادت حسن منٹو ' مجید امجد ' ساحر لدھیانوی ' جواہر لعل نہرو ' ممتاز شیریں ' حفیظ جالندھری ' جاوید اقبال ' قرۃ العین حیدر ' اثر لکھنوی ' عزیز احمد اور عبدالمجید سالک کے مضامین اور نام بے حد نمایاں نظر آتے ہیں ' پرچے کا پورا مزاج ادبی ہے اور اس پر کسی خاص گروہ کی چھاپ نمایاں نظر نہیں آتی " سویرا " نے طباعت اور میک اپ کا معیار ہی قائم نہیں کیا بلکہ ادبی پرچے کے لئے نیا ڈیمائی سائز بھی متعارف کرایا (۸۳) اور مضامین نظم و نثر کا معیار اتنا اونچا رکھا کہ چھپتے ہی مقبولیت کی تمام منزلیں سر کر گیا ۔ " سویرا " میں اختر حسین رائے پوری کا افسانہ " جسم کی پکار " ممتاز شیریں کا مقالہ "تکنیک کا تنوع" شفیق الرحمن کا افسانہ " سناٹا " اور عزیز احمد کا افسانہ " پگڈنڈی " تو اتنے کامیاب ثابت ہوئے کہ " سویرا " کی گونج دور دور تک سنی گئی اور اسے اردو زبان کا خوبصورت ' معیاری اور مثالی ادبی جریدہ شمار کیا گیا جو بعد میں عہد ساز اور جہت نگار بھی ثابت ہوا ۔

"سویرا" --- آزادی کے بعد

" سویرا " کا تیسرا شمارہ آزادی کے بعد شائع ہوا تو اس کی سابقہ غیر جانبداری کی جہت تبدیل ہو چکی تھی ' ساحر لدھیانوی نے " جائزے " میں آزادی کو مورد اعتراض ٹھہرایا تھا اور اس میں " یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر " --- " جو آفتاب دیا ہم کو لالہ فام دیا " --- " نئے لباس میں نکلا

ہے رہزنی کا جلوس " جیسے مصرعے نظموں میں شامل دیکھے گئے تو افق ادب و وطن پر اسے خطرے کا اعلامیہ قرار دیا گیا اور اس کے بعد " سویرا " کی نظریاتی جہت تبدیل ہو گئی ' اسے ترقی پسند ادب کا انقلابی ترجمان شمار کیا گیا اور متعدد ادارتی تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں ' عارف عبدالمتین ' ظہیر کاشمیری ' احمد راہی نے " سویرا " کی ترتیب و تدوین میں نمایاں خدمات سر انجام دیں اور بالآخر "سویرا" کو انتہا پسندی کے عروج پر پہنچا دیا گیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سویرا کے شمارہ ۷ ' ۸ کے چند ادارتی حصوں اور بعض مندرجات کو سرکاری حلقوں نے قابل اعتراض قرار دیا ۔ سویرا کو چھ ماہ کے لئے جبراً بند کر دیا گیا اور ناشر سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی گئی ۔ " سویرا " کا شمارہ نمبر ۱۲ شائع ہوا تو طغیانی لہر گزر چکی تھی اور احمد راہی اور نذیر احمد چودھری کی ادارت میں " سویرا " بھی مائل بہ اعتدال ہو چکا تھا ۔ چنانچہ " بات چیت " میں واضح طور پر لکھا گیا کہ

" انجمن ترقی پسند مصنّفین کی دوسری کل پاکستان کانفرنس ۱۲ اور ۱۳ جولائی کو کراچی میں منعقد ہوئی ۔ اس کانفرنس میں انجمن نے اپنے ۱۹۴۹ء کے انتہا پسندانہ منشور کو منسوخ کر کے ایک نیا منشور منظور کیا ہے .... نئے منشور میں انجمن نے بڑے واضح الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا ہے کہ وہ ایک ادبی انجمن ہے ' اس کا سیاست سے کوئی تعلّق نہیں " (۸۴) شمارہ ۱۴ ۔ ۱۳ میں " بات چیت " کے تحت جو رد عمل سامنے آیا اس کا رخ واضح طور پر ترقی پسند ادبا کی طرف تھا ۔ چنانچہ لکھا گیا کہ :

" نمائندہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت روز بروز اپنا وقار کھو رہی ہے ' ان کی نگارشات میں فنی اور خیالی گراوٹ آ رہی ہے ... شاعر حضرات پرانے خیالات کی جگالی کر رہے ہیں ۔ ان کے کلام سے تازگی ' ندرت اور زندگی کی سرمستی مفقود ہو گئی ہے .. ان کے لب و لہجہ میں تفکر اور گہرائی کے بجائے بوکھلاہٹ اور چڑچڑاہٹ آ گئی ہے -- اور یہی ادبی سطحیت اور پستی کا باعث ہے "(۸۵)

" سویرا " کا یہ روّیہ بھی انتہا پسندانہ تھا لیکن اس میں پشیمانی کا احساس موجود ہے ' " سویرا " تغیر کے ایک نئے دور کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ تبدیلی شمارہ ۱۶ ۔ ۱۵ میں سطح پر ابھر آئی ۔ اس پرچے کے مرتب حنیف رامے تھے ' اگرچہ یہ اب بھی " ترقی پسند ادب " کا ترجمان تھا لیکن ترقی پسندی کا مفہوم اب لغوی حدود میں آگیا ' بات چیت کا انداز فلسفیانہ ہو گیا اور اس میں مٹی کے ادراک کے علاوہ روح کی سرشاری کا جذبہ بھی موجود تھا اور تقاضا یہ کیا گیا کہ :

" اپنے آپ کو تسلیم کیجئے ' اپنی قوم اور سماج کو تسلیم کیجئے ' اپنے ملک کے وجود کو تسلیم کیجئے ' یہ مٹی ' یہ لہو ' یہ آپ کا خمیر آپ کی مدد کریں گے ' سینکڑوں ہزاروں سالوں کے چھپا چھپا کے رکھے ہوئے خزانے آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے ' اس نامعلوم کا رستہ بھی آپ کو بتا دیں گے جہاں

سے آگ ملتی ہے"(۸۶)

اس شمارے سے " سویرا " نے نا معلوم کا رستہ اور داخل کو روشن کرنے والی آگ کی تلاش شروع کر دی اور ادب کے علاوہ موسیقی " مصوّری " سنگ تراشی اور دیگر فنون لطیفہ کو بھی " سویرا " میں نمائندگی دی ' حنیف رامے کے عہد ادارت میں " سویرا " نے زندگی کے ساتھ ناتہ قائم رکھا ' لیکن تخلیقی عمل کو عبادت کا درجہ دیا اور فنکار کو معاشرے کا اسم بننے کی ترغیب دی تو یہ تقاضا بھی کیا کہ وہ معاشرے کی روح میں اتر جائے اور فن پارے تراشے ۔ اس دور میں زمینی سفر کے ساتھ ساتھ زمانی اور لا مکانی سفر کی تحریک بھی پیدا کی گئی اور ایسے افسانے ' نظمیں اور ناولٹ شائع کیے گئے جن میں نئی سر زمین تلاش کرنے کا رجحان نمایاں تھا ۔ سویرا نے اس مقصد کے لیے ایک کھڑکی مغرب میں بھی کھول دی اور لارنس ' ایلیٹ ' ایف آر لیوس جیسے مصنّفین کے تراجم شائع کیے ' مقالہ نگاروں میں محمد حسن عسکری ' ممتاز شیریں ' وحید قریشی ' وقار عظیم ' حنیف رامے ' شیخ صلاح الدین ' انتظار حسین ' مظفر علی سید کے نام نمایاں ہوئے ' افسانہ نگاروں میں انتظار حسین ' تسنیم سلیم چھتاری ' جیلانی بانو ' اشفاق احمد ' فضل الرحمٰن ' ممتاز شریں ' شفیق الرحمٰن ' شرون کمار ورما اور مسعود مفتی کے افسانوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے ۔ فکری ' فنی اور معنوی لحاظ سے " سویرا " کا یہ دور جس پر حنیف رامے کی پختہ چھاپ موجود ہے شاید سب سے زیادہ روشن دور ہے ۔

" سویرا " کے شمارہ ۳۶ کی نمایاں تبدیلی یہ تھی کہ اب اس کی ادارتی ذمہ داریاں محمد سلیم الرحمٰن اور ریاض احمد چودھری نے سنبھال لیں ' اس کے کچھ عرصہ بعد سویرا کے بانی نذیر احمد چودھری کا انتقال ہو گیا ۔ شمارہ ۴۶ (ستمبر ۷۳) میں نئے مدیر ظفر اقبال مقرر ہوئے جو در حقیقت صلاح الدین محمود صاحب کے معاون مدیر تھے ' وہ اس لطیف بوجھ کو برداشت نہ کر سکے اور جلد ہی علیحدہ ہوگئے ' اب صلاح الدین محمود کی ادارت میں " سویرا " کا آخری دور شمارہ ۴۷ سے شروع ہوا ۔ اس کے ذوق اور اختیار کا دائرہ ان الفاظ میں متعین کیا گیا ۔

"ایک عرصہ دراز سے اور آج بھی ہمارا موقف اسلام اور پاکستان کی وساطت سے پروان پاتا ہے ۔ ہماری کوشش ہے کہ اسلام ہمارا لہو ہو اور پاکستان ہمارے لہو کی ہمیشہ جاری گردان اور آج بھی ہماری طلب عمدہ سے عمدہ ' اعلیٰ سے اعلیٰ اور نئے سے نئے ادب کی تلاش بھی ہو اور ترویج بھی"(۸۷)

صلاح الدین محمود نے " سویرا " کو اپنی روح کی یاترا قرار دیا اور اس میں اپنے داخل کی آواز سننے کی کوشش کی ' ترقی پسند ادبا نے " سویرا " کو نظریاتی انتہا پسندی کا سبق دیا تھا ' صلاح الدین محمود نے اسی انتہا کا دوسرا کنارہ منتخب کیا اور ایک مخصوص طبقے کو " سویرا " میں نمایاں جگہ دی جن کے

تجربے ان کے اپنے ذہنی ہیولوں کو مرتب کرتے تھے لیکن افق ادب تابانی سے محروم رہتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ "سویرا" قاری کی ذہنی ' ادبی اور جمالیاتی آسودگی نہ کر سکا اور اچانک ایک روز ادب کے آسمان سے غائب ہو گیا ' ہو سکتا ہے کہ یہ غیاب عارضی ہو اور سویرا ایک دن پھر طلوع ہو جائے۔

"سویرا" اگرچہ اپنی کم و بیش چالیس سالہ زندگی میں ادارتی تغیرات کی زد میں رہااور اشاعتی اعتبار سے بھی اسے تسلسل نصیب نہیں ہوا تاہم اردو ادب کو اس باوقار خوبصورت اور معتبر پرچے نے کئی زاویوں سے متاثر کیا۔ "سویرا" کو ایک بڑے اشاعتی ادارے ' ایک تجربہ کار ناشراور ایک ذہین منتظم کا تعاون حاصل تھا ' اس کے ابتدائی مدیران نے "سویرا" کو خود مختار اور آزاد پرچہ بنانے کا عہد کیا تھا لیکن آزادی کے بعد اس نے خالصتاً ترقی پسند روش کو قبول کر لیا اور انتہا پسندی کا شکار ہوا۔ دوسرے دور میں اس پر تصوف کا رنگ غالب تھا لیکن اس میں جدیدیت کے تمام عناصر موجودہ تھے ' ذرے کی قوت کو اور جوہر کے اثر کو تسلیم کیا گیا تھا اور علوم مغرب سے استفادہ کی طرح ڈالی گئی ' "سویرا" کے صفحات پر لسانی تشکیلات کی نئی تحریک کو فروغ دینے کی سعی بھی کی گئی ' اس نے علامتی اور تجریدی افسانے کے تجربے کو بھی وسیع پیمانے پر قبول کیا۔ انور سجاد ' خالدہ اصغر ' احمد ہمیش ' انتظار حسین ' نکہت حسین کو اپنے صفحات پر نمایاں طور پر پیش کیا۔ نثری نظم کے متعدد نمونے "سویرا" کے صفحات پر ہی اشاعت پذیر ہوئے لیکن بوجوہ یہ سب تجربات غیر دوامی ثابت ہوئے اور "سویرا" کا رابطہ اپنے قارئین سے ٹوٹ گیا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو ادب کو آزادی کے بعد جن ادبی رسائل نے شدت سے متاثر کیا اور اظہار و ابلاغ میں ایک طرح نو ڈالی ان میں "سویرا" ایک اہم نام ہے۔ اور اس کی غیر معمولی خدمات کا دائرہ اثر وسیع ہے۔

"نیا دور" (بنگلور۔ کراچی)

"نیا دور" کے نام سے کتابی سائز پر ایک نئی وضع کا ادبی رسالہ صمد شاہین اور ممتاز شیریں نے ۱۹۴۶ء میں بنگلور سے جاری کیا تھا اس پرچے کو دو وجوہ کی بنا پر فوری طور پر پذیرائی حاصل ہوئی ' اول یہ کہ بنگلور جیسے دور افتادہ مقام سے اردو کا ایک بلند پایہ جریدہ پہلی دفعہ منظر عام پر آیا تھا ' دوم یہ کہ اس کی ادارت کے فرائض ایک خاتون ممتاز شیریں ادا کر رہی تھیں ' جن کا ذوق نظر پختہ اور تنقیدی جہت بالکل نئی تھی ' ممتاز شیریں نے ایک نقاد کی حیثیت میں عصری ادب پر اس آزادہ فکری سے رائے زنی کی کہ اس دور کے بہت سے نقادوں کی بھنویں تن گئیں ' اردو افسانے کی تنقید کو ممتاز شیریں نے مغربی اصولوں کے مطابق برتنے کی کوشش کی ' چنانچہ نیا دور نہ صرف ادبی حلقوں میں اپنے پاؤں جمانے

میں کامیاب ہو گیا بلکہ اسے بیشتر بڑے ادیبوں کا تعاون بھی حاصل ہو گیا۔

آزادی کے بعد " نیا دور " کا فسادات نمبر اس کی اشاعتی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، فسادات نمبر نے ادبی دنیا میں ایک فکری اور نظری فساد بھی پیدا کیا۔ ۱۹۴۷ء میں صمد شاہین اور ممتاز شیریں کراچی آ گئے تو انہوں نے اس نئے شہر سے " نیا دور " جاری کیا۔ اس کے صفحات سے " پاکستانی ادب " کی تحریک اٹھی۔ " ادب اور ریاست " کا سوال اہمیت اختیار کر گیا۔ ترقی پسند تحریک کے مصنفین نے نہ صرف " نیا دور " کی بلکہ اس کے بنیادی نقطہ نظر کو اور اس کی مدیرہ کو بھی مورد الزام ٹھہرایا۔ ممتاز شیریں اس سے اتنی دل برداشتہ ہوئیں کہ انہوں نے " نیا دور " کی اشاعت منقطع کر دی۔ "نیا دور" نے اپنے صفحات پر آزادی اظہار کو فروغ دیا تنقید کے لئے نئے پیمانوں کے استعمال کی طرح ڈالی، اردو افسانے کو مغربی افسانوں کے مقابل لانے کی سعی کی، نیا دور کے صفحات سے ممتاز شیریں ایک اعلیٰ پائے کی نقاد اور تخلیقی افسانہ نگار کے طور پر ابھریں لیکن خود " نیا دور " شعلہ مستعجل ثابت ہوا اور ۱۹۵۰ء کے بعد اس کا کوئی پرچہ نہیں چھپا۔

" نیا دور " کا جدید دور ۱۹۵۶ء کے لگ بھگ شروع ہوا لیکن مزاجاً یہ ایک بالکل نیا پرچہ تھا۔ اس کی ادارت کے فرائض شمیم احمد سرانجام دیتے تھے اور مدیر انتظامی ثناء اللہ تھے۔ لیکن اس کے ادبی نصب العین کی نگہداشت جمیل جالبی صاحب کرتے تھے اور انہیں پس پردہ مدیر کی حیثیت بھی حاصل تھی "نیا دور" کے پہلے اداریہ میں وجہ اشاعت کے طور پر بتایا گیا:

" رسالہ نکالنے کی خواہش اور وہ بھی اچھا رسالہ نکالنے کی خواہش اس بچے کی خواہش سے کم نہیں ہوتی جو بضد ہوتا ہے کہ مجھے چندا ماموں لا دو، اور پھر ایسا ہی رسالہ نکال لینا اتنا ہی دشوار ہے جتنا بچے کو چندا ماموں لا دینا۔۔ اتنی جگر کاوی کرنی پڑتی ہے جتنی فرہاد کو جوئے شیر لانے میں نہ کرنی پڑی ہو گی " (۸۸)

" نیا دور " کے پیش نظر صحت مند مقاصد تھے۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ " نیا دور " کے نام نے جہاں سالوں ہماری ادبی تشنگی کو سیراب کیا ہے، وہاں اس نے ادب کا ایک معیار بھی قائم کر دیا تھا اور اس نئے رسالے نے " نیا دور " ہی نام اختیار کیا تو اس کی وجہ جواز یہ پیش کی۔

" یہ تو مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ کراچی سے اس نام کا کوئی فلمی رسالہ نکلے " (۸۹)

مدیران " نیا دور " کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ " تخلیقی لگن اب ادیبوں کے دلوں میں سرد پڑ چکی ہے۔ بڑے بڑے لوگ خاموش ہیں، باوجود اس کے افسانے اب بھی لکھے جا رہے ہیں، نظمیں اب بھی کہی جا رہی ہیں مگر نہ جانے کیوں ہمارا ادب ہمارا معلوم نہیں ہوتا۔۔ بحیثیت مجموعی آج ادب کا وہ ہنگامہ اور زور شور نہیں ہے جو آج سے آٹھ دس سال پہلے تھا۔ ایک تحریک تھی، ایک قوت تھی،

جس کی نمائندگی ہر شخص اپنے طور پر کر رہا تھا۔ ہر شخص لکھنا اور اچھا لکھنا اپنا ایمان سمجھتا تھا۔ مگر آج تو لوگوں کے سامنے یہ سوال ہے کہ کیوں لکھیں؟" (۹۰)

اس دور میں ہی یہ نعرہ بھی ابھرا تھا کہ " ادب پر جمود طاری ہو گیا ہے " اس نعرے کی بالواسطہ صدا متذکرہ بالا اقتباس میں بھی موجود ہے۔ " نیا دور " نے ادب کے جمود کو توڑنے ' ادیبوں کو تحرک آشنا کرنے اور تخلیقی عمل کو فعال صورت دینے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ معمول یا ضابطے کی کارروائی سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے بعد " نیا دور " نے ادبی معاشرے اور اردو دنیا کی تنقید کا منصب سنبھال لیا۔ اس کے کچھ نقوش " نیا دور " ۳ ' ۴ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

" پاکستان کی نئے سرے سے تعمیر ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہمیں ایک نئے ادب کی داغ بیل ڈالنی چاہیے ہمارے ادب میں ریاست کے ساتھ وفاداری کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے ' مذہبی تصورات کی آمیزش ہونی چاہیے جیسے ملٹن کی " فردوس گم گشتہ " میں تھی یا گوئٹے کے ناولٹ میں۔ ہمارے ادب میں پاکستان کے مختلف علاقوں کے کلچر کی عکاسی ہو جیسے واٹیرڈ ہارڈی اور آرنلڈ بینٹ نے کی ہے " (۹۱)

اس سے اگلے شمارہ (۵ ' ۶) میں اس ذہنی انتشار کا مسئلہ اٹھایا گیا جو بیسویں صدی کے انسان کو پریشان کر رہا ہے:

"سائنٹفک نظریات نے عقائد کو متزلزل کر دیا ہے اور اس طرح انسانی نظریات کی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ اب مذہب عبادت تک محدود تو رہ سکتا ہے لیکن سماج میں ترقی پذیر قوتوں کا اضافہ اس کے بس کا روگ نہیں ہے بلکہ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم انسان سے انسان کے تعلقات کو سمجھیں اور پھر اس تصور زندگی سے اپنے افعال و اعمال کو پرکھیں ' سنواریں اور ترتیب دیں کیرک گارڈ کی یہ بات ہمیں بار بار یاد آتی ہے کہ " آیئے بس اب ہم آدمی بن جائیں " اور اگر دیکھا جائے تو اس میں ہماری ذات اور معاشرہ کی فلاح کا راز مضمر ہے " (۹۲)

ان دو اقتباسات سے اس دور کی وہ پریشان خیالی نظر آتی ہے جو معاشرے میں روز افزوں پھیل رہی تھی۔ جس سے تعلیم یافتہ طبقہ اور بالخصوص ادبا کا طبقہ زیادہ دو چار تھا۔ " نیا دور " نے اپنے ادارتی صفحات پر اسی قسم کے متعدد سوالات پیدا کئے ' ادب سے خالص تنقید اور سچ بولنے والے نقاد کے غائب ہو جانے کی اطلاع دی ' فقرے بازی کے رجحان کی مذمت کی ' نئی علامتوں اور نئے استعاروں کی تخلیق کی ضرورت کا احساس دلایا ' پاکستان میں ادیبوں کو پیش آنے والے مسائل اور انکی ذہنی الجھنوں کی نشان دہی کی اور یوں " نیا دور " نے مجموعی طور پر ایک ایسے رہنما کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کی ' جو زمانے کے تناظر کو سامنے رکھ کر سوچتا ہے اور پھر واضح رد عمل کا اظہار کر دیتا ہے۔

"نیا دور" نے اپنے صفحات پر بالعموم ایسے مضامین کو زیادہ اہمیت دی جن سے ادب کا کوئی نیا مسئلہ سامنے آتا تھا' نیا مبحث پیدا ہوتا تھا' یا ذہن کو جلا ملتی تھی' اس ضمن میں محمد صفدر کا مقالہ "ادیب اور آئیڈیا لوجی"۔ آغا عبدالمجید کا "فن اور سنسنی خیزی" جوگندر پال کا "اظہار کے تخلیقی مسائل" شمیم احمد کا "۲+۲=۵" ڈاکٹر جمیل جالبی کا "ادب سائنس اور نئی نسل" محمد حسن عسکری کا "رومال کی زنجیر" سلیم احمد کا "غزل' مظفر اور ہندوستان" محض چند عنوانات ہیں جو یہاں بطور حوالہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ "نیا دور" نے ادب کی کلاسیکی روایت سے بھی اپنا رابطہ قائم رکھا اور ڈاکٹر سید عبداللہ' مجنوں گورکھ پوری' امتیاز علی عرشی' ڈاکٹر شوکت سبزواری' مسعود حسن خان' رشید احمد صدیقی' ضمیر نیازی اور محمد ہادی کے ایسے مضامین کو بھی پیش کیا جن میں پرانے شاعروں کی دریافت نو کی گئی تھی

"نیا دور" نے اردو افسانے کو فروغ دینے میں خصوصی دلچسپی لی ہے' اس کے ہر شمارے میں افسانوں کو اولیں حیثیت دی جاتی اور دوسرے تیسرے سال ایک دقیع افسانہ نمبر بھی پیش کیا جاتا تھا۔ "نیا دور" نے ایسے افسانے کی سرپرستی کی جس میں ماجرا' کردار' پلاٹ اور فضا کی معاونت سے پوری کیفیت پیدا کرتا ہے اور قاری کو کہانی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ تجرید اور علامتی افسانے کو نیا دور کے صفحات پر بہت کم جگہ ملی ہے۔ ایک طویل عرصے تک "نیا دور" میں کتابوں پر تفصیلی تبصرے شائع کرنے اور ان کے حسن و قبح اور مصنف کی تعیین قدر کا فریضہ سرانجام دیا جاتا رہا۔ لیکن اب کچھ عرصے سے تفصیل نے اجمال کی اور تجزیے نے تاثر کی صورت اختیار کر لی ہے اور تبصرے کا حصہ محض کتابوں کی اشاعت کا اطلاع نامہ بن کر رہ گیا ہے۔

"نیا دور" کو ایک آزاد فورم کی حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسے ہر نقطہ نظر پر بحث اٹھانے کی اجازت دی لیکن انتہا پسندی سے ہمیشہ گریز کیا۔ نیا دور اب اپنی اشاعت کو باقاعدہ نہیں رکھ سکا' اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی منصبی مصروفیات ہیں۔ اس سب کے باوجود سال میں ایک آدھ مرتبہ جب "نیا دور" کا نیا پرچہ آ جاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ویرانے میں بہار آ گئی ہے اور پھر اس کے مضامین کا تذکرہ مہینوں تک ہوتا ہے۔ چنانچہ "نیا دور" ایک ایسا پرچہ ہے جو ردِ عمل پیدا کرتا ہے آپ کے خیالات کو مہمیز لگاتا ہے اور آپ کو بانداز دگر سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔

"سحر"۔ لاہور

آزادی کے بعد ستمبر ۱۹۴۷ء میں الطاف پرواز نے لاہور سے ماہنامہ "سحر" جاری کیا اس

پرچے میں ان کی شریک ادارت ان کی بیگم نسیم سحر تھیں۔

"سحر" مرنجاں مرنج مزاج کا معتدل پرچہ تھا جو تخلیقی اصناف کی خدمت اور فروغ ادب کے جذبے سے معرض عمل میں آیا تھا کچھ عرصے کے بعد جب ترقی پسند رسائل پر پابندی لگ گئی اور "سحر" مالی پریشانیوں کا شکار ہو گیا تو "سحر" کو ترقی پسند ادبا نے اپنے تصرّف میں لے لیا۔ یہ "سحر" کا دوسرا دور تھا اور اس میں "سحر" نے ترقی پسندانہ رویے کے انتہا پسندانہ مضامین کو فوقیت دی اور یہ ادب لطیف اور نقوش کا بدلا ہوا روپ نظر آنے لگا لیکن کچھ عرصے کے بعد "سحر" سے ترقی پسند ادبا نے تعاون ختم کر دیا اور یہ پرچہ بھی بند ہو گیا۔ مارچ ۱۹۴۸ میں "سحر" کا "بہار نمبر" اس کی ایک خاص اشاعت ہے اس کی دوسری خاص اشاعت سالنامہ ۱۹۴۹ء ہے۔ "سحر" کے آثار اشاعت مارچ ۱۹۵۳ء تک نظر آتے ہیں۔

"فانوس"۔ لاہور

ریاض جاوید نے پندرہ روزہ "فانوس" نومبر ۱۹۴۷ء میں لاہور سے جاری کیا۔ ملک کی آزادی کے اس ابتدائی دور میں "فانوس" پڑھنے والوں کی کثرت کو اپنی جانب متوجہ نہ کرا سکا چنانچہ اپریل ۱۹۴۸ء میں اس کی ادارت نسیم ایم اے نے سنبھال لی۔ انہوں نے اگست ۱۹۴۸ء میں "فانوس کا آزادی نمبر" شائع کیا لیکن ابتداء ہی میں یہ پرچہ غیر موثر ہو گیا اور کئی ہاتھوں میں گشت کرتا رہا۔ اس کی ایک یادگار اشاعت "غالب نمبر" ہے جو فروری ۱۹۶۲ء میں چھپی۔

"کائنات"۔ لاہور

ماہنامہ "کائنات" کا اجرا امرتسر سے ہوا تھا لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ لاہور منتقل ہو گیا اور تا دیر یہیں سے اشاعت پذیر ہوتا رہا، اس کی ادارت غلام محمد اور حامد علی حامد سرانجام دیتے رہے تھے، "کائنات" کا بنیادی مقصد اردو ادب کی خدمت تھا اور اس میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ادبا کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں، نظریاتی لحاظ سے "کائنات" نے کسی ادبی گروہ کے ساتھ وابستگی اختیار نہیں کی اور مضامین کے انتخاب میں خالصتاً ادبی اسلوب اور جمالیات کو ملحوظ نظر رکھا، چنانچہ "کائنات" ایک ایسا صاف ستھرا ادبی جریدہ تھا جسے ادبا کے سب حلقوں میں قبول عام حاصل تھا۔

"سب رس" (کراچی)

رسالہ "سب رس" حیدر آباد دکن سے جنوری ۱۹۳۸ء میں ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام جاری ہوا تھا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس کے نگران اور خواجہ حمید الدین شاہد اس کی مجلس ادارت کے رکن تھے' اعلیٰ پائے کے لطیف و متین' ادبی اور تحقیقی مضامین کی اشاعت سے "سب رس" نے اردو ادب کو متاثر کیا اور یہ سلسلہ دکن سے تا حال جاری ہے۔ آزادی کے بعد خواجہ حمید الدین شاہد پاکستان آ گئے' انہوں نے یہاں کراچی میں "ایوان اردو" کی داغ بیل ڈالی اور مرکزی اردو بورڈ میں خدمات سرانجام دینے کے بعد ۱۹۷۵ء میں فارغ ہوئے تو انہوں نے صحافت سے اپنا پرانا ناتہ "سب رس" کے ذریعے قائم کرنے کا ارادہ کیا' شاہد صاحب نے "سب رس" کا پہلا پرچہ دسمبر ۱۹۷۷ء میں "اقبال نمبر" کے نام سے کراچی سے شائع کیا' ان کا مقصد پڑھنے والوں کو ایک شائستہ پرچہ فراہم کرنا تھا' دوسرا مقصد زبان کی مقبولیت میں اضافہ کرنا ہے۔ خواجہ حمید الدین شاہد علالت طبع کے باوجود "سب رس" ہر ماہ باقاعدگی سے شائع کر رہے ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول میں پوری طرح کوشاں ہیں۔

"سب رس" کا مزاج کلاسیکی ہے' اس جریدے نے پاکستان میں حیدر آباد کے مصنفین کو متعارف کرانے کی خدمات سرانجام دی ہیں' صوری لحاظ سے "سب رس" جاذب نظر نہیں' اس کی کتابت اور طباعت بھی گوارا ہوتی ہے' لیکن شاہد صاحب کم قیمت پر اپنے قارئین کو پرچہ فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ "سب رس" نے دو جلدوں میں "یادرفتگاں نمبر"۔ "اقبال نمبر" اور "ممتاز حسن" نمبر پیش کئے ہیں۔ یہ تینوں خاص نمبر اب حوالے کی کتابیں بن چکی ہیں۔

"چراغ راہ"۔ کراچی

ماہنامہ "چراغ راہ" جنوری ۱۹۴۷ء میں جاری ہوا۔ اس کا مقصد ادب کے وسیلے سے اسلامی انقلاب برپا کرنا اور معاشرتی قدروں کی تقلید تھا۔ اس کی ادارت مختلف اوقات میں تبدیل ہوتی رہی چنانچہ ابتدا میں نعیم صدیقی' غلام محمد اور جیلانی صاحب "چراغ راہ" کے مدیر تھے۔ بعد میں خورشید احمد' مصباح الاسلام' احمد انس اور ممتاز احمد پر مشتمل مجلس ادارت ترتیب دی گئی۔ اس کے لکھنے والوں میں محمد عثمان رمز' ابن فرید لالہ صحرائی' نعیم صدیقی' جیلانی بی اے' صدیق الحسن گیلانی' عبداللہ خاور۔

اسعد گیلانی، زکی زاکانی، فضل من اللہ، اسرار احمد سہاوری، لالہ صحرائی، حفیظ الرحمن احسن، فروغ احمد، آسی کرنالی، طالب حجازی اور ابوالحسن علی ندوی کے نام بے حد اہم ہیں۔ "چراغ راہ" نے ادب اسلامی کو فروغ دینے کی جدو جہد کی اور ایسے موضوعات پر لکھنے والوں کو دعوت دی جن سے ادب اور انسانیت کی اخلاقی قدریں آشکار ہوتی تھیں۔ اس ضمن میں محمد عزیز کا مقالہ "اقبال اسلامی نظریہ ادب کی روشنی میں" لالہ صحرائی کا "اسلامی مشرق کے جدید محرکات" اسرار احمد سہاوری کا "ادب اسلامی کی جمالیاتی قدریں" اے کے بروہی کا "تاریخ انسانی پر قرآن کے اثرات" ابوالاعلیٰ مودودی کا "علمی تحقیقات کیوں اور کس طرح" کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ "چراغ راہ" کا "سوشلزم نمبر" ۱۹۶۷ء اور "احتجاج نمبر" ۱۹۵۳ء اس کی دو خاص اشاعتیں ہیں جن کے مضامین نے برصغیر میں طغیان بحث پیدا کیا۔ "چراغ راہ" خالص نظریاتی اور فکری پرچہ تھا، اس نے توازن و اعتدال سے مباحث کو ابھارا اور قاری کو اسلامی ادب کی فکری جہت سے آشنا کرنے کی سعی کی۔

○

حوالہ جات

۱۔ رسالہ " اردو "۔ اورنگ آباد۔ جنوری ۱۹۲۱ء

۲۔ امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" جلد پنجم۔ ص ۷۷۸

۳۔ رسالہ " اردو " کراچی۔ جولائی ۱۹۳۹ء۔ اندرون سرورق

۴۔ شاہ دین ہمایوں ماہنامہ "ہمایوں" جنوری ۱۹۲۲ء۔ ص ۲۔ لاہور

۵۔ عبدالصمد صارم رسالہ "نیچر" "لاہور نمبر"۔ لاہور ۲۵

۶۔ "بزم ہمایوں" جنوری ۱۹۳۷ء "ہمایوں" لاہور۔ ص ۷

۷۔ میاں بشیر احمد "بزم ہمایوں" جنوری ۱۹۳۴ء "ہمایوں" لاہور ص۔ ۳، ۴

۸۔ "بزم ہمایوں" فروری ۱۹۳۸ء، ص ۴۳

۹۔ ایضاً

۱۰۔ موئف کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسے ہمایوں کے اس دور میں افسانہ نگار کے طور پر متعارف ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ " ستاروں کے شکار میں " (جنوری ۱۹۵۰ء) سے لے کر " شمع سوزاں " (فروری ۱۹۵۴ء) تک موئف کے دس افسانے "ہمایوں" میں چھپے۔

۱۱۔ "بزم ہمایوں" جنوری ۱۹۵۵ء "ہمایوں" ۔ ص ۳

۱۲۔ ایضا" ۔ جنوری ۱۹۵۷ء۔ ص ۳

۱۳۔ نیاز فتح پوری "نگار" فروری ۱۹۲۲ء۔ ص ۵

۱۴۔ ایضا "

۱۵۔ نیاز فتح پوری "استفسارات وجوابات نیاز" جلد اول ۔ ص ۱۰۰

۱۶۔ "نگار" نومبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۵ (اشاعت مکرر)

۱۷۔ ایضا "

۱۸۔ ڈاکٹر امیر عارفی "نیاز فتح پوری" ص ۳۱۷

۱۹۔ "نگار" کے نام سے ایک فلمی پرچہ کراچی سے شائع ہو رہا تھا۔ اس لئے نام کی تبدیلی قانونی ضرورت بن گئی (انور سدید)

۲۰۔ اس ادبی سیمینار میں اب نیاز فتح پوری سالانہ خطبے کا اضافہ کر دیا گیا ہے ۔ اس میں شرکت کے لئے پاکستان کے علاوہ ہندوستان کے اہل ادب کو بھی مدعو کیا جاتا ہے ۔ ڈاکٹر خلیق انجم ' ڈاکٹر مسعود حسین خان ' پروفیسر رشید حسن خان' ڈاکٹر تنویر احمد علوی' ڈاکٹر وزیر آغا' احمد ندیم قاسمی' سبط حسن ' ڈاکٹر جمیل جالبی' رضی الدین صدیقی اور متعدد دوسرے نامور ادبا اس سیمینار میں خصوصی مقالے پیش کر چکے ہیں۔

۲۱۔ بحوالہ "سلور جوبلی نمبر" لاہور ۱۹۳۹ء مرتبہ: عبدالمجید سالک

۲۲۔ ایضا " ۔ ص ۷

۲۳۔ حکیم یوسف حسن اداریہ "نیرنگ خیال" جولائی ۱۹۲۴ء ۔ ص ۳

۲۴۔ بحوالہ "تاثیر نمبر" ۔ ص ۱۲

۲۵۔ شاہد احمد دہلوی "نقوش" "لاہور نمبر" ص ۱۱۳۳

۲۶۔ حکیم یوسف حسن "پیش لفظ' اقبال نمبر" طبع اول ۱۹۳۲ء

۲۷۔ ڈاکٹر تاثیر "نثر تاثیر" ص ۵۱۶ ۔ مجلس ترقی ادب' لاہور ۱۹۷۸ء

۲۸۔ ایضا "

۲۹۔ بحوالہ "تاریخ صحافت اردو" جلد پنجم ۔ ص ۹۰۸

۳۰۔ یوسف حسن " آپ بیتی" "جوبلی نمبر" ۱۹۷۸ء

۳۱۔ "باتیں" حکیم یوسف حسن۔ سالنامہ ۱۹۶۷ء۔ ص ۱۱

۳۲۔ "نیرنگ خیال" سالنامہ ۱۹۶۷ء۔ ص ۳۷۷

۳۳۔ "تاریخ صحافت اردو" امداد صابری۔ جلد پنجم۔ ص ۹۱۳

۳۴۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور۔ فروری ۱۹۳۵ء۔ ص ۳

۳۵۔ ایضاً "

۳۶۔ "اورینٹل کالج میگزین "جشن صد سالہ نمبر ۱۹۷۳ء

۳۷۔ یہ خاص نمبر ایک علمی انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اورینٹل کالج کے اساتذہ کے علمی کام کی یہ بنیادی کتابیات بھی ہے۔

۳۸۔ محمد عبداللہ قریشی "ادبی دنیا کی سرگزشت" "صحیفہ" لاہور، مارچ ۱۹۸۲ء

۳۹۔ "ادبی دنیا" اپریل ۱۹۳۲ء۔ ص ۳

۴۰۔ میرا جی کے بعض مضامین "بسنت سہائے" کے نام سے بھی "ادبی دنیا" میں شائع ہوئے۔

۴۱۔ "امروز" لاہور۔ ۷ جون ۱۹۸۵

۴۲۔ "ادبی دنیا" میں نظم کا تجزیہ شاعر کا نام پوشیدہ رکھ کر کرایا جاتا تھا (انور سدید)

۴۳۔ اس بحث میں غلام جیلانی اصغر، نظیر صدیقی اور وزیر آغا نے حصہ لیا تھا۔

۴۴۔ "بزم ادب" اکتوبر ۱۹۶۵ء۔ ص ۵

۴۵۔ بحوالہ "امروز" لاہور۔ ۷ جون ۱۹۸۵ء

۴۶۔ بحوالہ "صحیفہ" لاہور۔ مارچ ۱۹۸۳ء۔ ص ۱

۴۷۔ ایضاً "

۴۸۔ ایضاً"

۴۹۔ حسام الدین راشدی "ساقی"" شاہد احمد نمبر"۔ ص ۸۰

۵۰۔ شاہد احمد دہلوی اداریہ "ساقی" جنوری ۱۹۳۰ء

۵۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "ساقی"" شاہد احمد نمبر"۔ ص ۶

۵۲۔ "نگاہ اولیں"۔ از شاہد احمد، ستمبر ۱۹۴۸ء

۵۳۔ "نگاہ اولیں"۔ جون ۱۹۶۷ء

۵۴۔ شاہد احمد دہلوی۔ "خود نوشت سوانح شاہد نمبر"۔ ص ۶۵۳

۵۵۔ "اختلافات" مکتبہ اردو زبان' سرگودھا' ص ۱۴۳

۵۶۔ "ساقی" ہمیشہ ۸/۳۰x۲۰ انچ سائز پر نکلتا رہا۔

۵۷۔ "ادب لطیف جوبلی نمبر" ۱۹۶۳ء۔ ص ۲۸۸

۵۸۔ میرزا ادیب "مٹی کا دیا" ص ۲۳۹۔ لاہور ۱۹۸۱ء

۵۹۔ بیدار ملک "یاران مکتب"۔ ص ۲۴۶۔۲۴۷۔ لاہور ۱۹۸۶ء

۶۰۔ "مٹی کا دیا"۔ ص ۳۳۱

۶۱۔ انتظار حسین۔ "جوبلی نمبر"۔ ص ۴

۶۲۔ سالنامہ "ادب لطیف"۔ ۱۹۴۵ء۔ ص ۸

۶۳۔ اداریہ "ادب لطیف"۔ سالنامہ ۱۹۴۶ء۔ ص ۵

۶۴۔ عارف عبدالمتین "جوبلی نمبر" ص ۲۹۲

۶۵۔ "عارف عبدالمتین۔ جوبلی نمبر" ۱۹۶۳ء۔ ص ۲۹۳

۶۶۔ میرزا ادیب "پیرایہ آغاز" جولائی ۱۹۶۲ء۔ ص ۳

۶۷۔ انتظار حسین "ادب لطیف" اکتوبر ۱۹۶۲ء۔ ص ۳

۶۸۔ اظہر جاوید کا ذاتی ادبی جریدہ

۶۹۔ انتظار حسین، اظہر جاوید اور میرزا ادیب کے ادبی مزاج کے حوالے سے دیکھیے

۷۰۔ شذرات "شاہکار" اپریل ۱۹۳۵ء۔ ص ۶

۷۱۔ ن۔ م راشد۔ ایضاً "۔ ص ۴

۷۲۔ "شاہکار" لاہور۔ جنوری ۱۹۳۵

۷۳۔ "شاہکار" مارچ ۱۹۵۰

۷۴۔ قدوس صہبائی "خود نوشت سوانح" "افکار" کراچی۔ جون ۱۹۷۷ء۔ ص ۴۰

۷۵۔ مولف کے ابتدائی افسانے "نظام" میں چھپے تھے۔ قدوس صہبائی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ذاتی خطوط سے بھی کرتے تھے۔

۷۶۔ "افکار" جولائی ۱۹۷۷ء۔ ص ۲۳

۷۷۔ اے حمید "گلیاں۔ چاند، چہرے"، "نوائے وقت" لاہور۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء

۷۸۔ آغاز کار "افکار" سلور جوبلی نمبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۲۱

۷۹۔ انور سدید "اختلافات" ص ۱۳۵

۸۰۔ محترمہ ادا جعفری کی خود نوشت سوانح اب چھپ رہی ہے۔

۸۱۔ نذیر احمد چودھری "مجھے بھی کچھ کہنا ہے" "سویرا" شمارہ نمبر ۱

۸۲۔ "بات چیت" از ادارہ، حوالہ ایضاً

۸۳۔ یہ ۳۶/۸ x ۲۳ سائز تھا۔ اس سائز پر سب سے پہلے بھوپال سے "افکار" جاری ہوا۔ شیخ عبدالقادر کے دور میں بیشتر ادبی رسائل اس سائز میں اس چھپتے تھے۔

۸۴۔ "بات چیت"" "سویرا" نمبر۱۲۔ ص ۵

۸۵۔ اداریہ "سویرا" شمارہ ۱۳' ۱۴' ص ۴' ۵

۸۶۔ "بات چیت" حنیف رامے "سویرا" شمارہ ۱۵' ۱۶

۸۷۔ اداریہ۔ شمارہ ۷۔۸۔ ص ۴

۸۸۔ اداریہ "نیادور" شمارہ اول۔ ص ۵

۸۹۔ اس سے قبل نیاز فتح پوری کے رسالہ "نگار" کے نام پر کراچی سے ایک قلمی پرچہ نکلنے لگا تھا۔

۹۰۔ "نیا دور" شمارہ اول۔ ص ۶

۹۱۔ اداریہ "نیا دور" شمارہ سوم و چہارم۔ ص ۵

۹۲۔ اداریہ "نیا دور" شمارہ پنجم۔ ششم۔ ص ۸

چھٹا باب

پاکستان میں نئے ادبی رسائل

"ماہ نو" (کراچی، اسلام آباد، لاہور)

"ماہ نو" کراچی سے ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا۔ اس کے ادارت کے فرائض سید وقار عظیم نے سر انجام دیئے جو حکومت ہند کی نگرانی میں شائع ہونے والے جریدہ "آج کل" کے متحدہ ہندوستان کے آخری دور کے مدیر تھے، لیکن اسے "آجکل" کی توسیع قرار دینا مناسب نہیں، سید صاحب نے اسے ایک قومی رسالہ بنانے کے لئے اس کے ابتدائی خطوط وضع کئے اور سرکاری پرچہ ہونے کے باوجود اس کی ادبی جہت آشکار کی، ۱۹۵۰ء میں محمد حسن عسکری نے "ماہ نو" کو مباحثوں سے فعاّل بنایا اور غیر ملکی زبانوں کے تراجم سے اسے عالمگیر ادب سے روشناس کرانے کی طرح ڈالی، ان دونوں کا عرصہ ادارت زیادہ طویل نہ تھا۔ "ماہ نو" کا تیسرا طویل دور رفیق خاور اور ظفر قریشی کی معاونت سے شروع ہوا اور اب یہ ایک ایسے مقصدی پرچے کی صورت اختیار کر گیا جس میں مدیر، مصنف اور قاری تینوں ایک مضبوط مثلث کے ضلع تھے، یہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اور اپنے اثرات باہم تقسیم کر رہے تھے۔ اس طویل دور میں "ماہ نو" نے قومی سرگرمیوں کو ملحوظ نظر رکھا اور سماجی کروٹوں کو ادب کے وسیلے سے پیش کرنے کی سعی کی، مسائل و معاملات پر تبادلہ خیال کی راہ ہموار کی، مقامی زبانوں میں ارتباط پیدا کیا اور مختلف علاقائی ثقافتوں کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کی طرح ڈالی، اس دور میں ماضی حال کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا ہے اور حال کامیابی سے مستقبل کی طرف سفر کر رہا ہے۔ ملک کی سیاسی فضا اگرچہ انتشار کی زد میں تھی، لیکن قومی ثقافت "ماہ نو" کے صفحات میں جڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ رفیق خاور اور ظفر قریشی نے "ماہ نو" کو ادب اور ثقافت کی مضبوط بنیاد فراہم کر دی تھی۔ فضل قدیر کے دور ادارت میں اس حکمت عملی پر ثابت قدمی سے عمل کیا گیا، عوامی کہانیوں، لوک گیتوں، علاقائی شہ پاروں اور مشاہیر فن و ادب کو متعارف کرانے کا رجحان اس دور میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اس عرصے میں "ماہ نو" نے کراچی سے اسلام آباد اور پھر لاہور کی طرف سفر طے کیا۔ اسلام آباد میں "ماہ

نو" اپنی جڑیں زمین میں اتار نہ سکا۔ چنانچہ اس کی شاخیں مرجھانے لگیں۔ کچھ عرصے کے لئے اس کی اشاعت متزلزل ہو گئی اور اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا' لیکن پھر اس کی ادبی اور ثقافتی افادیت کا احساس پیدا ہو گیا تو "ماہ نو" کو لاہور منتقل کر دیا گیا۔ کشور ناہید اس کی مدیر مقرر ہوئیں اور پھر یوں ہوا کہ جیسے "ماہ نو" کو لاہور کا پانی راس آگیا۔ اس دوران میں کچھ عرصے کے لئے قائم نقوی صاحب نے بھی "ماہ نو" کی ادارت کے فرائض سرانجام دیئے لیکن یہ عرصۂ ادارت کشور ناہید کے ادارتی خصائص میں دبا ہوا ہے۔ چنانچہ موجودہ دور کو "ماہ نو" کا "کشور ناہید دور" قرار دیا جائے تو اس تسمیہ کی وہ حق دار ہیں۔ کشور ناہید نے "ماہ نو" کو ایک ایسا ماہ نامہ بنا دیا جس میں قومی' علاقائی اور بین الاقوامی لہریں اپنا تمام جزر و مد قاری کو منتقل کر دیتی ہیں' "ماہ نو" کے صفحات پر تصوّرات کے آئینے آپس میں ٹکراتے ہیں لیکن اس سے تناؤ پیدا نہیں ہوتا' بلکہ تنوع سامنے آتا ہے اور گھٹن دور ہوتی ہے' حقیقت معنی خیز انداز میں شعور کی سطح پر آتی ہے اور ادب و فکر کی عالمی لہروں سے اردو ادب میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ کشور ناہید نے "ماہ نو" کو ایک ایسا ادبی' ثقافتی اور علمی جریدہ بنا دیا جس کا مدیر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ تخلیقات سے صرف جمالیاتی تسکین حاصل نہیں کر رہا بلکہ اس کے خیال کی رو کو ایک مخصوص سمت کی طرف لے جانے کی سعی بھی ہو رہی ہے۔ "ماہ نو" کی یہ سمت قومی یک جہتی کی سمت ہے' جس میں پاکستان کے دس کروڑ عوام کے قدم آپس میں مل جاتے ہیں اور سب آوازیں صرف ایک آواز میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ "ماہ نو" سرکاری پرچہ نظر نہیں آتا' قومی پرچہ محسوس ہوتا ہے۔ جو زمانے کی جزر و مد کو دیکھتا ہے لیکن اپنے ادبی اور قومی نصب العین سے منحرف نہیں ہوتا۔

"ماہ نو" کی خوش قسمتی یہ بھی ہے کہ اسے خوش فکر شاعر' کشادہ نظر نقاد' اور بیدار مغز ادیب مرتب کرتے رہے' "ماہ نو" کی ادارت ان کے لئے فرض منصبی کی ادائیگی بھی تھی اور اپنے ذوق کی تکمیل بھی۔ انہوں نے اس عمل سے ادبی رہنمائی کا فریضہ بھی ادا کیا چنانچہ اصناف ادب کے اعتبار سے ماہ نو کو ہر صنف کے نمائندہ ادیبوں کا تعاون حاصل ہوا اور اس کے صفحات پر متعدد نادر تخلیقات کو عوام سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ مثال کے طور پر افسانے کی صف میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ "عشقیہ کہانی" عزیز احمد کا "خدنگ جستہ" غلام عباس کا "گوندنی والا تکیہ" اشفاق احمد کا "توتا کہانی" مسعود مفتی کا "دوزخ" غلام الثقلین نقوی کا "شیرا نمبردار" احسان ملک کا "شاہکار" انور کا "پیاسے کو قطرہ" فرخندہ لودھی کا "کوپی" "ماہ نو" میں ہی چھپے' بڑے افسانہ نگاروں کے ساتھ سلیم آغا قزلباش' طارق محمود' نوشابہ نرگس' عذرا اصغر' ظفر نیازی' اختر امان' طارق جامی اور متعدد دوسرے افسانہ نگاروں کو گذشتہ چالیس سال کے عرصے میں "ماہ نو" نے اعتبار فن عطا کیا ہے۔

"ماہ نو" نے شاعری کے افق کو بھی مختلف النوع شعرا کی تخلیقات سے منور کیا' چنانچہ عابد علی عابد' حفیظ جالندھری' ہادی حسین' رئیس امروہوی' ذوالفقار علی بخاری' حفیظ ہوشیار پوری' احسان دانش' صوفی تبسم' یگانہ چنگیزی' سیماب' فراق' جوش' وحشت' اثر لکھنوی جیسے اساتذہ فن کی منظومات کے ساتھ مرتضیٰ برلاس' ناصر زیدی' نذیر قیصر' افتخار عارف' خورشید رضوی' صابر ظفر' اکبر حمیدی' غلام حسین ساجد' رشید نثار' لطیف ساحل' مقبول عامر' منور ہاشمی' باصر سلطان کاظمی اور قمر رضا شہزاد کو بھی پیش کیا گیا جن کی نمود اوّل آزادی کے بعد ہوئی تھی۔

"ماہ نو" نے تنقید و تحقیق کے متعدد ایسے مضامین پیش کیے جن سے ادب اور ذہن دونوں کو جلا ملتی رہی۔ پطرس بخاری کا "آج کا اردو ادیب" ڈاکٹر یوسف حسین خان کا "موج تغزل" وزیر آغا کا "سمبلزم کی تحریک"۔ رشید احمد صدیقی کا "کچھ حسرت کے بارے میں" مولانا صلاح الدین احمد کا "شعر و ادب میں اسلامی اصطلاحیں" ڈاکٹر گیان چند کا "ادب اور اخلاق" وقار عظیم کا "اندر سبھا کی ادبی حیثیت" انتظار حسین کا" ناول میں کہانی کا عنصر" ممتاز شیریں کا "نیا ادب" محمد احسن فاروقی کا "تنقید علم و فن" محض چند عنوان نمونے کے طور پیش کیے جاتے ہیں۔ "ماہ نو" میں جو نئے نقاد مصروف تنقید نظر آتے ہیں ان میں تبسم کاشمیری' محمد علی صدیقی' ابوالکلام قاسمی' ڈاکٹر انوار احمد' سہیل احمد خان' رضی عابدی' سعادت سعید' قاضی جاوید اب اہم نام شمار ہوتے ہیں۔

"ماہ نو" نے انشائیہ' سفرنامہ' طنز مزاح اور ڈرامہ کی اصناف میں بھی اعلیٰ پائے کی تخلیقات پیش کیں' تاہم اس کی ایک بڑی عطا علاقائی زبانوں کے ادب کی پیش کش ہے۔ "ماہ نو" ہر سال فروری کے مہینے میں غالب پر اور اپریل کے مہینے میں اقبال پر مضامین پیش کرتا ہے' ان دو عظیم شعرا کی صد سالہ تقریبات پر "غالب نمبر" اور "اقبال نمبر" پیش کیے گئے' "ماہ نو" کے خاص نمبروں میں "سیرت نمبر" کا معیار تو بہت بلند تھا۔ قیاس غالب ہے کہ اس نمبر نے ہی نقوش کو رسول نمبر مرتب کرنے کی تحریک دی تھی "میر انیس نمبر" اور "میرزا دبیر نمبر" کے علاوہ "قائد اعظم نمبر" اور "انقلاب نمبر" کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ خاص نمبروں کی اس روایت کو کشور ناہید نے مزید مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے "اقبال نمبر" کے بعد چالیس سالہ نمبر شائع کیا جو "ماہ نو" کے مضامین کے انتخاب پر مشتمل تھا۔ اس کی حالیہ اشاعت "سارک نمبر" ہے جو صوری اور معنوی لحاظ سے بہت سراہا گیا ہے۔ "ماہ نو" نے فنون لطیفہ کو شاید پاکستان کے دیگر تمام رسائل سے زیادہ اہمیت دی ہے اور اس کے مدار میں تاریخی آثار کو بھی لے لیا ہے۔ چنانچہ مائن جوڈرو' گندھارا' نقاشی خطاطی' مجسمہ سازی' مصوری اور رسم الخط پر "ماہ نو" نے سب سے زیادہ مضامین پیش کیے ہیں۔ "ماہ نو" کے حالیہ دور میں موضوعاتی مذاکرے اس پرچے کا ایک اور گراں قدر اضافہ ہیں۔ "ماہ نو" حکومت پاکستان کا سرکاری پرچہ ہے لیکن

اس نے ادب اور فن کی ہمہ جہت خدمات سر انجام دی ہیں اور اس کا اعتبار قائم و دائم ہے۔

مجلس۔ لاہور

مقرب دہلوی کی ادارت میں ماہ نامہ "مجلس" کا طلوع لاہور سے جنوری ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی ادارت رضوی خیر آبادی نے سنبھالی اور انہوں نے مجلس کو ہر خاندان کے ہر فرد کا پسندیدہ رسالہ بنانے کی کوشش کی۔ اس میں بچوں، جوانوں، بوڑھوں اور عورتوں کی دلچسپی کے مضامین چھپنے لگے تو اس کی حیثیت ایک مقبول عام ڈائجسٹ پرچے کی ہو گئی اور افسانوں کی اشاعت کو فوقیت دی جانے لگی۔ مجلس میں قاسم محمود، اقبال منہاس، رام لعل، صفدر ادیب، احسن فاروقی، انتظار حسین، اشرف صبوحی، غلام الثقلین نقوی کے افسانے چھپتے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے "مجلس" کی غالب جہت ادب ہی قرار دی جا سکتی ہے۔

"ہم لوگ"۔ سرگودھا

"ہم لوگ" کے نام سے ۱۹۴۸ء میں ایک ادبی ماہنامہ سرگودھا سے شاعر شباب الطاف مشہدی نے جاری کیا۔ اس کا بنیادی مقصد علم و ادب کی خدمت اور عوام کے ادبی ذوق کی سیرابی تھا، الطاف مشہدی نے "ہم لوگ" کے لئے جگر مراد آبادی، سیماب اکبر آبادی، پروفیسر خلوت، کرشن چندر، عادل رشید، عبدالحمید عدم اور متعدد دوسرے نامور ادبا کا تعاون حاصل کر لیا تھا۔ اس کے مندر جات کی نوعیت ملغوبہ قسم کی تھی، الطاف مشہدی کے اپنے کلام کو نمایاں طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ پروفیسر رازی اور وزیر آغا کے درمیان شاعری میں ابہام کے مسئلہ پر ایک بحث اس کے اہم مندر جات کا حصہ ہے۔ اس پرچے کی ادارت میں کچھ عرصے کے لئے اصغر مشہدی نے ہاتھ بٹایا، لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد یہ پرچہ دم توڑ گیا۔ الطاف مشہدی نے پہلے اسے ہفت روزہ اخبار کی صورت دی اور پھر بند کر دیا "ہم لوگ" کی منفرد خوبی یہ تھی کہ یہ سرگودھا جیسے دور افتادہ مقام سے شائع ہوتا تھا اور پورے برصغیر میں پڑھا جاتا تھا۔

"چٹان" ۔ لاہور

شورش کاشمیری کا ہفت روزہ رسالہ " چٹان " جنوری ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا ۔ چٹان کا اساسی موضوع سیاست ہے لیکن اس نے ادب کو سماج کے ایک موثر وسیلے کے طور پر قبول کیا اور چٹان میں ہمیشہ ادب کی عملی قوت کو استعمال کرنے کی کاوش کی۔ شورش کاشمیری شدید ردِّ عمل کے ادیب تھے' ساحر لدھیانوی سے قربت اور دوستی کے باوجود وہ ترقی پسند تحریک اور اشتراکی نقطہ نظر کے شدید مخالف تھے' آزادی کے بعد انہوں نے ترقی پسند مصنفین سے چٹان کے صفحات پر ہی مجادلہ کیا۔ شورش کاشمیری نے "چٹان" کو خالص ادبی پرچہ کبھی شمار نہیں کیا لیکن اس کے صفحات پر خالص ادب پارے ہمیشہ شائع ہوتے رہے۔ ہر سال اپریل میں "اقبال نمبر" کی اشاعت اس کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ شورش نے خود بھی فکر اقبال کی تفہیم و تعبیر کے لئے متعدد مضامین لکھے اور ان میں سے بیشتر "چٹان" کے صفحات پر ہی شائع ہوئے۔ چنانچہ "چٹان" میں اقبالیات کا ایک نادر ذخیرہ جمع ہے اور بعض مضامین کی نوعیت تو خاصی نزاعی نظر آتی ہے۔ چودہری محمد حسین کا مقالہ "اقبال کا مخاطب عجم ہی کیوں تھا؟" عبدالقادر کا "فکر اقبال کا ارتقا" مولانا غلام رسول مہر کا "اقبال کی زندگی کا آخری دور" محمد حسین قرشی کا "شوال مے نہ کروں ساقی فرنگ سے میں" آفتاب احمد کا "اقبال اور ہمارے جدید شعرا" ابو سعید بزمی کا "اقبال اور اسلام"۔ اور شورش کاشمیری کا مقالہ "کلام اقبال کے مطالعہ کی دقتیں" یہاں حوالے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

فیض کی نظم "لاہور کی یاد میں" ساحر لدھیانوی کی "پرچھائیاں" چٹان ہی میں شائع ہوئی تھیں۔ دوسرے ادبی مضامین میں سے نعیم صدیقی کا "زندگی' ادب نظریہ اور اسلام"۔ ظہور الحسن ڈار کا "اے لالہ صحرائی" عذرا مسعود کا مضمون "عبدالعزیز خالد" شیخ تصدق حسین کا "بیگمات اودھ" کا حوالہ کافی ہے۔ شورش کے اشعار ارتجال ہر ہفتے شائع ہوتے تھے۔ ان کی آپ بیتی "دود چراغ محفل" کی اشاعت بھی "چٹان" میں ہوئی۔

شورش کی وفات کے بعد اب "چٹان" کو ان کے صاحبزادے مسعود شورش مرتب کرتے ہیں۔ اس کے سیاسی مزاج کے ساتھ اس کا ادبی مزاج بھی اسی جلال و جمال کے ساتھ "چٹان" میں موجودہ ہے جو کبھی شورش کے زمانے میں مرتب ہوا تھا۔ "چٹان" کی مجموعی ادبی خدمات بے حد قابل فخر ہیں اس تیز اور طرار مجلّے نے فی البدلیہ گوئی اور ارتجال نگاری کے علاوہ آپ بیتی اور خاکہ نگاری کی صنف کو پروان چڑھایا ہے۔

"نقوش" - لاہور

اردو کے بے مثال ادبی جریدہ " نقوش " نے اپنی زندگی کا آغاز مارچ ۱۹۴۸ء میں کیا - (۲)
نقوش کے بانی محمد طفیل نے لکھا ہے کہ :
"پہلے اسکی پرورش کے فرائض میرے بڑے بھائی احمد ندیم قاسمی اور چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور کے سپرد ہوئے "(۳)

نقوش کے پہلے شمارے کی پیشانی پر رقم تھا --- "زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا ترجمان"
اس دور میں ترقی پسند تحریک اپنی فعالیت کو باانداز دگر ظاہر کر رہی تھی اور مدیران " نقوش " اس تحریک کے سرگرم ارکان تھے ' چنانچہ ابتدا میں " نقوش " نے بھی ترقی پسند تحریک کی علمبرداری کے فرائض سرانجام دیئے اور اس میں ادبی مواد کے ساتھ نیم سیاسی مواد بھی پیش کیا گیا - اس کی روش جارحانہ ہو گئی اور ادب کے خاموش اور عبادت گزار عمل سے ہٹ کر " نقوش " کے " طلوع " میں اس قسم کے بیانات ظاہر ہونے لگے -

"ہم ملک کے تمام کارخانوں' زمینوں' اداروں' حتیٰ کی پیران عظام کے آستانوں کو بھی قومی ملکیت بنانا چاہتے ہیں" (۴) "نقوش" کے "جشن آزادی نمبر" میں آزادی اور ترقی پسندی دونوں کا رشتہ ازلی اور ابدی قرار دیا گیا اور لکھا گیا کہ: "ترقی پسند اس آزادی سے اب تک غیر مطمئن ہیں بلکہ اسے محکومی سے بھی پست درجہ دے رہے ہیں"- ان عزائم اور وسوسوں کے جلو میں "نقوش" کے صفحات کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی مضبوط تعمیر کے لئے وقف کر دیا گیا' چنانچہ "نقوش" اپنے ابتدائی دور میں ادبی مجلہ ہونے کے باوجود پارٹی آرگن زیادہ نظر آتا ہے اور اسے سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں چھ ماہ کی جبری پابندی کا سامنا بھی کرنا پڑا-(۵)

"نقوش" کا پہلا دور (مارچ ۱۹۴۸ء تا اپریل ۱۹۵۰ء) صرف دس ابتدائی شماروں پر مشتمل ہے۔ اس دور میں جو مضامین شائع ہوئے ان میں سید احتشام حسین کا "ادیب' حب الوطنی اور وفاداری" اختر انصاری کا "یہاں ڈالر اگتے ہیں" ظہیر بابر کا "یا خدا اور اس کا دیباچہ" ڈاکٹر عبادت بریلوی کا "اردو ادب کی ترقی پسند تحریک" چند اہم مضامین ہیں اور "نقوش" کے مزاج کی نشان دہی کرتے ہیں اس دور میں ادب کے سالانہ جائزے کی طرف توجہ بھی دی گئی' چنانچہ "جشن آزادی نمبر" میں "اردو نثر" "اردو فلم" کے موضوع پر جائزہ اور "اردو کا مستقبل کیا ہے؟" کے موضوع پر مذاکرہ بھی شامل اشاعت ہے۔ "نقوش" کا پہلا دور خاصہ ہنگامہ خیز تھا- اس نے موجوں کی طرح معاشرے کو اپنی زد میں لینے کی کوشش کی یہ نئی تعمیر کا خواب دکھاتا ہے لیکن جو تعمیر عمل میں آچکی ہے "نقوش" اس کی تخریب کے

درپے ہے۔ چنانچہ گیارہویں شمارے پر "نقوش" کی حکمت عملی میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت محسوس کر لی گئی، (۶) اور "نقوش" کی عنان ادارت سید وقار عظیم کو سونپی گئی۔ "نقوش" کا دوسرا دور بھی مختصر ہے اور یہ شمارہ ۱۱ سے ۱۸ تک (مئی ۵۰ء تا مارچ ۱۹۵۱ء) پھیلا ہوا ہے۔ سید وقار عظیم نے "نقوش" کا رابطہ زندگی کے ساتھ قائم رکھا، لیکن سیاست کی گرم بازاری کو قبول نہ کیا۔ ادبی مجلہ اور سیاسی پمفلٹ میں ایک واضح حد امتیاز قائم کی اور "نقوش" کا نیا نقطہ نظر یوں واضح کیا۔

"ادب کے سرچشمے زندگی ہی سے پھوٹتے ہیں زندگی سے بے تعلق ہو کر ادب بے معنی ہے، لیکن ادب کو زندگی کی مصوری اور ترجمانی کرتے وقت روایتی اور فنی لطافتوں سے بے نیاز نہیں ہونا چاہیے... "نقوش" ماضی کے نقوش کا امین اور حال کے تقاضوں کا پاسبان ہے۔"

وقار عظیم صاحب نے اس مختصر سے دور میں "نقوش" کی کایا پلٹ دی، اب اس میں ایسے ادیبوں کو جگہ دی گئی جو جمالیاتی قدروں کی پاسبانی کرتے تھے اور ادب کی روایتوں کے امین تھے۔ ان کے عہد ادارت میں جو مقالات چھپے ان میں سے نیاز فتح پوری کا "اندلس میں آثار علمیہ" نصیر الدین ہاشمی کا "قدیم اردو کی رزمیہ مثنویاں" ممتاز شیریں کا "اردو کا بہترین رپور تاژ" عابد علی عابد کا "فورٹ ولیم کالج کے چند ناول نگار" مولانا صلاح الدین احمد کا "اردو ناول" صوفی تبسم کا "اردو شاعری کی طرف پیش قدمی" ہیں ۱۹۵۱ء میں ایک "ناولٹ" نمبر بھی پیش کیا جس میں انتظار حسین کا ناولٹ "اللہ کے نام پر" اے حمید کا "جہاں برف گرتی ہے" اشفاق احمد کا "مہمان بہار" شوکت تھانوی کا "سسرال" اور سعادت حسن منٹو کا "کنواری" شائع ہوئے۔

"نقوش" کا تیسرا اور طویل ترین دور شمارہ ۱۹ سے شروع ہوا اور یہ اپریل ۱۹۵۱ء سے ستمبر ۱۹۸۶ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں "نقوش" کے بانی محمد طفیل اس کے مدیر تھے، (۷) انہوں نے لکھا ہے کہ

"جب "نقوش" ہمکنے اور ٹوں ٹاں کرنے لگا تو اس کی پرورش میرے سپرد ہوئی ... بیماری سمیت اس وقت اس کی عمر اڑھائی برس ہوگی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی، میری راتوں کی نیند اچٹ گئی، میں سوچتا تھا اتنا خوبصورت اور ہونہار بچہ۔۔ اگر میری نگرانی میں پنپ نہ سکا تو کتنی جگ ہنسائی ہوگی، میں تو لاجوں مرتا رہا۔ میرے مالی حالات زیادہ اچھے نہ تھے۔ مگر میں چاہتا تھا اسے ولایت تک بھیجوں، حوصلے اتنے۔۔۔ وسائل محدود" (۸)

"نقوش" اگرچہ اپنے پالنے میں ہی جوان ہو گیا تھا لیکن وہ "نقوش" جس نے آئندہ چند برسوں میں بے مثال اور بے نظیر حیثیت اختیار کی، درحقیقت ۱۹۵۱ء میں اپنے حقیقی ادبی پالنہار کی آغوش عافیت میں آیا اور پھر اس کے ارتقا کا گراف مسلسل بلند ہوتا گیا، صوری اور معنوی خوبیاں

بڑھتی چلی گئیں، کامیابیاں " نقوش " کی گرد راہ بن گئیں اور ادبی حلقوں میں اس کی عظمت اور احترام بڑھتا گیا۔ ایک محقق کا یہ قول ضرب المثل بن گیا کہ " جو ادیب " نقوش " میں نہیں چھپتا اس کا ادیب ہونا مشکوک ہے۔ " اس دور کے بیشتر ادبی پرچوں کو شکایت تھی کہ انہیں اچھے مضامین دستیاب نہیں ہیں اور نہ انہیں پرچے کے خریداروں کا تعاون حاصل ہے۔ لیکن " نقوش " نے اپنے صفحات سے اس قسم کی شکایت کبھی نہیں ابھاری اور حقیقت یہ ہے کہ " نقوش " میں قاری، مصنف اور مدیر نے ایک مضبوط اور ہم رشتہ مثلث تشکیل دی تھی اور اسکے استحکام میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کامیابی میں محمد طفیل کے اس انکسار اور عجز کا حصہ زیادہ ہے جس کا اظہار انہوں نے " نقوش " کی ادارت سنبھالتے وقت کیا اور جس سے نقوش اپنے دور اول میں محروم تھا۔ محمد طفیل نے کہا:

"مجھ میں علمیت اور قابلیت کا فقدان سہی لیکن میں پاکستان و ہند کے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے خلوص اور ان کے بھرپور تعاون پر اعتماد رکھتے ہوئے، یہ بڑے بول لکھ رہا ہوں کہ انشاء اللہ نقوش کے ادبی معیار کو بھی کوئی ضعف نہیں پہنچے گا... لمبے چوڑے دعوے کرنا میرے بس کی بات نہیں رہی.. "نقوش" کی باگ ڈور ہمیشہ انسانی ہاتھوں میں رہی ہے۔ پھر جیتے جی فرشتہ بننے کو دل بھی تو نہیں چاہتا" (۹)

محمد طفیل نے "نقوش" کو کسی مخصوص قسم کے دائرے میں گھٹ گھٹ کر چلنے کی اجازت نہ دی بلکہ اس کے لئے وسیع تر اور واضح اڑان کا آسمان منتخب کیا اور کرشن چندر اور عصمت چغتائی کی تخلیقات پر ناز کا اظہار کیا، تو عزیز احمد، ممتاز مفتی اور قرۃ العین حیدر کی نگارشات ادب کے قابل فخر مقام کو بھی تسلیم کیا، اپنے لیے جو منزل متعین کی وہ ایک ایسا نقطہ ارتکاز تھا جہاں ادب کی سب راہیں جا کر مل جاتی تھیں۔ "نقوش" نے اپنے لیے تگ و تاز کے وہ راستے منتخب کئے جن پر پہلے بہت کم لوگوں نے قدم رکھا تھا، اپنے صفحات پر ایسی ادبی تخلیقات اور مضامین کو پیش کیا جنہیں دوسرے رسالے قبول کرنے یا چھاپنے سے گریزاں تھے، ان میں تحقیقی نوادر بھی تھے، تنقیدی شاہ پارے اور تنقید کے جواہر پارے بھی اور اب "نقوش" ایک ایسا ادبی مجلہ بن گیا جس کی ترتیب و تدوین میں اس دور کے تمام مشاہیر ادب شامل تھے۔ یہاں صرف چند مشاہیر کا نام شمار کرنا کافی ہے، ابوالخیر مودودی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، عندلیب شادانی، علی عباس جلال پوری، محی الدین قادری زور، رشید احمد صدیقی، شوکت سبزواری، ایم آر کیانی، غلام جیلانی برق، صباح الدین عبدالرحمٰن، حفیظ جالندھری، اثر لکھنوی، ڈاکٹر اعجاز حسین، آنند نرائن ملا، محمد عبداللہ قریشی، امتیاز علی عرشی، جوش ملیح آبادی، حجاب امتیار علی، عبدالرحمن چغتائی، وزیر آغا، احمد علی، ابوالفضل صدیقی، صلاح الدین احمد، جوگندر پال، سہیل اعظم آبادی، کسریٰ منہاس، محمد عبدالمغنی، علی عباس حسینی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ، فراق گورکھ پوری، ڈاکٹر حمید اللہ، مجنوں گورکھ

پوری، مختار مسعود، ڈاکٹر محمد باقر، سید معین الرحمٰن، مسعود رضوی ادیب، حکیم یوسف حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔۔ اس سے یہ تصور جڑ پکڑنے لگا کہ "نقوش" خواص کا پرچہ ہے، اس کا مزاج تحقیقی ہے اور اس میں صرف ایسے ثقہ ادبا کے ادب پارے ہی جگہ پا سکتے ہیں جنہیں ادب میں درجہ استناد حاصل ہو چکا ہے اور جن کی شہرت سے "نقوش" اپنی عظمت کا چراغ روشن کر رہا ہے، محمد طفیل نے اس آواز کو بگوش ہوش سنا لیکن نقوش کی اس مروّجہ روش کو قائم رکھا کہ مستند ادبا کے ساتھ ایسے نئے ادیبوں کے تعارف کا سلسلہ بھی قائم تھا جن کی تخلیقات نقوش کے معیار ادب پر پوری اترتی تھیں، اور جن کی اشاعت سے ادب کی روشنی میں ایک نئی کرن کا اضافہ ہوتا تھا، چنانچہ ۱۹۵۲ء کے "افسانہ نمبر" میں "نقوش" کے اداریہ "طلوع" میں جن نئے لکھنے والوں کا تعارف بطور خاص کرایا گیا ان میں ضمیر الدین احمد، ابوالخطیب، خلیل احمد اور ابن الحسن شامل ہیں۔

"نقوش" پر نظر ڈالیں تو فرہاد زیدی، عذرا مسعود، اختر جمال، صادق حسین، جیلانی بانو، بشریٰ رحمٰن، بانو قدسیہ، رتن سنگھ، غلام الثقلین نقوی، اشفاق احمد، سلیم اختر، ستار طاہر، احمد شریف، حفیظ صدیقی، صدیق جاوید، ماجد صدیقی، تحسین فراقی، سلمان سعید، ضمیر الدین احمد، احمد فراز، جمیل ملک، احمد ظفر، مجید شاہد، افضل حسین اظہر، باقر رضوی، نثار عزیز، بلراج کومل، رضی ترمذی، نوید انجم، امر سنگھ شاعر ندیم، بشیر بدر چند ایسے نام ہیں جو ہمیں چند پرچوں کی ورق گردانی سے ہی مل جاتے ہیں، ان میں سے بیشتر ادباء اب اردو ادب کے روشن ستارے بن چکے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آج سے کم و بیش تیس برس قبل "نقوش" نے ان کی انگلی پکڑی تھی اور محمد طفیل نے انہیں اردو ادب سے متعارف کرایا تھا۔

اردو ادب میں سالنامے اور خاص نمبر چھاپنے کی روایت " نیرنگ خیال " سے منسوب ہوتی ہے، اس روایت کو اپنے اپنے مخصوص انداز میں " ہمایوں "، " نگار "، " ساقی "، " عالمگیر "، " ادبی دنیا "، " ادب لطیف "، " افکار " اور " سویرا "، نے ۱۹۴۷ء سے قبل تابندہ رکھنے کی سعی کی لیکن اس باب میں آزادی کے بعد جو خصوصی اور باعث افتخار حیثیت نقوش نے حاصل کی اس کا اعتراف پوری اردو دنیا میں کیا جا چکا ہے۔ محمد طفیل کے عہد ادارت میں " نقوش " نے ادبی رسالے کی ماہانہ حیثیت کم و بیش ختم کر دی اور اسے ایک ایسی کتاب کا ہم پلہ بنا دیا جو وقفوں وقفوں سے پڑھی جاتی تھی اور پھر ڈرائنگ روم کی کسی خوبصورت الماری میں سجا کر محفوظ کر لی جاتی تھی تا کہ مہمانوں میں بھی مطالعے کا ذوق پیدا کر سکے، انہیں پڑھنے کی ترغیب مل سکے، چنانچہ " نقوش " کا خریدنا اور اسے گھر میں محفوظ رکھنا اس دور کا فیشن بن گیا۔ جسے لوگوں نے اپنی علمی اور ادبی شان کے اظہار کے طور پر بھی قبول کیا۔

" نقوش " کی اس امتیازی مجلسی حیثیت سے قطع نظر واقعہ یہ ہے کہ محمد طفیل ایک خاص نمبر شائع کرنے کے بعد جب نئے نمبر کا پلان بناتے تو سوچتے کہ :

"جو کام دوسرے کر سکتے ہوں اسے ادارہ نقوش کیوں کرے؟۔ وہ کیوں نہ کسی نئی مہم پر نکلے، کیوں نہ وہ محنت دیدہ کا کوئی اور امتحان لے" (۱۰)

چنانچہ " نقوش " کے متعدد خاص نمبر در اصل محمد طفیل کی محنت دیدہ کے نئے نئے امتحان ہیں، ان کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ انہوں نے متعدد سالنامے اور افسانہ نمبر چھاپنے کے بعد ۱۹۵۴ء میں "غزل نمبر" شائع کیا، دو "شخصیات نمبر" اور تین "خطوط نمبر" نکالے، ایک پانچ سالہ اور ایک دس سالہ نمبر نکالا، ایک خاص نمبر میں "نقوش" کا ادب عالیہ جمع کیا، ایک ضخیم لاہور نمبر، دو جلدوں میں "آپ بیتی نمبر" "تین غالب نمبر" تین "میر تقی میر نمبر" دو جلدوں میں ادبی "معرکے نمبر" "طنز و مزاح نمبر" "پطرس نمبر" "شوکت تھانوی نمبر" "منٹو نمبر" "میر انیس نمبر" دو "اقبال نمبر" اور سب سے اہم اور سب سے وقیع اور رفیع الشان تیرہ جلدوں میں "رسول نمبر" شائع کئے اور خوبی کی بات یہ ہے کہ ہر خاص نمبر اپنے موضوع پر ایک قیمتی دستاویز ہے جس کے مطالعے اور حوالے کے بغیر کوئی ادبی کام ڈھنگ سے مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان نمبروں کی ترتیب و تدوین میں محمد طفیل نے نو دریافت قدیم نوادر کو بھی اہمیت دی اور اس کے ساتھ متعدد نئے موضوعات پر بھی کام کرایا۔ یہاں ان نادر مضامین کا حوالہ دینا ممکن نہیں جو پہلی دفعہ "نقوش" میں شائع ہوئے اور اب جن سے استفادہ عام کیا جا رہا ہے۔ چند ایک عنوانات کا حوالہ کافی ہے "شاعری میں عظمت گناہ" از ڈاکٹر اعجاز حسین "وقت کا ادب اور زندگی کے ساتھ رشتہ" از یوسف جمال انصاری "مزے دار شاعری" از حسن عسکری "غالب کی آوارہ خرامی" از وزیر آغا" "آتش کی غزل گوئی" از ڈاکٹر وحید قریشی، "فسانہ عجائب کے کردار" از نیر مسعود رضوی، "خدیجہ مستور کی شخصیت اور فن کے کرشمے" از احمد ندیم قاسمی "خالص شاعری" از اثر لکھنوی، اسلامی ادب کیوں نہیں؟" از احسن فاروقی "لاہور کا چلیسی" از احمد شجاع "غالب کا مقدمہ پینشن" از خواجہ احمد فاروقی "اردو داستان کا فنی تجزیہ" از سہیل بخاری "اسلامی ادب" از شوکت سبزواری "اردو ادب میں جذبات کا عنصر" از محمد شمس الدین صدیقی۔۔۔ "نقوش" کی ایک اور منفرد عطا اس کے مذاکرے اور مباحثے ہیں، اس کی ابتدا "اردو افسانے میں روایت اور تجربے" سے ہوئی جس میں وقار عظیم، سعادت حسن منٹو، ہاجرہ مسرور، انتظار حسین اور شوکت تھانوی نے حصہ لیا اور اس کے بعد شاعری اور تنقید پر بھی جاندار مذاکرے شائع کئے۔

" نقوش " کی ایک اور منفرد خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنے مدیر کی ادبی تربیت میں بھی گراں قدر حصہ لیا۔ محمد طفیل نے " نقوش " کی ادارت سنبھالی تو وہ ایک خوش نظر اور خوش ذوق قاری تھے

لیکن ان کے پاس کوئی اثاثِ تحریر نہیں تھا، " نقوش " نے سب سے پہلے انہیں بطور اداریہ نگار متعارف کرایا، کچھ عرصے کے بعد " نقوش " نے مدیرِ طفیل کے اندر خاکہ نگار طفیل کو دریافت کر لیا اور اب وہ اردو ادب کی شاید واحد شخصیت ہیں جنہوں نے خاکہ نگاری سے پہلی اور آخری محبت کی اور سب سے زیادہ خاکوں کی کتابیں تالیف کیں، جمیل احمد رضوی نے ان کی اعداد شماری کر کے ان کی تعداد ۴۹ بتائی ہے، ان میں سے ۱۳ خاکے " نقوش " میں شائع ہوئے۔ خاکہ نگاری اور اداریہ نگاری میں محمد طفیل کا اپنا منفرد اسلوب ہے اور اس کی سب سے قیمتی داد مولوی عبدالحق نے دی تھی اور ایک خط میں انہیں محمد نقوش کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ سید وقار عظیم نے لکھا ہے کہ :

"اب مجھے محمد طفیل اور محمد نقوش میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، ہم دونوں کے ممنون احسان ہیں، اگلی نسلیں بھی اس بار احسان کو محسوس کریں گی اور یہ دونوں نقش جو باہم ایک دوسرے کا عکس بن گئے ہیں ہمیشہ قائم رہیں گے"(۱۱)

محمد طفیل نے بابائے اردو کا دیا ہوا خطاب نہ صرف قبول کر لیا بلکہ وہ محمد نقوش کے نام سے ایک علیحدہ اداریہ بھی لکھنے لگے، محمد طفیل ۵ جولائی ۱۹۸۶ء کو اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ ان کی زندگی میں آخری شمارہ " نقوش " ۱۳۲ جون ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا، شمارہ ۱۳۳ ان کی وفات کے بعد جاوید طفیل نے شائع کیا لیکن اس کی ترتیب و تدوین کا کام محمد طفیل خود انجام دے گئے تھے، " نقوش " شمارہ نمبر ۱۳۳ کے ساتھ ستمبر ۱۹۸۶ میں " نقوش " کا سب سے روشن اور طویل ترین دور ختم ہو گیا۔

دسمبر ۱۹۸۶ء سے " نقوش " کا چوتھا دور جاوید طفیل کے ادارت میں شروع ہوا ان کی ادارت میں اب تک دو ضخیم جلدوں میں " نقوش " کا " محمد طفیل نمبر " اور دو ضخیم شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں، یہ شمارے ان تمام محاسن سے آراستہ ہیں جن سے " نقوش " کا تشخص محمد طفیل کی زندگی میں ہو چکا تھا، چنانچہ " نقوش " رسالہ " عصمت " اور " شاعر " کے بعد دوسرا قابل ذکر ادبی پرچہ ہے جس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کا افتخار دوسری نسل کو منتقل ہو گیا ہے۔ جاوید طفیل نے مضامین اور تخلیقات کی فراہمی، ان کے انتخابات اور ان کی اشاعت میں بڑی خوش ذوقی اور خوش نظری کا ثبوت دیا ہے، اب توقع کی جا سکتی ہے، کہ " نقوش " کا مقام افتخار نہ صرف قائم رہے گا بلکہ اسے فروغ و ارتقا بھی حاصل ہو گا۔

"استقلال" ۔ لاہور

لاہور سے حکومت پنجاب نے اپنی سرگرمیوں کی تشہیر اور نمائش کے لئے ۲ مئی کو ہفت روزہ "استقلال" جاری کیا۔ ۳۶ صفحات کا یہ رسالہ آفسٹ پر چھپتا تھا اور اس میں دو رنگی اور سہ رنگی تصویریں بھی شامل ہوتی تھیں۔

"استقلال" کے ابتدائی پرچوں میں شیر محمد اختر، ممتاز مفتی، قیوم نظر، عارف عبدالمتین، طفیل احمد خان، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، سعادت حسن منٹو، حسن عسکری، ہاجرہ مسرور کے مضامین اور نظموں اور غزلوں کو نمایاں جگہ دی گئی۔ "استقلال" سرکاری پرچہ تھا اور ادیبوں کو تخلیقات کا معقول معاوضہ پیش کرتا تھا۔ اس لئے بیشتر بڑے بڑے ادیب اس کی طرف کشاں کشاں کھنچے چلے آئے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی حلقے کے رسالہ "سویرا" نے "استقلال" کی اقتصادیات اور حکومت کے رویے پر کڑی تنقید کی اور اس قسم کے رسالے کی اشاعت کو نوزائیدہ مملکت میں اسراف قرار دیا۔ کچھ عرصے کے بعد "استقلال" اپنا معیار برقرار نہ رکھ سکا، اس کی ادبی پالیسی پر سرکاری ضرورتیں اور حکمتیں غالب آنے لگیں، چنانچہ پہلے اسے پندرہ روزہ کر دیا گیا اور ادارت کے فرائض عبدالصمد کے سپرد کیے اور بعد میں بند کر دیا گیا۔

"استقلال" ایک مخصوص نوع کے سرکاری تقاضوں کی تکمیل کے لئے میدان عمل میں آیا تھا۔ اس کے پہلے پرچے میں اغراض و مقاصد کی توضیح نہیں کی گئی مدیر کا نام بھی درج نہیں، تاہم اہل ادب جانتے ہیں کہ اس کی ادارت ممتاز مفتی کرتے تھے، اور شاید اسی لئے "استقلال" کا ادبی زاویہ زیادہ روشن ہے۔ "استقلال" میں جو چند اچھے مضامین شائع ہوئے ان میں حسن عسکری کا "اسلامی فن تعمیر کی روح" انتظار حسین کا "اردو میں سیاسی شاعری کا ارتقا" اینا مولکا احمد کا "پاکستان میں آرٹ کا مستقبل" صفدر حسین کا "تہذیب اور اس کی خصوصیات" ملک شیر خان کا "زمین کا مسئلہ تخلیق" امین الرحمٰن کا "مسلمانوں کا فن نقاشی" شمار کئے جا سکتے ہیں اور ان سے "استقلال" کے ادبی مزاج کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ تاہم اس قسم کے مضامین کی تعداد زیادہ نہیں۔ استقلال میں غلام الثقلین نقوی، اشفاق احمد، انتظار حسین کے ابتدائی افسانے چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں انتظار حسین بطور نقاد نمایاں ہوئے، استقلال نے عید اور آزادی کی پہلی سالگرہ پر اگست ۱۹۴۸ء میں خاص نمبر شائع کئے۔ ان میں یوسف ظفر، ابو سعید انور، اختر ہوشیار پوری، آغا بابر، کیفی دتاتریہ، اور عباس احمد عباسی کے مضامین نظم و نثر کے علاوہ "آزادی کا پہلا سال" کے عنوان سے جائزہ بھی پیش کیا گیا۔ "استقلال" ایک خوبصورت ہفتہ وار پرچہ تھا۔ اس نے سرکاری مقاصد کے علاوہ ادب کی خدمت بھی خلوص سے

کی۔ لیکن اس کا سرکاری پرچہ ہونا ہی اس کی کمزوری ثابت ہوا۔

"جاوید" ۔ لاہور

ماہنامہ "جاوید" لاہور گہوارۂ ادب لاہور کا ترجمان تھا۔ اس کے ادارتی فرائض ظہیر کاشمیری، کشور یاسین، نصیرانور اور اے حمید کے سپرد تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ترقی پسند تحریک کے ادبا سیاست، ادب اور معاشرت پر طغیانی انداز میں یلغار کر رہے تھے، ماہ نامہ "جاوید" کے مرتبین نے بھی ترقی پسند نظریات کے انتہا پسندانہ رویے کو قبول کیا اور اسی فکر و نظر کے مضامین کو فوقیت دی۔ کچھ عرصے کے بعد ادارے میں عارف عبدالمتین بھی شریک ہوگئے۔ "جاوید" کا چوتھا شمارہ اس کا خاص نمبر تھا اور اس میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" شائع ہوا جو سرکاری احتساب کی زد میں آگیا اور پرچہ ضبط کر لیا گیا۔ اس کے بعد "جاوید" کے چند شمارے چھپے لیکن اس کا دم خم ختم ہو چکا تھا۔

"فاران" ۔ کراچی

"فاران" مولانا ماہرالقادری کے ادبی، مذہبی اور سیاسی تصورات کا نقیب تھا، اس کا اجرا کراچی سے اپریل ۱۹۴۸ء میں عمل میں آیا اور ۱۹۷۷ء میں ماہرالقادری صاحب کی وفات تک باقاعدگی سے چھپتا رہا۔ مئی ۱۹۷۷ء سے "فاران" کی ادارت مسرور حسین نے سنبھالی۔ ان دنوں "فاران" کی ادارت محمد اسمٰعیل مینائی کرتے ہیں۔

"فاران" تحریک اسلامی کی فکری جہت کو ادب کے وسیلے سے فروغ دینے کا داعی تھا، اس کے لکھنے والوں کا حلقہ بھی علیحدہ تھا اور اس کا دائرہ قارئین بھی عام ادبی پرچوں سے مختلف تھا۔ حلقۂ تحریر میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی، اسعد گیلانی، طالب ہاشمی، اقبال احمد صدیقی، فروغ احمد، وارث سرہندی، مولانا محمد اسحٰق ندوی اور حبیب احمد صدیقی جیسے ادبا شامل تھے لیکن "فاران" کا بیشتر حصہ ماہرالقادری خود لکھتے تھے "فاران" کا اداریہ "نقش اول" سماجی اور سیاسی موضوعات کے لیے وقف تھا۔ "ہماری نظر میں" کے تحت کتابوں پر تبصرہ کیا جاتا تھا اور اس میں ماہرالقادری مصنفین کی زبان کی کمزوریوں کو نشان زد کیا کرتے تھے "یادرفتگاں" میں مرحوم ادیبوں کو ماہرالقادری اپنے ذاتی روابط سے دریافت کرتے اور ان کی خوبیوں کے ساتھ بعض اوقات ان کی خامیوں کو منکشف کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ اس قسم کے تعزیت ناموں میں علامہ رشید ترابی، صوفی تبسم، نواب صدیق علی خان،

افتخار احمد بلخی ، ابرا حسنی گنوری ، اے ڈی اظہر ، سلام مچھلی شہری ، بہزاد لکھنوی ، حسرت بدایونی ، شفقت کاظمی کو انھوں نے اپنی یادوں سے بازیافت کیا ہے اور ان میں ایسا مواد موجود ہے جو کسی اور ماخذ سے دریافت نہیں ہو سکتا۔

" فاران " کا شاعری کا مزاج کلاسیکی تھا' آزاد نظم کو " فاران " میں داخلے کی اجازت نہیں تھی' غزل میں بھی قدیم رنگ سخن کو اہمیت دی جاتی تھی اور ایک ہی صفحے پر اوپر نیچے متعدد غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ "فاران" کے تنقیدی حصے میں موضوعات اقبال کو زیادہ اہمیت ملتی۔ دوسرے مضامین میں بھی اخلاقی زاویہ پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ طالب ہاشمی صاحب کے مضامین میں مشاہیر اسلام کے تاریخی حالات کو ان کے محاسن اعلیٰ کی روشنی میں پیش کیا جاتا تھا۔ "فاران" رنگ و روغن سے بے نیاز' سادگی کی مثال تھا' مولانا ماہرالقادری کی وفات کے بعد بھی اس کے مزاج کو قائم رکھا گیا۔ "فاران" اب بھی ایک مخصوص طبقے کا پسندیدہ رسالہ ہے اور مذہب کے ساتھ ادب کی خدمت بھی کر رہا ہے۔ معمول کی اشاعتوں سے قطع نظر "فاران" کا ماہرالقادری نمبر اس کی ایک یادگار اشاعت ہے۔

"قومی زبان" کراچی

آزادی کے بعد انجمن ترقی اردو اپنی ہندوستانی شاخ سے کٹ کر پاکستان میں آئی تو یکم جون ۱۹۴۸ء کو اس نے اپنا نیا صحیفہ " قومی زبان " کے نام سے ہفت روزہ کی صورت میں جاری کیا۔ اس کا مقصد قومی زبان کو ساری قوم کی آواز بنانا تھا ' چنانچہ ہفت روزہ کی حیثیت میں اسے ایک ادبی صحیفہ کے بجائے اخباری نوعیت کے فرائض سرانجام دینے پڑے ۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا سائز تو قائم رکھا گیا لیکن اشاعت پندرہ روزہ کر دی گئی ' یکم جولائی کو پندرہ روزہ " قومی زبان " مروجہ رسالہ سائز پر چھپنے لگا اور ضخامت ۳۰ سے ۴۰ صفحات ہو گئی ' اب اس میں ادبی مضامین کے لیے جگہ نکالی جانے لگی ' چنانچہ یکم جولائی کے پرچے میں انور خواجہ کے مضمون " تعلیمی کمیشن اور اردو " من موہن تلخ کا مقالہ " اردو ادب کی تشکیل نو " سید جعفر طاہر کا مقالہ " حالی جادوبیاں " کے علاوہ شیر افضل جعفری اور نظیر محسن کی غزلیں بھی شائع ہوئیں ۔ کتابوں کے لیے رفتار ادب کا عنوان اور خبروں کے لیے گردوپیش کا عنوان قائم کیا گیا ۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق ۲۶ اگست ۱۹۶۱ء کو وفات پا گئے تو " قومی زبان " کی ادارتی تشکیل نو ہوئی ' ۶۳ء۔ ۱۹۶۲ء میں " قومی زبان " کی دو پندرہ روزہ اشاعتوں کو یکجا کر کے ماہانہ پرچے کی صورت دے دی گئی ۔ اس کے مدیر اعلیٰ جمیل الدین عالی مقرر ہوئے اور ادارت کے فرائض مشفق خواجہ کو

تفویض کیے گئے ' اس دور میں " قومی زبان " کی اخباری حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے ' اس کی ادبی افادیت کو زیادہ اہمیت دی گئی ' مضامین کی نوعیت تعارفی بھی تھی اور تحقیقی بھی ' لیکن تخلیقی اصناف ادب کو " قومی زبان " کے دائرہ عمل سے خارج رکھا گیا ۔ ایک نیا عنوان " نئے خزانے " قائم کیا گیا جس میں رسائل کے مطبوعہ مضامین کا اشاریہ پیش کیا جاتا تھا ۔ گنج ہائے گراں مایہ کے تحت افسر صدیقی امروہوی انجمن کے نادر مخطوطات کی وضاحت پیش کرتے تھے " ہمارے معاصرین " کے تحت معاصر رسائل میں سے اہم مضامین کا انتخاب مرتب کیا جاتا تھا ۔ پرچے کی کتابت و طباعت پر بھی توجہ دی گئی اور مواد کو اس طرح پیش کیا گیا کہ " قومی زبان " کا مطالعہ عام لوگوں کے لیے بھی دلچسپی کا باعث بننے لگا۔ مشفق خواجہ کے دور ادارت میں "قومی زبان" نے اپنا تخلیقی مزاج مستحکم کیا' ادبی مضامین اور خبروں کے نظام کو مضبوط بنایا اور کتب خانہ انجمن کے مخطوطات پر حواشی اور وضاحتی سلسلے کو وسیع تر کیا گیا۔ خواجہ صاحب نے "بابائے اردو نمبر" شائع کرنے کی روایت قائم کی' مولانا صلاح الدین احمد اور راس مسعود پر گوشے مخصوص کیے اور انگریزی اصطلاحات کے تراجم کا سلسلہ جاری کیا۔

۱۹۷۴ء میں مشفق خواجہ نے اپنی دوسری ادبی مصروفیات کی وجہ سے انجمن سے سبکدوش ہونے کی اجازت لے لی ۔ اب ان کی جگہ " قومی زبان " کے مدیر شبیر علی کاظمی مقرر ہوئے ۔ کاظمی صاحب نے ان روشن روایات کو قائم رکھا جن کی بنیاد مشفق خواجہ نے ڈالی تھی ۔ انہوں نے بابائے اردو ' اقبال اور غالب کی برسیوں پر " قومی زبان " میں خصوصی حصے چھاپنے کا اہتمام کیا اور تخلیقی مضامین کو اہمیت دی ' ان کے عہد ادارت میں نئے خزانوں کا تعارف ابوسلمان شاہ جہان پوری نے مرتب کیا ۔ دسمبر ۱۹۷۶ء میں " قومی زبان " کا " قائد اعظم نمبر " کاظمی صاحب کا ایک نمایاں کارنامہ ہے ۔

قدرت اللہ شہاب کی وفات کے بعد نورالحسن جعفری صاحب کو صدر انجمن ترقی اردو کے منصب پر فائز کیا گیا تو انہوں نے " قومی زبان " کی صوری اور معنوی حالت تبدیل کرنے پر بھی خصوصی توجہ دی ' اس کے مزاج میں جو نمایاں تبدیلیاں آئیں ان میں ایک تو تنقیدی مضامین کی شمولیت تھی ' دوسرے بیرونی ممالک اور علاقائی زبانوں کے تراجم کو بھی اہمیت دی جانے لگی ' بچوں کے لیے سائنسی مضامین کی جگہ نکالی گئی ' ان معنی خیز تبدیلیوں پر عمل ہو رہا تھا کہ " قومی زبان " کے مدیر شبیر علی کاظمی انتقال کر گئے ' محترمہ ادا جعفری ان کی زندگی میں ہی ادارت میں شریک ہو چکی تھیں ' ان کی معاونت کے لیے پہلے علی حیدر ملک کو اور پھر ادیب سہیل کو شریک ادارہ کیا گیا ۔ "قومی زبان" کا نیا دور اب انہیں اصحاب کی ادارت میں فروغ عام حاصل کر رہا ہے۔ علاقائی ادب کے تحت افسانوں کے تراجم ' غیر ملکی نظموں اور مضامین کی اشاعت کا اہتمام ہو رہا ہے۔ گزشتہ دو سالوں کے دوران شخصیات پر گوشے پیش کرنے کا رجحان بھی "قومی زبان" نے اپنا لیا ہے' چنانچہ ابوالفضل صدیقی' اشرف صبوحی' مولانا

صلاح الدین احمد پر گوشے چھپ چکے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب پر ایک خاص نمبر پیش کیا گیا ہے۔ قومی زبان اب تحقیقی یا تنقیدی رسالہ نہیں رہا بلکہ اسے ایک مستقل نوعیت کے ادبی رسالے کی حیثیت مل گئی ہے اور یہ مزید ترقیوں کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ ادیب سہیل اسے بامعنی' قابل مطالعہ' معلوماتی ادبی پرچہ بنانے میں دن رات کوشاں ہیں اور کامیابیاں حاصل کررہے ہیں۔

"قندیل" لاہور

جولائی ۱۹۴۸ء میں ہفت روزہ "قندیل" لاہور سے روزنامہ "نوائے وقت" کے اضافی ضمیمے کے طور پر جاری کیا گیا۔ اس کے ایڈیٹر انچارج مظہر انصاری تھے' ۱۴ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اس کی ادارت شیر محمد اختر اور احمد بشیر نے سنبھال لی اور یہیں سے اس کا ادبی روپ نکھرنا شروع ہوا۔ اس پرچے میں اشفاق احمد کا افسانہ "رات بیت رہی ہے" افضل صدیقی کی نظم "مال روڈ"' عبدالماجد دریا آبادی کی "سچی باتیں" انجم رومانی' امین حزیں' رضی ترمذی اور اعجاز اکرم کی غزلیں "قندیل" کی ادبی جہت ہی کو آشکار کرتی ہیں۔ شفیع منصور نے اردو کے لیے لاطینی رسم الخط کا مسئلہ ابھارا "آپ کی بات" میں حلقہ ارباب ذوق کے ہفتہ وار جلسے کی کارروائی درج کی جاتی۔ اس ابتدا نے "قندیل" کے مزاج کو صحت مند بنانے اور صحافت کو ادب کے ساتھ آمیز کرنے میں بڑی مدد دی اس کے بعد "قندیل" کے ادارے میں ثانوی نوعیت کی تبدیلیاں عمل میں آتی رہیں' اس کے ادارے میں کچھ عرصے کے لیئے قدوس صہبائی' ظہور الحسن ڈار اور عبداللطیف انور بھی شامل رہے۔ لیکن شیر محمد اختر اور شرقی بن شائق کی وابستگی بہت طویل اور معنوی طور پر قندیل کی مزاج ساز ہے۔

"قندیل" نے ادب کو عوام الناس تک پہنچانے اور ان کے ذوق کی تربیت میں بنیادی نوعیت کی خدمت سرانجام دی ہے۔ اس پرچے میں ادب کی سرگرمیوں کا رپورتاژ "دیکھتا چلا گیا"۔ شیر محمد اختر لکھتے تھے اور اکثر ایسا تاثر پیدا کرتے کہ پڑھنے والوں کو حلقہ ارباب ذوق اور دوسری ادبی مجالس میں شریک ہونے کا مزا آتا۔ "قندیل" نے زیادہ گہرے موضوعات کے بجائے ادب کے ہلکے پھلکے موضوعات کو اہمیت دی۔ تاہم اسے بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل تھا چنانچہ اس میں ہمہ اقسام کے مضامین شائع ہوتے اور ان پر ردعمل بھی مختلف نوعیتوں کا ہوتا۔ ایک پرچے کے اداریے میں مدیر محترم نے لکھا کہ "ہر رسالے کی کامیابی کا ثبوت یہ ہے کہ اسے بہت سے لوگ ناپسند کریں اور بہت سے لوگ پسند کریں۔ اگر کوئی تحریر بعض لوگوں کو چونکا نہ دے اور ان کے منجمد ذہنوں کو پگھلانا شروع نہ کردے تو وہ تحریر ہی کیا" (۱۲)

"قندیل" نے متعدد مرتبہ ایسی تحریریں پیش کیں جو ذہن کے جمود کو توڑ دیتی تھیں اور پڑھنے والے اظہار خیال پر مائل ہوجاتے تھے۔ "رسم الخط کی بحث"، "عورت کا مسئلہ" احمد بشیر کا کالم "آپ کی بات"، "مصوری کی تشکیل نو" وغیرہ مضامین نے خاصی گرمی گفتار پیدا کی۔ "قندیل" نے تخلیقی اصناف میں سے شاعری پر زیادہ توجہ دی عدم، فرخ امرتسری، ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین، نصیراحمد زار، طفیل احمد خان، لطیف انور، ناصر کاظمی، امین حزیں، آغا صادق، لطفی صدیقی، اثر صہبائی، حفیظ جالندھری، الطاف پرواز کے نام ابتدائی دور میں نمایاں نظر آئے اور پھر یہ سلسلہ ہر دور میں نئے شعرا تک پھیلتا چلا گیا۔

"قندیل" میں اقبالیات کو ایک اہم موضوع کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ ہر سال اپریل میں اقبال کے یوم وفات پر ایک پرچے میں ان پر چند صفحات ضرور مخصوص کیے جاتے اور ان کے شایان شان خراج تحسین پیش کیا جاتا۔ وقار انبالوی کی نظم "یوم اقبال پر روح اقبال۔ جوانان پنجاب سے" شیخ عبدالقادر کا یاد نامہ "علامہ اقبال سے میری آخری ملاقات" ظہور الحسن ڈار کا طنزیہ "اقبال کی تربت پر" "قندیل" میں ہی شائع ہوئے تھے۔ "قندیل" نے ادبیات عالیہ کے تعارف کا ایک مفید سلسلہ بھی شروع کیا، جس کے تحت عرش صدیقی نے "لارڈ جم" ملک عزیز حیدر نے طامس مور کی "یوٹوپیا" انعام الحق نے "ڈیوڈ کاپر فیلڈ" مرزا ادیب نے "اوڈیسی" کا ترجمہ و تلخیص پیش کی۔ مولانا عبدالمجید سالک کی خودنوشت سوانح بھی "قندیل" ہی میں قسط وار شائع ہوئی تھی۔

متذکرہ بالا اجمال کو پیش نظر رکھیں تو "قندیل" کی ادبی خدمات ماہانہ ادبی پرچوں سے کم نظر نہیں آتیں "قندیل" صحت مند صحافت کا ترجمان اور ادب کی مثبت قدروں کو فروغ دینے میں کوشاں تھا۔ "پھول اور پتھر" میں قارئین کو سلیقے سے اختلاف ابھارنے کی تربیت دی جاتی تھی "حدیث خلوتیاں" میں زندگی کے اسرار دروں پردہ کو آشکار کیا جاتا تھا لیکن اس سے کبھی کسی کی کردار شکنی کا زاویہ پیدا نہیں ہوا۔ "قندیل" نے ادیبوں کے احترام کو قائم رکھا، اچھا اور متنوع ادب پیش کیا اور متعدد نئے لکھنے والوں کو ادب کی کہکشاں میں ایک روشن ستارہ بننے کی تربیت دی۔

۱۹۶۸ء میں قندیل پر اضمحلال طاری ہونا شروع ہوگیا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے وسط میں اطلاع دی گئی کہ "قندیل" ایک نئے دور کا آغاز کر رہا ہے چنانچہ ۱۱ جولائی ۱۹۷۰ء کا پرچہ نئے روپ رنگ میں شائع ہوا۔ لیکن اب ادب پس منظر میں چلا گیا تھا اور فلمی طرز کی مصورانہ صحافت "قندیل" پر غالب آگئی تھی، اس لحاظ سے اس کا یہ نیا دور غیر مؤثر ادبی دور ہے جو زیادہ طول نہ کھینچ سکا۔

"سنگ میل" پشاور

لاہور سے " سویرا " کے انداز پیشکش نے ادبی صحافت میں نئی صوری تبدیلیاں پیدا کی تھیں۔ اگست ۱۹۴۸ء میں پشاور سے دوماہی جریدہ "سنگ میل" جاری ہوا تو اس کی ترتیب و آرائش بھی "سویرا" کے خطوط پر ہی کی گئی' اس نئے پرچے کے مدیر فارغ بخاری' رضا ہمدانی' خاطر غزنوی اور قتیل شفائی تھے اور اس میں خالصتاً" ترقی پسند رجحانات کو پیش کرنے کی کاوش کی گئی تھی' اس دوران میں "نقوش" نے ہاجرہ مسرور کی اعانت حاصل کی تو "سنگ میل" نے خدیجہ مستور کو شریک ادارت کر لیا۔ لیکن یہ تعلق زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ کچھ عرصے کے بعد خاطر غزنوی بھی "سنگ میل" کو خیر باد کہہ گئے۔ یہ دور ترقی پسند تحریک کے لیے اس کے سیاسی رجحانات کی وجہ سے خاصہ کڑا تھا' پنجاب کی طرح صوبہ سرحد میں بھی ترقی پسند ادبا کی سیاسی' مجلسی اور تحریری سرگرمیوں پر نظر رکھی جا رہی تھی' چنانچہ اس کی زد میں "سنگ میل" اور اس کے مدیران بھی آئے۔ خدیجہ مستور' خاطر غزنوی اور قتیل شفائی کی علیحدگی میں متذکرہ بالا احتساب کا عمل دخل بھی نظر آتا ہے۔ "سنگ میل" کے انتظامی اور ادارتی امور پر فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی گرفت مضبوط تھی اس لیے احتساب کی زد میں بھی وہی آئے تھے۔ اب "سنگ میل" اپنی اشاعت کی باقاعدگی اور معیار کا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کچھ عرصے کے بعد مطلع ادب سے غائب ہو گیا۔ "سنگ میل" کا سب سے بڑا کارنامہ "سرحد نمبر" ہے جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا' اسے صوبہ سرحد میں اردو کی تاریخ شمار کرنا چاہیے۔ جس میں شعرا کے تذکرے کی خصوصیات بھی موجود ہیں۔ بعد میں "سنگ میل" سرحد نمبر کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا اور بے حد مقبول ہوا۔ محمد عارف قریشی نے لکھا ہے کہ "کتابی سائز پر چھپنے والا یہ دو ماہی رسالہ ظاہری ٹیپ ٹاپ سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ معنوی حسن کا بھی مظہر تھا"(۱۳) فسادات کے موضوع پر خدیجہ مستور کا افسانہ "مینوں لے چلے بابلا وے" سنگ میل میں ہی شائع ہوا تھا۔

۱۹۷۳ء میں " سنگ میل " کا دوسرا دور " فوک لور اور عوامی ادب " کے نمائندہ کی حیثیت میں شروع ہوا ۔ (۱۴) لیکن اب اس کی نوعیت ایک تیکنیکی پرچے کی تھی ' اس کی پیشکش کا انداز خوبصورت تھا ' مضامین میں تنوع اور معنویت تھی ۔ لیکن اسے قبول عام حاصل نہ ہو سکا اور چند اشاعتوں کے بعد ہی بند کر دیا گیا ۔ " سنگ میل " کو بیشتر ترقی پسند ادبا فیض احمد فیض ' احمد ندیم قاسمی ' خاطر غزنوی ' عتیق احمد ' رفیق چوہدری کا تعاون حاصل تھا اور اس نے انٹرنیشنل فوک لور کی روایت کو صرف اشتراکی ممالک تک محدود رکھنے کی کوشش کی ' جس پر ادبی حلقوں میں رد عمل کا اظہار بھی کیا گیا۔ مارچ ۱۹۷۳ء میں "سنگ میل" نے ایک وقیع "زبان و ادب نمبر" پیش کیا جس میں نیشنل کونسل

آف دی آرٹس اسلام آباد کے ایک قومی سیمینار کے مقالات کو خصوصی اہمیت دی گئی ' یہ نمبر اپنے مضامین کے تنوع اور افتاد بحث کی وجہ سے خاصا مقبول ہوا ۔ ابن انشا کا مقالہ " زبان ادب اور کلچر " وزیر آغا کا " ادب اور سیاست " سجاد باقر رضوی کا " پروپیگنڈا اور ادب " عطاشاد کا " اردو کا بلوچی زبان سے تعلق " اور عتیق احمد کا مقالہ " ادب اور تاریخ " اس کے چند اہم مقالات تھے ۔ " سنگ میل " فارغ بخاری کی ادبی ادارت کا ایک بے حد خوبصورت نقش ہے ۔ اس پرچے نے صوبہ سرحد اور پشاور کو ادبی جریدہ نگاری میں ایک مقام امتیاز عطا کیا ہے ۔

" پرچم " لائل پور

شاکر عروجی کا ادبی ماہنامہ " پرچم " لائل پور (موجودہ فیصل آباد) سے ۱۹۴۸ ء میں جاری ہوا۔ اس پرچے کو منظور احمد ۔ خلیق قریشی ' آغا صادق ' محشر رسول نگری ' ماہرالقادری ' افضل حسین علوی۔ اعجاز احمد ناصر۔ فیض جھنجھانوی کا تعاون حاصل تھا " پرچم " ادب کے کلاسیکی انداز کا نقیب تھا ۔ اس لیے پرانی اقدار کے قارئین میں پسند کیا جاتا تھا ۔ " پرچم " نئے زمانے کا ساتھ نہ دے سکا لیکن اس کی اشاعت طویل عرصے تک جاری رہی ۔

" اردو ادب " ۔ لاہور

" اردو ادب " لاہور سے سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کی ادارت میں جاری ہوا تو شائع ہونے سے پہلے ہی ایک متنازعہ پرچہ بن گیا ۔ " عذر گناہ " میں لکھا گیا ہے کہ " اس رسالے کے دم سے اردو میں ایک نئی صنف ادب " کھلے خط " کا اضافہ ہوا ۔ لوگ طرح طرح سے کھلے ... پرچے کا جو حصہ لاہور میں چھپ چکا تھا اسے پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا ۔ " خدا خدا کر کے عدالت میں مقدمہ چلا اور چالیس روپیہ جرمانہ بھرنے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ ہم نے لاہور سے اجازت لئے بغیر پرچہ " شائع " کر دیا تھا " ۔ (۱۵)

" اردو ادب " میں منٹو اور عسکری کا ادارتی اشتراک ہی ایک دلچسپ واقعہ تھا ۔ تاہم جب پرچہ چھپ کر آیا تو واقعی یہ ایک چیزے دیگر تھا ۔ مضامین میں موضوعات کا تنوع ' نظموں اور غزلوں میں تخلیقی ایج ۔ افسانوں میں نیا پن ' تبصروں میں چوٹیلا انداز ' اردو ادب کتابی سائز میں چھاپا گیا تھا اور اس میں بھی انوکھا پن موجود تھا ۔ چنانچہ اردو ادب چھپتے ہی ادبی دنیا کا ایک معرکہ آرا واقعہ بن گیا ۔

منٹو کی طنازی اس کے قلم قتلوں سے واضح تھی، ڈاکٹر سعید اللہ نے "ہم جنسیت پر ایک اجمالی نظر" محمد حسن عسکری نے "ہمارا ادبی شعور اور مسلمان" آفتاب احمد نے "شاعری میں کفر" اور دوست محمد طاہر نے "ہیر سیال وارث شاہ کا ایک ترقی پسند کردار" کے موضوعات پر خیال انگیز مقالات لکھے تھے۔ عزیز احمد کا افسانہ "تصور شیخ" غلام عباس کا "اس کی بیوی" کرتار سنگھ کا "کالو" اور اشفاق احمد کا افسانہ "سنگ دل" اس پرچے میں چھپے تھے، اور یہ سب اول درجے کی تخلیقات تھیں۔

مضامین نظم و نثر کے لحاظ سے اردو ادب کا دوسرا پرچہ بھی بے حد ہنگامہ خیز تھا "ممتاز مفتی کا افسانہ "گوبر کے ڈھیر" ابو سعید قریشی کا "مسز ڈین" اشفاق احمد کا "بابا" سعادت حسن منٹو کا "خالی بوتلیں خالی ڈبے" اس پرچے میں شائع ہوئے۔ مترجمہ منظومات اس میں ایک نیا اضافہ تھا۔ شان الحق حقی کا ترجمہ "انطونی قلو پطرہ" اور محمد ہادی حسین کا "آسمان صیاد" اس ضمن میں بطور مثال پیش ہیں۔ محمد حسن عسکری کا مقالہ "فن برائے فن" راشد کی نظم "ایران میں اجنبی" یوسف ظفر کی "خواب کار" اس پرچے کی خاص چیزیں تھیں۔ اس پرچے پر جو رد عمل ظاہر ہوا اس کا کچھ عکس خطوط وحدانی میں پیش کر دیا گیا اور یہ خاصہ چونکا دینے والا تھا۔

"اردو ادب" نے آزادی اظہار آزادی فن اور آزادی ادب کا ایک نیا انداز پیدا کیا تھا۔ منٹو اور عسکری نے ادیب کے لئے جن آزادیوں کا تقاضا کیا تھا اس پرچے میں ان کا نقش نظر آتا تھا۔ لیکن اس کے خلاف رد عمل بھی سب سے زیادہ ادیبوں کے طبقے سے ہوا۔ چنانچہ دو شاندار پرچے چھاپنے کے بعد "اردو ادب" بند کر دیا گیا۔ اسی نام سے کئی سال کے بعد ایک پرچہ بشیر سیفی نے راولپنڈی سے جاری کیا لیکن اب اس کی اشاعت بھی معطل ہے۔

"مخزن"۔ لاہور

"مخزن" جس کی بنیاد اس صدی کی ابتدا میں شیخ عبدالقادر نے رکھی تھی، آزادی کے بعد جنوری ۱۹۴۹ء میں ایک دفعہ پھر منظر عام پر آیا۔ اب شیخ عبدالقادر اس کے مدیر اعزازی تھے اور "ہمایوں" کے سابق مدیر مولانا حامد علی خان نے منصب ادارت سنبھالا تھا "مخزن" کی حیات نو کا خیال جناب حمید نظامی کے ذہن میں پیدا ہوا تھا، جو نئے وطن میں روزانہ صحافت کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی مؤثر رجحان ساز قوّت کے طور پر آزمانے اور صحت مند اقدار کو فروغ دینے کے آرزو مند تھے، نیا "مخزن" ادارہ نوائے وقت کے زیر اہتمام منصۂ شہود پر آیا۔ شیخ عبدالقادر نے اس دور کے آغاز پر فرمایا کہ:

" مخزن " کے نام سے اس رنگ کے ایک نئے رسالے کا مخزن کی ابتدا سے تقریباً نصف صدی بعد جاری ہونا ' اس کا مر کے جی اٹھنا ' اس تحریک میں جو احباب شامل ہیں ان میں دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں ' ایک جناب حمید نظامی مدیر " نوائے وقت " اور دوسرے جناب حامد علی خان ... ان کے ہاتھ میں اس نئے پودے کے سرسبز اور بار آور ہونے کی وثوق سے امید کی جا سکتی ہے " (١٦)

" مخزن " کے اجرا کا ایک فوری فائدہ یہ ہوا کہ بہت سے پرانے بادہ کش جو محفل ادب سے غائب تھے ' ایک دفعہ پھر" مخزن " کی طرف کھنچے چلے آئے ' چنانچہ " مخزن " کے ابتدائی پرچوں میں ہمیں خلیفہ عبدالحکیم ' پنڈت کیفی ' غلام بھیک نیرنگ ' محمد اسمٰعیل پانی پتی ' اثر صہبائی ' جوش ملسیانی ' آغا صادق ' فیاض محمود ' محمد ہادی حسین ' تلوک چند محروم ' آغا حسین ارسطو جاہی ' جلال الدین اکبر اور مرزا محبوب بیگ جیسے ادبا کے نام نمایاں نظر آتے ہیں اور " مخزن " کی نشاۃ ثانیہ کا رشتہ ' اس کے دور اول و دوئم سے منسلک ہو جاتا ہے ۔ ترتیب و تدوین کا اندازہ بھی قدیم " مخزن " جیسا تھا " مخزن المخازن " کے تحت ادبی رسائل کے منتخب مضامین اور اسی عنوان کے تحت انتخاب مخزن پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا ۔ "منشورات" سماجی مسائل کے تبصروں کا اور "ایڈیٹر کے نام" قارئین کے تاثرات کا باب تھا' اور یہ سب کچھ اس شائستہ انداز میں پیش کیا جاتا تھا کہ ثقہ پڑھنے والے متاثر ہوتے۔

"مخزن" نے اس دور میں نئے لکھنے والوں کی ایک خاصی بڑی جماعت کی تربیت کی' اس دور میں ہمیں "مخزن" کے صفحات پر انور جلال' غلام رسول تنویر' ریاض الرحمٰن' مسعود اشعر' امین الرحمٰن' شمس الدین صدیقی' ارشد مسعود' صادقین' جاوید صدیقی' سعید احمد رفیق ' جمیل جالبی' تمکین کاظمی' اور بشیر ساجد کے نام بے حد نمایاں نظر آتے ہیں' جو اس دور میں قلم سے اپنا نیا رشتہ استوار کر رہے تھے۔ "مخزن" نے نئے ادب کا ساتھ دینے کی کوشش کی' قدیم ادب کے نوادرات کو نئی تابانی عطا کی' یک بابی ڈرامہ اور مختصر افسانہ کی اشاعت میں گہری دلچسپی لی' ڈاکٹر محمد باقر' حمید احمد خان ' فیاض محمود۔ ڈاکٹر تاثیر' یوسف ظفر' علی عباس جلال پوری' عابد علی عابد' اور شیر محمد اختر کی نگارشات کو نئی نسل کی تہذیبی اور ادبی تربیت کے لئے پیش کیا۔ لیکن "مخزن" اقتصادی لحاظ سے خود کفیل نہ بن سکا اور صرف دو سال کے بعد اس کا سلسلہ اشاعت منقطع کر دیا گیا۔(١٧) "مخزن" ادب میں اظہار کے تہذیبی زاویوں کا ترجمان تھا' اس کے صفحات پر ہمیشہ ایسی تخلیقات کو جگہ ملتی تھی جو جمالیاتی اور اخلاقی اقدار کو روشن کرنے میں معاونت کرتی تھیں اور انسانی ذہن کو نئے آفاق سے متعارف کراتی تھیں' "مخزن"کا دور اشاعت محدود تھا لیکن اس کی ادبی خدمات کا اعتراف ضروری ہے۔

"گل خنداں" - لاہور

ماہنامہ "گل خنداں" کے مدیر منظور احمد تھے' انہوں نے یہ رسالہ اکتوبر ۱۹۴۹ میں لاہور سے جاری کیا - اس کا مقصد ادب و سماج کی اصلاح تھا - "گل خنداں" نے یہ مقصد طنز و مزاح اور تنقید سے حاصل کرنے کی کوشش کی - "گل خنداں" کے لکھنے والوں میں نعیم صدیقی' منصور قیصر' فدائے ادب تونسوی شفیع عقیل کے نام نمایاں ہیں اس پرچے نے نئے لکھنے والوں کے لیے پہلی سیڑھی کا کام زیادہ سرانجام دیا ہے اس کا دور اشاعت ۱۹۶۳ء تک پھیلا ہوا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "گل خنداں" کو عام قاری کا تعاون حاصل تھا - گل خنداں کا "۱۸۵۷ نمبر" اس کی ایک یادگار اشاعت ہے- پیام شاہجہان پوری' ناصر زیدی' امین ہاشمی نے اس کی ادارت کے فرائض سرانجام دیئے -

"سوغات" - کراچی

محمود ایاز کا رسالہ "سوغات" بنگلور سے جاری ہوا تھا اور اس نے "نیا دور" کی طرح شائع ہوتے ہی اپنا ایک مستقل ادبی مقام بنا لیا تھا' اس کا "جدید نظم نمبر" اب اس عہد کا ایک نمائندہ شمارہ اور حوالے کی کتاب شمار ہوتا ہے - چھٹے خاص سہ ماہی شمارے سے "سوغات" ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں شائع ہونے لگا - پاکستان میں "سوغات" کے مدیر غلام محمد تھے' لیکن اس پر محمود ایاز کے افکار و تصورات کی چھاپ پختہ نظر آتی ہے -

"سوغات" جدیدیت کا ترجمان تھا' اسے خیال کو نئی نئی ہیئتوں میں پیش کرنے اور فکر کے نئے گوشے تلاش کرنے میں دلچسپی تھی - چنانچہ ۶۲ - ۱۹۶۱ء میں جدیدیت کی روشنی پھیلانے والے ادبی جرائد میں "سوغات" کو نمایاں ترین اہمیت حاصل ہے' اس پرچے نے مغرب کی ادبی تحریکوں کو اردو میں رواج دینے کی کوشش کی اور متعدد انقلاب آفریں مضامین شائع کئے - اس ضمن میں ممتاز شیریں کا مقالہ "منفی ناول کی مثال" ریاض احمد کا "جدید اردو نظم کا ارتقا" - ممتاز حسین کا "شاعر- صانع یا خالق" محمد حسین عسکری کا "ایک دیباچہ" خلیل الرحمٰن اعظمی کا "اس پہ مچلے ہیں کہ ہم درد جگر دیکھیں گے" رفیق خاور کا "مطالعہ راشد" خاص طور پر قابل ذکر ہیں' "سوغات" میں ممتاز شیریں کا افسانہ "کفارہ" ضمیر الدین احمد کا "پہلی موت" راجندر سنگھ بیدی کا خاکہ "میں؟" اور گوربچن سنگھ کا افسانہ "اندھے کی لاٹھی" کو بھی معرکہ آرا تصور کیا گیا-

"سوغات" کی ایک اہم عطا نظم جدید کا فروغ و تعارف ہے- اس کا شاعری کا حصہ نثر کے حصے

پر سبقت حاصل کر جاتا تھا۔ اس کے ایک شمارے میں محمد علوی، اسد محمد خان، ساقی فاروقی کی متعدد نظمیں اکٹھی شائع کی گئیں "سوغات" ایک بے حد موثر ادبی جریدہ تھا۔ اس نے لکھنے والوں میں تحریک بھی پیدا کی اور نئے تجربے کو بھی فروغ دیا۔ لیکن یہ پرچہ بھی سخت جان ثابت نہ ہوا۔

"ادب" ۔ کراچی

"ادب" کراچی کے مدیر غلام محمد بٹ تھے، ان کا شمار ایسے لوگوں میں کرنا چاہئے جو ادب کی خدمت کو عبادت سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ رسالہ "ادب" بھی ان کی عبادت ہی کا ایک وسیلہ تھا۔ "ادب" سادہ اور بے رنگ، لیکن بے حد موثر پرچہ تھا۔ اس نے ادبی دنیا کو خاموشی سے منقلب کرنے کی کوشش کی اور اپنے دامن میں اس دور کے چند اعلیٰ ادب پارے پیش کئے، مثال کے طور پر "قانون حمورابی" ایک ایسا مقالہ ہے جو اب صرف "ادب" ہی میں دستیاب ہے۔ محمد عارف قریشی نے لکھا ہے کہ:

"ادب" ظاہری حسن سے عاری مگر پر مغز رسالہ تھا"(۱۸)

"یثرب" ۔ لاہور

ماہنامہ "یثرب" لاہور اسلامی ادب و ثقافت کا ترجمان تھا، اس کی ادارت ریاض خالد اور ابن انوار سرانجام دیتے تھے۔، اس پرچے نے اسلامی ادب کی تحریک کو پروان چڑھانے کی کوشش کی اور ابو صالح اصلاحی، مسعود جاوید، شمیم جاوید، عاصی ضیائی رامپوری، جیلانی بی اے، شفقت کاظمی کے تعاون سے اس پرچے کی ادبی جہت کو استوار کیا۔ ابو صالح اصلاحی کا مقالہ "حضرت عائشہ کے سیاسی مکتوب" اور عاصی ضیائی کا "غالب کی شاعری اور نفسیات" جیسے مضامین سے اس کا تنوع ظاہر ہوتا ہے۔

"اوراق نو" - لاہور

لاہور سے ماہنامہ " اوراق نو " کی بنیاد شیخ عبدالقادر نے رکھی تھی - اس کے مدیران ریاض قادر اور ناصر کاظمی تھے ' یہ جریدہ ٹائپ میں مصور چھپتا تھا اور اسے اس عہد کے بیشتر ممتاز ادبا کا تعاون حاصل تھا ' لیکن صوری اور معنوی خوبیوں کے باوجود تین اشاعتوں کے بعد " اوراق نو " بند ہو گیا - کچھ عرصے کے بعد اس کی تجدید اشاعت ہوئی لیکن اب نہ مدیران میں پہلے جیسا ولولہ تھا اور نہ "اوراق نو" میں پہلے جیسا نیاپن' صوری رعنائی اور معنویت تھی۔ "اوراق نو" کا "شیخ عبدالقادر نمبر" اس پرچے کی ایک خصوصی اشاعت ہے۔ "اوراق نو" کو سعادت حسن منٹو' محمد حسن عسکری' ڈاکٹر نذیر احمد' میرا جی' یوسف ظفر' قیوم نظر' عبدالرحمٰن چغتائی کا تعاون حاصل تھا۔ محمد حسن عسکری کا مقالہ "مسلمان اور ترقی پسندی" میرا جی کی نظم "گھنا گرم جادو" منٹو کا افسانہ "خالد میاں" اوراق نو ہی میں چھپ کر مقبول ہوئے تھے۔ "اوراق نو" نے ادبی صحافت کو صوری اور معنوی زاویوں سے ایک نئی جہت دی ' اس نے اردو ادب کے مزاج کو منقلب کرنے کی کاوش بھی کی۔

"جام نو" - کراچی

" جام نو " کا شمار مقبول عوامی ادبی رسائل میں کرنا چاہئے - ۱۹۵۰ء میں مظہر خیری نے اس کی اشاعت کا آغاز کیا تو انہیں راشدالخیری کی مصلحانہ روش اور ادب کے ذریعے تہذیب و اخلاق کے مقاصد کا حصول ورثے کے طور پر ملا تھا۔ مظہر خیری نے " جام نو " سے ادب میں انقلابی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی - تاہم اس نے ادب کی پہلی دہلیز پر قدم رکھنے والوں کی ہمیشہ راہنمائی کی اور ایک ایسا صاف ستھرا اور شائستہ پرچہ پیش کیا جس کا مطالعہ بڑوں کے ساتھ چھوٹے اور مردوں کے ساتھ عورتیں بھی کر سکتی تھیں - "جام نو" تعمیری ادب اور اخلاقی اقدار کا نمائندہ تھا اور ان مقاصد کے حصول میں اس نے مقدور بھر کوشش ہمیشہ جاری رکھی ' عوام کا تعاون اور پڑھنے والوں کی محبت جیتنے میں " جام نو " نے نمایاں کامیابی حاصل کی ' اس کے ادارۂ تحریر میں اقبال حیدری ' شریف رزمی اور وزیری پانی پتی شامل تھے اور یہ اصحاب ادارتی خدمات بھی سرانجام دیتے تھے - جام نو کے سالنامے ملک بھر میں دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے - اس قسم کی خاص اشاعتوں کے لئے بڑے بڑے ادیبوں کا تعاون بھی حاصل کر لیا جاتا تھا - چنانچہ جام نو کے سالناموں میں ہمیں یگانہ چنگیزی ' جگر مراد آبادی ' فراق گورکھ پوری ' شادعارفی ' اسد ملتانی ' شکیل بدایونی ' آل احمد سرور ' عبدالحمید عدم ' ماہر القادری '

عشرت رحمانی ، نیاز فتح پوری ، خواجہ احمد عباس ، شوکت تھانوی ، قدرت اللہ شہاب اور صادق الخیری جیسے ادبا کے نام نظر آتے ہیں ، " جام نو " نے احسان دانش اور ایم اسلم کے فکر و فن پر دو یادگار خاص نمبر پیش کئے ۔ ۱۹۶۳ء میں جام نو کا بارہ سالہ نمبر شائع ہوا ۔ " جام نو " نے متعدد افسانہ نمبر بھی پیش کئے ، مظہر خیری کی وفات کے بعد " جام نو " اپنی اشاعت برقرار نہ رکھ سکا ۔ " جام نو" کا مظہر خیری نمبر بھی اس کی ایک یادگار اشاعت ہے ۔

"مشیر" ۔ کراچی

مئی ۱۹۵۰ء میں کراچی سے عبدالغفور بیگ نے ماہ نامہ "مشیر" نکالا جس کے سر عنوان لکھا تھا "پاکیزہ ادب اور صحیح اسلامی مشورے لئے ہوئے" ۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں اس کے حلقۂ ادارت میں محمود فاروقی شامل ہوئے تو اس کا اعلامیہ تبدیل ہو گیا۔ یہ اب یوں تھا "ایک خدا' ایک انسان۔ ایک نظام"۔۔ اس پرچے کی فکری جہت اسلامی ہے لیکن اس نے پروپیگنڈہ کرنے اور نظریے کو سطح پر شعوری انداز میں ابھارنے کی تحریک پیدا نہیں کی "مشیر" نے سید ابوالاعلیٰ مودودی اور قائد اعظم کے ارشادات کو تسلسل و تواتر سے پیش کیا' تخلیقی زاویوں سے محمود فاروقی' اسد ملتانی' ایوب سرور' ابراہیم جلیس' اسعد گیلانی' شمیم جاوید' ماہر القادری' نعیم صدیقی' فضل من اللہ' ممتاز مفتی' طاہر سردھنوی' مسعود عالم ندوی' عاصی کرنالی اور کوثر نیازی "مشیر" کے ممتاز قلم کار ہیں۔ مشیر اپنے قارئین کو ایک مخصوص نظریاتی جہت کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا رہا' اپریل ۱۹۵۶ء میں "مشیر" نے "اسلامی جمہوری نمبر" پیش کیا لیکن جون ۱۹۵۶ء کے بعد اس کی اشاعت ڈانواں ڈول ہو گئی۔

"اقدام" ۔ لاہور

" اقدام " لاہور کا اجرا اپریل ۱۹۵۰ء میں ہوا تھا ' اس کے مدیران میاں محمد شفیع ' ممتاز احمد خان اور عبداللہ بٹ تھے " اقدام " سیاسی ہفت روزہ تھا لیکن اس کے مدیران چونکہ ادیب تھے اور علامہ اقبال کی تعلیمات سے خصوصی رغبت رکھتے تھے اس لئے اس پرچے میں سیاسی ' سماجی اور تہذیبی مضامین کے ساتھ علمی اور ادبی مضامین کی شمولیت بھی ضروری تصور کی جاتی تھی " اقدام " ہر سال اپریل میں اقبال نمبر شائع کرنے کا اہتمام کرتا اور اس میں اقبال کو منظوم خراج عقیدت پیش کرنے کے علاوہ فکر و فن اقبال پر بھی مضامین پیش کرتا تھا ' اس ضمن میں خیال امروہوی ' ندا بخاری ' آغا یمین '

محمد شریف بقا، تبسم رضوانی اور الطاف حسن قریشی کی نظموں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ جسٹس ایس اے رحمٰن کا مقالہ "یاد اقبال" احمد نبی خان کا "اقبال ایران میں"۔ خیال امروہوی کا "اقبال کا نظریہ اشتراکیت" خواجہ غلام الدین کا "اقبال کے پیغام کی عالمگیری" محمد ظہیر کا "اقبال اور قائد اعظم" چند اہم مضامین اقبالیات ہیں۔

"اقدام" میں شاعری کے لئے بھی گنجائش نکالی جاتی تھی، اس باب میں شیر افضل جعفری، عزیز حاصل پوری، سلیم تابانی، محمود اختر کیانی، عبدالکریم ثمر، لطیف انور، اور شمیم جالندھری کے نام نظر آتے ہیں۔ مضامین ادب میں "مذہب کا انتہائی درجہ" (از دیوان سنگھ مفتون) جسٹس کیانی کا "پاکستان اور اسلامی نظریہ"۔ امجد کندیانی کا "میر کی غزل"۔ ریاض احمد پرواز کا "سید سلمان ندوی کی شاعری" سے "اقدام" کے ادبی مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ "اقدام" نے غیرافسانوی نثر کی ان اصناف کو فوقیت دی جن میں افسانے کے عناصر موجود تھے، اس ضمن میں خودنوشت سوانح اور یاد نگاری کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ دیوان سنگھ مفتون کی زندگی کے واقعات و حادثات اور خادم حسین بٹالوی کی یادیں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں کہ قارئین انکا انتظار کرتے اور بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے، "اقدام" کا ایک اور بڑا اقدام اردو میں ڈائری نگاری کا فروغ ہے۔ م۔ ش کی ڈائری اگرچہ سیاسی نوعیت کی ہوتی تھی لیکن میاں محمد شفیع اکثر اوقات ادبی موضوعات اور شخصیات پر بھی اظہار خیال کرتے، اس ڈائری کی دوسری خوبی اس کا متحرک ادبی اسلوب اور م۔ ش کا مثبت نقطہ نظر تھا۔ اس ڈائری کی تقلید صحافت اور ادب میں بڑے پیمانے پر کی گئی۔

"العلم" (کراچی)

آل پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے اغراض و مقاصد میں ایک ضروری جزو "پاکستان میں مسلمانوں کی تعلیم، علمی ثقافتی اور لسانی ترقی و اصلاح" بھی تھا اس جزو کی تکمیل اور حصول مقصد کے لیے سید الطاف علی بریلوی نے جولائی ۱۹۵۱ء میں کراچی سے ادبی سہ ماہی رسالہ "العلم" جاری کیا جو اپنے بانی کی وفات کے بعد متذکرہ انتظامات کے تحت تا حال چھپ رہا ہے۔

"العلم" میں تخلیقی اصناف ادب کو جگہ نہیں دی جاتی، اس کا مزاج تحقیقی اور تنقیدی ہے "العلم" نے ادب، زبان اور تاریخ کے موضوع پر تحقیق و تنقید کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ ادب کے حوالے سے ثقافت اور تہذیب پر بھی قابل قدر مضامین پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کا مقالہ "عربی ادب میں سندھ کا حصہ"۔ ظفر واسطی کا مقالہ "پاکستان میں عربی زبان

کا لزوم" مولانا عبدالقدوس ہاشمی کا مقالہ "طلسم ہو شربا کے آئینہ میں انیسویں صدی کا تمدن" ابو جعفر کشفی کا مقالہ "موازنہ غالب نظیری و بیدل" کا حوالہ دینا مناسب ہے۔ "العلم" کے مقالہ نگاروں میں محمد ایوب قادری، جلیل قدوائی، محمد امین زبیری، مفتی انتظام اللہ شہابی، سیدہ انیس فاطمہ بریلوی، مصطفےٰ علی بریلوی، ضیاء الدین احمد برنی، علامہ سلیمان ندوی، جیسے نامور زعمائے قلم کرتے رہے ہیں، غالب کی صد سالہ برسی پر "العلم" نے ایک ضخیم خاص نمبر پیش کیا تھا "العلم" چونکہ ایک تعلیمی کانفرنس کا رسالہ ہے اس لئے اس کا حلقہ اثر وسیع نہیں۔ تاہم اس کی علمی فتوحات کا دائرہ وسیع ہے۔ "العلم" گذشتہ اڑتیس سال سے مشنری جذبے سے خدمات ادب سرانجام دے رہا ہے اور اس نے متعدد ایسے مضامین پیش کئے ہیں جو ادب و لسانیات کے بنیادی ماخذات شمار ہوتے ہیں۔ "العلم" نے فروغ اردو کے لئے بھی قابل قدر خدمات ادا کی ہیں۔

"الحمرا"۔ لاہور

مولانا حامد علی خان نے "مخزن" سے جو قومی اور ادبی نصب العین وابستہ کیا تھا اسے "مخزن" کے انقطاع اشاعت کے بعد "الحمرا" سے حاصل کرنے کی کوشش کی، یہ علمی اور ادبی رسالہ جولائی ۱۹۵۱ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ مولانا حامد علی خان نے "ہمایوں" اور "مخزن" کو ایک مخصوص ادبی اخلاقیات عطا کی تھی۔ "الحمرا" بھی اسی جہت کی توسیع تھا، لیکن المیہ یہ ہوا کہ اب حامد علی خان کو وہ وسائل حاصل نہیں تھے، جو میاں بشیر احمد مدیر "ہمایوں" اور حمید نظامی مدیر "نوائے وقت" کی بدولت دستیاب تھے۔ اس کے ساتھ ہی ادب کا مذاق تغیر و تبدل کی زد میں آچکا تھا۔ "الحمرا" نے قومی اور لسانی مسائل میں تحفظ زبان و ادب کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن اردو کا افق بعض ہنگامی تبدیلیوں کو تیزی سے قبول کر رہا تھا۔ "الحمرا" رئیس احمد جعفری، اثر لکھنوی، اختر علی تلہری، کبیر انور جعفری، سراج علوی، صدق جائسی، ناظر رومانی، نشتر جالندھری، علی سجاد مہر کو احترام سے شائع کر رہا تھا لیکن زمانہ اب تیزی سے آگے نکل چکا تھا۔ چنانچہ "الحمرا" کا یہ انداز قبول عام حاصل نہ کر سکا اور چند سالوں کے بعد مولانا حامد علی خان اس کے مالی امور کو سنبھالنے سے قاصر ہو گئے۔

"الحمراء" نے اپنی حیات مختصر میں تحفظ زبان اردو کی کوشش کی، راجہ امین الرحمن نے مصوری کے فن اور تجرید و علامت نگاری پر چند اعلیٰ پائے کے مضامین لکھے، فہمیدہ اختر علی کوہ زئی، سید باقر علیم، عبدالصبور طارق، علی احمد شاہدی، شرون کمار ورما، ابوالحسن نغمی اور شمیم جاوید کے نام "الحمراء" کے صفحات سے ابھرے، سعید اختر درانی کے لندن کے سفرنامے اور مضافات لندن کی سیر بھی اس

پرچے کی چند نادر چیزیں ہیں۔

"نورنگ" کراچی

آزادی کے بعد دہلی کا رسالہ "چمنستان" بند ہو گیا اور آغا سرخوش قزلباش کراچی منتقل ہو گئے تو انہوں نے اس شہر سے نیا ادبی جریدہ "نورنگ" ۱۹۵۱ء میں جاری کیا۔ "نورنگ" پر دہلوی مزاج اور آغا شاعر قزلباش کی گہری چھاپ تھی "چمنستان" کی طرح اسے ایک مخصوص حلقے کا تعاون بھی حاصل تھا۔ اس پرچے نے تخلیقی ادب میں عوامی دلچسپی کا مواد پیش کرنے کی کوشش کی لیکن اسے "چمنستان" جیسی کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور یہ بالا آخر غیر تجارتی خطوط پر جاری نہ رہ سکا۔

"نورنگ" کے ادارہ تحریر میں مسعود الرحمٰن اور اثر جلیلی شامل تھے، لکھنے والوں میں عندلیب شادانی، جگر مراد آبادی، شاد عارفی، اثر لکھنوی، صادق الخیری، معین احسن جذبی، اقبال عظیم کے نام اہم ہیں۔ قرۃ العین کا افسانہ "چکوروں کی دنیا" احمد شجاع پاشا کا طنزیہ "سازش" اے حمید کا افسانہ "خزاں کی ایک رات" مجتبیٰ حسین کا مقالہ "کچھ لہجے کے بارے میں" "نورنگ" میں چھپ کر ادبی دنیا میں مقبول ہوئے۔ "نورنگ" کے ہر صفحے پر لمٹن گھڑیوں کا اشتہار ایک سطری صورت میں چھپتا تھا، جو ذوق ادب پر گراں گزرتا تھا۔

"تاریخ و سیاست" ۔ کراچی

سہ ماہی رسالہ "تاریخ و سیاست" کراچی سے انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام اپریل ۱۹۵۱ء میں جاری ہوا، اس کی مجلس ادارت میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، پیر حسام الدین راشدی، ہاشمی فرید آبادی، قاضی احمد میاں اختر، ڈاکٹر ریاض الحسن، ڈاکٹر معین الحق اور مسٹر ایم بی احمد شامل تھے، اس پرچے کے اجرا کے پس منظر میں جو فکر کارفرما تھی، اس کا اظہار ظفر اللہ خان نے ایک جلسے میں کیا تھا اور اسی تقریر کو "تاریخ و سیاست" کا افتتاحیہ شمار کیا گیا۔ چنانچہ لکھا گیا کہ:

"مسلمانوں نے فلسفہ تاریخ کی بنیاد رکھی اور بتایا کہ زندہ قوموں کے لئے تاریخ کا مطالعہ کس قدر ضروری ہے.. مسلمانوں میں یہ سیاسی و اجتماعی زوال اور جمود آیا تو انہوں نے تاریخ سے غفلت برتنا شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دور حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کی مستند تاریخیں غیر مسلم مورخین

نے ترتیب دیں یا لکھیں اور انہیں اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا"

اس پرچے کا مقصد ان غلط بیانیوں کو رفع کرنا تھا جو غیر ملکی مؤرخین نے تاریخ اسلام میں دانستہ شامل کر دی تھیں، دوسرا مقصد تحقیق تاریخ کے علاوہ مطالعہ تاریخ کے ذوق کی افزائش تھی۔ چنانچہ اس پرچے نے ماضی کے واقعات و حادثات کو تحقیقی زاویے اور ادبی اسلوب میں پرکھنے کی کوشش کی۔ "ہندوستان میں مسلمانوں اور انگریزوں کے آثار پر ایک نظر" از نصیر الدین ہاشمی۔ "مشاہدات کابل و یاغستان" از محمد علی قصوری "ہماری تمدنی تاریخ اور فوری ضرورتیں" از ڈاکٹر محمد اشرف۔ "ہندی الاصل اور ہندوی النسل سلاطین" از سید سلیمان ندوی "تحریک سید احمد" از ہاشمی فرید آبادی "بابلی تہذیب و تمدن" از مالک رام "موئن جوڈرو کی زبانیں" از ابوالجلال ندوی جیسے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس رسالے نے تاریخ و سیاست کی اطراف و جوانب سے ہٹ کر دیکھنے کی کوشش بھی کی لیکن بنیادی مزاج کو قائم رکھا اور قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔

"الشجاع" - کراچی

۱۹۵۲ء میں ٹائمز پریس کے مالک ایس ایم شجاع الدین کو خدمت ادب کا خیال پیدا ہوا تو انہوں نے "الشجاع" کے نام سے ایک ماہنامے کی ابتدا کی۔ چند برسوں تک اسے پس پردہ رہنے والے ادبا نے مرتب کیا، اس لئے "الشجاع" کا ذاتی تشخص ابھر نہ سکا۔ سلمان الارشد اس کے مدیر مقرر ہوئے تو انہوں نے ملک بھر کے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا اور پہلے سالنامے میں ہی فخر کا اظہار کیا کہ اسے نہ صرف نامور ادیبوں کا تعاون حاصل ہو گیا ہے بلکہ "الشجاع" اب صحیح معنوں میں ادبی جریدہ بھی بن گیا ہے۔ سلمان الارشد نے "الشجاع" کی اشاعت کو نئے خطوط پر استوار کیا اور اسے ایک باقاعدہ ماہنامہ بنا دیا۔ جو عمل اور رد عمل کو منظر عام پر لانے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ اس پرچے میں جو فکر انگیز مضامین شائع ہوئے ان میں "ادب شعور کی روشنی میں" از منظور حسین شور "اردو افسانہ میں روح عصر" از ڈاکٹر میمونہ انصاری "حقیقت ادبی" از وقار احمد رضوی "میرا جی کی دریافت" از ڈاکٹر وزیر آغا "ادبیات پر اسلام کے اثرات" از ڈاکٹر حسن خان "اردو لپی" از ڈاکٹر سہیل بخاری چند خیال افروز مضامین ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ "الشجاع" میں فکر و نظر کے اظہار کی مکمل آزادی تھی اور یہ کسی خاص گروہ کا پرچہ نہیں تھا۔ غالب صدی پر "الشجاع" کا غالب نمبر سب سے پہلے منظر عام پر آیا اور اتنا مقبول ہوا کہ اس کے دو ایڈیشن چھاپے گئے۔ اس پرچے میں غالب کی خود نوشت سوانح عمری کا ایک ورق بخط غالب چھاپا گیا ہے۔

"الشجاع" نے جدید افسانہ ' شاعری ' طنز و مزاح کے علاوہ یک بابی ڈراموں کی اشاعت کو بھی فوقیت دی ۔ سلمان الارشد چونکہ خود بھی ڈرامہ نگار تھے اس لئے انہوں نے اسی صنف کے فروغ میں خصوصی دلچسپی لی ۔ ادارتی شندرہ "التماس" کے تحت شجاع الدین مسائل کے تذکرے کے علاوہ ادبا کی تخلیقات پر بھی اظہار خیال کرتے تھے ۔ اس پرچے میں " ہمارے نام " کے عنوان سے خطوط پرچے کی ابتدا میں پیش کئے جاتے تھے ۔ رائٹرز گلڈ کے بارے میں ایک دلچسپ بحث ناصر زیدی نے چھیڑی تھی جس پر شدید رد عمل ہوا " الشجاع " مالی لحاظ سے نہایت آسودہ تھا ۔ لیکن اس تجارتی ادارے نے ۱۹۷۸ کے لگ بھگ اسے بند کر دیا "الشجاع" کا یہ منفرد اعزاز قائم ہے کہ اسے اردو کے تمام ممتاز فنکاروں کا پر خلوص تعاون حاصل تھا ۔

"خاور" ۔ ڈھاکہ

ڈھاکہ کو مشرقی پاکستان کے صدر مقام کی حیثیت حاصل ہوئی تو اس کا ایک مخصوص ادبی تشخص بھی ابھرنے لگا ۔ ڈھاکہ کی اس جہت کو ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ادبی ماہنامہ " خاور " نے استوار کیا تھا ۔ "خاور" کا پہلا پرچہ مارچ ۱۹۵۲ ء میں نکلا اور مشرقی پاکستان کا پہلا اہم ادبی پرچہ شمار کیا گیا۔ اس پرچے پر ڈاکٹر عندلیب شادانی کی چھاپ بہت گہری تھی ' انتخاب کڑا اور معیار بلند تھا ۔ لیکن یہ عوام کی سطح سے اونچا اور کاروباری لحاظ سے غیر منفعت بخش تھا ۔ چنانچہ "خاور" ایک سال کے بعد ہی بند کر دیا گیا ۔

"اقبال" ۔ لاہور

سہ ماہی مجلّہ " اقبال " لاہور سے ۱۹۵۲ء میں جاری ہوا ۔ یہ بزم "اقبال" لاہور کا ترجمان تھا اور اس کے مقاصد میں "اقبال" کے افکار اور علوم و فنون کے ان شعبہ جات کا تنقیدی مطالعہ شامل تھا جن سے " اقبال " کو دلچسپی تھی ۔ اس قسم کے شعبہ جات میں اسلامیات ' فلسفہ ' مذہب ' فن ' ادب اور عمرانیات وغیرہ سب شامل تھے ۔ " اقبال " کریم احمد خان کے اہتمام سے چھپتا تھا لیکن اس کے مدیر اعزازی ایم ایم شریف اور معاون مدیر بشیر احمد ڈار تھے ۔ ۱۹۶۹ء میں "اقبال" کی ادارت سعید شیخ نے اور ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر جہانگیر خان نے کی ۔ ان کے معاون مدیر گوہر نوشاہی تھے ۔ کچھ عرصے کے لئے پروفیسر محمد عثمان بھی اس کے مدیر اعزازی کے طور پر کام کرتے رہے ۔

ایک لمبے تعطل کے بعد ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر وحید قریشی نے "اقبال" کی تجدید اشاعت کی اور مختصر سے عرصے میں اس کی فعال حیثیت کو بحال کر دیا۔ "اقبال" کا شمار ان ممتاز ادبی پرچوں میں ہوتا ہے جن کا علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی معیار بہت بلند ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں سب اول درجے کے ادبا تھا اور مدیران چونکہ خود صاحب نظر مفکر تھے اس سے "اقبال" میں صرف ایسے مضامین کو اشاعت ملتی تھی جن سے زیر بحث موضوع کی کوئی نئی جہت روشن ہوتی تھی یا جس سے بحث کا کوئی نیا زاویہ آشکار ہوتا تھا۔ "اقبال" کا غالب موضوع اقبالیات تھا لیکن ایم ایم شریف صاحب نے اس کے دائرہ عمل میں بیشتر علوم نو کو شامل کر لیا اور وہ اذکار پارینہ میں بھی گہری دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ دین محمد شفیقی کا مقالہ "پیغمبر ایران۔ زرتشت" اپریل ۱۹۵۴ء میں، سید عابد علی عابد کا "خاقانی شیروانی" اکتوبر ۱۹۵۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ رسالہ "اقبال" نے قدیم یونانی ڈرامے کے تعارف نو میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں یونانی دیو مالا کو نئی روشنی عطا کی۔ رحمن مذنب کا مقالہ "ڈرامے کی ابتدا" اور سوفوکلیز کا حوالہ خاص طور پر مفید مطلب ہے۔ رحمن مذنب نے "یونانیت" کو رسالہ "اقبال" میں متعارف کرانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کا یہ کام بنیادی نوعیت کا ہے اور اب صرف رسالہ "اقبال" ہی میں دستیاب ہے۔

اقبالیات کو ۱۹۵۲ء میں ایک ایسے موضوع کی حیثیت حاصل تھی جس پر زیادہ کام نہیں ہوا تھا۔ اس موضوع کے اطراف و جوانب میں کام کرنے کی گنجائش بہت زیادہ موجود تھی، رسالہ "اقبال" نے اس موضوع کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اقبالیات کے متعدد نئے گوشوں کو منور کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس ضمن میں یہ حقیقت بے حد اہم ہے کہ "اقبال" نے اقبالیات پر لکھنے والوں کی اپنی ایک جماعت پیدا کی اور اس جماعت نے اقبالیات کے نہ صرف نئے موضوعات تلاش کئے بلکہ اقبال کی زندگی کی گم شدہ کڑیاں اور ان کے خطوط کی بازیافت میں بھی گراں قدر کام کیا۔ اس سلسلے میں یہاں عباداللہ فاروقی کے مقالے "علامہ اقبال اور بو علی قلندر" عبدالغنی نیازی کا "تصوف اور اقبال" محمد فرمان کا "اقبال اور آرٹ" غلام حسین ذوالفقار کا "اقبال اور نیٹل کالج میں" سید عبدالواحد کا "اقبال اور حیدر آباد دکن" محمد عثمان کا "حیات اقبال کا ایک جذباتی دور" "اقبال شعرائے فارسی کی صف میں" از ڈاکٹر سید عبداللہ، بشیر احمد ڈار کا "فکر اقبال مسئلہ اجتہاد" محمد مظہر الدین صدیقی کا "اقبال کا تصور فقر" خلیفہ عبدالحکیم کا "اقبال کی شاعری میں عشق کا مفہوم" حوالہ کافی ہے۔ "اقبال" میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کو اہمیت دی گئی۔ چنانچہ "اقبال" کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے فکر و فن اقبال کو بیرونی دنیا میں متعارف کرایا اور کئی غیر ملکی مصنفین کے مضامین کو "اقبال" میں جگہ دے کر انہیں برصغیر کی ادبی حلقوں سے تعارف پیدا کرنے کا موقع دیا۔ "اقبال" کے مقالات کا

معیار اتنا بلند تھا کہ اس پرچے کے مضامین کے کم از کم تین " منتخبات " شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے عہد ادارت میں اردو اور انگریزی کے ساتھ فارسی زبان میں اقبالیات پر مضامین کے لئے جگہ نکالی گئی ہے ڈاکٹر وحید قریشی نے " اقبال " کی اشاعت کو نہ صرف باقاعدہ بنا دیا ہے بلکہ اس کے لئے لکھنے والوں کا ایک نیا حلقہ بھی پیدا کیا ہے ' چنانچہ اب " اقبال " کی اشاعت جدید خطوط پر استوار ہو گئی ہے۔

" نئی تحریریں " ۔ لاہور

جریدی سلسلہ " نئی تحریریں " حلقہ ارباب ذوق لاہور کا نمائندہ ادبی صحیفہ تھا ' جس کے اوّلیں مدیر قیوم نظر تھے ' لیکن سرورق پر ان کا یا کسی اور کا نام بطور مدیر نہیں چھاپا جاتا تھا۔ " جملہ معترضہ " کے تحت قیوم نظر نے لکھا ہے کہ

" مجموعی صورت میں " نئی تحریریں " پیش کرنے کا خیال نیا نہیں۔ پاکستان کے وجود میں آنے پر کراچی دارالحکومت بنا تو حلقہ ارباب ذوق کے کچھ دیوانے جو مرکزی ملازمتوں سے تعلق رکھتے تھے ' وہاں بھی پہنچ گئے ' پھر ان کی دیوانگی اپنا رنگ لائی اور کراچی میں حلقہ کی شاخ کی بنیاد رکھی گئی " (۱۹)

ان حلقہ بگوشوں میں الطاف گوہر ' تابش صدیقی اور ممتاز حسن احسن بھی شامل تھے۔ " نئی تحریریں " شائع کرنے کا خیال سب سے پہلے انہیں کو آیا تھا۔ مرکزی حلقہ لاہور کی اجازت سے " نئی تحریریں " کا پہلا شمارہ کتابی سائز اور ۱۹۲ صفحات کی ضخامت میں ۱۹۴۸ء میں کراچی سے چھپا اس پرچے میں یزدانی ملک کا " بکھرے ہوئے موتی " ' الطاف گوہر کا " خود فریب " ' اور محمد تقی کا " غسالنی " کے افسانے ' اختر الایمان ' قیوم نظر ' ضیا جالندھری ' اعجاز بٹالوی ' بلراج کومل اور تابش صدیقی کی نظمیں اور شان الحق حقی اور ممتاز حسین کے تبصرے شائع ہوئے ' رفیق خاور کا مقالہ " غالب ایک ذہنی تشخص " اس کا خاص مضمون ہے۔ " نئی تحریریں " کا سائز کتابی تھا اور یہ انوکھا محسوس کیا گیا ' مندرجات کا معیار بلند تھا ' لکھنے والے تازہ فکر تھے ' اس کے باوجود " نئی تحریریں " کراچی سے دوبارہ نہیں چھپا۔ (۲۰) اس پرچے کی ادبی تاریخ صرف ایک اشاعت تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

حلقہ ارباب ذوق لاہور نے ستمبر ۱۹۵۴ء میں " نئی تحریریں " کی تجدید اشاعت کی ' تو نام کے لحاظ سے یہ پرانا لیکن ترتیب و تدوین کے اعتبار سے نیا پرچہ تھا۔ اس کی حکمت ادبی ' حلقہ ارباب ذوق کے مزاج کو منعکس کرتی تھی لیکن اس کے اشاعتی امور کی انجام دہی کے لئے ظہیر الدین صاحب کا تعاون حاصل کیا گیا تھا جو اس سے قبل طویل عرصے تک رسالہ " کتاب " پیش کر چکے تھے اور ایک

اشاعتی ادارہ اردو بک سٹال لاہور ان کی نگرانی میں کامیابی سے کام کر رہا تھا۔

ادب اور فن کی پائدار اور مستقل حیثیت کو " نئی تحریریں " نے بطور خاص اجاگر کیا اور اپنے اصولوں کی وضاحت میراجی کے حوالے سے کی۔ نئی باتوں کو نت نئے رنگوں اور چمکدار انداز میں پیش کرنے کے لئے ادیب کے ذہن کو بھی تغیر و تبدل کو قبول کرنے کا مشورہ دیا گیا اور اس عمل میں ماضی کے سرمائے کو ساتھ رکھنے کا عہد کیا گیا' " نئی تحریریں " میں ایسے ادیبوں اور ایسی تحریروں کو ادبی طبقے سے روشناس کرانے کی نوید بھی دی گئی جو گروہ بندی اور نظریاتی اختلافات کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں' میراجی نے نظم کے تجزیاتی مطالعوں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا' اسے اب کتابوں اور مصوری کے شہ پاروں پر پھیلانے کی تجویز بھی سامنے آئی' ان سب امور کو پیش نظر رکھیں تو " نئی تحریریں " کا ادبی سفر نئے اور کھلے نیلے پانیوں کا سفر نظر آتا ہے اور اس کی منفرد بات یہ ہے کہ' ایک ایسے دور میں جب ترقی پسند مصنفین نے اپنے رسائل میں غیر ترقی پسندوں کا چھپنا ممنوع قرار دے دیا تھا " نئی تحریریں " نے اپنے صفحات سب کے لئے کشادہ کر دئے اور تخلیق و تحریر کے لئے " ادب " ہونا ضروری قرار دیا۔

" نئی تحریریں " نے اپنی اشاعتی زندگی میں اس پر حتی الوسع عمل بھی کیا' چنانچہ اس میں محمد صفدر عارف' عبدالمتین' سلام مچھلی شہری' احمد ندیم قاسمی کی تخلیقات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا اور اس میں خواجہ منظور حسین' آفتاب احمد خان' سید عبداللہ' اسلوب احمد انصاری' اعجاز حسین رضوی کے ادب پارے بھی شریک اشاعت ہیں۔ تاہم " نئی تحریریں " چونکہ حلقہ ارباب ذوق کا ترجمان تھا اس لئے حلقے کی چھاپ اس پرچے پر واضح اور گہری ہے۔

لاہور سے " نئی تحریریں " کا اجرا ایک اہم ادبی کارنامہ تھا۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس نے ادبی رسالے کو کتاب جیسا وقار عطا کیا' (۲۱) اس نے ادبا کو مقبولیت اور شہرت عطا کرنے کے بجائے ان کی تخلیقات کو فوقیت دی اور انہیں اس طرح اکٹھا شائع کیا کہ فنکار کا ذاتی تشخص ابھر سکے' اس ضمن میں یوسف ظفر' محمد صفدر' سردار انور' انجم رومانی' مشفق خواجہ' اور میراجی کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ جن کی تین سے چھ تک تخلیقات ایک ہی پرچے میں چھاپی گئیں' نتیجہ یہ ہوا کہ فن کی پہچان اور فنکار کی انفرادیت کے ادارک میں قاری کو سہولت حاصل ہوئی۔ " نئی تحریریں " میں ذہن و خیال کو منور کرنے کے لئے ایسے موضوعات منتخب کئے گئے جن میں قاری کے لئے تازگی اور نیا پن موجود تھا' ریاض احمد کا مقالہ "ادب اور صحافت" خواجہ منظور حسین کا "بانگ درا پر ایک نظر" آفتاب احمد کا "چند ملاقاتیں" الطاف گوہر کا "میراجی کے چند خطوط" مختار الدین احمد کا "سرسید کے ایک رفیق" مسعود پرویز کا "موسیقی میں شور کی اہمیت" ن۔ م۔ راشد کا "شاعری کی تین آوازیں" کی مثالیں پیش خدمت ہیں' اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے عالمی ادب کے چند اہم مضامین کو تراجم کے ذریعے اردو دان طبقے کے

لیے شائع کیئے گئے۔ لائنل ٹرلنگ کا مضمون "ادب اور فرائیڈ" (ترجمہ امجد الطاف) پال ویلری کا مضمون "شاعری اور فکر مجرد" (ترجمہ محمد حسن عسکری) سینٹ بیو کا مضمون "کلاسیک کیا ہے" (ترجمہ غلام یعقوب انور) بالخصوص قابل ذکر ہیں ان مضامین کی اشاعت سے یورپی ادب کے بعض سرچشموں تک اردو دان طبقے کی رسائی بھی ہو گئی۔ سید عبداللہ کا مقالہ "میر کے ادھورے گیت" ڈاکٹر وحید قریشی کا مقالہ "سودا کی غزل گوئی" اور عابد علی عابد کا "غالب اور بیدل" ادب کی روایت سے "نئی تحریریں" کے مضبوط ناتے کے آئینہ وار ہیں۔ تنقید کے تجزیاتی زاویوں کو کتابوں کے تفصیلی تبصروں اور نظموں کے جائزوں میں پیش کیا گیا۔ "نئی تحریریں" میں اردو افسانے کا انوکھا پن سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر آغا بابر اور رحمٰن مذنب نے تیسری جنس کو افسانے کا موضوع بنایا' صلاح الدین اکبر اور یزدانی ملک کے افسانے "شہید" اور "بے گھر" فسادات کا غیر انسانی رویہ اجاگر کرتے ہیں' اعجاز حسین بٹالوی' ممتاز مفتی اور جیلانی بانو نے شجر ممنوعہ کا ذائقہ چکھنے کی کوشش کی ہے۔ محمود نظامی کے نظرنامے پہلی دفعہ "نئی تحریریں" ہی میں سامنے آئے تھے' ناٹک ساگر کے تحت امجد حسین اور سید رضی ترمذی کی تخلیقات کو متعارف کرایا گیا۔

"نئی تحریریں" انوکھی وضع کا بلند پایہ جریدی سلسلہ تھا۔ اسے ایک بڑے ادبی حلقے اور ایک کامیاب اشاعتی ادارے کا تعاون حاصل تھا' لیکن یہ چار جاوداں اشاعتیں پیش کرنے کے بعد دسمبر ۱۹۵۶ء میں بند ہو گیا "سویرا" کی طرح "نئی تحریریں" نے بھی صوری' معنوی اور فنی لحاظ سے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا اور ادب پر امٹ نقوش ثبت کئے۔

"مشرب" - کراچی

ماہنامہ "مشرب" کراچی سے ابو مسلم صحافی کی ادارت میں جاری ہوا لیکن اس کی روح رواں مشفق خواجہ تھے۔ اس پرچے نے ابتدا ہی میں ایسے کارنامے سرانجام دینے کی کوشش کی' جن سے دوسرے رسائل بالعموم اجتناب برتتے ہیں۔ مشرب کا "تاریخ ادب اردو نمبر" اسی قسم کا ایک کارنامہ ہے۔ اس خاص نمبر میں تاریخ ادب کے مختلف موضوعات پر بنیادی نوعیت کے تحقیقی و تنقیدی مضامین پیش کئے گئے۔ مثال کے طور پر نصیرالدین ہاشمی نے "قدیم اردو" کے موضوع پر' جمیل نقوی نے "فورٹ ولیم کالج" عبدالسلام خورشید نے "غدر سے پہلے کی اردو صحافت" پروفیسر عبدالقادر سروری نے "اردو شاعری اور نئی تحریکیں" کے موضوع پر مقالہ لکھا۔ "اردو میں دخیل الفاظ کا مسئلہ" از مولوی عبدالحق "سرقے سے ترقی تک" از کیفی "مرثیہ اور اس کا اثر" از اعجاز حسین "اردو میں طلسماتی

افسانے" از نورالحسن ہاشمی اسی نوع کے چند مضامین ہیں، جن سے اردو تاریخ کا سراغ ملتا اور نئی راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ "مشرب" کا ایک اور بڑا کارنامہ "مقالات نمبر" ہے اس کی ترتیب میں قیوم نظر، تحسین سروری، شجاع احمد زیبا، مسلم ضیائی، کشن پرشاد کول، حبیب اللہ غضنفر جیسے ادبا نے معاونت کی۔ محمد حسن عسکری کا مقالہ "قومی تعمیر میں تھیٹر کا حصہ" ریاض احمد کا "جدید اردو نظم کا ارتقاء" احمد الدین ظہیر کا "ہمارے علم عروض پر ایک نظر" اور قمر جمیل کا "شاعری، مصوری اور موسیقی" اس پرچے کے چند اہم مندرجات ہیں۔

"دستور" ۔ لاہور

ماہنامہ " دستور " لاہور کو اصغر گوبند پوری نے ایک خوبصورت ' وقیع اور وضعدار ادبی پرچہ بنانے کی کوشش کی ' ڈاکٹر سلیم واحد سلیم اس دلکش پرچے کے مدیر اعزازی تھے ' اور محمد رمضان منتظم اشاعت کی خدمات سرانجام دیتے تھے ' ابتدائی چند پرچوں میں مولانا صلاح الدین احمد ' چراغ حسن حسرت ' جگر مراد آبادی ' غلام علی چودھری اے حمید ' عارف عبدالمتین کی تحریریں اس پرچے کی زینت بنتی رہی ہیں ۔ " دستور " نے ادبی مقالات میں اپنا معیار بلند رکھا لیکن بہت جلد اقتصادی مخمصوں میں پھنس کر یہ رسالہ جو اعلیٰ پائے کا ادب پیش کر رہا تھا بند ہو گیا۔

"کامران" ۔ (سرگودھا)

جولائی ۱۹۵۵ء میں سرگودھا سے ماہنامہ " کامران " کا اجرا انور گوئندی کے شوق اور ذوق کی تکمیل کا نتیجہ تھا ' انور گوئندی اس سے قبل اخگر سرحدی کے ہفت روزہ رسالہ " نظام نو " سرگودھا کے ساتھ وابستہ تھے ' اس پرچے کا مزاج سیاسی تھا ' انور گوئندی نے " کامران " نکالا تو اسے خالص ادبی خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی اور ایک سال کے عرصے میں نعیم صدیقی ' اسرار احمد سہاوری ' منور میرزا ' جعفر طاہر ' غلام علی چوہدری ' حسن اختر جلیل ' جوہر نظامی ' وزیر آغا ' اختر واصفی کا تعاون حاصل کر لیا ۔ ضلعی سطح پر " کامران " نے جو کامیابی حاصل کی اسے قومی سطح پر بھی تسلیم کیا گیا ' لیکن جلد ہی " کامران " نے معمول کے پرچے کی حیثیت اختیار کر لی انور گوئندی کی خوش سلیقگی اور شائستہ ذوقی اس میں کوئی نمایاں جدت روبہ عمل نہ لا سکی ' کامران داخلی طور پر مالی کمزوری کا شکار بھی تھا ۔

"کامران" کا دوسرا دور ۱۹۵۸ء میں شروع ہوا۔ اس پرچے کو ڈاکٹر وزیر آغا کا تعاون اور عملی سرپرستی حاصل تھی اور اب یہ ادبی عظمت اور انسانی شعور کا ارمغان نظر آتا ہے۔ "کامران" میں ڈاکٹر سہیل بخاری، غلام الثقلین نقوی، رحمٰن مذنب، انور سجاد، شاد امرتسری، رفعت، شہزاد منظر، شاہین غازی پوری کی تخلیقات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا تھا، "کامران" کے مستقل عنوانات میں انور گوئندی کا ادارتی کالم "جبرو اختیار" اور ڈاکٹر وزیر آغا کا کالم "ادبی مسائل" بے حد دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ "کامران" کی ادبی جہت کو مستحکم کرنے میں سجاد نقوی نے بھی قابل قدر خدمات سر انجام دی ہیں۔ "کامران" کا یہ کامیاب دور کم و بیش دس برس پر پھیلا ہوا ہے۔ اس عرصے میں "کامران" نے ملک کے بیشتر اہم ادیبوں کا تعاون حاصل کر لیا۔ جمیل ہمدم (اب جمیل یوسف) حامد جیلانی، گوہر ہوشیار پوری مظفر حسن منصور، فرخندہ لودھی، اے بی اشرف، خواجہ اعجاز احمد بٹ، اقبال منہاس، خیر الدین انصار، انوار انجم اور متعدد دوسرے نئے ادیبوں کے ساتھ جعفر طاہر، فارغ بخاری، وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، سعید احمد رفیق، شہاب جعفری، خلیل الرحمٰن اعظمی، جگن ناتھ آزاد، علی عباس جلال پوری کی تخلیقات "کامران" میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔

"کامران" کا پہلا قابل ذکر کارنامہ اس کا سالنامہ ۱۹۵۸ء ہے اس میں تنقید، نظم، غزل، افسانہ اور تبصرے کے لئے الگ حصے وقف کئے گئے تھے اور ہر مصنف کے ادب کے بارے میں ابتدا میں ایک تبصرہ بھی شامل کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا مقالہ "اردو ادب میں بغاوت کی ایک مثال۔ راشد" اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مقالہ "غزل کا مزاج" کی مثال یہاں پیش کی جا سکتی ہے۔ رحمٰن مذنب کا افسانہ "خلا" اور میرزا ادیب کا افسانہ "فاصلہ" نے بھی توجہ حاصل کی۔ اس سالنامے کی کامیابی نے "کامران" کو خاص اشاعتیں پیش کرنے پر مائل کیا۔ "کامران" اگرچہ ادب کے ایک غیر اہم مقام سے شائع ہوتا تھا لیکن اس نے ادبی فضا کو ملک گیر سطح پر متاثر کرنے کی کوشش کی اور یہ ایک وسیع ادبی حلقے میں عزت و توقیر کی نظر سے دیکھا گیا۔ مضافات کے کسی ادبی پرچے کو شائد اتنی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ "کامران" کے مدیر انور گوئندی محنتی انسان تھے، آخری دور میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور صحت کی خرابی نے "کامران" کی اشاعت کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء کے بعد "کامران" کا کوئی پرچہ دیکھا نہیں گیا چھٹی دہائی میں سرگودھا سے "کامران" جیسا صاف ستھرا ادبی پرچہ چھاپنا انور گوئندی کا کارنامہ تھا۔ چنانچہ انہیں بڑے پیمانے پر سراہا گیا۔ رحمٰن فراز نے لکھا کہ:

"میں ہر بار "کامران" کے معیاری پرچے کو دیکھ کر ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہوں کہ آپ سرگودہا جیسے دور افتادہ اور ادبی لحاظ سے خشک علاقہ میں رہ کر بھی کس طرح ایسا خوبصوت رسالہ نکال لیتے ہیں، جب مرکز سے شائع ہونے والے کئی ادبی رسائل یا تو مر چکے ہیں یا آخری سانس لے رہے

ہیں ۔"

"تعمیر انسانیت" ۔ لاہور

۱۹۵۵ء میں مولانا کوثر نیازی اور عبدالحمید کی ادارت میں ماہنامہ " تعمیر انسانیت " لاہور سے جاری ہوا ۔ اس پرچے کا بنیادی مقصد تحریک ادب اسلامی کا فروغ تھا ۔ اس کے لکھنے والوں میں نعیم صدیقی ، ماہر القادری ، امین احسن اصلاحی ، محمد عثمان رمز ، اسرار احمد سہاروی ، عاصی کرنالی ، لائقہ صحرائی ، ابن فرید اور اسعد گیلانی کے نام نمایاں ہیں۔ "تعمیر انسانیت" میں ادب کو سماجی مقاصد حاصل کرنے کا وسیلہ بنانے کی کوشش کی گئی ' ماہرالقادری کا مقالہ "شعر اور لذتیت" سید اظہار حسین کا "ادب و اخلاقیات و میر انیس" نعیم صدیقی کا "اسلامی ادب" محمد عثمان رمز کا "تنقید اور تنقیدی اصول" جیسے عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اظہار و ابلاغ کا دامن خاصہ وسیع تھا۔ "تعمیر انسانیت" افسانہ نظم ' غزل ڈراما کہ اصناف کو بھی فوقیت دی گئی۔ اس میں گوپال متل ' مخمور سعیدی ' عارف عبدالمتین ' عرش صدیقی اور میرزا ادیب کی تخلیقات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا۔ اپریل ۵۶ء میں "تعمیر انسانیت" کا ایک خیال افروز سالنامہ شائع ہوا۔ لیکن یہ پرچہ طویل العمر ثابت نہ ہو سکا۔

"محفل" ۔ لاہور

ماہ نامہ " محفل " کی ابتدا جنوری ۱۹۵۴ء میں ہوئی ۔ اس کے بانی مدیر طفیل ہوشیار پوری ہیں جن کی ترنم ریز شاعری اس زمانے میں قبول عام حاصل کر چکی تھی ' طفیل ہوشیار پوری نے " محفل " کو بوجھل علمی پرچہ بنانے کے بجائے شائستہ اور لطیف ادبی پرچہ بنانے کی کوشش کی ۔ " محفل " نے ادب کی دہلیز پر پہلا قدم رکھنے والوں کو بالخصوص پروان چڑھایا اور نئے ادبا کی تربیت کے لئے " محفل " میں اس عہد کے نامور ادیبوں کی نگارشات بھی شائع کیں ۔ " محفل " پابندی اور باقاعدگی سے شائع ہونے والا ماہ نامہ ہے ۔ اب کچھ عرصے سے محمد خان کلیم " محفل " کے ادارت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں " محفل " کا شمار ایسے ادبی پرچوں میں کرنا چاہئے جو انقلاب برپا کرنے کے بجائے طغیان فکر و نظر کو مائل بہ اعتدال رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ' ادب کی خدمت کو زندگی کا فریضہ شمار کرتے ہیں اور اپنے اثرات آہستہ آہستہ پھیلاتے ہیں ۔

" ثقافت " ۔ لاہور

ادارہ ثقافت اسلامیہ کے زیر اہتمام ماہنامہ " ثقافت " جنوری ۱۹۵۵ء میں جاری ہوا ' جنوری ۱۹۶۸ء میں اس کا نام بدل کر " المعارف " کر دیا گیا ۔ ماہنامہ " ثقافت " کے مدیر مسئول خلیفہ عبدالحکیم تھے ۔ ادارہ تحریر میں محمد حنیف ندوی ' محمد جعفر پھلواری ' مظہر الدین صدیقی ' بشیر احمد ڈار ' رئیس احمد جعفری اور شاہد حسین رزاقی کے نام شامل ہیں ۔ " ثقافت " کے پہلے اداریہ میں " اغراض و مقاصد " کے تحت لکھا گیا کہ:

" یہ کوئی فلمی یا جنسی ماہنامہ نہیں ' کوئی سیاسی پرچہ نہیں ... رسالے کا اصل مقصد دین کی ان بنیادی قدروں کو واضح کرنا ہے جن پر سارا عالم متحد ہو سکے ... " ثقافت " دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق زندگی کی ایسی تشکیل جدید چاہتا ہے جس کی بنیاد خالص اسلام قدروں پر ہو ... اس کا مقصد ایسا شعور صحیح پیدا کرنا ہے جو امامت اقوام کی اہلیت پیدا کرے " (۴۲)

" ثقافت " نے ان مقاصد عظیم کے حصول کے لئے فکری جمود کو توڑنے کی کوشش کی اور اس عمل میں وجدانی مضامین کے ساتھ عملی اور فکری مضامین کی اشاعت کا خاص اہتمام کیا ۔ خلیفہ عبدالحکیم کی ادارت میں " ثقافت " نے نزاع پیدا کئے بغیر بحث و نظر کو فروغ دیا اور متعدد ایسے فلسفیانہ مضامین پیش کئے جو ذہن کو نئے انداز میں کروٹ دیتے اور ماضی کی باز یافت فکر فردا کے مطابق عمل میں لاتے تھے ' اس ضمن میں محمد مظہر الدین صدیقی کا مقالہ " دین اور سیاست " شاہد حسین رزاقی کا "رومن نظام حکومت میں جمہوری عناصر" ڈاکٹر محمد عبداللہ کا "اسلامی تہذیب کی ماہیت" عابد علی عابد کا "عباسی تہذیب میں ہندی عناصر" خلیفہ عبدالحکیم کا "رومی کا تصور آدم" اور شاہد حسین رزاقی کا مقالہ "سرسید کے زمانے میں مسلمانوں کی حالت" اس کے ثقافتی مزاج کے آئینہ دار ہیں۔

ماہنامہ " ثقافت " کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اسے اپنی زندگی میں خلیفہ عبدالحکیم اور ایم ایم شریف جیسے اہل علم کی سرپرستی اور نگرانی نصیب ہوئی ۔ اس پرچے کی علمی جت اور معیار میں کبھی زوال نہیں آیا ۔ اس نے اسلامی تہذیب و ثقافت کے گوشوں کو روشن کیا اور اہل علم کے مزاج پر اثر انداز ہونے کی سعی کی ۔ ماہنامہ " ثقافت " کا شمار ایسے ادبی اور علمی پرچوں میں کرنا چاہئے جن سے کسی قوم کے فکری مزاج کی نشان دہی ہوتی ہے ۔ اس پرچے نے خرد افروزی کی تحریک کو فروغ دینے میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں ۔ " ثقافت " دسمبر ۱۹۶۷ کے بعد بند کر دیا گیا اور اس کی جگہ ادارہ " ثقافت " اسلامیہ نے " المعارف " کے نام سے ایک نیا ماہنامہ جاری کیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

"نئی قدریں" - حیدر آباد

اختر انصاری اکبر آبادی کراچی سے حیدر آباد منتقل ہوئے تو اپنے ادبی شوق کی تکمیل اور سندھ میں اردو کے فروغ کے لئے ۱۹۵۵ء میں ماہنامہ "نئی قدریں" جاری کیا' اور پھر نا مساعد حالات اور خریداروں کے عدم تعاون کے باوجود اس پرچے کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک زندہ رکھا۔ "نئی قدریں" اردو ادب کا معمول کا رسالہ تھا' اختر انصاری نے اس کے لئے نہ صرف ملک بھر کے ادیبوں کا تعاون حاصل کیا بلکہ اس کا حلقہ قرات بڑھانے کے لئے ملک کے کونے کونے کی خاک بھی چھانی۔ اس پرچے میں جوش ملیح آبادی' فیض احمد فیض' ڈاکٹر وزیر آغا' مجید امجد' مصطفےٰ زیدی' ظہور نظر' عزیز حامد مدنی' سلیم احمد' مشفق خواجہ' شاد امرتسری' عارف عبدالمتین' محمد احسن فاروقی' جیلانی کامران' افتخار جالب' الیاس عشقی' حمایت علی شاعر' ظہیر کاشمیری' عرش صدیقی' سہیل بخاری' محبوب خزاں' مظفر علی سید' عبدالحمید عدم' احمد ہمدانی' سب کو بالا التزام چھاپا جاتا تھا "نئی قدریں" کے ہر پرچے میں نئے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد کو شرکت کا موقعہ ملتا اور یہ لوگ "نئی قدریں" کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتے تھے۔ اختر انصاری کو نئے لکھنے والوں کو اپنے خریداروں کی طویل فہرست میں شامل کرنے کا بڑا عمدہ سلیقہ رکھتے تھے چنانچہ اختر انصاری اکبر آبادی کی منفرد عطا یہ بھی ہے کہ انہوں نے "نئی قدریں" کے خریداروں کو بھی ادیب بننے کا موقعہ فراہم کر دیا شہرت یافتہ اور ممتاز ادیبوں سے مضامین اور تخلیقات حاصل کرنے کا طریق یہ تھا کہ تازہ پرچے میں وہ اپنے قلم سے خط لکھ کر بھجواتے اور مضامین کا مطالبہ کرتے' نہ ملتا تو ناراض ہوجاتے اور واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا کوئی ادیب اختر انصاری اکبر آبادی کو ناراض کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اختر انصاری پاس وفا یوں کرتے کہ جو چیز جہاں سے ملتی اسے "نئی قدریں" میں من و عن پیش کر دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادیبوں کی جتنی تابندہ کہکشاں "نئی قدریں" میں مرتب ہوتی تھی اتنی دوسرے مدیران تشکیل نہ دے پاتے تھے' نقصان یہ ہوا کہ "نئی قدریں" کا اپنا رنگ نکھر نہ سکا اور بعض اوقات متضاد نظریات کے مضامین بھی "نئی قدریں" میں چھپ جاتے۔ "نئی قدریں" کا رنگ و روپ زیادہ دلکش نہیں تھا' کتابت کی اغلاط بھی زیادہ ہوتی تھیں جس سے شاعری کا چہرہ مسخ ہو جاتا تھا۔ اختر انصاری ہر دفعہ صاف ستھرا اور اغلاط سے پاک پرچہ چھاپنے کا وعدہ کرتے لیکن ہر دفعہ اس میں اغلاط راہ پا جاتیں۔ معمول کا پرچہ ہونے کے باوجود اختر انصاری نے "نئی قدریں" کے متعدد خاص نمبر شائع کئے۔ "فکر جدید نمبر" "نئی شاعری نمبر" "سلور جوبلی نمبر" "مشرقی پاکستان نمبر" "شاعر نمبر" "شاہ بھٹائی نمبر" "کونشن نمبر" اور متعدد سالنامے اس کی چند ممتاز اشاعتیں ہیں جن میں متعدد ایسے مضامین بھی شامل

ہوئے جن کی صدائے بازگشت پوری ادبی دنیا میں سنی جاتی رہی۔ ان میں سے مظفر علی سید کا مقالہ "اردو افسانے میں نفسیات" محمد احسن فاروقی کا "جدید شاعری" ڈاکٹر وزیر آغا کا "آج کی اردو تنقید" جیلانی کامران کا "نئی شاعری کے ضمنی مسائل" عارف عبدالمتین کا "نثری نظم کا قضیہ" ڈاکٹر مبارک علی کا "تاریخ ایک المیہ" سلیم احمد کا "بینگن کا بھرتہ" سید وقار عظیم کا "تنقید کا منصب" غلام جیلانی اصغر کا "یاترا کا دوسرا روپ" جیسے چند مقالات بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔ "نئی قدریں" نے منظوم تراجم کو بھی اہمیت دی اور اپنی اشاعتی زندگی میں جن ادبا پر گوشے مخصوص کئے ان میں جوش ملیح آبادی، اسرارالحق مجاز، مصطفےٰ زیدی، عزیز حامد مدنی، ڈاکٹر وزیر آغا، حمایت علی شاعر، عرش صدیقی اور عارف عبدالمتین کے نام اہم ہیں "غالب کے طرفدار نہیں" "نئی قدریں" کا خطوط کا کالم تھا۔ جس میں عمل کی پھوار بھی پھیلتی اور رد عمل کی گرد کو اڑنے کا موقع بھی دیا جاتا "نئی قدریں" نے فروغ اردو کو ایک مشنری جذبے سے سرانجام دیا۔ اختر انصاری کو مہران کا بابائے اردو تسلیم کیا جاتا تھا۔ اختر انصاری اگست ۱۹۸۵ء میں فوت ہوئے تو "نئی قدریں" کا چراغ جھلملانے لگا اور "اختر انصاری نمبر" کے بعد یہ شمع بجھ گئی۔

"نئی قدریں" کا شمار ایسے ادبی رسائل میں کرنا چاہئے جو آہستہ آہستہ ادب کی خدمت سر انجام دیتے ہیں اور نئے لکھنے والوں کی تربیت کہنہ مشق اور ممتاز شعرا کی تخلیقات کی اشاعت سے کرتے ہیں۔ "نئی قدریں" نے ادب میں کوئی انقلابی تبدیلی پیدا نہیں کی لیکن اس نے ادب کی روشنی کو دور و نزدیک پھیلانے میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔

"کتابی دنیا" ۔ کراچی

کراچی سے ضیاء الدین احمد برنی نے جنوری ۱۹۵۵ء میں رسالہ "کتابی دنیا" ماہنامے کی صورت میں جاری کیا۔ ۱۶ صفحات کے اس پرچے میں کتابی دنیا کی ہمہ اقسام کی سرگرمیاں پیش کی جاتی تھیں، لیکن سب سے زیادہ اہمیت کتابوں پر تبصروں اور تازہ رسائل کے مضامین کو ملتی تھی جن کا اجمالی ذکر "کتابی دنیا" میں ہر ماہ کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی اس میں ادبی مضامین کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ "ولی" پر کمال کبریا کا مضمون۔ انشائیہ "کچھ کتابوں کے بارے میں" از احمد جمال پاشا، "ذرا سوچئے تو" از علاؤ الدین خالد اس پرچے میں ہی شائع ہوئے تھے۔ "کتابی دنیا" کی نوعیت تیکنیکی تھی، تاہم اس نے اردو ادب اور تعارف کتب میں اپنی خدمات مناسب طور پر سرانجام دیں اور یہ ایسی خدمت تھی جو دوسرے ادبی رسائل میں جزوی حیثیت رکھتی تھی۔

"تجلّی" - کراچی

"تجلّی" کے نام سے ایک نیا ادبی جریدہ کراچی سے تحسین سروری صاحب نے جنوری ۱۹۵۶ء میں جاری کیا، ڈاکٹر زور، ابواللیث صدیقی، ابراہیم جلیس، تمکین کاظمی، شاد عارفی اور جگن ناتھ آزاد اس کے لکھنے والوں میں شامل تھے۔ "تجلّی" میں جمیل نقوی ہر ماہ "منتخب ادب" کے عنوان سے دوسرے رسالوں کا انتخاب پیش کیا کرتے تھے، "تجلّی" نے ادب کو مخصوص زاویوں کا پابند بنانے اور بے راہ روی کے عناصر سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔ اس کا حلقہ اثر وسیع لیکن نئی نسل کے ساتھ "تجلّی" کا رابطہ غیر مضبوط تھا اور یہی اس کی عدم مقبولیت پر منتج ہوا۔

"انشاء" - کراچی

کراچی سے "انشاء" کا اجرا جنوری ۱۹۵۶ء میں عمل میں آیا۔ "انشاء" ادارہ ذہن جدید کا ترجمان تھا اور اس کے مدیر جون ایلیا تھے، جن کے خانوادۂ ادب میں سید محمد تقی اور رئیس امروہوی جیسی نامور شخصیات موجود تھیں۔ "انشاء" نے اگرچہ نظم، غزل، افسانہ اور تنقید کی اصناف کو زیادہ اہمیت دی لیکن اس کا مقصد نئی فکر کو پروان چڑھانا اور خرد افروزی کو رائج کرنا تھا۔ اس دور میں ابھرنے والے سوالات کو "انشاء" نے نسبتاً زیادہ موضوع بنایا۔ اس ضمن میں سید محمد تقی، محمد علی صدیقی، محمد مہدی، انعام حسین، دیانند ورما، اور رام سرن نگینہ کے مضامین نے متعدد نئے مباحث کو جنم دیا۔ "انشاء" میں اداریہ کو "انشائیہ" کے عنوان سے پیش کیا جاتا تھا، یہ ایک ایسی جدت تھی جس کا "انشائیہ" کے مزاج سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ محض رعایت لفظی تھی، جسے مناسب چلن نہیں مل سکا۔

"انشاء" ایک مقبول عام پرچہ تھا اس کی جہت علمی تھی، لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کی شکل و صورت تبدیل کر دی گئی۔ اسے ڈائجسٹ بنا دیا گیا۔ اس کے مدار تحریر میں مذاہب عالم۔ سفرنامہ، شکار، معلومات عامہ، ترقیات، لطائف، فلم اور افسانوں کو شامل کر لیا گیا۔ اب یہ عوامی قسم کا مقبول پرچہ تھا جس کی ادبی جہت دب گئی تھی۔ ۱۹۶۵ء کے لگ بھگ "انشاء" عالمی ڈائجسٹ کی صورت میں نکلنے لگا اور اب اسی نام سے معروف ہے۔

"مہر نیم روز" ۔ کراچی

ماہ نامہ " مہر نیم روز " کی اشاعت کے پس پشت ادب پر طاری جمود کو توڑنا اور ادب کی بامعنی سرگرمی کو بحال کرنا تھا ۔ اس کی ادارت کے فرائض سید حسن مثنیٰ ندوی ، سید ابوالخیر کشفی اور علی اکبر قاصد نے سرانجام دیئے ۔ پہلا شمارہ فروری ۱۹۵۶ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ "مہر نیم روز" کو احمد علی، غلام عباس، جمیل مظہری، مسعود اختر جمال، ڈاکٹر احسن فاروقی، ممتاز مفتی، وزیر آغا، کلیم الدین احمد، مظفر حسین شمیم، خالد حسن قادری کے علاوہ متعدد دوسرے ادیبوں کا تعاون حاصل تھا۔ اس پرچے کو سب سے زیادہ مقبولیت اس کے مستقل سلسلہ مضامین "چہ دلا وراست وز دے" نے دی جس کے تحت بڑے بڑے ادیبوں کے سرقے بے نقاب کئے جاتے تھے۔ "مہر نیم روز" نے انکشاف کیا کہ امتیاز علی تاج کا چچا چھکن جیروم کے جیروم کا چربہ ہے۔ قاضی عبدالغفار نے "لیلیٰ کے خطوط" کی تازگی الیگزنڈر کوپرین کے گل تر سے لی ہے، انتصار حسین کا ناول "پتھر" کے متعدد حصے تسنیم سلیم چھتاری سے اڑائے گئے ہیں، عصمت چغتائی کا ناولٹ "ضدی" ترکی ناول "ہاجرہ" کا چربہ ہے۔ ابوالکلام آزاد اور خلیقی دہلوی کی عبارتوں میں سرقے کی حد تک پہنچی ہوئی مماثلت تلاش کی گئی۔

" مہر نیم روز " کا ایک اور اہم عنوان " رسالوں میں " تھا ، اس کے تحت دوسرے رسائل میں چھپنے والے بلند پایہ مضامین کو متعارف کرایا جاتا تھا ۔ یہ پرچہ بے حد ہنگامہ خیز تھا ، اس کی صدائے بازگشت دور دور تک سنی جاتی تھی لیکن ۶۲ ۔ ۱۹۶۱ء سے آگے اس کے آثار نہیں آئے ۔

" قند " ۔ مردان

۱۹۵۷ء میں رسالہ " قند " کا اجراء ایک ایسے دور افتادہ مقام سے ہوا جہاں ادب اور فن کے نقوش کا تلاش کرنا ایک مشکل کام ہے ۔ تاج سعید نے مردان شوگر ملز کی انتظامیہ کو ادب کی خدمت پر مائل کر لیا تو مردان سے ماہنامہ " قند " جاری ہوا اور شاید پہلی دفعہ مردان کو ادبی نقشے پر ایک اہم مقام کی حیثیت مل گئی ۔ " قند " کی ترتیب و تدوین ، ادبی جہت اور مزاج سازی میں تاج سعید کا حصہ زیادہ ہے ۔ انہوں نے معمول کے پرچوں کے علاوہ " قند " کا " ناولٹ نمبر " جس میں عبدالسلام ، منصور قیصر ، انور خواجہ ، ریاض بٹالوی، عوض سعید اور رضیہ فصیح احمد نے شرکت کی بڑے تزک و احتشام سے پیش کیا، اس کا "موسیقی نمبر" بھی اب تک سراہا جاتا ہے۔ "قند" کی جاوداں اشاعت "ڈرامہ نمبر" ہے۔ "قند" کی ایک خوبی وہ مختصر شخصیت نامے ہیں جن سے ادیبوں اور فنکاروں کا

تعارف کرایا جاتا تھا۔ "قند" ادبی افق پر اپنے مخصوص انداز میں تابانی پھیلا رہا تھا لیکن بعض انتظامی مجبوریوں کے تحت اسے اچانک بند کر دیا گیا۔

۱۹۷۲ء میں "قند" کا دوسرا دور شروع ہوا تو تاج سعید ایک نئے ولولے سے سرشار تھے، اب "قند" کو خاص نمبر کی صورت دے دی گئی جو ہر تین ماہ کے بعد شائع ہوتا تھا۔ اس دور میں "قند" نے "مجید امجد نمبر" "ممتاز شیریں نمبر" "افسانہ نمبر" شائع کئے اور انہیں ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

اس دفعہ "قند" اور تاج سعید کی رابطہ مہم نے عتیق احمد، مشتاق قمر، نظیر صدیقی، انجم انصار، رباب عائشہ، منصور قیصر، صفدر سلیم سیال، اختر امان، سائرہ ہاشمی۔ میمونہ انصاری، اور زیتون بانو کو بطور خاص شہرت کے زینے پر قدم رکھنے میں مدد دی "آئینہ" کے زیرِ عنوان "قند" نے متعدد ادیبوں کے گوشے شائع کے، جمیلہ ہاشمی، احمد ندیم قاسمی اور منصور قیصر کے گوشے یہاں بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں جنہیں تاج سعید نے ندرت و تازگی سے مرتب کیا۔

"قند" ایک دفعہ پھر کامیابی کی منزلیں طے کر رہا تھا کہ منتظمین نے اسے اچانک بند کر دیا۔ اب "قند" ماضی کی ادبی صحافت کی ایک یادگار ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ "قند" نے مطلع ادب کو منور رکھنے میں اپنے مقدور سے بڑھ کر کوشش کی اور "ڈرامہ نمبر" "مجید امجد نمبر" اور "ممتاز شیریں نمبر" جیسی جاوداں اشاعتیں پیش کر کے اعلیٰ مراکز سے شائع ہونے والے رسائل میں اپنا مستقل مقام بنا لیا۔

"نیا راہی" ۔ کراچی

ماہنامہ "نیا راہی" ع۔ س مسلم نے جنوری ۱۹۵۷ء میں کراچی سے جاری کیا تھا۔ وحید فاروقی ان کے معاون تھے، اس ادبی پرچے کا مقصد قارئین کو بین الاقوامی اور قومی حالات سے باخبر رکھنے کے علاوہ علمی ادبی مضامین، افسانے اور منظومات فراہم کرنا تھا۔ ابتدا میں یہ پرچہ معمولی ضخامت میں شائع ہوتا تھا لیکن جنوری ۱۹۵۹ء میں اس کی ضخامت بڑھا دی گئی۔ "نیا راہی" کا انداز کمرشل پرچوں جیسا تھا تاہم اس میں آغا صادق، مجنوں گورکھپوری، سحر انصاری، اشرف قدسی، شوکت صدیقی، انور عنایت اللہ، جیلانی بانو، رام لعل، الطاف مشہدی، کرشن چندر اور بلونت سنگھ کے تخلیقی مضامین، نظموں اور افسانوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ اپریل مئی ۱۹۶۱ء کا شمارہ "افسانہ نمبر" کے طور پر شائع ہوا اس میں منٹو کے افسانے "ٹھنڈا گوشت" کا تجزیہ شمیم رضوی نے نفسیات کی

روشنی میں کیا۔ اس پرچے میں کرشن چندر، واجدہ تبسم، خواجہ احمد عباس، خدیجہ مستور شفیق الرحمن، انور عنایت اللہ دیو بندر سیتارتھی، اور محمد خالد اختر کے علاوہ متعدد غیر ملکی افسانوں کے تراجم بھی شائع کیے گئے۔ افسانوں کے ساتھ مصنفین کے حالات حیات کی اشاعت اس افسانہ نمبر کی ایک اضافی خوبی ہے۔ "نیا راہی" عوامی مزاج کا پرچہ تھا۔ "نیا راہی" نے زیادہ تر مقبول عام اور سادہ فہم ادب پیش کرنے میں سبقت حاصل کی اور ادب کی لہروں کو رواں رکھنے میں مقدور بھر کوشش کی۔

"لیل و نہار"۔ لاہور

ہفت روزہ "لیل و نہار" ادارہ امروز اور پاکستان ٹائمز کے زیر اہتمام جنوری ۱۹۵۷ء میں جاری ہوا۔ اس کے پہلے مدیران میں فیض احمد فیض اور سبط حسن شامل تھے، ۱۹۵۸ء میں مارشل لا لگا تو "لیل و نہار" کی ادارت ۱۹ اکتوبر کے پرچے سے ظہیر بابر کے سپرد کر دی گئی۔ ایک طویل عرصے تک "لیل و نہار" کی ادارت اشفاق احمد اور صوفی تبسم نے بھی انجام دی اور اس کے عوامی مزاج میں ادب کا پیوند لگانے کی کامیاب کوشش کی۔

"لیل و نہار" خالص ادبی پرچہ نہیں تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ "لیل و نہار" نے تخلیقی ادب اور فکری مضامین کو ہمیشہ اہمیت دی اور عوام کا مزاج ادب کے ذریعے منقلب کرنے کی سعی کی۔ آفسیٹ کی طباعت، خوبصورت سرورق اور اندرونی صفحات کی تصویریں اور فیچر اس کی صوری حیثیت کو اجاگر کرتے تھے۔ لیکن اس کے مضامین نظم و نثر ذہنی اور فکری آبیاری کرتے "لیل و نہار" کا ہر دور اس کے مدیران کے فکر و نظر کا آئینہ دار تھا۔ فیض اور سبط حسن کے دور ادارت میں "لیل و نہار" نے ادب کے ترقی پسند زاویوں کو اجاگر کرنے میں اور اشتراکی حقیقت پسندی کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ طنز و مزاح میں بالواسطہ طور پر ایسی ناہمواریوں کو اجاگر کیا جن سے حقیقت کا منفی رخ سامنے آتا اور زہر خند پیدا ہوتا تھا۔ نظموں کا رخ بھی خارجی زاویے کی طرف تھا اور غزلیں معاشرے کے معائب کو بیضوی صورت میں سامنے لاتی تھیں "لیل و نہار" نے اسی دور میں پرانے اور ممتاز ادیبوں کو زیب و آرائش سے پیش کیا اور متعدد نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس دور میں افسانے کے میدان میں ارشاد احمد صدیقی، غلام علی چودھری، ریاض عرفی، یونس ادیب، جیلانی بانو، تگ و تاز کرتے نظر آتے ہیں، شعرا میں شکیب جلالی، احمد ریاض، جلیل حشمی، شور علی، شہزاد احمد، اصغر سلیم، ظفر اقبال اور تاب اسلم نمایاں ہیں۔ اگست ۱۹۵۷ء میں "لیل و نہار" کا "یوم استقلال نمبر" شائع ہوا۔ اس کا اہم ترین حصہ دسویں سالگرہ کے مضامین۔۔ مثلاً "آزادی کے دس سال" "عالم اسلام کے دس

سال" "پاکستان کے ادبی مسائل ہمارے ادبی رجحانات" اور "تقسیم کے بعد ناول" وغیرہ تھے۔ اس خاص نمبر کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر سید عبداللہ' مظفر علی سید' وقار عظیم' عبدالرحمن چغتائی' ڈاکٹر عبادت بریلوی اور محمد خالد اختر کے نام اہم ہیں جنوری ۱۹۵۸ء میں "لیل و نہار" نے اپنی پہلی سالگرہ پر سالنامہ پیش کیا' ۱۹۵۹ء میں "آزادی نمبر" اور اکتوبر ۱۹۵۹ء میں "انقلاب نمبر" شائع کیا۔ خصوصی نمبروں کے یہ سلسلے بہت پسند کئے گئے تو بعد میں "لیل و نہار" نے "اقبال نمبر" "افسانہ نمبر" "آزادی نمبر" "نونہال نمبر" "استقلال نمبر" اور "خواجہ فرید نمبر" پیش کر کے ہفتہ وار صحافت میں ادبی پیوند کاری کو چار چاند لگا دیئے۔

سبط حسن کے عہد ادارت میں "لیل و نہار" کا رخ واضح طور پر اشتراکیت کی طرف تھا۔ اشفاق احمد اور صوفی تبسم نے اس دور کے تقاضوں کے مطابق "لیل و نہار" کا رخ مشرقی تہذیب' تمدن اور مذہب کی طرف موڑا۔ اخلاقیات کی مثبت قدروں کو ابھارنے کی کوشش کی اور انسان کے داخل کو دنیا کو دریافت کرنے اور روحانی زاویوں کو تسکین فراہم کرنے میں گہری دلچسپی لی۔ افسانہ نگاروں اور شاعروں کی کہکشاں میں متعدد نئے ستاروں کا طلوع ہوا۔ فیچروں اور سیاسی مضامین میں سرکاری نقطہ نظر نمایاں ہے۔ لیکن تخلیقی اصناف ایک جادۂ خود متعین کی طرف رواں ہیں۔ اس دور میں عزیز اثری' یونس جاوید' ابو سعید قریشی' رحمٰن مذنب' رفعت' رضیہ فصیح احمد کے کئی معرکہ آرا افسانے "لیل و انہار" میں شائع ہوئے۔ مضامین میں قومی' تہذیبی اور ادبی رجحانات کو تلاش کرنے کا ذوق و شوق نمایاں ہے۔ اس ضمن میں مولانا غلام رسول مہر کا مقالہ "قومی تعمیر کے تقاضے" میرزا ادیب کا "ادب میں کردار کی تلاش" حکیم صابر ملتانی کا "جمالیاتی حسن اور جمالیاتی ذوق" منیر احمد شیخ کا "ٹیڈی ازم" انور رومان کا "کچھ اپنی ثقافت کے بارے میں" عبدالشکور احسن کا "فارسی شاعری میں نیا احساس" مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔

"لیل و نہار" نے ادب کو صحت مند انداز میں منقلب کرنے کی کوشش کی' اس کے اوراق سے رپور تاژ' سفر نامہ اور طنز و مزاح کو نئے زاویوں سے متعارف کرایا گیا۔ امجد حسین کا معرکہ آرا رپور تاژ "گواتک" اور احمد بشیر کا امریکہ کا بے نظیر سفر نامہ کا یہاں حوالہ کافی ہے۔ طنز و مزاح میں "سو یہ ہے آدمی" اور ظہیر بابر کا کالم "ساتواں صفحہ" اس کے باقاعدہ اور ہفتہ وار فیچر تھے۔ ریاض عرفی' محمد خالد اختر' منصور قیصر' نواز' خادم حسین بٹالوی' عنایت اللہ' یہاں بطور مزاح نگار نمایاں نظر آتے ہیں' اقبالیات کے سلسلے میں سید وقار عظیم کا مقالہ "اقبال کی شاعری کے ڈرامائی عناصر" پروفیسر رازی کا "اقبال اور ایران" صدیق کلیم کا "اقبال کی شاعری کا مزاج" اکبر حسین قریشی کا "اقبال کی بعض نظموں کے ماخذ" ڈاکٹر سید عبداللہ کا "نغمہ سرافیل یا بال جبریل" "لیل و نہار" ہی میں چھپ کر مقبول

ہوئے تھے۔

لاہور سے "لیل و نہار" کا آخری شمارہ ۳ مئی ۱۹۶۴ء کو شائع ہوا حرف آخر صوفی تبسم صاحب نے لکھا

"آج سے سوا سات برس پہلے "لیل و نہار" کا اجرا ہوا اور اس کا پہلا شمارہ ۲۰ جنوری ۱۹۵۷ء کو منصۂ شہود پر آیا۔ بعض ناگزیر حالات کے ماتحت یہ مجلّہ بند ہو رہا ہے۔ جس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔"

مئی ۱۹۷۰ء میں "لیل و نہار" کا ایک اور دور کراچی سے شروع ہوا۔ اس کے ادارۂ تحریر میں فیض احمد فیض، حسن عابدی، امین مغل اور احمد الیاس شامل تھے، لیکن اب اس کا مزاج تبدیل ہو چکا تھا، سیاست کی گرم مزاجی نے اسے شدت سے متاثر کیا ادب اس پرچے میں موجود تھا لیکن اب اس کی اہمیت پہلے دور جیسی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ یہ جلد ہی منظر صحافت سے غائب ہو گیا۔

"لیل و نہار" نے زندگی اور ادب دونوں کو متاثر کیا۔ اس نے صحافت اور ادب میں تعلّق پیدا کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی، لکھنے والوں کو تخلیقی اظہار کے لئے معیّن وقت پر چھپنے والا ایک عمدہ، جاذب نظر اور تصویروں سے آراستہ رسالہ پیش کیا اور ردِ عمل مرتب کرنے کے لئے قارئین کو خطوط کے کالم میں اپنی آزادانہ رائے پیش کرنے پر مائل کیا۔ اس دور میں ملک بھر میں جتنے لکھنے والے تھے ان کی بیشتر تعداد "لیل و نہار" میں شامل نظر آتی ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ "لیل و نہار" نے لکھنے والوں کو معاوضہ پیش کرنے کی طرح ڈالی اور اس سلسلے کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ تقویت بھی دی۔ سات سال کا عرصہ زیادہ طویل نہیں لیکن اسے "لیل و نہار" کا سنہری دور شمار کیا جا سکتا ہے۔ فیض صاحب کی ادارت میں کراچی سے "لیل و نہار" کا طلوع نو سیاسی نوعیت رکھتا ہے۔ اس لئے چنداں قابل ذکر نہیں۔

فروری ۱۹۸۰ء میں "لیل و نہار" ایک دفعہ پھر لاہور سے جاری ہوا۔ اب اس کے مدیر طابع اور ناشر منظور ملک تھے، لیکن اس کا جوہر نچڑ چکا تھا اور "لیل و نہار" ادبی لحاظ سے ایک غیر فعال جریدہ بن چکا تھا۔ سلمان بٹ اور مظفر بخاری نے ستمبر ۱۹۸۰ء میں اس کی ایک خصوصی اشاعت "طنز و مزاح نمبر" کے عنوان سے پیش کی لیکن اس پرچے میں بھی منظور ملک صاحب کا رویہ معذرت خواہانہ تھا اور اس میں شکست خوردگی اور مایوسی کے آثار نمایاں تھے۔ انہوں نے لکھا کہ:

"ادب شناس اور ادب فہم اب ناپید ہو چکے ہیں یہ کرخنداری ادب کا زمانہ ہے۔ "عالمگیر" "ہمایوں" "سویرا" "ادبی دنیا" جیسے جرائد مرور ایّام کی نذر ہو چکے ہیں اور لاہور جو کبھی ادبی صحافت کا مرکز ہوا کرتا تھا اب ویران ہو چکا ہے۔ کراچی کے ڈائجسٹوں نے ادب کا اس طرح گھیراؤ کیا

ہے کہ سانس لینا مشکل ہو گیا ہے۔"

"لیل و نہار" کا "طنز و مزاح نمبر" پرانی تحریروں کا ایک انتخابی مجموعہ تھا اور اس نمبر کو "قند مکرر" کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن طنز و مزاح کے معیاری مضامین کی قلّت کی وجہ سے اس نمبر کو غنیمت سمجھا گیا۔اس خصوصی شمارے کے بعد "لیل و نہار" غیر فعال ہو گیا اور اس کی ادبی حیثیت ختم ہو گئی۔

"صحیفہ" - لاہور

سہ ماہی "صحیفہ" کا پہلا شمارہ جون ۱۹۵۷ میں لاہور سے منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر سید عابد علی عابد اور معاون مدیر سجاد رضوی تھے۔ "صحیفہ" کے اداریہ "جمع متکلم" کے تحت واضح کیا گیا کہ مجلس ترقی ادب نے کلاسیکی کتب کے علاوہ ہر مکتبہ خیال کے ادیبوں، انشاپردازوں اور شاعروں کی صحت مند نگارشات کی اشاعت کو بھی اپنے قیام کے مقاصد میں شامل کیا تھا اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہی "صحیفہ" کا اجرا عمل میں لایا گیا تھا (۲۱) ادبی زاویے سے سید صاحب کا خیال تھا کہ ادبی روایت تب ہی صحت مند اور توانا رہ سکتی ہے کہ ادیب اور انشاپرداز ماضی کی میراث سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، حال کے کوائف سے کامل طور پر مطلع ہوں اور مستقبل کی تعمیر ملحوظ رکھیں۔ (۲۲) انہوں نے کلاسیکی روایت کے جمود کے خلاف بغاوت کو صحت مند قرار دیا لیکن اس کے لیے ادب کی جمالیات کو قائم رکھنے اور بغاوت کو صحت مند خطوط پر استوار کرنے کی ضرورت کو بھی نمایاں کیا۔ ان امور کے پیش نظر انہوں نے نو عمر لکھنے والوں کو بھی دعوت نگارش دی اور ان بنیادی خطوط پر ہی "صحیفہ" کو استوار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

سید عابد علی کے زیر ادارت چھپنے والے "صحیفہ" کے پرچے ظاہر کرتے ہیں کہ انہوں نے اس ادبی مزاج کو معینہ خطوط پر چلانے کی کوشش کی اور ہر چند سجاد رضوی ۱۹۵۸ء میں ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور ارشاد حسین کاظمی، سید قاسم محمود اور صدیق کلیم نے مختصر سے عرصے کے لیے ان کی معاونت کی لیکن "صحیفہ" کی ادبی پالیسی میں توازن و اعتدال نمایاں نظر آتا ہے۔ سید صاحب نے ماضی کی میراث کو اجالنے اور حال کے خطوط کو روشن رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی نگہ نکتہ جو ایسے ادب پاروں کو پہچان لیتی تھی جو حال کے ادب کا خزینہ تھے اور مستقبل میں اس دور کی کلاسیکی روایت کا حصہ بننے کی صلاحیت رکھتے تھے، سید صاحب چونکہ ادب میں ایک اہم مقام رکھتے تھے اور ایک نامور معلم بھی تھے، اس لیے انہیں "صحیفہ" کے لیے ادبی حلقہ بنانے میں دیر نہیں لگی۔ "صحیفہ" میں چونکہ مضامین کی

اشاعت پر معاوضہ بھی دیا جاتا تھا' اس لیے یہاں جو بھیڑ ہے وہ دیگر نوع کی ہے۔ "صحیفہ" کے پہلے پرچے میں شعرا کی صف میں ڈاکٹر وحید قریشی' انجم رومانی' فراق گورکھ پوری کے ساتھ عدیم راوی موجود ہیں۔ داستاں طرازی کے باب میں چیخوف کے ترجمہ شدہ افسانے کے ساتھ غلام علی چودھری اور جمیل الزمان کے افسانے پیش کیے گئے' جو اس زمانے میں ادب کے نووارد تھے' محمود نظامی بطور ڈرامہ نگار اور قیوم نظر بطور محقق سامنے آئے ہیں' ڈاکٹر محمد باقر کا سفرنامہ " لاہور بنگلے سے لاہور تک " بھی بالکل نئی چیز ہے۔ اس پرچے کے دوسرے اہم مضمون نگاروں اور شاعروں میں خادم محی الدین' ریاض احمد' شوکت تھانوی' سجاد حیدر' امجد حسین' شہزاد احمد' شہرت بخاری' ہوش ترمذی' شاد امرت سری' اور سید رضی ترمذی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی انوکھی نظم " ثنویت۔ ظلمت وضو کی کشمکش " اس پرچے کی خصوصی شعری تخلیق ہے۔

"صحیفہ" اڑھائی صد صفحات کا ضخیم پرچہ تھا جو پہلے ہر تین ماہ کے بعد باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ اسے چونکہ سرکاری سرپرستی حاصل تھی اس لیے "صحیفہ" کو دوسرے ادبی پرچوں کی طرح اقتصادی بدحالی یا کمزوری کا سامنا نہیں تھا۔ سید عابد علی کی خوبی یہ بھی نظر آتی ہے کہ انہوں نے معیار کو قائم رکھا اور انتخاب کڑا کیا۔ "صحیفہ" میں شعرا و ادبا کا بے ہنگم ہجوم نظر نہیں آتا۔ مضامین کے موضوعات اہم' نادر اور انوکھے ہیں ان کی حیثیت علمی بھی ہے اور تعلیمی بھی اور ان میں مستقبل کا حوالہ بننے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ چند مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ " اقبال اور حافظ کے ذہنی فاصلے " از سید عبداللہ "تاریخ ادب کا مطالعہ" از مظفر علی سید "اردو میں شخصیات نگاری" از سید صفدر حسین "آزاد کی حمایت میں" از ڈاکٹر محمد صادق "سائنسی طرز تنقید" از صدیق کلیم "اردو ادب میں مغربی تنقید" از مظفر علی سید۔ سید صاحب نے ایک اختراع یہ کی کہ ہر صنف کے لیے الگ باب وقف کیا تو اس کے لیے ایک خوبصورت عنوان بھی نیا تراشا' چنانچہ فہرست کے لیے جمالیاتی عنوان "آئینہ ترتیب" مقالات کے لیے "انجمن خیال" غزل کے لیے "یک چمن گل" نظم کے لیے "یک نیستاں نامہ یک نحانہ ے" سفرنامے کے لیے "زہے روانی عمرے" طنزومزاح کے لیے "خندۂ گل" اور تبصروں کے لیے "تعصبات" کا عنوان تراشا۔ سرورق کے لیے صوری خوبیاں پیدا کیں' کتابت اجلی کروائی اور طباعت کو روشن رکھا' "صحیفہ" سید عابد علی عابد کے دورادارت میں واقعی ایک ایسا ادبی پرچہ نظر آتا ہے جس کی تنقید و تخلیق کے زاویے بوقلموں ہیں اور ہر پرچہ دامان باغبان وکف گل فروش کا منظر ہے۔ لیکن یہ نظرافزا کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی' پہلے ضخامت کے ساتھ عنوانات کم ہوئے' پھر تخلیقی اصناف نثر محذوف کر دی گئیں اور اپریل ۱۹۶۳ء میں اس کی صورت یکسر تبدیل ہو گئی۔

"صحیفہ" کا ۲۳ واں شمارہ ٹائپ میں چھپا " رفتار ادب " اس کا ایک نیا عنوان تھا جس کے

تحت کتابوں پر تبصرے کیے جاتے تھے اور دوسرے رسائل کے مضامین کا تعارف چھپتا تھا۔ ایک نیا باب مجلس ترقی ادب کی کارگزاریوں کی تشہیر کے لیے الگ قائم کیا گیا۔ "انجمن خیال" میں تحقیق کو اہمیت دی گئی، اسے اگر "صحیفہ" کا دوسرا دور کہا جائے تو سابقہ تخلیقی دور کے مقابلے میں یہ دور زوال شمار ہو گا۔ ہرچند سید عابد علی عابد اس کے مدیر تھے لیکن اب وہ سرکاری کارروائیوں میں دبے ہوئے نظر آتے ہیں، اس دور میں تحقیقی نوعیت کے جو مضامین شائع ہوئے ان کی اہمیت کے باعث اس دور میں بھی "صحیفہ" اہم ادبی پرچہ شمار کیا گیا۔

"صحیفہ" کا تیسرا دور جو خالصتاً تحقیقی نوعیت کا تھا شمارہ ۴۰ سے ۴ جولائی ۱۹۶۷ء میں شروع ہوا، سید عابد علی عابد کی صحت انہیں ادارتی فرائض کی پابندیوں اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھی، اس لیے وہ "صحیفہ" کی ادارت سے سبکدوش ہو گئے۔ سید امتیار علی تاج نے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا "رسالے کا مزاج اس کی ترتیب اور اس کی زیبائش سب ان ہی کے ذوق حسن کا نتیجہ تھی۔ وہ "صحیفہ" کے بانیوں میں تھے بلکہ "صحیفہ" اور عابد علی ایک ہی شے کے دو نام سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف ذوق رکھنے والے قارئین کا حلقہ وسیع کیا بلکہ عام قاری کا ادبی شعور بیدار کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ (۲۳)

"صحیفہ" کی خوش قسمتی یہ تھی کہ عابد صاحب کے ایما پر اس کی ادارت اردو ادب کی ایک فعال شخصیت ڈاکٹر وحید قریشی کو تفویض کی گئی "صحیفہ" میں ڈاکٹر وحید قریشی کا دائرہ عمل اگرچہ صرف تنقید و تحقیق تک محدود تھا تاہم انہوں نے اس پرچے کی باقاعدہ اشاعت اور مضامین کے بلند معیار سے ایک دفعہ پھر "صحیفہ" کو ادبی دنیا کا ایک مقبول و ممتاز رسالہ بنا دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پرچے میں اپنے تحقیقی ذوق کی پرورش یوں کی کہ ان محققین سے جن کے قیمتی نوادرات عرصے سے منظر پر نہیں آ سکے تھے "صحیفہ" کی وساطت سے چھپ کر پورے برصغیر میں پھیل گے، اس سے نہ صرف تحقیق کا ذوق پروان چڑھنے لگا بلکہ تنقید کرنے والوں کو بھی نیا مستند مواد میسر آنے لگا۔ انہوں نے علاقائی ادب کی حوصلہ افزائی بھی کی اور "صحیفہ" کو تحقیقی مباحث کا مرکز بنانے میں کامیابی حاصل کی، ان کے عہدادارت میں چند نمایاں ترین مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ "انجمن پنجاب کے مقاصد و قواعد" ازاشفاق احمد "طبقات شعرائے ہند اور مولوی کریم الدین احمد" از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار "سندھ میں اردو کا پہلا شاعر" ازاعجاز الحق قدوسی "برج موہن کیفی" از محمد اسماعیل پانی پتی "مواج نامہ قادریار" از جیلانی کامران "شبلی اور حالی کی بعض غیر مطبوعہ تحریریں" ازاحمد نواز "علم عروض اور وزن و آہنگ کا امتیاز" از سید جابر علی "دیباچہ گلزار عشق" از جمیل جالبی "قیس کی اردو مثنوی ہیررانجھا" از بذل حق محمود "پنجاب میں مسلم لیگ کے انتخاب اور مسلم لیگ کی سول نافرمانی" از اکرام علی ملک۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے غالب ' اقبال ' حالی ' پر متعدد اشاعتوں میں خاص نمبر شائع کیے اور مجلس کے سابق رفقا امتیاز علی تاج اور سید عابد علی عابد کی وفات پر ان کی خدمات ادب کو جامع ' مضبوط اور فکر انگیز اشاعتوں میں خراج تحسین پیش کیا۔ انہوں نے "صحیفہ" میں ادب و تحقیق کی لو کو نہ صرف روشن رکھا بلکہ نظر یہ آتا تھا کہ ادب اب اس شمع کی ساری روشنی ڈاکٹر وحید قریشی کی ذات سے ابھر رہی تھی اور وحید قریشی ہی کا دوسرا نام "صحیفہ" تھا اس دور میں خود انہوں نے "صحیفہ" میں متعدد نئے مقالات پیش کیے۔ دس سالہ قومی ترقی نمبر میں ان کا مقالہ "پاکستان میں اردو تحقیق کے دس سال" اسی سلسلے کی ایک مثال ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا دور ادارت ۱۹۷۴ء تک پھیلا ہوا ہے اور یہ "صحیفہ" کا دوسرا دور زریں ہے۔

دو سال کے تعطل کے بعد ۱۹۷۶ء میں "صحیفہ" کا چوتھا دور شروع ہوا اس کی مجلس ادارت میں احمد ندیم قاسمی ' کلب علی خان فائق اور یونس جاوید شریک تھے۔ "صحیفہ" کو سہ ماہی سے دوماہی کر دیا گیا ' ضخامت محدود کر دی گئی اور تحقیقی اور تنقیدی مقالات کے علاوہ اس میں شاعری ' افسانہ ' ڈرامہ ' انشائیہ اور تخلیقی ادب کی دیگر اصناف کے علاوہ دوسری زبانوں کے تراجم کو بھی اہمیت دی گئی۔ یہ ڈھانچہ بظاہر سید عابد علی عابد کے وضع کردہ "صحیفہ" کی بدلی ہوئی صورت ہی تھی لیکن حالیہ دور کا "صحیفہ" جس کی عمر کے اب بارہ مزید سال گزر گئے ہیں عابد صاحب کے "صحیفہ" کا پرتو نظر نہیں آتا۔ اب "صحیفہ" ایک سرکاری پرچے کی طرح چھپ رہا ہے اور مدیر ' قاری اور مصنف میں ربط باہم مفقود ہے۔

"صحیفہ" کی ابتدا اردو کے ایک موثر اور فعال پرچے کی صورت میں ہوئی تھی ' اس نے اعلیٰ ذوق کو پروان چڑھایا۔ لکھنے والوں کو اعلیٰ اور معیاری ادب تخلیق کرنے کی ترغیب دی اور پڑھنے والوں کو اچھا ادب پڑھنے کا عادی بنایا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے دور ادارت میں "صحیفہ" نے گم شدہ تحقیقی نوادرات کو نئی روشنی دی ' "صحیفہ" کی تقسیم کا نظام اتنا اعلیٰ تھا کہ پرچہ باذوق حضرات کو پابندی وقت سے ملتا اور ان کے تاثرات اہل تحقیق تک پہنچتے تو انہیں لکھنے کی اور تحقیق مزید کی تحریک ملتی ' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شخصیت فعال ہو اور مقاصد نیک اور بے لوث ہوں تو کامیابی کی منزل دور نہیں رہتی۔ "صحیفہ" پر ان دنوں مینوپاژیت طاری ہے لیکن اس کا تابناک ماضی اس کا اثاثہ ہے۔ اس کی ادبی خدمات گراں قدر ہیں۔

"داستاں گو" - لاہور

افسانہ نگار اشفاق احمد کا ننھا سا رسالہ "داستان گو" تجرباتی نوعیت کا ایک خوبصورت رسالہ تھا

جس میں اردو افسانے کے علاوہ شگفتہ و لطیف ادب کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ یہ رسالہ لاہور سے ۱۹۵۷ء میں آفسٹ کی طباعت میں انوکھے سرورق اور کتابی سائز میں صرف ۶۴ صفحات کی ضخامت میں چھپتا تھا لیکن دلچسپ اتنا کہ ایک ایک لفظ مسرت خیز ثابت ہوتا' بڑی سے بڑی بات کو اس رسالے میں معصومیت اور خنک روی سے پیش کر دیا جاتا تھا۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اشفاق احمد "داستان گو" کو زیادہ عرصے تک چلا نہ سکے' وہ "لیل و نہار" کی ادارت کرنے لگے' تو "داستان گو" کو بانو قدسیہ نے آسرا دیا۔ بانو قدسیہ کو شکایت تھی کہ مطلوبہ معیار کی چیزیں دستیاب نہیں ہوتیں اور بہت سی تخلیقات نام بدل کر انہیں خود لکھنا پڑتی تھیں۔ "داستان گو" کا "افسانہ نمبر" اور "ناولٹ نمبر" اس کی یادگار اشاعتیں ہیں اس پرچے کے صفحات پر شرون کمار ورما' جمیلہ ہاشمی' غلام علی چودھری' ریزی' اے حمید' افضل سیار' کا طلوع ہوا لیکن "داستان گو" داستان سناتے سناتے ہی ایک دن سو گیا۔ اس کی موت ۱۹۶۰ء کے اوائل میں غیر طبعی حالات میں واقع ہوئی۔ خوش ذوق قارئین اسے اب بھی یاد کرتے ہیں۔

"شعور" - کراچی

سہ ماہی "شعور" آذر زوبی کا مصور ادبی رسالہ تھا' جو ۱۹۵۷ء میں کراچی سے نرالے بانکپن اور نئی سج دھج سے نکلا۔ شعور ادب اور آرٹ کا امتزاج تھا اسے مصورانہ صورت زوبی نے دی اور اس کے ادبی خطوط سعادت حسن منٹو' ممتاز شیریں' محمد خالد اختر' رشید احمد صدیقی' کرشن چندر' یوسف ظفر' عزیز حامد مدنی' خلیل الرحمٰن اعظمی' بلونت سنگھ' ممتاز مفتی' عبدالروف عروج' ظہور نظر نے اجاگر کیے۔ بزرگ ادیبوں میں سے مولوی عبدالحق' اثر لکھنوی' شاد عارفی اور فراق کی تخلیقات حاصل کی گئیں "شعور" خوبصورت ٹائپ میں چھاپا گیا تھا' یہ مرکز نظر بھی تھا اور دامن کش دل بھی' لیکن اس کا عرصہ اشاعت زیادہ طول نہ پکڑ سکا اور تین دل ربا اور جنت نظر اشاعتوں کے بعد یہ روشن ستارہ ڈوب گیا۔ مجتبیٰ حسین نے "شعور" کو ماہنامے کی صورت دی لیکن آذر زوبی نے جو صوری معیار قائم کیا تھا ماہنامہ اسے جاری نہ رکھ سکا اور آخر اس کی اشاعت معطل ہو گی۔

"نصرت" - لاہور

۱۹۵۸ء میں لاہور سے ہفت روزہ "نصرت" کا اجرا ادبی صحافت میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ اس کے ادارۂ تحریر میں حنیف رامے اور عبدالقدیر رشک شامل تھے' محمد سلیم الرحمٰن اور ذوالفقار

احمد تابش نے بھی اس پرچے کو معنوی اور فنی رعنائیاں عطا کی ہیں۔ لیکن "نصرت" کے مزاج کا فکری زاویہ حنیف رامے کی تخلیقی اپج آشکار کرتا ہے۔ اس ہفت روزے کی بنیادی خوبی یہ تھی کہ اس میں زندگی کے جملہ مظاہر و مسائل ادبی انداز میں پیش کرنے اور ایک عام قاری کی تہذیبی سطح بلند کرنے کی کاوش کی جاتی تھی "نصرت" اگرچہ خالصتاً" ادبی پرچہ نہیں تھا لیکن اس کا مزاج ادبی تھا اور اس میں شاعری، افسانہ، تنقید، تبصرہ کتب، بحث و نظر کے علاوہ عالمی اور ملکی مسائل پر ایک ادیب کی نظر ڈالی جاتی تھی۔ اس میں حنیف رامے کے اداریے فکر کی نئی لہر کو ابھارتے اور فرد کو زندگی کے معمول سے ہٹ کر سوچنے کی دعوت دیتے تھے۔ اس کی ایک مثال "عمل یا فریب عمل" کے عنوان کے اداریہ سے دیکھیے "حرکت میں برکت ہوتی ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ صرف اسی حرکت میں برکت ہوتی ہے جو انسان کو آگے بڑھائے، وہ حرکت جو روز مرہ بن جائے، ایک دائرہ بن جائے، وہ آہستہ آہستہ جمود کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ویسے ہی جیسے ہماری زمین ہر لحہ حرکت کر رہی ہے لیکن ہمارے لیے اس کی حرکت کا احساس مٹ چکا ہے۔ مصروفیت بے عمل بھی ہو سکتی ہے۔ مصروفیت وقت کو آگے بڑھانے کا راستہ بنانے کے بجائے اسے موت بھی بخش سکتی ہے۔ ایک نشہ بھی بن سکتی ہے۔"(۲۴)

"نصرت" نے "صلائے عام" کے عنوان سے مختلف عنوانات پر مباحثوں کا آغاز کیا۔ "ملت کی تعمیر کیوں کر ہو" پر بحث کا آغاز مولانا غلام رسول مہر نے کیا، بعد میں اس میں عطا اللہ پالوی، اور حبیب اشعر نے بھی حصہ لیا۔ "نصرت" کو تعمیری صحافت اور تعمیری ادب کا نمائندہ قرار دیا گیا ہے۔ تو یہ غلط نہیں ہے۔

جولائی ۱۹۵۹ء میں "نصرت" نے "مہاجرین نمبر" شائع کیا۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی مبسوط ادبی و معاشرتی دستاویز تھی جس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے لے کر سعادت حسن منٹو تک ہر نقطہ نظر کے ادیب نے اپنے مضامین سے شرکت کی تھی "نصرت" ایک ایسا ہفت روزہ بن گیا جہاں بحث ادب کے مدار میں ابھاری جاتی تھی اس کے صفحات پر قدیم اور جدید کی کوئی قید نہیں تھی۔ عطاء اللہ پالوی کا مقالہ "آزادی کا قرآنی راستہ" اور خواجہ عبدالرشید کا مقالہ "سیاروں پر زندگی موجود ہے" بعد الطرفین کے باوجود "نصرت" میں ہی شائع ہوئے۔ نئے لکھنے والوں میں سے منیر احمد شیخ، لطیف قریشی، سلیم اختر، نوید انجم، دانیال ساجد، نذیر ناجی، ذوالفقار رضوی، انوار انجم، محمود قیصر، نثار ناسک، اور مینا بٹالوی کئی نام ایسے ہیں جن کی ابتدائی تحریریں "نصرت" میں شائع ہوئیں۔ ان میں سے بعض ستارے اپنی ذات کی روشنی میں گم ہو گئے اور بعض اب تک انعکاس نور کر رہے ہیں۔

نومبر ۱۹۶۰ء میں "نصرت" نے ماہانہ ایڈیشن کا سلسلہ شروع کیا اور اب اس کی فکری اور ادبی حیثیت نمایاں ہو گئی، "نصرت" نے ایک محرک قوت اور مؤثر ماہنامے کی حیثیت میں ادب کی سب

اصناف میں متعدد قابل ذکر اور ہمیشہ یاد رہنے والی تخلیقات پیش کیں، مشتاق احمد یوسفی کا مزاح پارہ "قومی جوتا" اعجاز حسین بٹالوی کا افسانہ "تاج نہیں مانگتی" افتخار جالب کا مضمون "بے ربطی کی تلاش" پروفیسر محمد عثمان کا مقالہ "تردید خودی کی ایک ناکام کوشش" خان فضل الرحمٰن کا افسانہ "ڈوبنے والے" اس دور کے چند تابندہ مضامین ہیں۔

۱۹۶۵ء کے اوائل میں "نصرت" نے اپنا جامہ ایک بار پھر تبدیل کیا' اب ہفت روزہ اشاعت اور ماہانہ ایڈیشن کے بجائے حنیف رامے اور ریاض احمد چودھری کی ادارت میں ڈیمائی سائز پر "نصرت" ٹائپ میں دو ماہی رسالے کی صورت میں چھپنے لگا۔ اس نے ایک تہذیبی اور فکری رسالے کا روپ اختیار کر لیا۔ اس دور میں مولانا تمنا عمادی کے مقالہ "وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود" منظور قادر کا مقالہ "دین اور سیاست کا رشتہ" مظفر حسین کا مقالہ "انسان زمین اور اخلاق" رشید ملک کا مقالہ "موسیقی مفروضے اور افادیت" پروفیسر محمد عثمان کا "تعلیم کی تصویر کا دوسرا رخ" اور ڈینس بیلی کا ترجمہ "نئے معاشروں میں مذہب کا عمل دخل" چند بے حد فکر انگیز مقالے ہیں۔ نظموں اور غزلوں کا حصہ کم ہو گیا لیکن ناصر کاظمی' سجاد باقر رضوی' شہزاد احمد' ظفر اقبال' مجید امجد' منیر نیازی جیسے شعرا کو نمایاں جگہ ملتی رہی۔ "نصرت" کا یہ دور بھی مختصر ثابت ہوا۔

"نصرت" فکر و خیال کو تحریک دینے اور جمود کو توڑنے والا جریدہ تھا۔ حنیف رامے نے "نصرت" کی وساطت سے پاکستانی ذہن کو مائل بہ ارتفاع کرنے اور سوچ کا زاویہ تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے اثرات امٹ تھے۔ لیکن اس کا حلقہ وسیع نہ ہو سکا۔ آخری دور میں "نصرت" خواص کا رسالہ بن گیا تھا' مالی زیاں کا یہ سلسلہ آخر بند ہو گیا۔ اس کا آخری زمانہ سیاست میں عمل دخل کا زمانہ ہے۔ اس لیے ادبی زاویے سے چنداں اہم نہیں ہے۔

"نگارش" - کراچی

ماہنامہ "نگارش" کراچی سے ۱۹۵۸ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر ناصر محمود اور معاون ممتاز جاوید تھے "نگارش" کے اجرا کا مقصد اس تشنگی کی تسکین تھا جو ایک عام پڑھنے والے کی حیثیت میں خود مدیران نے محسوس کی تھی۔ اس پرچے نے اشاعتی مراحل دو سال تک طے کیے۔ اس کی سب سے نمائندہ اشاعت سالنامہ ۱۹۶۴ء تھا' جس میں کرشن چندر' اقبال متین' شفیع عقیل' غیاث احمد گدی اور ایم اسلم کے افسانے' خلیل الرحمٰن اعظمی' سلام مچھلی شہری' راجہ مہدی علی خان' عبدالعزیز خالد' اطہر نفیس اور الطاف مشہدی کی نظمیں پیش کی گئیں' اس پرچے میں ڈاکٹر احراز نقوی

کا مقالہ " ۱۹۶۳ء کا اردو افسانہ " اور سعادت نظیر کا مقالہ " جگر مراد آبادی کی غزل " بھی شائع ہوا۔ " نگارش " کے سامنے ادب کی کوئی واضح جہت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ اس رسالے کے صفحات پر مختلف المزاج ادبا و شعرا کا اجتماع الضدّین نمایاں ہے۔ " نگارش " کا سالنامہ اس کا آخری پرچہ نظر آتا ہے۔ اس کے بعد " نگارش " قارئین کی توجہ حاصل نہ کر سکا۔

"سات رنگ"۔ کراچی

کراچی سے ۱۹۵۹ء میں جاری ہونے والے ماہنامہ " سات رنگ " کی ادارت اطہر صدیقی کرتے تھے لیکن اس کے ادبی محرک محمد حسن عسکری تھے " سات رنگ " بظاہر سادہ اور رنگ روپ سے بے نیاز پرچہ تھا، لیکن اس کے مضامین کی شوخی اور ندرت نے بہت جلد ادبی دنیا میں اپنے لئے ایک مستقل جگہ بنا لی۔ اس کے مضامین غور و فکر کو دعوت دیتے، نظموں میں جدت کا پرتو نظر آتا۔ اختر احسن اور مادھو کی نظموں نے اظہار کے نئے پیکروں کو متعارف کرایا اور سب سے اہم بات یہ کہ محمد حسن عسکری کا پورا حلقہ اب " سات رنگ " میں مجتمع ہو گیا تھا اور " سات رنگ " ادب اور فنون لطیفہ کا ایسا مرکز بن گیا جو روشنی کی لہروں کو منعکس کر رہا تھا۔ اس پرچے میں ن۔ م۔ راشد کا مقالہ " جدیدیت کیا ہے ؟ " ممتاز حسین کا " جمود اور انجماد " اختر احسن کا " فاعلاتن فاعلات " محمد حسن عسکری کا " مشرق اور مغرب کی آویزش اردو ادب میں " سلیم احمد کا " ضرب کلیم۔ شاعری یا فلسفہ " چونکا دینے والے اور خاصے طغیان خیز مقالات تھے۔ محمد علوی، عادل منصوری، عباس اطہر، زاہد ڈار، ظفر اقبال، راحت ملک اور نسیم بخاری نے ادب کے متعدد نئے تجربات "سات رنگ" کے صفحات پر ہی کئے۔ اس پرچے میں غیر ملکی زبانوں کے تراجم کو بھی بہت اہمیت دی جاتی تھی لیکن اکثر اوقات مباحثے اور گفتگو میں ادبی قدروں کی ثقاہت کو دانستہ مجروح کر دیا جاتا تھا، عباس اطہر کا مقالہ "بات چیت" یہاں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ "سات رنگ" ہنگامہ خیز اور چونکا دینے والا پرچہ تھا۔ اس نے عمل اور رد عمل شدت سے پیدا کیا۔ ادب کے افق پر گرد اڑائی اور اسے گدلا بھی کیا۔ لیکن یہ ایک بڑے حلقے میں پڑھا جاتا تھا۔ چار سال تک اس پرچے کی پیالی میں طوفان اٹھتے رہے اور آخر یہ انقطاع اشاعت پر مجبور ہو گیا۔ "سات رنگ" عام قاری کا پرچہ نہیں تھا۔

" دانشور "۔ کراچی

سہ ماہی " دانشور " انجمن دانشوران ادب کراچی کا رسالہ تھا جس کے اراکین ادارہ رئیس

امروہوی اور تنزیل الرحمٰن صاحب تھے ' اس کا مقصد اہل نظر کی خدمت میں پڑھنے اور سوچنے کا مواد فراہم کرنا تھا۔ چنانچہ اسے علمی اور تحقیقی مضامین کے لئے وقف کرنے اور نوآموزوں سے بچانے کا عہد کیا گیا۔ " دانشور " کا پہلا پرچہ جنوری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس پرچے میں رئیس امروہوی کا مقالہ " شعر و ادب کی سائنسی روایات " شیخ عبدالخالق عبدالرزاق کا " پاکستانی زبان " تنزیل الرحمٰن کا " انقلاب مشروطیت ایران " اور سید محمد تقی کا " ادب کیا ہے " بے حد علمی مضامین ہیں ' ایک انجمن کا آرگن ہونے کے باوجود " دانشور " مسلسل اشاعت برقرار نہ رکھ سکا۔

"قلم کار" ۔ لاہور

" قلم کار " ادارہ مصنفین پاکستان کی خصوصی پیشکش تھا جسے میرزا ادیب نے مرتب کیا۔ "ابتدائیہ" میں بتایا گیا کہ رائٹرز گلڈ کو ایک باقاعدہ سہ ماہی ادبی جریدے کا اجازت نامہ نہ مل سکا' لہٰذا جتنی تخلیقات مل چکی تھیں انہیں کتابی جریدے کی صورت دے دی گئی۔ تاہم حیرت کی بات یہ ہے کہ "قلم کار" کا صرف ایک ہی پرچہ شائع ہوا اور گلڈ کی لاہور شاخ نے اس قسم کا اعلیٰ پائے کا پرچہ چھاپنے کی کوششیں اس ابتدائی تجربے کے بعد ختم کردیں۔

" قلم کار " کے لئے میرزا ادیب نے پاک و ہند کی نمائندہ ادیبوں سے مضامین جمع کئے تھے ' سعید احمد رفیق کا " ارسطو کا نظریہ فن " سید احتشام حسین کا " ادبی تنقید۔ قدر و معیار کی جستجو " محمد اسلم قریشی کا " تماشا اور تماشائی " ظہیر کاشمیری کا " ٹیڈی شاعر " چند ایسے مضامین ہیں جن کی بازگشت اب تک سنی جاتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا انشائیہ " سیاح " مسعود مفتی کا مزاحیہ " کرکٹ نامہ " اے حمید کا رپورتاژ " ایبٹ آباد سے لاہور تک " کرشن چندر رام لعل ' رضیہ فصیح احمد ' خالدہ اصغر ' رضیہ سجاد ظہیر کے افسانے ' اختر الایمان ' شاذ تمکنت ' شور علیگ ' بلراج کومل ' جوش ملیح آبادی ' مشفق خواجہ ' باقی صدیقی اور عارف عبدالمتین کی منظومات نے اس کتابی سلسلے کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ لیکن یہ چاندنی ایک دفعہ نکھر کر ہی ختم ہوگئی۔ اسی قسم کا ایک رسالہ " قلم کار " رائٹرز گلڈ نے ڈھاکہ سے بھی شائع کیا تھا۔

...

"ندیم" ڈھاکہ

ماہ نامہ " ندیم " جنوری ۱۹۶۰ء میں ارشد کاکوی کی ادارت میں ڈھاکہ سے جاری ہوا اور

اپریل ۱۹۶۱ء تک جاری رہا۔ اس عرصے میں اس کے صرف ۱۳ پرچے منظر عام پر آئے، جن میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، قاضی عبدالودود، حنیف فوق، نیاز فتح پوری، حامد حسن قادری، وفا راشدی، یونس احمر، جمیل مظہری اور عطاء اللہ پالوی جیسے ادبا نے شرکت کی۔ "ندیم" نے بنگالی زبان و ادب کو اردو دان طبقے سے متعارف کرانے میں زیادہ خدمات سرانجام دیں اور ایک "نذرالاسلام نمبر" (اشاعت جون جولائی ۱۹۶۰ء) نکالا "ندیم" میں مشرقی پاکستان کے ادیبوں کو زیادہ استحقاق حاصل تھا اور ستمبر کے پرچے کو "مشرقی پاکستان نمبر" قرار دیا۔(۲۶) ارشد کاکوی صاحب نے "ندیم" کے لئے پوری اردو دنیا سے مضامین نظم و نثر حاصل کئے۔ چنانچہ "ندیم" کی اشاعت کو پروفیسر کاکوی کا "جوٹ سے شہد نکالنے کا عمل" قرار دیا گیا۔(۲۷)

"اسلوب" لاہور

ماہنامہ "اسلوب" ۱۹۶۰ء میں لاہور سے جاری ہوا تو اس کا مقصد ادب کی عظیم قدروں اور جدید رجحانات کی آئینہ داری تھا۔ اس کی ادارت کے فرائض ضمیر فاطمی اور شفیق شمس نے سر انجام دیئے۔ ابتدائے سفر میں ہی صوفی تبسم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، عرفان صدیقی، وقار عظیم، فیض احمد فیض، احسان دانش، سید محمد جعفری، عبدالحمید عدم، میرزا ادیب، شہزاد احمد، ایوب رومانی، عمر فیضی، عابد حسن منٹو، غلام حسین ذوالفقار اور حمایت علی شاعر جیسے ادبا کا تعاون حاصل کر لیا، "اسلوب" کے صفحات پر صابر لودھی، رفیق خاور جسکانی، سجاد رضوی، ناصر بغدادی، صابر کنجاہی، فیروز نظر، خیال امروہوی، یوسف زاہد جیسے نام بھی نمایاں نظر آتے ہیں جو اس دور میں ادب کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے۔ "اسلوب" معنوی طور پر ایک بے حد فعّال پرچہ نظر آتا ہے۔ اس کے مضامین خیال انگیز تھے۔ عزیز الحق کا مضمون "آزاد خیالی کیا ہے؟" فیض کا "موضوع اور طرزادا" سید عبداللہ کا "تعلیم میں عقیدے کی اہمیت" عبدالصارم ازہری کا "قید خانوں اور سزاؤں کا تاریخی پس منظر" ڈاکٹر عبادت بریلوی کا "اردو تنقید میں نئے تجربے" اور عابد حسن منٹو کا "منٹو اور اس کا فن" اسی پرچے میں شائع ہوئے، صابر لودھی "اسلوب" میں ڈرامہ نگار کی حیثیت میں سامنے آئے ان کا ڈرامہ "ارجن کا درخت" "اسلوب" کے پانچویں شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اتنی اچھی اٹھان کے باوجود "اسلوب" زیادہ طویل عرصے تک زندہ نہ رہ سکا۔ پانچویں اشاعت پر تاخیر ہونے لگی اور دوسرے سال کے بعد یہ پرچہ اچانک غائب ہو گیا۔

"اقبال ریویو" - کراچی

سہ ماہی رسالہ " اقبال ریویو " اقبال اکادمی کا رسالہ ہے - کراچی سے اپریل ۱۹۶۰ء میں اس کا اجرا عمل میں لایا گیا تو اس کا مقصد ----- " اقبال کی زندگی ' شاعری اور حکمت کے مطالعہ پر تجزیاتی ' تشریحی ' تحلیلی اور علمی مضامین شائع کرنا تھا - اس کے دائرہ عمل میں ان مضامین کو بھی شامل کیا گیا جن میں خود اقبال کو دلچسپی تھی - چنانچہ فلسفہ ' اخلاقیات ' مذہبیات ' عمرانیات ' ادب ' فن اور اسلامیات جیسے اہم موضوعات کو " اقبال ریویو " میں نمایاں جگہ ملنے لگی یہ رسالہ بے حد سادہ لیکن فکر و معنی کے لحاظ سے ایک خاموش تحریک کا درجہ رکھتا ہے - اقبال پسندوں کو نئے نئے گوشوں سے آشنا کراتا ہے یہ اقبال اور اطراف اقبال کے متعدد علوم پر بحث و نظر کی راہ بھی ہموار کرتا ہے - اس کی یہ خدمت متنوّع اور با معنی ہے ----

" اقبال ریویو " ذولسانی پرچہ تھا - سال میں اس کے چار شمارے چھپتے تھے ' دو شمارے اردو میں اور دو انگریزی میں شائع ہوتے تھے - اس علمی پرچے کے پہلے مدیر ڈاکٹر محمد رفیع تھے - جولائی ۱۹۶۵ء میں اس کی ادارت بشیر احمد ڈار صاحب نے سنبھالی ' ۱۹۷۱ء میں ادارتی کام کی نگرانی کے لئے ایک مجلس ادارت قائم کی گئی جس کے ارکان جناب ہادی حسن ' خواجہ آشکار حسین اور علی اشرف اور صدر مجلس سید عبدالواحد تھے - مجلس ادارت کے ارکان میں حسب ضرورت تبدیلیاں عمل میں آتی رہیں ' اقبال اکادمی لاہور منتقل ہوئی تو یہ رسالہ بھی لاہور آگیا جولائی ۱۹۷۶ء میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور جنوری ۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر محمد باقر صدر مجلس مقرر ہوئے - ڈاکٹر محمد معزالدین اور ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی اس جلیل القدر پرچے کی ادارتی خدمات سر انجام دیں - اب کچھ عرصے سے " اقبال ریویو " ششماہی بنیادوں پر انگریزی میں چھپ رہا ہے اور اس کے جزو ثانی کا نام تبدیل کر کے " اقبالیات " رکھ دیا گیا ہے اقبالیات کے مدیر اعلی مرزا محمد منوّر ہیں اور نائب مدیر محمد سہیل عمر ' ڈاکٹر وحید عشرت ' احمد جاوید اور انور جاوید ان کے معاونین میں شامل ہیں - " اقبال ریویو " نے اقبالیات کے موضوع کو نئی بصیرتیں اور نئے زاویے عطا کئے ہیں ' اپنی ۳۸ سالہ زندگی میں اس پرچے نے فکر اقبال کی توضیح اور فروغ میں زیادہ حصہ لیا - اس ضمن میں " علامہ اقبال اور تصور وطن " از ڈاکٹر وحید قریشی "علامہ اقبال اور آدم گریزی" از مرزا محمد منور "علامہ اقبال کا تصّور حیات ' موت" از سید محمد اکرم شاہ "اقبال شناسی کی نئی جہتیں" از وارث میر "فلسفہ اقبال کے ماخذ و مصادر" از ڈاکٹر وحید عشرت چند اہم عنوانات مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں ' "اقبال ریویو" کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس نے اقبال کے روابط اشخاص اور ان کے فکر کے گرد و پیش کو اجالنے کی کوشش بھی کی ہے - اس پرچے میں ہمیں متعدد ایسے

مضامین ملتے ہیں جن کا تعلق اقبال سے ملنے والی شخصیات اور ایسے امصار سے ہے جہاں اقبال نے کبھی قدم رنجہ فرمایا تھا۔ اس ضمن میں جو مضامین سامنے آ چکے ہیں ان میں عبدالکافی ادیب کا "اقبال کے احباب" پروفیسر اکبر رحمانی کا "اقبال اور لمحہ لمحہ" "اقبال اور مولانا صلاح الدین احمد۔" محمد حنیف شاہد کا "اقبال اور احسان دانش" ڈاکٹر مظفر حسن کا "اقبال اور گجرات" ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا "اقبال اور بلوچستان" ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی کا "اقبال اور ایران" کا تذکرہ امثال امر کے لئے کیا جاتا ہے۔ رسالہ "اقبال ریویو" میں بہت سے ارمغان محبت نظم اور نثر میں مرتب ہوئے ہیں۔ اقبالیات کے موضوع کو وسعت ملی اور تحقیقی نوادر منظر عام پر آئے' اقبال کا بہت سا گم شدہ کلام اور خطوط "اقبال ریویو" میں پہلی دفعہ پیش کئے گئے۔

رسالہ "اقبالیات" جو "اقبال ریویو" ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے' اقبالیات کے موضوع پر ایک جلیل القدر ادبی صحیفہ ہے۔ اسی کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر وحید قریشی' ڈاکٹر وزیر آغا مرزا محمد منور' ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی' ڈاکٹر محمد ریاض' ڈاکٹر سید اکرم شاہ' سید حسین نصر' حسن اختر ملک' عبدالکافی ادیب' تحسین فراقی' صابر کلوروی' اکبر رحمانی' مہر عبدالحق' ڈاکٹر وحید عشرت' سہیل عمر' محمد عبداللہ قریشی' عبدالحمید کمالی' ڈاکٹر مظفر عباس' انعام الحق کوثر' مظفر حسین برنی' خواجہ حمید یزدانی' کے علاوہ متعدد اہل علم شامل ہیں "اقبالیات" عوام کا پرچہ نہیں۔ یہ اقبال کے خاص خاص طالب علموں کا پرچہ ہے۔ لیکن اس کا حلقہ اثر وسیع' معیار ادب و تحقیق بلند اور اس کے مندرجات با اعتبار شمار ہوتے ہیں جن کے حوالے بعد میں لکھے جانے والے مضمون میں حسب ضرورت افراط سے استعمال کئے جاتے ہیں۔

"اردو نامہ" ۔ کراچی

ترقی اردو بورڈ کا سہ ماہی ادبی مجلہ "اردو نامہ" اگست ۱۹۶۰ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ اس کے نگران ممتاز حسن تھے اور ادارۂ تحریر میں جوش ملیح آبادی' شان الحق حقی' نسیم امروہوی' اور خواجہ حمید الدین شاہد تھے' "اردو نامہ" اگرچہ سرکاری قسم کا پرچہ تھا لیکن مدیران نے اس میں ادبی شان پیدا کی اور شعبہ لغت کی فنی بحثوں کے علاوہ اس میں علمی' ادبی تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے لئے گنجائش پیدا کی۔ اردو لغت کے ابواب مجمل صورت میں "اردو نامہ" میں پیش کئے جاتے تھے' کتابوں پر خیال افروز تبصروں کے علاوہ ایک حصہ مراسلات کے لئے وقف تھا جس میں مضامین پر بحث ہوتی اور لفظ و معنی کی دلچسپ آویزش کو آشکار کیا جاتا۔ "اردو نامہ" نے اپنے پڑھنے اور لکھنے والوں

کا ایک مخصوص طبقہ پیدا کیا اور آہستہ روی سے زبان و ادب کی بیش بہا خدمت کی ۔

" اردو نامہ " کے مضامین نادر اور چنیدہ ہیں ' ان کی فہرست بہت طویل ہے ۔ ان کی نوعیت تحقیقی بھی ہے ' توضیحی بھی اور معلومات افزا بھی مثلاً اردو زبان کی تحقیق و تاریخ پر ڈاکٹر شوکت سبزواری ' قدرت نقوی ' رشید حسن خان اور سہیل بخاری کے مضامین کی یہاں مثال پیش کی جا سکتی ہے ۔ " اردو نعت نگاری " پر ممتاز حسن کا مقالہ ' اکبر حسین قریشی کا " فن اور فنی اقدار " سخاوت مرزا کا " مثنوی من موہن " اختر حسن کا " اردو مختصر نویسی کی تاریخ " مسلم ضیائی کا " غالب کا زائچہ اور تاریخ ولادت " قدرت نقوی کا " پوٹھوہاری پر دراوڑی اثرات " ' امجد کندیانی کا " سب رس کا تنقیدی جائزہ " ۔ محمد اکرام چغتائی کا " اردو بمعنی زبان کی نئی تحقیق " سے موضوعات کے تنوع اور وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ زبان و بیان کے اعتبار سے قیصری بیگم کی خود نوشت " کتاب زندگی " جو " اردو نامہ " میں قسط وار چھپ چکی ہے خاصے کی چیز ہے ۔ مراسلات کی بحث میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی ' مولانا عبدالقادر ' عرش ملسیانی ' رشید حسن خان ' غلام مصطفیٰ خان ' محمد سلیم الرحمن ' ڈاکٹر صفدر آہ ' ماہر القادری ' تحسین سروری اور ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے ماہرین زبان و ادب نے شرکت کی ہے ۔ بعض مقامات پر غزلوں کی اشاعت کا محل بھی پیدا کیا گیا ہے ۔ لیکن غزلیات میں بھی کلاسیکی انداز اور صحت زبان کی پاسداری نمایاں ہے ۔ چند غزل نگاروں کے نام یہ ہیں شان الحق حقی ' شفقت کاظمی ' دوار کا داس شعلہ ' --- " اردو نامہ " کے ۵۴ شمارے شائع ہوئے ۔ ۱۹۷۷ء میں اردو نامہ کی اشاعت معطل ہو گئی بعد میں اسی نام سے مجلس زبان دفتری پنجاب لاہور نے مارچ ۱۹۸۲ء میں ایک ماہنامہ جاری کیا جو اردو کو سرکاری زبان بنانے کی لئے تیکنیکی قسم کی خدمات سرانجام دے رہا ہے ۔

" ہم قلم " ۔ کراچی

پاکستان رائٹرز گلڈ جنوری ۱۹۵۹ میں تشکیل دیا گیا تھا ۔ جب اس ادارے کی تاسیس مکمل ہو گئی تو گلڈ کی کراچی شاخ نے ایک پندرہ روزہ " اطلاع نامہ " ٹائپ میں چھاپنا شروع کیا ' جس کی اشاعت باقاعدہ نہیں تھی ' اگست ۱۹۶۰ء اس اطلاع نامے کو جو " ہم قلم " کے نام سے موسوم تھا ادبی پرچے کی حیثیت دے دی گئی ۔ " ہم قلم " کے پہلے مدیر شمیم احمد اور ناشر طفیل احمد جمالی تھے ۔ لیکن بعد میں اس کے مدیران میں متعدد تبدیلیاں عمل میں آئیں اور یہ خدمات مشفق خواجہ ' ابن انشاء اور شوکت صدیقی کے علاوہ کچھ پس پردہ ادیبوں نے بھی سرانجام دیں ' لیکن " ہم قلم " چونکہ رائٹرز گلڈ کا

سرکاری پرچہ تھا اس لئے اس کی ہیئت اور مزاج پر مدیران کا اثر نمایاں نظر نہیں آتا۔

" ہم قلم " کا مقصد تجارت یا اچھی مارکیٹ حاصل کرنے کے بجائے ادیبوں کو اور بالخصوص نئے لکھنے والوں کو اشاعت کی سہولتیں فراہم کرنا تھا۔ " ہم قلم " چونکہ مندر جات کا معاوضہ بھی دیتا تھا اس لئے مشاہیر و اکابر ادبا نے بھی اس رسالے کی پوری سرپرستی کی۔ اس کا ایک حصہ گلڈ کی سرگرمیوں کے لئے وقف تھا، اس لئے اس پر اطلاع نامے کی پختہ چھاپ لگ بھی لگی ہوئی تھی۔ "ہم قلم " نے ادب کی جہت سازی یا رہنمائی کرنے کے بجائے ادیبوں اور پڑھنے والوں کو نئی تخلیقات فراہم کرنے کا فریضہ زیادہ ادا کیا۔ اس پرچے میں علاقائی زبانوں کے تراجم کو خصوصی اہمیت دی گئی، مولوی عبدالحق " اردو شاعری میں ابہام گوئی " ضمیر علی بدایونی " فن اور لاشعور " غلام حسین ذوالفقار "عمرانیات اور ادب" گوپی چند نارنگ "اردو نثر نگاری کے جدید رجحانات"۔ محمد اسحٰق نعمان شبلی کی شخصیت کے تین رخ" کے مضامین کی صدائے بازگشت "ہم قلم" کے صفحات سے ہی ابھری تھی، اس پرچے میں انور کا معرکہ آرا رپورتاژ "اٹھ فرید استیا" بھی ایک یادگار تخلیق ہے۔ ن۔ م۔ راشد، احمد فراز، جعفر طاہر، جلیل حشمی، یوسف ظفر، وزیر آغا۔ ریاض انور کی متعدد اچھی نظمیں "ہم قلم" میں شائع ہوئیں، ۱۹۶۱ء میں "ہم قلم" کا سالنامہ شائع ہوا اور اس میں غلام عباس، عبدالعزیز خالد، حجاب امتیاز علی، شور علیگ، عزیز حامد مدنی، حفیظ ہوشیار پوری، ظہیر کاشمیری، یونس احمر، جمیل ملک، جلیل حشمی کے علاوہ متعدد ہندوستانی ادیبوں کے مضامین بھی شائع کئے گئے۔

" ہم قلم " پر رائٹرز گلڈ کی سیاست کا غلبہ تھا اور اپریل ۱۹۶۵ء تک یہ معمول کی کاروائی پوری کرتا اور شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد " ہم قلم " کی اشاعت بے قاعدہ ہو گئی۔ " ہم قلم " کی جلد نمبر ۵ کا دسواں شمارا اس کا آخری پرچہ تھا جو مئی ۱۹۶۵ء کو شائع ہوا۔

" الزبیر " ۔ بہاولپور

اردو اکیڈمی بہاولپور کے زیر اہتمام جنوری ۱۹۶۱ء میں سہ ماہی " الزبیر " جاری کیا گیا تو اس کی ادارت علامہ شبیر بخاری صاحب کو تفویض ہوئی لیکن کچھ عرصے کے بعد مسعود حسن شہاب مدیر مقرر کئے گئے۔ " الزبیر " کی علمی، ادبی اور تہذیبی روایت مسعود حسن شہاب دہلوی نے تعمیر و تشکیل کی اور اب " الزبیر " انہیں کی شخصیت کا نقش نظر آتا ہے۔ شہاب صاحب نے " الزبیر " کو خصوصی موضوعات کا پرچہ بنایا اور متعدد ایسے موضوعات پر بنیادی نوعیت کا مواد فراہم کر دیا جن پر پہلے کام نہیں ہوا تھا۔ مثال کے طور پر " سفرنامہ نمبر " اور " آپ بیتی نمبر " " الزبیر " کی اختراعات تھیں۔

موخرالذکر موضوع پر بعدمیں " نقوش " نے اضافہ کیا ۔ " الزبیر " کے دوسرے خصوصی شماروں میں اصناف "ادب نمبر" " چولستان نمبر " " بہاولپور نمبر " ادبی معرکے نمبر " تنقید نمبر " بے حد اہم نمبر ہیں۔ ان کے دامن میں صدہا نوادر محفوظ ہیں ' جو اب تحقیق و تنقید میں معاونت کرتے ہیں۔

" الزبیر " بنیادی طور پر تحقیقی مزاج کا پرچہ ہے لیکن اس میں موضوعاتی تنقید کے مضامین کو بھی نمایاں جگہ دی جاتی ہے ۔ البتہ تخلیقی اصناف کی طرف توجہ کم دی جاتی ہے ۔ " اصناف ادب نمبر" میں متعدد تخلیقات کے تجزیے پیش کرنے کی کاوش کی گئی اور یہ " الزبیر " کے ادبی مزاج میں ایک خوشگوار تبدیلی تھی ۔

" الزبیر " کے جن خاص نمبروں کو اہمیت حاصل ہوئی ان میں " غیر ملکی افسانہ نمبر " "آپ بیتی نمبر(۱۹۶۳ء) اور "کتب خانہ نمبر" (۱۹۶۷ء) کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ "الزبیر" کی منفرد خوبی یہ ہے کہ اس نے بعض نادر مضامین کو اپنے صفحات میں جگہ دی اور ان کی صدائے بازگشت دور دور تک سنی گئی۔ صادق مصور کامقالہ "ادب العالیہ میں موضوع اور اظہار کا تصور" عبدالمجید قریشی کا "ذکر علی گڑھ اور یاران علی گڑھ اردو ادب میں" نور محمد علوی کا "فارسی شاعری میں گھوڑے کی مذمت"۔ فضل اللہ زبیری کا "خط نسخ اور اس کی تاریخ" سید قدرت نقوی کا "لسانی اثرات" اور مسعود حسن شہاب کا "غالب اور غدر" اس ضمن میں بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ بہاولپور کو ادب کا مرکزی مقام عطا کرنے میں "الزبیر" کی خدمات نمایاں ہیں۔

" خیابان " ۔ پشاور

" خیابان " شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی کا علمی و ادبی جریدہ ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی نے لکھا تھا کہ

" مجلہ خیابان " پابندی وقت کے ساتھ شائع نہیں ہوتا ' یہی اس کا امتیازی وصف ہے " (۲۵)

" خیابان " تجارتی جریدہ نہیں ہے ۔ یہ نجی تقسیم کے لئے اور طلباء اور اساتذہ کے علاوہ ادبا کے استفادہ کے لئے شائع کیا جاتا ہے جون ۱۹۶۲ ء میں " خیابان " کا " اقبال نمبر " شائع ہوا تو اسے ارباب علم و ادب نے بے حد سراہا ۔ اس پرچے کے مرتبین میں ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی اور خاطر غزنوی شریک تھے ۔ طلبہ میں سے ادارت کے فرائض سحر یوسف زئی نے سرانجام دیئے ۔ " اقبال نمبر " " فکر و نظر " ۔ " شعر و فن " " تنقید و تجزیہ " اور " منظومات " کے ابواب میں منقسم کیا گیا اور ایک حصہ انعامی مضامین کے لئے وقف تھا اس پرچے میں "اقبال اور مسئلہ جبر قدر" رضی الدین صدیقی "اقبال کا

تصور حسن" شمس الدین صدیقی "اقبال اور فلسفہ خودی" مرتضیٰ جعفری "بھرتری ہری کا ایک اشلوک" صمد رضوی۔ "خضر راہ" عبادت بریلوی۔ "ساقی نامہ" محمد طاہر فاروقی چند قیمتی مضامین ہیں۔ اقبال کو منظوم خراج عقیدت عطا حسین کلیم، محسن احسان، یوسف ظفر، آل احمد سرور، نخشب جارچوی نے ادا کیا ہے۔

" خیابان " کا ایک اہم کارنامہ ۱۹۶۴ء کا خاص نمبر ہے جس میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک اردو زبان و ادب کے پاکستانی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ساڑھے چھ صد صفحات کے اس نمبر میں زبان کے مسائل، پاکستان کے مختلف خطوں میں اردو کی رفتار، پاکستانی ادب کے مختلف ادوار اور اصناف کا تجزیہ اور علمی و ادبی اداروں کے کام کی رفتار کا مکمل جائزہ پیش کرنے کی کاوش کی گئی اور ہر مقالے کے لئے موضوع کے مطابق ملک کی اہم شخصیات کو زحمت تحریر دی گئی۔ محمد طاہر فاروقی نے قومی زبان کے مسائل پر، ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو میں دخیل الفاظ کے موضوع پر، ابواللیث صدیقی نے اردو زبان کے مسائل پر اظہار خیال کیا۔ علاقائی زبانوں سے اردو کے روابط کے سلسلے میں کلیم سہسرامی نے " مشرقی پاکستان میں اردو " انعام الحق کوثر نے " بلوچی اور اردو " شرر نعمانی نے " علاقہ سرحد میں اردو " محمد احسن فاروقی نے " سندھ اور اردو " کے موضوع پر مقالات لکھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ " پاکستانی ادب کے دس سال " عرش صدیقی کا "جدید نظم" نظیر صدیقی کا "اردو غزل کدھر" ڈاکٹر وزیر آغا کا "اردو نثر میں طنز و مزاح" سید وقار عظیم کا "اردو افسانہ" خاطر غزنوی کا "ریڈیو ڈراما" محمد عارف قریشی کا "علمی و ادبی رسائل" چند ایسے مقالات ہیں جو اس دور کے ادب کا پورا منظر ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ "خیابان" کے اس پرچے کو ایک ادبی انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت حاصل ہوئی اور کچھ عرصے کے بعد اسے پشاور سے کتابی صورت میں بھی پیش کیا گیا۔

محمد طاہر فاروقی ۱۹۶۸ء میں ریٹائر ہو گئے۔ ان کی سبکدوشی کے بعد " خیابان " کی ادارت ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی نے انجام دی، ان کے معاون ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری تھے۔ ان کے عہد ادارت میں " خیابان شرر " اور " خیابان فاروقی " دو یادگار اشاعتیں منظر عام پر آئیں "شرر نمبر" (جون ۱۹۷۲ء) میں شرر کے تخلیق فن کے متعدد گوشوں کو اجاگر کیا گیا۔ پروفیسر عبدالستار جوہر کا مقالہ "اردو ناول شرر سے پہلے" افتخار احمد صدیقی کا "اوّلیات شرر" نصیر احمد زار کا "شرر کی شاعری" عبدالسلام خورشید کا "شرر کا صحافتی کارنامہ اردو" سجاد باقر رضوی کا مقالہ "شرر کے تنقیدی تصورات" اس پرچے کے چند اہم مقالات ہیں۔ "خیابان فاروقی" میں پشاور یونیورسٹی کے ایک فاضل استاد اور ایک علم دوست شخصیت کو ان کے شایان شان خراج تحسین پیش کیا گیا اور ان کی شخصیت کو عہد گزشتہ کی یادوں سے بازیافت کیا گیا۔ اس سلسلے میں ان کی فن شناسی کا فریضہ بھی ادا کیا گیا۔ شمس

الدین صدیقی "طاہر فاروقی کی سوانح نگاری" صدیق جاوید "ایک معروف اقباص شناس" مرتضیٰ اختر جعفری "طاہر فاروقی کی شاعری" خاطر غزنوی "طاہر فاروقی کی مکتوب نگاری" جیسے مقالات اسی سلسلے کو روشن کرتے ہیں۔ "خیابان" کا "غالب نمبر" بھی اس کی ایک معرکہ آرا اشاعت ہے، جسے بعد میں "خیابان غالب" کے نام سے شائع کیا گیا۔ میر انیس کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر "خیابان" نے "میرانیس نمبر" پیش کیا اور یہ بھی اس کی ایک وقیع پیش کش ہے۔

"خیابان" کی عطا یہ ہے کہ ایک یونیورسٹی مجلّہ ہونے کے باوجود اس نے ادب کی وسیع تر ابعاد کا احاطہ کیا اور نہ صرف یونیورسٹی اساتذہ کی رہنمائی کی بلکہ اتنی اعلی تنقیدی چیزیں "خیابان" میں پیش کر دیں کہ اسے اردو کا ایک وقیع اور اہم پرچہ شمار کیا گیا اور اس کے خاص نمبروں کو بعد میں کتابی صورت دی گئی۔

منٹگمری گزٹ "فردا" ساہیوال

پندرہ روزہ "فردا" ضلع کونسل ساہی وال کا سرکاری آرگن تھا۔ اس سے قبل ساہی وال کا نام منٹگمری تھا تو اردو ادب اور قومی تعمیر و ترقی کے یہ امور ہفت روزہ "منٹگمری گزٹ" سرانجام دیا کرتا تھا، ان پرچوں کی ادارت اشرف قدسی نے سرانجام دی۔ انہوں نے شاعر ہونے کے ناتے ان کو ادبی روپ دینے کی کوشش کی۔ ساہی وال پر ممتاز شاعر مجید امجد کا سایہ ہے، خوش قسمتی سے یہاں وقتاً فوقتاً ایسے نظما متعین ہوتے رہے جنہیں ادب کے ساتھ خصوصی دلچسپی تھی، ان میں مصطفےٰ زیدی اور مظفّر قادر خاص طور پر قابل ذکر ہیں اوّل الذّکر کے عہد میں "منٹگمری گزٹ" کا "مولانا صلاح الدین احمد نمبر" شائع ہوا اور موخرالذکر نے "فردا" کی اشاعت خاص ۱۹۶۷ء پیش کی۔ مظفر قادر نے ان دونوں پرچوں کو تحریک کا درجہ دیا ہے "بابا فرید نمبر" اور "مشاعرہ نمبر" بھی ایسی اشاعتیں ہیں جنہیں اہل ادب نے بہت سراہا۔

"فردا" کی اشاعت خاص ۱۹۶۷ء بالخصوص ایک ادبی پرچہ نظر آتا ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ادبی شہ پارے اور دوسری میں قومی مسائل سے متعلق تحریریں شامل ہیں اور اب ان میں سے چند ایک کو تو نوادرات کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ مجید امجد کا مقالہ "مصطفےٰ زیدی کی نظمیں" مولانا حالی کا نایاب مضمون "شواہد الالہام" مولانا نظامی کی نظم "خطاب بہ گل سوسن" کو ایسے نوادرات میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس پرچے میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کا مقالہ "اقبال اور ملّت اسلامیہ کا نصب العین" جیلانی کامران کا "ادب اور تمدن" خواجہ محمد زکریا کا "اردو ادب اور انگریزی دان" مولانا

صلاح الدین احمد کا "پاکستانی بچوں کی تعلیم کا مسئلہ" اور سجاد میر کا "سمرسٹ ماہم" جیسے عمدہ مضامین شائع ہوئے۔ جوش، مجید امجد، مصطفےٰ زیدی، منیر نیازی، جعفر طاہر، صوفی تبسم، ناصر کاظمی، ظہور نظر اور احسان دانش کی منظومات بھی اس پرچے میں شامل ہیں۔ "منٹگمری گزٹ" اور "فردا" کو ساہی وال کے نئے ادبا کا گہوارہ کہا جا سکتا ہے۔ ان پرچوں میں ہمیں مراتب اختر، اشرف قدسی، نجم ثاقب، اطہر ندیم، طارق عزیز، سجاد میر، ناصر شہزاد، احسن شیرازی، ناصر صدیقی کی متعدد ابتدائی تحریریں ملتی ہیں۔ منٹگمری گزٹ ۱۹۶۶ء میں "فردا" میں ضم کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۶۷ء کے بعد "فردا" کا بھی کوئی پرچہ نظر نہیں آتا۔ اس پرچے کو ایک مؤقر ادبی پرچہ بنانے میں اشرف قدسی کے تخلیقی ذہن اور محنت کا عمل دخل زیادہ ہے۔

"بصائر" کراچی

سہ ماہی رسالہ "بصائر" دائرہ معین المعارف کا ترجمان تھا۔ اس کی ترتیب و تدوین کے فرائض ڈاکٹر سید معین الحق سرانجام دیتے تھے، جولائی ۱۹۶۲ء میں "بصائر" کے اجرا پر انہوں نے لکھا کہ:

"عرصے سے خواہش تھی کہ اردو میں ایک علمی ادبی اور تحقیقی رسالہ جاری کیا جائے، جس میں ارباب قلم کی تخلیقات کے علاوہ محققین کی تحقیقی کاوشوں کے نتائج کو شائع کر کے اردو ادب کے سرمایہ کو بہتر بنایا جا سکے"

ڈاکٹر معین الحق مسلم لیگ کی قومی تحریک کے سرگرم رکن تھے، ۱۹۵۰ء میں انہوں نے "پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" قائم کی تو اس میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر محمود حسین، ایم بی احمد، مرزا علی اظہر برلاس اور مفتی انتظام اللہ شہابی کا تعاون حاصل کیا۔ "بصائر" کا ایک مقصد تحریک پاکستان کے بارے میں تحقیقی مواد جمع کرنا تھا۔ تاہم اس پرچے کے مضامین کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو یہ کسی ایک موضوع تک محدود نہیں۔ مثال کے طور پر ایک پرچے میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان نے "غالب اور صہبائی" کے موضوع پر، خواجہ حمید الدین شاہد نے "اردو کی چند قدیم مثنویاں" اور محمد سخاوت میرزا نے "شاہ محی الدین پھلواری اور ان کی تالیفات" پر مقالہ لکھا ہے۔ سید معین الحق کا "چیکوسلاویکیہ کا سفرنامہ" اور عبداللہ خاور کی نعت کو بھی شائع کیا گیا ہے۔ تبصرہ کتب میں "سرکشی ضلع بجنور"۔ "اخبار رنگین" اور "قول سدید" از ضیا احمد بدایونی اور رباعیات امجد زیر بحث آئی ہیں، ایک پرچے میں عباس خان شیروانی کی کتاب "تاریخ شیر شاہی" پر ڈاکٹر معین الحق کے حواشی پیش کیے گئے اور اس کے

ساتھ پورا متن بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس سب سے رسالہ "بصائر" کا علمی ' ادبی اور تحقیقی مزاج متعین ہوتا ہے۔ "بصائر" نے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے مختلف جلسوں کا احوال پیش کرنے میں بھی سبقت حاصل کی۔ اس کے لکھنے والوں میں جلیل قدوائی' سخاوت مرزا' محمد ایوب قادری' فروغ علوی' جلال الدین تھانیسری' ابرار علی صدیقی' محمود احمد برکاتی کرنل خواجہ عبدالرشید' حکیم محمد موسیٰ امرتسری' دریندر پرشاد سکسینہ' نادم سیتاپوری کے اسما اہم ہیں۔ اس پرچے کی ایک یادگار اشاعت "ٹیپو سلطان نمبر" ہے۔

"سیارہ" ۔ لاہور

لاہور سے ماہنامہ " سیارہ " کا اجرا اگست ۱۹۶۲ء میں عمل میں آیا ۔ ادارت کے فرائض نعیم صدیقی نے سرانجام دیئے ۔ انہوں نے لکھا کہ انسانیت کی محبت انہیں صحیفہ نگاری کی " کوئے ملامت " میں لائی ہے اور اب وہ خامۂ مژگاں کو خون دل میں بھر بھر کر چمن طرازی داماں کا شغل اختیار کر رہے ہیں ۔ (۲۸) انہوں نے

آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے اے وائے اگر معرض اظہار میں آئے

کے مصداق خود بھی قلم کا سہارا لیا اور اہل قلم کو بھی اپنی آتش دروں معرض اظہار میں لانے کی دعوت دی ۔ چنانچہ " سیارہ " نے ایک نظریاتی ادبی پرچے کے فرائض سنبھالے تو ابتدا ہی میں تازہ مسائل اور مباحث پر گفتگو کی سبیل پیدا کی اور اس سلسلے میں انٹرویو کے طریق کو زیادہ اہمیت دی۔ "سیارہ" نے اس دور میں انتظار حسین کا انٹرویو "اردو ادب میں قومی احساس کا مدو جذر" اور میرزا ادیب کا "ادب لطیف سے قلم کار تک" شائع کئے۔ غلام حسین اظہر نے شاہد احمد دہلوی اور اے ڈی اظہر کا اور سجاد حارث نے عبداللہ حسین کا بہت تفصیلی انٹرویو لیا۔ "سیارہ" میں "کتاب نامہ" کے عنوان سے وزیر آغا' نظر زیدی اور عبدالمجید نے اپنی کتابوں کا تعارف کرایا۔ "سیارہ" کا مضامین کا حصہ نظریاتی نوعیت کا تھا۔ ان میں نقد و بحث کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ موضوعاتی مذاکروں میں سے "یوم دفاع اور ادبی رجحانات" "کیا صحافت بے مقصدیت کی طرف جا رہی ہے" کا حوالہ کافی ہے۔

" سیارہ " نے لکھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بنایا اور متعدد نئے لکھنے والوں کو متاثر کیا۔ "سیارہ" کے مستقل قلم کاروں میں عبدالماجد دریا آبادی' ماہر القادری' ادیب سہارن پوری' اسرار احمد سہاروی' احسان دانش' عبدالعزیز خالد' فضل من اللہ' ابوالمعانی' آغا صادق' رفیع الدین ہاشمی' خورشید رضوی' عبدالصمد صارم کے نام اہم ہیں۔ "سیارہ" نے ادب کو معمول کے مطابق متاثر کرنے کی

کوشش کی اس کی ایک غیر معمولی اشاعت "عبدالعزیز خالد نمبر" کی صورت میں سامنے آئی۔ اس نمبر کی ترتیب میں برصغیر کے اہم ترین ادبا نے شرکت کی اور خالد کو خراج تحسین پیش کیا۔ شخصی زاویے سے اتنا ضخیم نمبر اردو میں اس سے قبل کبھی شائع نہیں ہوا اس کے بعد "سیارہ" قدرے بے قاعدہ ہو گیا۔ اس کے بطن سے "سیارہ ڈائجسٹ" طلوع ہوا جو ایک تجارتی پرچہ تھا۔

"سیارہ" کا دوسرا دور جون ۱۹۷۶ء میں شروع ہوا، اس کی مجلس ادارت میں نعیم صدیقی، پروفیسر فروغ احمد، فضل من اللہ، طاہر شادانی اور حفیظ الرحمٰن احسن کے نام شامل تھے اور اب اسے "سہ ماہی اشاعت خاص" کی حیثیت دے دی گئی تھی، مدیر انتظامی فضل من اللہ صاحب نے لکھا۔

"جون ۱۹۷۶ء۔ سیارہ" کے نئے درخشاں دور کا آغاز، نیا نظام ادارت، نئے انتظامات، نیا عزم، نئی امنگیں ۔۔ اور درمیان میں سات سونے سال .... ایسا لگتا ہے کہ خود پر اصحاب کہف والی واردات گزر گئی ہے۔ دنیا بدل چکی ہے ... لیکن ایک بات جو ہمت اور حوصلہ دیتی ہے وہ ہے ہمارا مقصد، ادب میں فلاحی اور تعمیری اقدار کو ابھارنا" (۲۹)

محدود ضخامت کی ماہانہ اشاعتوں کے برعکس ضخیم سہ ماہی اشاعتوں کا یہ سلسلہ اس لئے کامیاب نظر آتا ہے کہ گذشتہ بارہ سال کے عرصے میں "سیارہ" نے اپنے موقف کو توازن و اعتدال سے پیش کیا ہے اور ۲۷ خاص نمبروں میں ایسے فکری اور نظری مباحث ابھارے جو عام اشاعتوں میں سما نہیں سکتے تھے "سیارہ" کی اشاعت کا وقفہ اگرچہ غیر معین ہے۔ تاہم اس کی بے قاعدہ اشاعت نے بھی باقاعدہ رسالے کا سماں قائم رکھا اور "محفل غائبانہ" میں مباحث کے سلسلے کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ اس تمام عرصے میں "سیارہ" میں ایک انتظامی تبدیلی ۱۹۸۴ء کے اواخر میں آئی اور وہ یہ تھی کہ فضل من اللہ "سیارہ" سے الگ ہو گئے اور "سیارہ" کے انتظامی امور حفیظ الرحمٰن احسن نے سنبھال لئے۔ اس تبدیلی کے باوجود "سیارہ" کا بنیادی مزاج تو قائم رہا لیکن ادبی لحاظ سے اس میں خاصی وسعت پیدا ہو گئی اور اس میں ایسے مضامین کو بھی جگہ ملنے لگی جن سے مباحث کو طغیانی صورت مل جاتی تھی اور مرنجاں مرنج اور معتدل مزاج "سیارہ" موضع گفتگو بن جاتا تھا۔

"سیارہ" کی ایک اہم عطا یہ ہے کہ اس نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکری جہت کو ادبی زاویوں سے آشکار کیا، مولانا مرحوم کی ادبی حیثیت ان کی مذہبی سیاسی اور تبلیغی سرگرمیوں میں دب گئی تھی، "سیارہ" نے ان کی دینی خدمات کے ساتھ ساتھ ادبی خدمات کا اثبات اہل قلم سے کرایا اس ضمن میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا مقالہ "مولانا مودودی کا اسلوب" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا "مولانا مودودی، مصنف اور مضمون نگار"۔ ابوالخیر کشفی کا "مولانا کی ادبی حیثیت" ڈاکٹر سید محمد یوسف کا "مولانا بحیثیت ایک ادیب" اسلم کاشمیری کا "مولانا ایک عظیم انشا پرداز" سلطان احمد اصلاحی کا "مولانا

کی نثر نگاری" اسرار احمد سہاروی کا "مولانا کا طرز نگارش" اور میرزا ادیب، حسین علی امام، حفیظ الرحمٰن احسن، فروغ احمد، اسعد گیلانی، اور ڈاکٹر احمد سجاد کے مقالات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ مولانا مودودی پر "سیارہ" کی خاص اشاعت اور متعدد اشاعتوں میں ان پر گوشوں کی ترتیب اس رسالے کا ایک منفرد اور قابل فخر کارنامہ ہے۔

"سیارہ" کا دوسرا اہم موضوع اقبالیات ہے۔ "سیارہ" نے دوسرے دور میں ستّر سے زائد مضامین اس سلسلے میں شائع کئے اور مطالعہ اقبال کے متعدد گوشوں کو منور کیا۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا مقالہ "اقبال اور جستجوئے گل" ڈاکٹر معین الدین عقیل کا "دنیائے اسلام میں اشتراکیت کا مسئلہ اور اقبال" مولانا اسعد گیلانی کا "اقبال مرد مومن اور مودودی کا مرد صالح" نظیر صدیقی کا "اقبال کی تجلیل" ڈاکٹر خیرات ابن رسا کا "مطالعہ سائنس اور اقبال" حسین احمد پراچہ کا "اقبال اور علم کلام" ماہر القادری کا "اقبال کی نثر نگاری" ڈاکٹر وزیر آغا کا "اقبال اور اردو" ڈاکٹر انور محمود خالد کا "تصویر درد کا فکری و فنی تجزیہ" ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا "اقبال کا ادبی مقام" مرزا محمد منور کا "رگ مجازی اور اقبال" اور رفیع الدین ہاشمی کا "قائد اعظم اور اقبال" چند ایسے مقالات ہیں جن سے اقبال کی متعدد نئی ابعاد "سیارہ" نے روشن کیں۔

"سیارہ" کے پیش نظر چونکہ تعمیر فکر اور فلاح معاشرہ کے اہم مقاصد تھے، اس لئے نعیم صدیقی اپنے ادارتی مضامین ادبی اور سماجی معاشرے کے معائب کو بالخصوص دردمندانہ انداز میں موضوع گفتگو بناتے، اور ان تمام اندیشوں کا جوہر پیش کر دیتے جو حالات و واقعات و تخلیقات ان پر آشکار کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کی قدروں کو حسن انسانیت سے وابستہ کیا اور عمل صالح سے ابدیت کا راستہ دکھانے کی کوشش کی۔ ادب میں فحاشی، اور بے راہ روی کو انہوں نے کبھی قبول نہیں کیا، لفظ کی حرمت کو قائم رکھنے کی تلقین کی اور حسین خیال کے لئے اعلیٰ اسلوب اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ نعیم صدیقی صاحب کی سوچ کا زاویہ مستقیم ہے لیکن خود سر معاشرے نے ان کی اقدار پسندی کو مرغوب نظروں سے نہیں دیکھا، چنانچہ ان کے ادارئیے تنقید و تبصرہ کی منفی زد میں لئے جاتے اور اکثر اوقات نعیم صدیقی صاحب کی کردار شکنی کا محل بھی پیدا کر لیا جاتا لیکن "سیارہ" چونکہ مقصدی پرچہ ہے اس لئے یہ اپنی روش پر استقامت سے چل رہا ہے۔ حفیظ الرحمٰن احسن نے "سیارہ" کو شدید رد عمل کا راستہ دکھایا۔ "ادب اور جعلی ذہنی وارداتیں" از نعیم صدیقی "انجمن ترقی پسند مصنفین کی اسلام بیزاری اور اخلاق دشمنی" از ابو فیصل "فیض کی شاعری کے چند پہلو" از رشید حسن خان "اردو تنقید اور ترقی پسند تحریک" از ڈاکٹر ملک حسن اختر اور "اردو ادب میں مشرق کی بازیافت" از ڈاکٹر عبدالمغنی جیسے مقالات کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے، جن میں استدلال با معنی لیکن اظہار جوئے تیز رو کا منظر پیش

کرتا ہے۔ "سیارہ" نے اب اس قسم کے مقالات کے لئے " آئینہ خانہ " کا عنوان اختیار کر لیا ہے۔

" سیارہ " نے اجتماعی سوچ ابھارنے اور فکر و خیال کو متنوع زاویوں سے اجاگر کرنے کے لئے ادبی مذاکروں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ چنانچہ " ادب اور فحاشی " کے موضوع پر مذاکرے میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، نعیم صدیقی، پاشا رحمن، فضل من اللہ اور انور سدید نے حصہ لیا۔ " زبان میں محاورے کی اہمیت " میں مسعود حسین خان، رشید حسن خان اور امیر اللہ شاہین کے نام نمایاں ہیں، ادبا کے لئے مخصوص گوشوں کی اشاعت میں " سیارہ " پیش پیش نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، محمد طفیل، حمید احمد خان، فضل من اللہ، نسیم حجازی، حفیظ جالندھری، ماہر القادری اور فاخر ہریانوی کے گوشوں میں بہت سا سوانحی اور تنقیدی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مصنف کے خطوط کا عکس پیش کرنے کا زاویہ بھی " سیارہ " نے اختیار کر رکھا ہے۔

تخلیقی اصناف ادب میں سے " سیارہ " نے نظم، غزل، افسانہ، انشائیہ، سفر نامہ اور تنقید کی نمائندگی کا پورا حق ادا کیا ہے۔ حمد و نعت کے فروغ میں " سیارہ " نے دوسرے تمام ادبی رسائل سے زیادہ خدمات سرانجام دی ہیں، اس صنف کو " سیارہ " نے اپنے دور اول میں ہی ترویج دینا شروع کر دیا تھا۔ بہت سے رسائل نے اسے ہنگامی ضرورت کے تحت قبول کیا لیکن " سیارہ " کے لئے حمد و نعت کی اشاعت اس کی ایمانیات کا جزو ہے۔ اردو نعت نگاروں کا ایک وسیع حلقہ " سیارہ " کے صفحات سے ابھرا ہے۔ اسی طرح " سیارہ " کے مضمون نگاروں اور قلم کاروں کا بھی ایک مخصوص حلقہ موجود ہے اور اس میں ڈاکٹر عبدالمغنی، آباد شاہ پوری، ماہر القادری، اسرار احمد سہاوری، مولانا فضل معبود، ابن فرید، احمد سجاد، مظہر معین، ڈاکٹر صدر الحق، ڈاکٹر انور محمود خالد، تحسین فراقی، رفیع الدین ہاشمی، عبدالغنی فاروق، غلام حسین اظہر، گوہر ملسیانی، رؤف انجم، پروفیسر خورشید احمد، محمود فاروقی، محمد عبداللہ قریشی، ڈاکٹر محمد ریاض، وارث سرہندی، آسی ضیائی، جعفر بلوچ، مسعود جاوید، رشید حسن خان، جیسے نامور ادبا شامل ہیں۔

" سیارہ " ایک مخصوص مزاج کا نظریاتی ادبی جریدہ ہے اور ادب کے وسیلے سے یہ انسانی ذہن کو مثبت قدروں کی طرف مائل کرنے میں کوشاں ہے۔

" آرگس " لاہور

دو ماہی " آرگس " لاہور سے جون جولائی ۱۹۶۲ء میں عزیز جاوید کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس کے معاونین میں محمد آصف اور امان عاصم شامل تھے، اشاعتی ادارہ مکتبہ ادب جدید لاہور اس کے

مالی اور انتظامی امور کا نگران تھا ۔ اداریہ " نقش عطارد " میں اجرا کے محرکات میں بنیادی اہمیت اس بات کو دی گئی ہے کہ خالصتا " علمی اور ادبی جرائد کی ملک میں کمی ہے اور علمی اور ادبی جرائد کہلانے والے رسائل کے بارے میں بے اطمینانی کا احساس موجود ہے ۔ " آرگس " نے عام جرائد سے الگ اپنا ایک جاندار اور صحت مند مکتب خیال ' تشکیل دینے کا ارادہ کیا اور لکھا کہ ہم ان کے ذہنی تلازمے خود پیدا کریں گے جو کسی مکتب خیال طبقے ' ملک یا قوم یا دور تک محدود نہیں ہوں گے ۔ دور رس اعتبار سے " آرگس " کی حیثیت ہمارے نزدیک ایک علامت کی ہے جو اساطیر میں سے گزرتی ہوئی ہیئت تک پہنچتی ہے ۔ (۳۰) " آرگس " نے اپنی حیات مختصر میں ان آرزوں کو تکمیل تک پہنچانے کی مقدور بھر کوشش کی پہلے پرچے میں کہکشاں کے زیر عنوان اقتباسات " قصہ آدم " کے تحت افسانے "ماہ نجم" کے تحت غزلیات "زرگل" کے تحت مباحثے "رہ آورد" کے تحت شخصیات "گردش رنگ" کے تحت نظمیں "پر تو مہتاب" کے تحت تراجم "استبصار" کے تحت تنقیدی مضامین "سنگ زر" کے تحت تبصرے اور "عکس زہرہ" کے تحت فلموں کے بارے میں مضامین شائع کیے' اس پرچے میں جیلانی کامران' جبار توقیر' اصغر بٹ' مصطفیٰ زیدی' سیف الدین سیف' نظر زیدی' کاظم حسین شمس' اعجاز اکرم کی تخلیقات اور مضامین شامل کیے اور یہ سب جدیدیت کے زاویوں کو روشن کرتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "آرگس" کی پذیرائی خاطر خواہ نہیں ہوئی۔ چنانچہ دوسرے پرچے میں قارئین اور ادبا کے تغافل پر زہر خند ظاہر کیا گیا(۳۱) اور توجہ اور نوازش کی درخواست کی گئی' ایک اور پرچے میں رسالہ مانگ کر پڑھنے والوں کو آسکر وائلڈ کے الفاظ میں انتباہ کیا گیا کہ "مانگ کر پڑھنا لکھنے والوں کی توہین ہے۔ مانگ لینا چرالینے سے محفوظ سہی لیکن چرالینا مانگنے سے لطیف اور زیباتر ہے۔ مانگ کر پڑھنے والا ظالم' ڈاکو چور اور بھکاری نہ سہی لیکن ان سب کا ذلیل اور مکروہ ترین امتزاج ہوتا ہے" لیکن یہ انتباہ بھی بااثر نظر نہیں آتا۔

" آرگس " نے ۱۹۶۴ ء میں ایک ضخیم سالنامہ پیش کیا اور اس میں سابقہ سال کی پوری کارگزاری کا جائزہ لیا ۔ اس پرچے میں عزیز جاوید کا مقالہ " ادارت کے مسائل " اس جانکاہ مہم کی مختلف منازل آشکار کرتا ہے ' جو ایک مدیر کو سر کرنا پڑتی ہیں اور اسی میں " آرگس " کی شکست کی آواز بھی موجود ہے " آرگس " ضخامت اور طباعت کے لحاظ سے ایک وقیع ادبی پرچہ تھا ۔ اس کے مدیران جواں حوصلہ تھے لیکن انہیں ڈھنگ کے مضامین ' افسانے اور نظمیں دستیاب نہ ہو سکیں ۔ ممتاز ادباو شعرا کا تعاون بھی معمولی نظر آتا ہے ۔ نوجوان مدیران نے چند عمدہ تجربے کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن "آرگس" اپنا پائیدار نقش قائم نہ کر سکا۔

"تہذیب" الاخلاق لاہور

آزادی کے بعد سر سید احمد خان کے افکار و نظریات کے فروغ کے لیے لاہور میں "تہذیب الاخلاق" ٹرسٹ قائم ہوا تو اس کے ٹرسٹیوں نے رسالہ "تہذیب الاخلاق" کی تجدید اشاعت بھی کی۔ لاہور سے اس کی ابتدا ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ عشرت رحمانی ایک طویل عرصے سے اس تہذیبی ماہنامے کی اعزازی ادارت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" کا مقصد ادب کے وسیلے سے خرد افروزی کی تحریک کو فروغ دینا اور قوم کی ذہنی نشوونما صحت مند خطوط پر استوار کرنا ہے۔ اس پرچے میں مسلمانوں کے قومی اور تہذیبی مسائل کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ علی گڑھ تحریک کی شخصیات اور ان کے کارناموں کو تابندگی عطا کرنا اس ماہنامے کا ایک بنیادی مقصد ہے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی آواز اس ماہنامے سے سنائی دیتی ہے۔ "تہذیب الاخلاق" کے لکھنے والوں میں سید محمد حامد، ممتاز حسین جون پوری، مصطفٰے علی بریلوی، جمال میاں فرنگی محلی، سید سلیمان ندوی، اثر لکھنوی اور علی گڑھ تحریک کے متعدد دوسرے ہمنوا مختلف ادوار میں شامل ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" اگرچہ اپنے معینہ خطوط پر کام کر رہا ہے لیکن اب اس کی عوامی اپیل مؤثر نظر نہیں آتی۔ "تہذیب الاخلاق" کی اشاعت ٹرسٹ کے ضابطے کی کارروائی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر پرانے مضامین کی مکرر اشاعت تبرک کے طور پر ہوتی رہتی ہے۔

"فنون" ۔ لاہور

جناب احمد ندیم قاسمی اور حبیب اشعر کی ادارت میں ۱۹۶۳ء کے اوائل میں "معیاری علم و فن کی تخلیقی رفتار کا پیمانہ" سہ ماہی "فنون" لاہور سے جاری ہوا تو یہ ایک بڑا اور اہم ادبی واقعہ تھا۔ "حرف اول" میں "فنون" کے مدیر جناب احمد ندیم قاسمی نے فرمایا کہ وہ پاکستان کے ادبی رسالوں کی فہرست میں ایک اور رسالے کا اضافہ اس لئے کر رہے ہیں کیوں کہ "ایسا کرنے کو جی چاہا تھا"۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ "ان کے رسالے میں کوئی خاص بات نہیں، نہ وہ قارئین پر کوئی احسان دھر رہے ہیں" (۳۲) لیکن حقیقت یہ ہے کہ "فنون" کی ابتدائی چند اشاعتوں نے ہی ادبا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور چار دانگ پاکستان میں قاسمی صاحب کا سکہ بطور مدیر "فنون" بیٹھ گیا۔ "فنون" کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ صرف ادب کی اشاعت کے لئے مخصوص نہیں تھا۔ اس دور میں خالص ادب کے

رسائل میں "ادبی دنیا" "نیا دور" اور "نقوش" شامل تھے۔ "فنون" نے دیگر "فنون لطیفہ" مثلاً مصوری، خطاطی، موسیقی، اور فوٹو گرافی اور فلم تک کو اپنے دائرہ اشاعت میں شامل کر لیا اور ان موضوعات پر عبدالرحمن چغتائی، احمد علی خان، افض پرویز، عنایت الٰہی ملک اور یوسف سدیدی کے مضامین پیش کئے، مظفر علی سید کا "نئی تنقید اور آدھا آدمی" اور فتح محمد ملک کا "نئی شاعری اور جدید شاعری" نے بے حد خیال انگیز مضامین لکھے، تاہم "فنون" میں جس مضمون نے سب سے زیادہ توجہ کھینچی اس کا عنوان تھا "خدا"۔۔۔ اس میں ابوالخیر مودودی نے ضمیر انسانی کا تجزیہ کیا تھا اور انسان کو اس وجود کے بارے میں احساس دلایا تھا جو لا وجود ہے لیکن ہر انسان کے دل میں کسی نہ کسی طرح موجود ہے۔(۳۳) تحقیق کے زاویے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے "غالب کے غیر مطبوعہ خطوط" کے حوالے سے ایک گراں قدر مقالہ لکھا۔ ایک اور نادر چیز حافظ محمود شیرانی کا ایک مکتوب تھا جس میں نصف صدی پہلے کے لندن پر نظر ڈالی گئی ہے۔

"فنون" کے پہلے پرچے میں راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ "جوگیا" عصمت چغتائی کا "بھیڑیں" اور انور کا "زمین کے نیچے" سب اول درجے کے افسانے تھے اور یہ "فنون" کو اس لئے حاصل ہو گئے کیوں کہ اس کے مدیر ادب کے ممتاز، کہنہ مشق اور نامور صحافی احمد ندیم قاسمی تھے۔ محمد خالد اختر کا معرکہ آرا سفرنامہ "کاغانی مہم" کی پہلی قسط بھی اسی پرچے میں شائع ہوئی۔ شعرا میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، مجید امجد، اختر انصاری، مختار صدیقی، وزیر آغا، احمد ظفر، فارغ بخاری اور ظہور نظر نے شرکت کی اور اپنی تخلیقات سے "فنون" کو چار چاند لگا دئے۔

"فنون" کے پہلے پرچے نے اس کو جو شہرت عطا کی تھی وہ دوسرے پرچے میں سید وقار عظیم کا مقالہ "کہانی کی منطق" ڈاکٹر وزیر آغا کا "مجروح انا کا سفر" ممتاز حسین کا "جدید شاعری کے جمالیاتی اصول" شمیم احمد کا "تعصب اور تہذیب" اور ممتاز شیریں کے مضمون "پاسترناک۔۔۔ ہیرو بطور ادیب" سے مزید مستحکم ہو گئی۔ اس پرچے میں راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ "چلتے پھرتے چہرے" کرشن چندر کا "بڑا آدمی" انور عظیم کا "درد کا ساحل کوئی نہیں" عزیز اثری کا "کمینہ" محمد خالد اختر کا سفرنامہ "کاغانی مہم" شاکر علی کا مقالہ "جدید مصوری کے رجحانات" عنایت اللہ ملک کا "کلاسیکی موسیقی اور نئی قدریں" نے بھی اس پرچے کی ادبی اور فنی عظمت میں اضافہ کیا۔ کرشن چندر کا انٹرویو اور رینے گینوں کی کتاب "مقدس علم کی بنیادیں" پر محمد حسن عسکری کا تبصرہ "فنون" کو مزید تابانی عطا کرتا ہے۔ "دشت وفا" پر مکین احسن کلیم کے تبصرے کو بھی "فنون" کی خاص چیز شمار کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا تاثر "فنون کا پہلا پرچہ" ایک ایسا تجزیاتی مطالعہ ہے جسے "فنون" کی کامیابی کا ثبوت اور مستقبل کا جہت نما شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان کا ارشاد تھا کہ:

"مدت کے بعد اردو کا ایک پورا رسالہ دیکھنے میں آیا... یوں ملک میں بلند پایہ رسالے اور بھی ہیں، ان کو بھی پڑھ کر بڑا اطمینان ہوتا ہے۔ مگر "فنون" رنگ و بوئے دیگر رکھتا ہے" (۳۴)

"فنون" کی امتیازی شان یہ بھی ہے کہ اس میں مخدوم محی الدین، اختر الایمان، اختر انصاری دہلوی، شاذ تمکنت، راجندر سنگھ بیدی، فراق، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، انور عظیم، امر سنگھ، اقبال متین، بلونت سنگھ، اور مغیب الرحمٰن جیسے ممتاز اور نامور ہندوستانی ادیبوں نے اپنی تازہ ترین تخلیقات سے شرکت کی ہے اور حرف اول میں اس بات پر فخر کا اظہار کیا گیا کہ:

"ہندوستان کے بڑے بڑے اردو ادبا، شعرا کا جو اجتماع "فنون" میں ملتا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے دستیاب ہو سکے گی" (۳۵)

اور "فنون" نے اپنے اس کرب کا اظہار بھی کیا کہ "پاکستانی ادیبوں کو کیا ہو گیا ہے؟... انہوں نے افسانہ نگاری چھوڑ کر ان دنوں کون سا شغل اختیار کر لیا ہے؟ اور اگر وہ آج بھی افسانے ہی لکھتے ہیں تو وہ کہاں شائع ہوتے ہیں؟ ہم تمام معیاری ادبی رسائل کے مجموعی مندرجات کو سامنے رکھ کر عرض کر رہے ہیں کہ پاکستان کے افسانہ نگاروں پر نہایت خوف ناک جمود طاری ہے"۔۔۔ "فنون" کی یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی۔ چنانچہ "فنون" کے شمارہ خاص نمبر ۲ جولائی ۶۳ء میں صرف دو پاکستانی افسانہ نگاروں (عزیز اثری کا افسانہ "کمینہ" اور زین العابدین کا "دھرتی کا گھاؤ") کی تخلیقات شائع ہوئی تھیں، لیکن فروری مارچ ۱۹۶۶ء میں اشاعت خاص نمبر ۴ چھپی تو اس میں گیارہ افسانے "آخری خندق" از انتظار حسین، "رضائی" از مسعود مفتی، "ننھا مانجھی" از محمد خالد اختر، "دریچے کی صلیب" از ندرت الطاف، "ون اصغر مال" از منیر احمد شیخ، "پابہ زنجیر" از مسعود اشعر، "ایک محبت کی کہانی" از فہمیدہ ریاض، "اکھاڑا" از عباس رضوی، "تتلی" از کمال مصطفےٰ، "آدھی رات" از فرخندہ لودھی، "نئی نسل" از منصور قیصر، اور "ماں اور بیٹی" از ہارون جمال شامل تھے اور یہ سب پاکستانی افسانہ نگاروں کی تحریریں تھیں۔

۱۹۶۶ء میں "فنون" نے اہل قلم کو بانداز دگر متعارف کرانے کے لئے ان کے فن پر مختصر تعارفی مضامین کے ساتھ ان کی متعدد تخلیقات پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ادبا کے شخصی تعارف کے لئے تصویروں کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ابتدا میں فہمیدہ ریاض پر محمد خالد اختر نے، کشور ناہید پر شہزاد احمد نے، اور ادا جعفری پر قاضی عبدالغفار کے مضامین شائع کئے گئے، ان سب کی تصویروں نے بھی ان کے تعارف و شناخت میں لطافت پیدا کی۔ شہزاد احمد نے لکھا تھا کہ "عورت جب فنکار بنتی ہے تو اپنے عورت پن کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے" (۳۶) کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض اس وقت نوعمر شاعرات تھیں، ان کے نئے لہجے نے "فنون" کے قارئین کو چونکا دیا۔ عورت فنکار بن چکی تھی اور کہہ

رہی تھی:

ہر مرحلے پہ شوق' تماشائی چاہیے' ہے---- عشق نمود پیشہ بھی رسوائی چاہیے' ہے

(کشور ناہید)

مری چنبیلی کی نرم خوشبو
ہوا کے دھارے پہ بہہ رہی ہے
ہوا کے ہاتھوں میں کھیلتی ہے
ترا بدن ڈھونڈنے چلی ہے

(فہمیدہ ریاض)

"فنون" نے انہیں عنفوان نمود پر ہی بام شہرت پر پہنچا دیا تھا۔ "فنون" کا پہلا تعارفی پرچہ بڑے اور نامور ادبا کی تخلیقات سے مزین تھا۔ لیکن آئندہ اشاعتوں میں آہستہ آہستہ نئے ستارے بھی طلوع ہوتے نظر آتے ہیں' اس ضمن میں امجد اسلام امجد' فہمیدہ ریاض' خالد طور' صفدر شفق' احمد وحید اختر' سعد شمیم' ذکاء الرحمن' فاضل رشیدی' فہیم جوزی' خالد شیرازی' خالد احمد' یعقوب ناسک' لیلیٰ عطاء اللہ' سعیدہ احسان' شمع پرویز' نگہت مرزا' عرفانہ عزیز' عزیزہ بیگم وغیرہ متعدد نئے نام "فنون" کے صفحات سے ابھرے۔ ان میں سے بعض نے ادب سے شرط وفا پوری نہیں کی اور بہت جلد زندگی کے مادی اندھیروں میں کھو گئے لیکن "فنون" کی اس عطا سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے ان ادبا کی انگلی ان کی تخلیقی زندگی کے ابتدائی دور میں پکڑی تھی۔

"فنون" کو ابتدائی مراحل پر ہی جو پذیرائی ملی وہ بے حد حوصلہ افزا تھی' اسے لکھنے والوں کے علاوہ پڑھنے والوں کی سرپرستی بھی ملی' اس کی ادارت احمد ندیم قاسمی جیسی شخصیت کے ہاتھ میں تھی جنہیں رسالہ "پھول" "تہذیب نسواں" "ادب لطیف" "سحر" "نقوش"۔ "امروز" اور "سویرا" کی ترتیب و تدوین اور حسن و زیبائش کا تجربہ تھا۔ تاہم "فنون" چوں کہ ان کا ذاتی رسالہ تھا اس لئے اس کے انتظامی امور کی نگہداشت بھی انہیں کا فریضہ تھا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی چند اشاعتوں کے بعد "فنون" تاخیر اشاعت کا شکار ہو گیا اور قلمی معاونین کو یہ شکایت ہوئی کہ ان کے مضامین نظم و نثر دیر سے چھپتے ہیں۔ شمارہ خاص نمبر ۷ (دسمبر ۱۹۶۶ء) کے حرف اول میں اس طرف یوں اشارہ کیا گیا۔

"آج کے زمانے میں ادبی رسالے کے قاری کو پڑھنے کے لئے رسالہ چاہئے اور بروقت چاہئے اس سے زیادہ اسے رسالے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی" (۳۷) اور "فنون" نے اپنے قارئین سے وعدہ کیا کہ:

"فنون" کی سہ ماہی اشاعتوں میں آئندہ ہر قیمت پر باقاعدگی پیدا کی جائے گی اور اگر ہماری یہ

کوشش ناکام رہی تو ہم " فنون " کو بند کر دینے کے اعلان میں کوئی جھجک محسوس نہیں کریں گے"(۳۸)

قارئین کے رویے سے قطع نظر "فنون" کو تاخیر اشاعت کے باعث نہ لکھنے والوں کے ہدف طعن کا شکار ہونا پڑا۔ چنانچہ " حرف اول " میں لکھا گیا کہ اکا دکا ایسے اصحاب بھی ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقات کی اشاعت میں تاخیر سے خفا ہو کر " فنون " کو باقاعدہ ہدف طعن بھی بنایا ہے ... ظاہر ہے کہ جب کوئی ادیب کسی کو برا بھلا کہتا ہے تو اسکے پاس اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہو گی۔ چاہے یہ وجہ ذاتی ہی ہو۔ ہم ادیب کی "ذاتی وجہ " کا بھی احترام کرتے ہیں ' اس لئے کہ وہ ادیب ہے اور اس کے ہاتھ میں قلم جیسی مقدس امانت ہے ' جسے کما حقہ ' استعمال کرنے کا سلیقہ تھوڑی سی ریاضت کے بعد ہی آتا ہے"(۳۹)

لکھنے والوں کے اس منفی رویے کی زد میں "فنون" کا ایک بے حد مفید اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کا کالم " ہمارے شاعر " آگیا " فنون " نے لکھا کہ:

" افسوس کہ خود بعض شعرا میں یہ سلسلہ خاصہ غیر مقبول ہوا... "ہمارے شاعر" کے اس سلسلے پر بعض ایسے اعتراضات عائد کرنا مناسب سمجھا گیا جن سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ گروہ بندی کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے... سو اس اشاعت سے یہ سلسلہ ختم سمجھئے... ہم معترف ہیں کہ "فنون" نے اس ضمن میں خود فن کاروں سے شکست کھائی ہے"(۴۰)

تاہم خوش آئند بات یہ ہے کہ "فنون" نے اس اچھے سلسلے کو کلیتہً بند نہیں کیا اور بعد میں نئے رنگ و روپ میں اس سلسلے کی تجدید و توسیع بھی کی۔ چنانچہ حالیہ دور میں " فنون " نے جن لکھنے والوں کے فن کا اعتراف فراواں ' ان کی متعدد تخلیقات کو ایک ہی اشاعت میں نمایاں طور پر پیش کر کے کیا ان میں شفیق سلیمی (۸ غزلیں)۔ صفدر سلیم سیال (۴ غزلیں) پروین شاکر (۱۲ غزلیں)۔ شہناز پروین سحر (۴ غزلیں)۔ شبنم شکیل (۴ غزلیں) ثمینہ راجہ (۶ نظمیں) نگہت یاسمین گل (۴ غزلیں) شاہدہ تبسم (۸ غزلیں) اور ایوب خاور (۶ غزلیں) چند اہم نام ہیں۔ اردو شاعری کے فروغ اور شعرا کے تعارف میں اتنی دلچسپی اردو کے کسی دوسرے ادبی رسالے نے نہیں لی۔ " فنون " کی یہ خدمات لازوال ہیں۔

" فنون " کی ابتدائی اشاعتوں پر واقعی تخلیقی رفتار کے پیمانے کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن مئی جون ۱۹۶۷ء میں قارئین کے رد عمل کو بھی اہمیت دی گئی اور گزشتہ اشاعتوں پر قارئین کے خطوط پر مبنی "اختلافات" کا باب جاری کیا گیا۔ اس میں جابر علی سید' خالد احمد اور زاہد فارانی کے خطوط شائع کئے گئے۔ بعد میں اس حصہ کی اہمیت بڑھتی گئی' خطوط لکھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا (شمارہ نومبر

دسمبر ۱۹۸۷ میں سید علی عباس جلال پوری، محمد ارشاد، آصف ثاقب، ڈاکٹر صابر آفاقی، احمد لطیف، تصدق شعار، عارف محمود، خیر الدین انصاری، ارشاد متین اور رانا غلام شبیر کے ۱۰ خطوط شریک اشاعت ہیں اور یہ حصہ بارہ صفحات پر محیط ہے)۔ "فنون" نے اس حصے میں طغیانی مباحث پیدا کیے، تاثراتی آرا کو اہمیت دی، اور بعض اوقات بحث کو سلسلہ در سلسلہ آگے بڑھانے میں بھی گراں قدر کاوش کی، تاہم اس حصے میں بعض آرا کی نوعیت ہنگامی، قدرے جراحت آمیز اور خالصتہ" ذاتی تھی۔ اس سے لکھنے والوں کی تلخ مزاجی بھی آشکار ہوتی تھی لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ "فنون" کا اختلافات کا حصہ سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے اور اس حصے سے شریف الدین اشرف، حبیب اسد علی اور امتیاز علی خان (شارجہ) جیسے مکتوب نگار ابھرے جو خالصتاً "فنون" کی پیداوار تھے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ "فنون" نے ادب کو ساکن سمندر کی طرح قبول نہیں کیا بلکہ اس سمندر کی طغیانی موجوں کو سطح پر نمودار کرنے میں زیادہ دلچسپی لی اور پھر تلاطم کا منظر بھی پیدا کیا ہے۔ یہ تلاطم کبھی "اختلافات" کے حصے میں رونما ہوتا اور کبھی مفصل مضامین کی صورت میں سامنے آتا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ "اردو شاعری پر ایک اور نظر" "ہمارے ادب کا نیا دور" از ڈاکٹر وحید قریشی "میرا جی۔ ویشنومت اور دھرتی پوجا" از عمیق حنفی، "اقبال کا علم کلام ایک تجزیہ" از بشیر احمد ڈار، "تنقیحات و تصریحات" از سید علی عباس جلال پوری "اردو انشائیہ کے خدو خال" از مشکور حسین یاد "اہل تحقیق کی واماندگیاں" از رشید ملک "سائنس اور سائیکی" از شہزاد احمد "روایت اور جدیدیت" از محمد ارشاد "شاعری کا ابتدائی سبق" از شمس الرحمن فاروقی "موتین انشائیہ اور اردو انشائیہ نگار" از محمد ارشاد "شعری تجربہ اشاریت و معنویت" از قاضی عبدالقادر محض چند عنوانات ہیں جو یہاں بطور مثال پیش ہیں۔

"فنون" خاص نمبروں کا پرچہ ہے۔ اس کی ضخیم اشاعتیں اگرچہ معینہ وقت پر شائع نہیں ہوتیں لیکن اسے ادبی دنیا میں وقار اور احترام حاصل ہے۔ اس کا ایک مخصوص ترقی پسندانہ نظریہ اور واضح تشخص ہے۔ نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں "فنون" نے ماہانہ ادبی جریدے کی صورت اختیار کرنے اور پابندی وقت سے شائع ہونے کی نوید دی۔ مختصر ضخامت میں اس کا پہلا پرچہ فروری ۱۹۷۰ء میں منظر عام پر آیا لیکن اب بھی اس کا مزاج سابقہ سہ ماہی اشاعتوں سے مختلف نہیں تھا۔ اس عرصے میں "فنون" کے شریک مدیر حبیب اشعر علم و ادب کی شاندار خدمات سرانجام دینے اور اپنی شرافت اور عظمت کا ایک سچا اور بے داغ نقش قائم کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مدیر "فنون" نے حبیب اشعر کی رحلت کو ذاتی اور قومی حادثہ قرار دیا اور جون ۱۹۷۱ء میں حکومت سے ان کے پسماندگان کے لئے وظیفے کی درخواست کی۔ اب "فنون" پر صرف احمد ندیم قاسمی صاحب کا نام چھپنے

لگا۔ اس عرصے میں فکر و خیال کو متحرک کرنے کے لئے موضوعاتی مباحث کا سلسلہ شروع کیا گیا اور اس میں نوجوان اذہان کی شرکت سے بحث کو تازہ خطوط پر استوار کیا گیا۔ "فنون" میں اس سلسلے کے جن مباحث نے زیادہ توجہ کھینچی ان میں ادیبوں کے مسائل "شاعری اور عصری تقاضے" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اسے شمیم نوید نے بطور مرتب ایک طویل عرصے تک جاری رکھا۔ ایک اور بحث سید علی عباس جلال پوری کی معرکہ آرا کتاب "روح عصر" پر جاری ہوئی اور اس میں انور سدید کو ایک فریق کی حیثیت حاصل رہی۔ "ارضی تہذیب" کے موضوع پر سلیم احمد کے مقالے نے بھی ایک اور بحث کو ہوا دی جس میں مشتاق قمر کی شرکت نے معنی کے نئے زاویے پیدا کر دیئے۔ "فنون" کی ماہانہ اشاعتوں میں نظموں، غزلوں، افسانوں، طنز و مزاح، تبصروں اور مقالات کا حصہ بھی توجہ کھینچتا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماہانہ اشاعتوں کا تجربہ کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء میں دو ماہی اشاعتوں کا اور کچھ عرصہ کے بعد سابقہ انداز کے خاص نمبروں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اشاعت میں جتنی تاخیر ہوتی "فنون" کی ضخامت اتنی ہی بڑھ جاتی اور اب مدیر "فنون" کی خواہش اور کوشش کے باوجود بمشکل سال میں "فنون" کے دو پرچے چھپتے ہیں اور اکثر اوقات تو قارئین کو صرف ایک سالانہ نمبر پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۷ء میں "فنون" کا صرف ایک ایک پرچہ منظر عام پر آیا۔

"فنون" نے خاص اشاعتوں کے ذریعے اردو ادب کو ہزاروں صفحات پر مشتمل تخلیقی اور تنقیدی ادب عطا کیا ہے۔ "جدید غزل نمبر" (۱۹۶۹ء) اس کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے مدتوں یاد رکھا جائے گا اور واقعہ یہ ہے کہ اتنا ضخیم غزل نمبر اردو ادب میں پہلے کبھی شائع نہیں ہوا۔ یہ غزل نمبر علامہ اقبال سے لے کر اعجاز گل تک کم و بیش اس صدی کے ستر سال کا احاطہ کرتا ہے اور اس میں سوا دو سو سے زائد شعرا کی غزلیات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ بیشتر شعرا کی دس دس غزلیں اور کچھ شعرا کی پانچ یا پانچ سے زیادہ غزلیں اس نمبر میں شامل کی گئیں اور تعداد کی کمی بیشی کے باوجود یہ التزام برتا گیا کہ شاعر کا پورا اسلوب نگارش اور فنی حسن نکھر کر سامنے آ جائے، جدید اردو غزل اور غزل گو شعرا پر ۲۶ نئے مقالات لکھوائے گئے اور متعدد شعرا کے حالات حیات پیش کئے گئے، غزل نمبر کے مقالات فن میں غزل کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا اور ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز غزل نگاروں کے فن کا جائزہ لیا گیا اس ضمن میں سید احتشام حسین کا مقالہ "جدید غزل۔ چند اشارے" ڈاکٹر حنیف فوق اور آغا سہیل کے طویل جائزے خیال انگیز اور خیال افروز تھے۔ فراق صاحب نے حفیظ جالندھری کی غزل کا، محمد حسن عسکری نے فراق کا، ظہیر فتح پوری نے یگانہ کا، مظفر علی سید نے حفیظ ہوشیار پوری کا، مختار صدیقی نے شہزاد احمد کی غزل کا خصوصی مطالعہ مرتب کیا۔ اس نمبر کے بارے میں حمید

احمد خان نے مدیر " فنون " کو لکھا:

" آپ نے کس کس طرح " سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی " تب کہیں نئی غزل کی یہ رنگا رنگی اور نئی تنقید کی یہ دقیقہ سنجی صفحہ قرطاس پر جلوہ گر ہوئی ہوگی ۔ نئی غزلوں کا یہ عظیم الشان ذخیرہ ارباب ذوق کو برسوں تک دعوت نقد و تبصرہ دے گا ۔ سبحان اللہ " (۴۱)

اور واقعی اس غزل نمبر نے نقد و تبصرہ بانداز دگر پیدا کیا جس کی گونج اب تک سنی جا رہی ہے۔

"فنون" نے غزل نمبر کے علاوہ جو خاص اشاعتیں پیش کی ہیں' ان میں "اقبال نمبر" اور "خدیجہ مستور نمبر" کو بھی منفرد قرار دیا گیا ۔ "اقبال نمبر" میں مدیر "فنون" نے اقبالیات کی تنقید کے علاوہ اقبال کی زمینوں میں شعرا کو دعوت سخن بھی دی' یہی عمل انہوں نے "فنون" کے غالب ایڈیشن (۱۹۶۹ء) میں بھی آزمایا تھا' جو بہت مقبول ہوا۔

" فنون " تازہ ادبی تخلیقات کا رفتار پیا ہے۔ تاہم اس نے تحقیق کو پس پشت نہیں ڈالا اس ضمن میں ڈاکٹر سید معین الرحمن کا مقالہ "اردو کا پہلا افسانہ" محمد اکرام چغتائی کا "پنجاب میں اردو۔۔۔ مزید تحقیق" مکاتیب سر سید از قاضی فضل حق قرشی "ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری" از خورشید الاسلام کو مشتے نمونہ از خروارے سمجھئے "فنون" میں ممتاز افسانہ نگاروں مثلاً ممتاز شیریں' انور سجاد' اشفاق احمد' قراۃ العین حیدر اور چند دوسرے افسانہ نگاروں پر نذیر احمد کا سلسلہ مضامین بھی پسند کیا گیا۔ "فنون" کے صفحات سے مستنصر حسین تارڑ' محمد کاظم' عطاء الحق قاسمی اور حسین شاہد بطور سفر نامہ نگار نمایاں ہوئے' رشید ملک' محمد کاظم' امجد اسلام امجد کی رونمائی بطور مقالہ نگار ہوئی' محمد خالد اختر "فنون" کے اہم ترین مزاح نگار ہیں ان کی پر لطف تخلیقات کا بیشتر خزینہ "فنون" کے صفحات میں ہی محفوظ ہے۔ اردو ادب کے افق سے ٹوٹ جانے والے ستاروں کی روشنیاں جمع کرنے کے لئے "فنون" نے متعدد ادبا پر گوشے مخصوص کئے اور بہت سے لوگوں پر ان کی وفات کے بعد عقیدت کے پھول "حرف اول" میں نچھاور کئے۔ اس سے یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ جن ادبا کو "فنون" نے ان کی زندگی میں اپنے صفحات میں جگہ نہیں دی تھی ان پر وفات کے بعد تعریف و توصیف کا در کھول دیا اسی طرح "فنون" کے "حرف اول" پر اخبارات و رسائل میں تنقید و تبصرہ کا ایک نیا باب کھل جاتا اور ادب کا مطلع گرد آلود نظر آنے لگتا تھا۔

مجموعی اعتبار سے " فنون " نے اردو ادب کی قریباً سب اصناف کی بیش بہا خدمت کی ہے ۔ اس نے ممتاز ادبا و شعرا کی تخلیقات و مضامین کو پیش کرنے کے علاوہ نئے لکھنے والوں کے ذوق و نظر کی آبیاری کی اور اردو ادب کو نئے شعرا اور شاعرات سے متعارف کرایا ۔ بالفاظ دیگر " فنون " نے اردو

ادب کو معنوی اور صوری دونوں طرح کے حسن سے آراستہ کیا ہے ۔ " فنون " پر ترقی پسند ادب کی چھاپ پختہ ہے ۔ اس میں اشاعت حاصل کرنے والوں کی نظریاتی جہت ' ادبی وابستگی اور حسن عقیدت کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے اور بعض اوقات کمزور تخلیقات بھی " فنون " میں راہ پاجاتی ہیں ۔ ان معمولی باتوں کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ " فنون " نے ادب اور فن کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اور " فنون " نے جتنی روشنی بھی پھیلائی ہے یہ سب اس کے قلمکاروں ' تخلیق کاروں اور مضمون نگاروں کی گراں قدر کاوشوں سے پھوٹی ہے ۔ مدیر " فنون " مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اتنے طویل عرصے تک " فنون " کو زندہ رکھا ہے اور اب تک اسے شائع کر رہے ہیں ۔

" فکرو خیال " ۔ کراچی

ماہنامہ " فکر و خیال " سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کراچی کا رسالہ تھا جسے شمیم جاوید مرتب کرتے تھے ' یہ رسالہ اپریل ۱۹۶۳ ء میں جاری ہوا اور مقصد تعلیم ' سائنس ' فلسفہ ' نفسیات ' تاریخ اور ادب کے موضوعات پر مضامین کی اشاعت تھا ' اس پرچے میں ادب کے مضامین کے لئے ایک خاص گوشہ مختص کیا جاتا تھا ۔ اس حصے میں فرمان فتح پوری ' ابن شعور علیگ ' انجم اعظمی ' رئیس امروہوی ' الطاف گوہر ' مظفر حسین شمیم ' سید محمد تقی ' یوسف جمال انصاری ' عبداللہ خاور نے تسلسل و تواتر سے شرکت کی ہے ۔ اس پرچے کو اگر علمی ' ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا جائزہ نگار شمار کیا جائے تو درست ہو گا ۔ " فکر و خیال " کی اشاعت کے آثار ۱۹۶۷ ء تک ملتے ہیں ۔

" الرحیم " ۔ حیدر آباد

ماہنامہ " الرحیم " ۱۹۶۳ ء میں حیدر آباد سے شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے زیر اہتمام جاری ہوا ۔ اس کے مدیر مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی تھے اور مجلس ادارت میں ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتا اور مخدوم امیر احمد کے نام شامل ہیں ۔ اس پرچے کا مقصد شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو عام کرنا ' دینی اور دنیوی علوم میں صحت مند اور مفید ادغام عمل میں لانا تھا ' اس پرچے میں بالعموم ایسے مضامین کو جگہ ملتی تھی جن سے افکار ولی اللہ اور اس خانوادے کے بزرگان کی تعلیمات کی توضیح و تشریح منظر پر آسکے ۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتا کا مقالہ " شاہ ولی اللہ کا فلسفہ " محمد ایوب قادری کا " محمد احسن نانوتوی کے علمی کارنامے " محمد سرور کا " مولانا سندھی کا مکتب فکر " ابو سلمان شاہجہان پوری کا " شاہ ولی اللہ کے عہد

کے سیاسی حالات " عبدالغفور چودھری کا " شاہ ولی اللہ کا سفر حرمین " نسیم احمد امروہوی کا " شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی " عبدالحمید سواتی کا " مسئلہ وحدۃ الوجود میں راہ اعتدال " وفا راشدی کا " سید نصیرالدین اور ان کی اولاد " کا یہاں حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے " الرحیم " کے علمی ، فکری اور ادبی مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ " الرحیم " نے شاہ ولی اللہ کے مکتب فکر سے متعلق علماء کے علمی اور تصنیفی کارناموں کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔

"سیپ" کراچی

"سیپ" کا پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۶۴ء میں فکر نو کے ترجمان کی حیثیت میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مدیر نسیم درانی ہیں جنہوں نے اپنے پہلے اداریہ میں لفظ ، خیال ، نظم اور افسانے کی اہمیت کو تسلیم کیا اور ادبی اسلوب کے ضمن میں لکھا کہ :

" ہر احساس یا کیفیت کے موثر اظہار کے لیے ایک لہجہ کی ضرورت ہے۔ لہجہ اس وقت بنتا ہے جب ادیب کی ہر لفظ کے ساتھ گہری وابستگی ہو ، ہر لفظ کی بناوٹ ، ماہیت اور اس لفظ کے ساتھ منسلک دیگر کیفیات سے وہ پوری طرح آشنا ہو۔ الفاظ جب اس وابستگی اور آشنائی کے ساتھ کسی تحریر میں مرتب ہوں گے تو ان میں خود بخود مطلوبہ تاثر کے ساتھ خوبصورتی ، روانی ، بہاؤ ، ترنم اور نغمگی پیدا ہو جائے گی۔"(۴۲)

اس اداریے میں نسیم درانی نے اس فکری واماندگی کا ذکر بھی کیا جو ادب اور ادیب دونوں میں در آئی تھی اور اس کا باعث یہ تھا کہ ادیب بدلتی ہوئی اقدار کے ساتھ اپنا رشتہ طے نہیں کر پایا تھا۔ نسیم درانی نے لکھا کہ " ادب کا موضوع زندگی ہے ، چنانچہ "سیپ" نے اپنا جریدی سفر شروع کیا تو اس نے لفظ اور خیال کی داخلی قوت کو اجاگر کرنے کے لیے تخلیق کا رشتہ زندگی کے ساتھ قائم کیا اور پہلے پرچے میں شمیم احمد کا مقالہ " جدید شاعری -- شاعری کی تلاش میں " ڈاکٹر وزیر آغا کا " پاکستانی کلچر کا مسئلہ " اور ڈاکٹر جمیل جالبی کا " نذیر احمد اور ہمارے تہذیبی رشتے " جیسے چونکا دینے والے مقالات پیش کیے ، جن کے موضوعات ہی اہم نہیں تھے بلکہ بات کو کہنے کا ڈھنگ اور اسلوب بھی انوکھا تھا۔ ادیب اور آزادی رائے کے مسئلہ پر بحث کرنے کے لیے ممتاز حسین اور مجتبیٰ حسین پر مشتمل ایک محفل آراستہ کی۔ تخلیقی ادب میں عصمت چغتائی ، بلونت سنگھ ، الطاف فاطمہ ، غیاث احمد گدی ، اقبال متین کے افسانے ، شاذ تمکنت ، بلراج کومل ، شباب جعفری ، عبدالعزیز خالد ، انجم اعظمی ، ادیب سہیل ، محبوب خزاں کی نظمیں اور روایت کے ساتھ رشتہ قائم رکھنے کے لیے منور لکھنوی ، محشر بدایونی ،

رساچغتائی ' غلام ربانی تاباں ' اور شمس زبیری کی غزلیں پیش کیں ' دوہے اور گیت میں صہبا اختر ' نگارصہبائی ' شاہد عشقی اور تاج سعید کے نام نظر آتے ہیں - ایک باب ترجمے کا بھی کھلا ہوا ہے اور اس میں چیخوف ' البرٹوموراویا ' کافکا ' ولیم سرویاں اور اینڈرسن وغیرہ سے ملاقات ہوتی ہے - "سیپ" کی یہ ابتدا تھی جس میں اس کے عروج کے مظاہر بھی موجود نظر آتے ہیں - تاہم اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ سیپ نے طلوع ہوتے ہی ایک آفتاب کی صورت اختیار کر لی اور اس کی آمد کو نہ صرف اردو ادب کا ایک اہم واقعہ تصور کیا گیا بلکہ لکھنے والوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم بھی مل گیا جہاں مدیر ایک ادبی ڈکٹیٹر کا روپ اختیار نہیں کرتا تھا اور ادبی اظہار کو جمہوری قدروں کے مطابق پروان چڑھانے کا آرزو مند تھا۔

"سیپ" کے اداریے خاصے فکر انگیز تھے ' یہ ادبی معاشرے کو سوال کی لپیٹ میں لیتے اور اپنا فیصلہ دو ٹوک انداز میں پیش کر دیتے چنانچہ اس سے طغیان خیال بھی پیدا ہوا اور کچھ گرد بھی اڑی لیکن "سیپ" نے اپنا سفر جاری رکھا - مثال کے طور پر ایک پرچے میں اس غلط رجحان کی نشاندہی کی گئی کہ نقادوں نے تنقید کی جگہ مجسمہ سازی کا کاروبار شروع کر دیا ہے - تنقید کے بجائے کاری گری شروع کر دی ہے۔ "سیپ" نے لکھا کہ اگر نقاد اپنا فرض منصبی صحیح طور پر ادا نہیں کرتے تو تخلیق کار کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیے (۴۳) ایک اور پرچے میں انہوں نے ثقافت کی اس تھانیداری کو ہدف تنقید بنایا جو بیورو کریسی سے ابھر رہی تھی اور پوری قومی زندگی کو چابک کی لپیٹ میں لے رہی تھی (۴۴) ایک اور اداریے میں "ادب اور تہذیبی زوال" کا سوال اٹھایا گیا اور اسے "تہذیب الاخلاق" سے لے کر "سیپ" تک ایک صدی کے سفر کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی گئی "سیپ" کا ایقان یہ تھا کہ مردہ معاشروں میں زندگی کی رمق ادیبوں ہی میں ہوتی ہے' معصیت زدہ تاریکیوں میں نور کی کرن یہیں سے پھوٹتی ہے۔ لیکن "سیپ" کا دکھ یہ بھی ہے کہ آج کرن پیدا کرنے والے خود کٹہرے میں کھڑے ہیں اور بیورو کریسی پوچھ رہی ہے کہ ادیب کا منصب کیا ہے؟"(۴۵)

"سیپ" کا جریدی سفر طمانیت کا سفر نظر نہیں آتا۔ چنانچہ اس کی اشاعتوں میں بے قاعدگی کا عنصر موجود ہے اور بعض شماروں میں ادارتی اظہار سے بھی گریز کیا گیا ہے - اس کے پس منظر میں ممکن ہے کہ اقتصادی وجوہ کے علاوہ قارئین کی عدم توجہی بھی موجود ہو ' لیکن نسیم درانی نے "سیپ" کا سلسلہ اشاعت کلیتہً منقطع نہیں کیا۔ "اوراق" اور "فنون" کی طرح سال میں اس کے ایک یا دو شمارے خاص نمبر کے صورت میں چھپتے ہیں اور ہوا کے جھونکے کی طرح تازگی اور توانائی کا احساس پیدا کر دیتے ہیں۔

ایک طویل عرصے تک "سیپ" کا اعزاز یہ بھی تھا کہ یہ نئے اور پرانے لکھنے والوں کا ترجمان

اور نمائندہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے گروہ بندیوں اور تعصبات و اختلافات سے بلند رہنے کی کوشش کی اور ہر مکتبہ فکر کے ادبا کا تعاون حاصل کیا اور نئے ادیبوں کو مطلع اشاعت پر نمودار کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ "سیپ" کی ادبی کہکشاں نئی نہیں، اس افق پر دوسرے متعدد رسائل کے روشن اور نئے ستارے موجود ہیں، تاہم احساس ہوتا ہے کہ اس کا اپنا ایک اندرونی حلقہ بھی ہے جس میں عبیداللہ علیم، احمد ہمدانی، سرشار صدیقی، طلعت اشارت، شمس زبیری، اطہر نفیس، شمی فاروقی، نگار صہبائی، مشرف احمد، حسن اکبر کمال، شاہد عشقی، اشتیاق طالب، سلطان جمیل نسیم، مدبر رضوی، افسر آذر جیسے ادبا کو شامل سمجھا جا سکتا ہے۔ "سیپ" نے سلیم احمد سے اتنا ادبی تعاون حاصل کیا کہ اس پر سلیم احمد کے فکر کا پرتو بھی سایہ فگن نظر آتا ہے۔ "سیپ" کی منفرد عطایہ ہے کہ اس نے اردو افسانے کے ارتقا میں سرگرم حصہ لیا اور متعدد ضخیم افسانہ نمبر شائع کیے۔ شمارہ ۱۱۵ میں نہ صرف ۱۰۱ افسانے پیش کیے گئے بلکہ ڈاکٹر وزیر آغا "افسانے کا فن"۔ نذیر احمد "ہم عصر اردو افسانے" اور محمد احسن فاروقی کا خود نوشت افسانہ حیات "دل کے آئینے میں" شائع ہوا ہے۔ ۱۰۱ افسانہ نگاروں کی اس طویل فہرست میں آج کے پرانے لیکن اسی دور کے متعدد نئے نام نظر آتے ہیں۔ ان میں سے مظہرالاسلام، سلطانہ مہر، اعجاز راہی، رضوانہ حامد، خالدہ شفیع، مہ ناز قریشی، سمیع آہوجہ، نجمہ محمود، انوار احمد، سلیم اختر، سلیم الظفر خاصے اہم نام ہیں جو "سیپ" سے ابھرے۔

اردو غزل اور نظم کے فروغ کے علاوہ "سیپ" نے دوہا اور گیت کے فروغ میں بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان دونوں اصناف ادب پر تنقیدی مضامین اور تجزیاتی مطالعے "سیپ" میں سب سے زیادہ شائع ہوئے، ناصر شہزاد، تاج سعید، نگار صہبائی، جمیل عظیم آبادی، اسد محمد خان، الیاس عشقی کی گیت اور دوہا نگاری کو "سیپ" میں نسبتاً زیادہ فروغ ملا۔ اردو غزل اور نظم کے بیشتر اہم نام "سیپ" کے صفحات پر روشن نظر آتے ہیں۔ "سیپ" نے نظریاتی وابستگی اور ادبی گروہ بندی کو چونکہ قبول نہیں کیا اس لیے ظہیر کاشمیری، ادا جعفری، تابش صدیقی، جون ایلیا، اظہر جاوید، سرمد صہبائی، احسن علی خان، احمد فراز، مجروح سلطان پوری، جمیل ملک، اختر انصاری اکبر آبادی، افتخار عارف، کیف انصاری، سیما احمد، ماہ طلعت زاہدی، سب سے ایک ہی پرچے میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ "سیپ" کی موضوعاتی اشاعتوں میں "میرانیس نمبر" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ "سیپ" نے متعدد نئے عنوانات پر پہلی دفعہ کام کروایا ہے۔

"سیپ" ایک ادبی جریدہ بھی ہے اور اسے ایک وقیع مجموعہ نظم و نثر کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اس میں قارئین کے خطوط کو چونکہ پیش نہیں کیا جاتا اس لیے وہ رد عمل بھی سامنے نہیں آتا جو اس کے مضامین پر مرتب ہوتا ہے۔ "سیپ" نے اذہان کو متحرک کرنے اور نئے خیال کو سطح پر

ابھارنے کی کوشش تو کی ہے۔ لیکن اپنے صفحات پر رد عمل کی گرد کو اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ چنانچہ "سیپ" مرنجاں مرنج مزاج کا پرچہ بن گیا ہے جو قاری کی انگلی پکڑتا ہے اور اس کی راہنمائی کے لیے مضامین نو اور تخلیقات کا انبار لگا دیتا ہے۔ نثری نظم، لسانی سوالات، ثقافتی مسائل کے علاوہ "سیپ" نے ادیب کا ذاتی تشخص ابھارنے کے لیے خاکہ نگاری اور شخصیت ناموں کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا، اصناف ادب میں خصوصی مضامین پیش کیے۔ ان سب زاویوں کو پیش نظر رکھیں، تو "سیپ" کی چوبیں سالہ زندگی بے حد روشن اور ادب کے لیے اس کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع نظر آتا ہے۔

مجلّہ "ادارہ تحقیقات" پاکستان لاہور

"ادارہ تحقیقات" پاکستان دانش گاہ پنجاب کے زیر اہتمام ۱۹۶۴ء میں مجلّہ "ادارۂ تحقیقات" پاکستان جاری کیا گیا جس کا مقصد پاکستان کے بارے میں نئی تحقیق کو منظر عام پر لانا تھا۔ اس قسم کے کام کا حلقۂ قرات چونکہ محدود ہوتا ہے اس لیے عام طور پر تجارتی ناشرین اس کی اشاعت پر آمادہ نہیں ہوتے۔ دانش گاہ پنجاب نے اس سلسلہ میں متروکہ اوقاف بورڈ کا مالی تعاون حاصل کیا اور اس علمی اور تحقیقی رسالے کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ عام پرچے میں قریشی احمد حسن قلعداری کا مقالہ "خاندان نوشاہیہ اور شاہان وقت کے شاہی فرامین اور تاریخی تحریریں" بلقیس بیگم کا مقالہ "محمد اعظم۔۔ مصنف تاریخ واقعات شمر" اور پروفیسر غلام ربانی عزیز کا "غنیمت کنجاہی کی شاعری پر ایک نظر" جیسے علمی نوادر منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس پرچے کی مجلس ادارت میں پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر دانی، سید رضی واسطی، اور فیاض محمود جیسے تاریخ و ادب و آثار قدیمہ کے محقق شامل تھے، اس کا ایک بڑا کارنامہ جنوری اپریل ۱۹۶۴ء میں فہرست مخطوطات شیرانی کی اشاعت ہے۔ اس کا پیش لفظ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے۔

مجلّہ "علمی" لاہور

جولائی ۱۹۶۴ء میں ریسرچ سوسائٹی مغربی پاکستان کا سہ ماہی تحقیقی مجلّہ "علمی" منصۂ شہود پر آیا تو اس کے مقاصد میں ادب تاریخ فنون لطیفہ، مذہب اور عمرانیات کی تحقیق اور قدیم فنون کی اشاعت وغیرہ کو شامل کیا گیا۔ اس کے مدیر ڈاکٹر وحید قریشی تھے، انہوں نے ہی اس مجلّے کی ادبی اور تحقیقی جہت متعین کی اور جولائی کے پہلے پرچے میں "سخندان فارس" پر ڈاکٹر محمد صادق کا مقالہ "انجمن قصور اور

اس کے علمی و ادبی رسالے " پر شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کا مقالہ " مصطفٰے خان شیفتہ " پر محمد ایوب قادری کا اور " نورالعین واقف " پر غلام ربانی عزیز کا مقالہ پیش کر کے اسے ایک دقیع مقام عطا کر دیا۔ مجلّہ "علمی " میں انگریزی اور اردو کے مضامین ایک ہی پرچے میں چھپنے لگے۔ ۱۹۶۵ء میں اس مجلّہ کے لیے ایک ادارتی بورڈ بھی تشکیل دیا گیا جس میں پروفیسر شیخ عبدالرشید، ڈاکٹر وحید مرزا، ڈاکٹر پی بارڈی اور ڈاکٹر افتخار احمد غوری شامل تھے۔ ان دنوں یہ مجلّہ عبدالشکور احسن کے زیر نگرانی چھپتا ہے اور ایک مخصوص علمی حلقے میں قدر کی نگہ سے دیکھا جاتا ہے۔

"اوراق" لاہور

جنوری ۱۹۶۶ء میں لاہور سے ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں " اوراق " منصۂ ادب پر ظاہر ہوا تو اس وقت ۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ نے پاکستانی قوم پر یہ حقیقت منکشف کر دی تھا کہ ارض وطن ایک مقدس اثاثہ ہے جس کے ناموس اور تحفظ کے لیے خون کا آخری قطرہ بہا دینا بھی عین سعادت ہے "اوراق" کے ادبی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا "کسی ملک کے ادب کو اس کی ثقافت اور تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور ثقافتی ماحول زمین کی باس، پانی نمک اور فضا پر عناصر آفاقی کے عمل سے پیدا ہوتا ہے۔" اوراق "زمین کو اہمیت دینے میں اس لیے پیش پیش رہے گا کہ زمین عورت کی طرح تخلیق کرتی ہے لیکن وہ آسمان کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہیں کرے گا کہ آسمان اس تخلیق میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے " (۴۶)

ڈاکٹر وزیر آغا ایک طویل عرصے تک مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی مشن میں ان کے معاون رہ چکے تھے، رسالہ " ادبی دنیا " کے تابندہ ترین پانچویں دور میں وزیر آغا نے مولانا کے شریک مدیر کی خدمات سرانجام دی تھیں ان دونوں کے اشتراک عمل سے ادبی دنیا اس دور میں جدیدیت کا نمائندہ ادبی جریدہ بن گیا تھا۔ " ادبی دنیا" نے نہ صرف اس آفاق کو روشن کر دیا تھا جس کے ابتدائی ترتیب میں مولانا صلاح الدین کے ساتھ میراجی شامل تھے بلکہ نئی اردو نظم اور جدید تنقید کو ارتقا کا اگلا قدم اٹھانے میں بھی مدد دی تھی ۔ مولانا صلاح الدین احمد کی وفات کے بعد " ادبی دنیا " کی مشاورت اور ادارت میں کلاسیکی مزاج ادب کے زعمانے شرکت قبول کی، تو وزیر آغا نے محسوس کیا کہ " ادبی دنیا " نے سابقہ پانچویں دور میں افکار و تصورات کی جو نئی شمع روشن کی تھی اب وہ متعدد خطرات کی زد میں ہے، لٰہذا انہوں نے " اوراق " جاری کیا تو اسے جدید ادب کا نمائندہ بنانے کا عہد کیا ان کے معاون مدیر عارف عبدالمتین تھے جو ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن اور ایک بے حد فعال ادیب ہیں اس سے ظاہر ہوتا

ہے کہ " اوراق " کو کسی مخصوص گروہ ، جماعت یا نظریے سے جامد قسم کی وابستگی نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد شوریدہ سری کے بجائے فکر و خیال اور جذبہ و احساس کو فنی قدروں اور جمالیاتی اسالیب میں پیش کرنا تھا ، اہل پاکستان میں جنگ ۱۹۶۵ ء سے فکری جہت کی جو تبدیلی آئی تھی " اوراق " نے اس کا خیرمقدم کیا تھا اور کہا کہ :

" ہم بے یقینی کے دھندلکوں سے نکل کر یقین کی شفاف روشنی میں آ گئے ہیں ۔ بے شک ابھی واقعات کی ہنگامہ خیزی اور حادثات کی شوریدہ سری نے ادبی اور فنی تقاضوں کو ایک بڑی حد تک پس پشت ڈال رکھا ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جہت تو بدل گئی ہے اور اب وہ دن قطعاً دور نہیں جب ہماری شاعری میں قریبی مظاہر اشیا ، الفاظ ، محاوروں ملکی رسوم ، تہواروں اور بالخصوص اپنے وطن سے ایک گہرا لگاؤ بھی پیدا ہو جائے گا " (۴۷)

" اوراق " کے مدیر ثانی عارف عبدالمتین نے واضح کیا کہ " اوراق " کا اجرا کسی فوری ذہنی اضطرار کا نتیجہ نہیں ، بلکہ اس کے برعکس یہ ایک سوچی سمجھی ادبی منصوبہ بندی کا مرہون منت ہے ۔۔۔ " اوراق " ایک ادبی منصوبہ بندی کا نتیجہ تو ہے مگر کسی اقتصادی منصوبہ بندی کی پیداوار نہیں ہے ۔ لہٰذا یہ ادب و فن کی نشرواشاعت کا ضامن تو ہو گا ان کی تجارت نہیں کرے گا " (۴۸)

" اوراق " نے متذکرہ بالا ادبی منصوبہ بندی کے لازمی تقاضے کے طور پر بلند پایہ نظموں ، غزلوں ، افسانوں ، اور مقالوں کی اشاعت کے علاوہ چند مستقل عنوانات قائم کرنے اور قارئین کے فکر و نظر کو جلا دینے کا عہد کیا ۔ " اوراق " کے مستقل عنوانات میں اہم ترین عنوان "سوال یہ" تھا۔ جس کے تحت مفکرین عہد کی توجہ بڑے بڑے مسائل کی طرف دلائی جاتی اور بحث کو صحت مند خطوط پر استوار کیا جاتا۔ نظم کا تجزیاتی مطالعہ ایک اور تخلیقی نوعیت کا عنوان تھا۔ "میرا پسندیدہ فنکار" کے تحت ممتاز قلمکار اپنے من بھاتے ادیب کا تعارف کراتے اور اپنے ذاتی میلانات کا اظہار کرتے تھے۔

" ادھوری ملاقاتیں " قارئین کے خطوط کا کالم تھا ۔ اس کا مقصد سابقہ پرچے کے مندرجات پر آرا کی اشاعت کے علاوہ ایسے فعال ناظرین کو روشناس کرانا بھی تھا جو ادب سے تاثر ہی قبول نہیں کرتے بلکہ اسے اپنی رائے سے متاثر بھی کرتے ہیں ۔

وزیر آغا اور عارف عبدالمتین کے اشتراک سے اب جو ادبی جریدہ منظر عام پر آیا ، وہ محض ادبی تشنگی کو رفع نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے پیش نظر زندگی ، تہذیب اور ثقافت کو ادب کے وسیلے سے فروغ دینا ، زندگی کی اعلیٰ قدروں میں انسانی اعتماد کو بحال کرنا اور حب الوطنی کے جذبات کی افزائش تھی ۔ "اوراق" عام ادبی پرچوں سے مختلف نظر آتا تھا اور اس کے اثرات مستقل نوعیت کے تھے ، اہم بات یہ کہ "اوراق" نے آغاز سفر پر ۱۹۶۶ء میں جن مقاصد کو اپنا نصب العین بنایا تھا ، اس میں ارتقا اور

توسیع تو ہوئی ہے لیکن انحراف کی صورت سامنے نہیں آئی۔ "اوراق" جدیدیت کے موقف پر قائم ہے اور اپنے چوبیسویں سال اشاعت میں زندگی کے افکار و احساسات کو خالصتاً ادب کے جمالیاتی زاویوں سے پیش کر رہا ہے۔

"اوراق" کا ادبی موقف کشادہ، آزاد اور وسعت آشنا تھا، لیکن اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں میں ہی اسے شدید مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس کی نظریاتی جہت بھی مخالفانہ تنقید کی زد میں آئی اور اس پر بعض ایسے لوگوں نے بھی شخصی حملے کیے۔ جو ادب کو تجارت، شہرت، حکومت اور تجلیل ذات کا وسیلہ سمجھتے تھے "اوراق" کے ادارہ میں عارف عبدالمتین کی شمولیت کو بھی ہدف اعتراض بنایا گیا اور بات جب ادب کے دائرے میں داخلے سے پہلے ہی ذات کے مدار میں چلی گئی اور گفتگو میں دشنام کی آمیزش ہو گئی، تو وزیر آغا نے جولائی ۱۹۷۰ء کے "خاص نمبر" کے بعد "اوراق" کا سلسلہ اشاعت معطل کر دیا۔

"اوراق" کا پہلا دور جنوری ۱۹۶۶ء سے جولائی ۱۹۷۰ء تک ساڑھے چار سال پر محیط ہے۔ اس عرصے میں تیرہ خاص نمبر جن میں دو سالنامے، ایک افسانہ نمبر اور ایک ضخیم "غالب و سالانہ نمبر" بھی شامل تھے، شائع ہوئے۔ "سوال یہ ہے" کے تحت "ابلاغ کی اہمیت" شہزاد احمد "نثر اور شعر کا مابہ الامتیاز" صلاح الدین ندیم "معنی کا معنی" افتخار جالب "اسلوب کیا ہے؟" غلام جیلانی اصغر "ادب میں دائمی اقدار کا مسئلہ" عابد حسن منٹو جیسے موضوعات پر خیال انگیز مباحثے کرائے گئے، جن میں قاضی محمد اسلم، ریاض احمد، عرش صدیقی، اعجاز فاروقی، بلراج کومل، صدیق کلیم، سجاد باقر رضوی، جیلانی کامران، نظیر صدیقی، جمیل ملک، جیسے متعدد اہل فکر و نظر نے نہ صرف حصہ لیا بلکہ موضوعات کو اپنے اپنے انداز کے مطابق اجال دیا۔ تجزیاتی مطالعے کے تحت شہزاد احمد، ن۔ م۔ راشد، علی سردار جعفری، جمیل ملک، صلاح الدین محمد، قیوم نظر اور اعجاز فاروقی کی نئی نظمیں، تحلیل و تجزیہ کے لئے منتخب ہوئیں اور ان پر نظم جدید کے شعرا نے ہی تجزیاتی نظر ڈالی، ان شعرا میں ضیا جالندھری، مجید امجد، قیوم نظر، غلام جیلانی اصغر، شکیب جلالی، یوسف ظفر، ادیب سہیل، شاد امرتسری کے نام نمایاں ہیں۔ اس ضمن میں "اوراق" کی عطا یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے دور اول میں سلیم اختر، فرخندہ لودھی، مسعود الروف، کمار پاشی کو پہلی دفعہ بطور تجزیہ نگار متعارف کرایا۔ تجزیہ و تحلیل کا یہ عمل "میرا پسندیدہ فنکار" کے عنوان میں بھی نمایاں ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر داؤد رہبر کا فن و شخصیت نامہ "مولوی محمد شفیع" ایوب رومانی کا "وانم باڑی"۔۔ روشن آرا بیگم" عرش صدیقی کا "ٹی ایس ایلیٹ" نظام الدین کا "حافظ یوسف سدیدی" شہزاد منظر کا "سومرسیٹ مام" اور رحمن مذنب کا "ارسطو" کا حوالہ بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ "اوراق" کا شمار ان معدودے چند پرچوں میں ہوتا ہے جنہیں برصغیر کے بیشتر بلند

نظر لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا "اوراق" کے پہلے دور میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر سہیل بخاری، میرزا ادیب، قاضی محمد اسلم، عابد علی عابد، ظہیر کاشمیری، عبدالرحمٰن چغتائی، یوسف ظفر، قیوم نظر، فارغ بخاری، ظہور نظر، جعفر طاہر، مجید امجد، مصطفےٰ زیدی، عبدالعزیز خالد، راجہ مہدی علی خان، حفیظ جالندھری اور آغا محمد باقر جیسے ادبا کے نام نظر آتے ہیں تو ان کے ساتھ متعدد ایسے ادبا بھی ہیں جن کی پہلی ادبی رونمائی "اوراق" میں ہوئی۔ "اوراق" کو یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ادبی دنیا کو فرخندہ لودھی پہلا افسانہ "پاربتی" مشتاق قمر پہلا انشائیہ "چھڑی" جمیل آذر کا پہلا انشائیہ "پلنگ" اور سلیم اختر کا پہلا تجزیہ "بلیک آؤٹ کی پہلی رات" جیسے ادبا کو اپنے پہلے پرچے میں متعارف کرایا اور پھر یہ سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔ یہاں مجھے ایک ذاتی اعتراف کی اجازت بھی ملنی چاہئے کہ "اوراق" نے مجھے زندگی کے گم شدہ اوراق سے دوبارہ ادب کی طرف راغب کیا اور مولانا صلاح الدین احمد پر میرا پہلا مضمون اور محمد خالد اختر کے ناول "چاکی واڑا میں وصال" پر تجزیاتی تبصرہ "اوراق" کے پہلے پرچے میں شائع کیا۔

"اوراق" کا پہلا دور اگرچہ زمانی اعتبار سے زیادہ طویل نہیں۔ تاہم "ادھوری ملاقاتیں" میں قارئین کے رد عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے بہت سے لکھنے والوں کو اظہار پر مائل کیا، اس حصے کی آرا محض "واہ" اور "آہ" پر مبنی نہیں بلکہ اس میں مقالات جیسی تفصیل بھی موجود ہے اور اس حصے میں شریک ہونے والے لوگوں میں سید احتشام حسین، جوگندر پال، غلام الثقلین نقوی، احمد ظفر، شاد امرتسری، قدرت نقوی، نظیر صدیقی، ارشد ملتانی، احمد وقار واثقی، جعفر طاہر، رحمٰن مذنب، رام لعل، محمود ہاشمی، شمس الرحمٰن فاروقی، فضیل جعفری اور رشید نثار جیسے نامور ادبا بھی مصروف بحث نظر آتے ہیں۔

"اوراق" کا دور ثانی مارچ ۱۹۷۲ء میں "افسانہ و انشائیہ نمبر" سے شروع ہوا۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اس دور کا آغاز بھی ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد کی بارود آلود فضا ہی میں ہوا۔ اس وقت احساس شکست وہزیمت نے اذہان کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور پاکستان قوم ایک بے پتوار کشتی کی طرح ڈول رہی تھی، "اوراق" نے تجزیہ کیا کہ:

"قوم تخلیقی عمل کے ایک خاص پیٹرن کے تحت ہی برگ وبار لاتی ہے۔ پہلے معاشرے کے بے حس قالب میں ایک تصادم سا نمودار ہوتا ہے۔ نظریات، میلانات اور طبقات کی آویزش جنم لیتی ہے۔ منفی اور مثبت، خیر اور شر، علم اور جہالت ایک دوسرے پر جھپٹتے ہیں اور آخر میں زندگی میدان کارزار میں تبدیل ہو کر نزاع پر منتج ہونے لگتی ہے۔ مگر جب نزاع اپنے انتہائی نقطے پر پہنچ جائے تو عین اس وقت ساری قوم اجتماعی ذات کے اندر اتر کر ایک انوکھی قوت سے بھی لیس ہو جاتی ہے۔

پاکستانی قوم ایک مختصر سے عرصہ میں تخلیقی عمل کے ان جملہ مراحل سے گذر گئی ہے" (۴۹)

"اوراق" نے احساس شکست کی عکاسی کرنے کے بجائے اس روشنی کو پکڑنے کی کوشش کی جو احساس شکست کے بطون سے ابھر رہی تھی اور جس نے ہمیں "ہونے اور نہ ہونے" کی کیفیت سے آشنا کر دیا تھا "اوراق" گذشتہ سترہ برس کے عرصے میں اسی نظریاتی موقف پر ادبی، تخلیقی اور تنقیدی سطح پر عمل کر رہا ہے اور زندگی کی ان جہتوں کو آشکار کرنے میں مصروف ہے جس کا تناظر ہمارے گرد و پیش میں پھیلا ہوا ہے لیکن جس کی معنویت دریافت کرنے کے لئے انسان کو اپنے اندر کی روشنی بیدار کرنی ضروری ہوتی ہے۔

"اوراق" کے دوسرے دور کی ابتدا میں ایک ادارتی تبدیلی یہ عمل میں آئی کہ عارف عبدالمتین کچھ عرصہ کے لئے اس جریدہ سے منقطع ہو گئے، لیکن حالات کے سازگار ہوتے ہی وہ دوبارہ "اوراق" سے منسلک بھی ہو گئے، یہ تعلق ۱۹۷۵ء تک قائم رہا۔ جنوری ۱۹۷۶ء میں جناب سجاد نقوی نے اعزازی مدیر کا منصب سنبھالا اور گذشتہ بارہ سال سے وہ "اوراق" کی ترتیب و تدوین میں وزیر آغا کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، چنانچہ "اوراق" کو ان پرچوں میں شمار کیا جا سکتا ہے جن میں ادارتی تبدیلیاں بہت کم رونما ہوئی ہیں اور جن کی نظریاتی جہت نہ تو متزلزل ہوتی ہے اور نہ ہی مفادات کے تعاقب میں اپنا رخ تبدیل کرتی ہے۔ اس کی دوسری نمایاں بات یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۷۵ء میں "اوراق" مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں چھپنے لگا۔ اس وقت "ادبی دنیا" محمد عبداللہ قریشی صاحب کا دور ادارت گزارنے کے بعد بند ہو چکا تھا۔ وزیر آغا نے لکھا کہ:

"ہمیں اس اظہار میں تامل نہیں کہ "اوراق" "ادبی دنیا" ہی کا دوسرا نام ہے اور جب تک یہ پرچہ جاری رہا مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی مشن کی تکمیل میں سدا کوشاں رہے گا" (۵۰)

"اوراق" نے مولانا کے ادبی مشن کے مطابق اردو ادب کی بقا کے لئے کام کیا، ادیب کو اپنے مسلک اور تخلیق کی تقدیس کا احساس دلایا، سیاست اور نظریے کی سنگلاخیت سے نجات دلانے کی کوشش کی اور سب سے اہم یہ کہ تنقید و تجزیہ میں آزاد عمل کو فوقیت دی، نئے تجربے کو آزمانے میں عار محسوس نہ کیا اور نئے ادیبوں کو متعارف کرانے اور اردو ادب اور ادیب کی راہنمائی صحت مند خطوط پر کرنے میں تاخیر نہ کی۔ "اوراق" کا دوسرا دور اس کے سابق دور کی طرح توازن و اعتدال کا دور ہے۔ یہ ادب کے نہال تخلیق کو آہستہ آہستہ بارور کرتا اور کمال طمانیت سے ثمرات حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس کا حلقہ اثر ذہنی بھی ہے، مکانی بھی، زمانی بھی اور مختلف اصناف ادب بھی "اوراق" کی ادبی تحریک سے اثرات قبول کر رہی ہیں۔

"اوراق" کے دوسرے دور میں "اوراق" کا "جدید نظم نمبر" (۱۹۷۷ء) اس کا ایک بڑا کارنامہ

ہے۔ اس کی اشاعت میں بنیادی طور پر یہ نکتہ ابھرا کہ جدید اردو نظم میں سب سے زیادہ اثرات اقبال نے نفوذ کئے ہیں اور اس سے درسی تنقید کی اس روش کی نفی بھی ہو گئی کہ جدید اردو نظم اقبال اور اس کے انداز فکر نیز اسلوب اظہار سے انحراف کا درجہ رکھتی ہے۔ اس نمبر میں اقبال سے لے کر حسن طاہر تک اردو نظم کا ایک ایسا کڑا انتخاب پیش کیا گیا جس میں شامل ہر نظم خیال کی پرواز کا لطف ہی مہیا نہ کرے بلکہ پڑھنے والوں کو احساسی گرفت میں بھی لے لے۔ اس کی دوسری خوبی جدید اردو نظم کے علامتی پیکروں کو توضیح پر مبنی مضامین تھے۔ اس ضمن میں سجاد نقوی نے "شام" کا، رشید نثار نے "شہر" کا، ذوالفقار احمد تابش نے "موت" کا سعداللہ کلیم نے "ماں" کا، سلیم اختر نے "دھرتی، برگد آنچل" کا، اور انور سدید نے "ہوا" کا مطالعہ پیش کیا۔ اقبال (وزیر آغا)۔ یوسف ظفر (شہرت بخاری) قیوم نظر (صدیق جاوید) بلراج کومل (شمیم حنفی) اور اعجاز فاروقی (جمیل یوسف) کے شخصی اور فنی تجزیوں کے علاوہ متعدد نظموں کے تجزیاتی مطالعے پیش کئے گئے، اردو نظم کے مباحث میں ڈاکٹر عبادت بریلوی (نظم کی ضرورت) اقبال آفاقی (نئی شعری ذہنیات) ڈاکٹر عنوان چشتی (نئی نظم میں علامت نگاری) مشتاق قمر (جدید اردو نظم میں موجودیت پسندی) کے علاوہ ڈاکٹر غلام حسین اظہر، رشید امجد، جمیل آذر، تبسم کاشمیری اور بلراج کومل نے جدید نظم نگاری کے خیال انگیز جائزے لکھے، جو وسیع حلقے میں مقبول ہوئے۔ چنانچہ اب یہ "جدید نظم نمبر" حوالے کی کتاب کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

"اوراق" کا دوسرا بڑا کارنامہ انشائیہ کی صنف کا فروغ ہے۔ "اوراق" کے دوسرے دور کی ابتدا "انشائیہ نمبر" سے ہوئی تھی، دس سال کے بعد ۱۹۸۵ء میں "اوراق" نے ایک اور ضخیم "انشائیہ نمبر" پیش کیا اور انشائیہ نگاروں کی اتنی بڑی کہکشاں کو متعارف کرایا جو "اوراق" کے صفحات پر روشن ہوئی تھی اور اب "اوراق" کے ۳۵۰ صفحات کی ضخامت سے بھی تجاوز کر رہی تھی، انشائیہ نمبر میں جوگندر پال، غلام الثقلین نقوی، شہزاد احمد، محمد منشا یاد اور صابر لودھی جیسے بڑے ادیب پہلی دفعہ انشائیہ کی صنف میں نمودار ہوئے، خالد اقبال، آفاق احمد، انجم نیازی، علی اختر، حیدر قریشی، اظہر ادیب، نذیر احمد راہی، جان کاشمیری، اکبر حمیدی، بشیر سیفی، رضی الدین رضی، محمد اسلام تبسم، حامد برگی اور محمد اسد اللہ اس کہکشاں کے روشن ستاروں میں شامل تھے، انشائیوں کے تجزیاتی مطالعے، غیر ملکی انشائیوں کے تراجم، "سوال یہ ہے" کے تحت انشائیہ کے دو مباحث، انشائیہ کی کتابوں پر تبصرے اور رشید نثار کا "انشائیہ کے چند پہلو" "انشائیہ کیا ہے؟" ذوالفقار احمد تابش کا "انشائیے کے بارے میں" شہزاد منظر کا "انشائیہ کا فن" حامد برگی کا "انشائیہ ایک ہمہ جہت صنف نثر" سلیم آغا قزلباش کا اس خاص نمبر کے قیمتی مضامین تھے جن سے انشائیہ کا تمام گرد و پیش روشن ہو جاتا ہے۔ جدید افسانے کو "اوراق" نے جو

خصوصی توجہ دی ہے اس کا ایک قیمتی ثمر سلیم آغا قزلباش، طارق محمود، مبین مرزا ندیم، عذرا سید، نگہت سیما، انجم ترازی، فریدا مرزا، محمد جلیل، مستنصر حسین تارڑ، انجم انصار، فاروق خالد، علی تنہا، قمر عباس ندیم، اسلام اعظمی، محمود احمد قاضی، شمس نعمان اور عشرت ظہیر جیسے افسانہ نگار ہیں جنہیں "اوراق" نے قلم کا اعتماد بخشا۔ "اوراق" کے افسانہ نمبروں نے اس صنف کو مختلف زاویوں سے متعارف کرایا علامتی اور تجریدی افسانے کی توضیح اور تشریح کے علاوہ اس صنف پر عمل اور رد عمل کو ظاہر کرنے میں بھی تاخیر نہ کی۔ "اوراق" نے ادب کو نئی جہت دینے کے علاوہ افکار و نظریات کو متاثر کرنے کی سعی بھی کی۔ "اوراق" کا پہلا ورق میں ڈاکٹر وزیر آغا، ادبی دنیا کے طوفانوں کو سمیٹنے اور آنے والے طوفانوں کی نشاندہی کرتے، بہت سے مسائل و افکار جو بعد میں رجحان ساز ثابت ہوئے سب سے پہلے "اوراق" کے اداریہ میں زیر بحث آئے، مثال کے طور پر نثری نظم، ہائیکو کی مختصر صنف شعر، طویل نظم، انشائیہ تراجم کی ضرورت، نئی تنقید، سٹرکچرل تنقید کا زاویہ، سفر نامہ اور متعدد دوسرے مباحث "اوراق" کے صفحات سے ابھرے اور ان کی صدائے بازگشت پوری ادبی دنیا میں سنی گئی۔ تنقیدی مضامین کا بہت سا قیمتی سرمایہ "اوراق" کے صفحات پر ہی پیش کیا گیا۔ یہاں بہت زیادہ مضامین کا حوالہ دینا ممکن نہیں۔ تاہم گذشتہ چند سالوں میں جو مضامین بہت مقبول ہوئے ان میں "فیض اور ان کی شاعری" از ڈاکٹر وزیر آغا "سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ" از گوپی چند نارنگ "نئی تنقید کا منصب" از ڈاکٹر جمیل جالبی "جدید اسلوبیات کا بانی" از ریاض صدیقی "ایک صورت خرابی کی" از شہزاد احمد "انشائیہ کیا ہے" از ڈاکٹر بشیر سیفی "اردو سفر نامہ" از رحمن مذنب "نئی غزل ایک مطالعہ" از حامدی کاشمیری "نئے فکر کے ابتدائی سوال" از جیلانی کامران "ادب میں خیال کی اہمیت" از وقار احمد رضوی۔ صرف چند عنوانات ہیں جو حوالے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ کتابوں پر تبصروں کو "اوراق" نے تاثراتی انداز دینے کے علاوہ ان کی تجزیاتی نوعیت "اس کتاب میں" کے زیر اثر بحال کی۔

"اوراق" نے ادب ہی کو نہیں ادیب کی مجموعی شخصیت دریافت کرنے کی کاوش بھی کی ہے، اس ضمن میں "اوراق" نے گوشوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا اور مولانا صلاح الدین احمد، شہزاد احمد، غلام جیلانی اصغر، غلام الثقلین نقوی، تخت سنگھ، مشفق خواجہ پر بے حد خیال انگیز گوشے پیش کئے۔ "اوراق" نے ان گوشوں میں تزئین ذات کے بجائے، تعبیر و دریافت فن کا زاویہ تراشا اور ادیب کا تشخص اس کے ادب سے کیا۔ یاد نگاری کے حصے میں یہ عمل خود ادیب نے خود نوشت کے تحت سرانجام دیا ہے۔ اس ضمن میں غلام الثقلین نقوی کے "رابطے" اور ہرچرن چاولہ کے "البم" کے سلسلے کے مضامین مثالی ہیں۔

"اوراق" خاص اشاعتوں کا پرچہ ہے۔ یہ سال میں دو تین بار چھپتا ہے۔ لیکن یہ غیر حاضر کبھی

شمار نہیں ہوا۔ اس کے اٹھائے ہوئے مباحث پوری ادبی دنیا میں فکری روشنی پھیلاتے ہیں، چنانچہ اسے جدید ادب کی سب اصناف کا نمائندہ قرار دیا جاتا ہے اور اس کے لکھے ہوئے کو اعتبار حاصل ہے۔
"اوراق" اس دور کا معتدل، موثر اور زندہ ادبی جریدہ ہے، جس نے "ادبی دنیا" کے اسلوب حیات میں زندگی بسر کی اور مولانا صلاح الدین احمد کے مسلک کے مطابق اردو ادب اور ادیب کی راہنمائی کی۔ وزیر آغا نے "اوراق" میں لکھنے والوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جس کے لئے ادب عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور جو لفظ کی مالی افادی حیثیت کو قبول نہیں کرتے۔ "اوراق" اب بھی فنی ادب اور افادی ادب، ایک نادرہ کار ادیب اور ایک ہوشیار قلم کار کے مابہ الامتیاز کو روشن کر رہا ہے اور اس کی روشنی ظلمت میں بھی دور سے نظر آ جاتی ہے۔

"اردو زبان" - سرگودھا

ماہنامہ "اردو زبان" سرگودھا سے جنوری ۱۹۶۶ء میں عصمت اللہ نے جاری کیا۔ ابتدا میں اس پرچے کو ملک بھر کی ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کرنے اور قارئین کو ادب کے منتخب شاہ پاروں سے متعارف کرانے کا فریضہ سونپا گیا۔ وزیر آغا اس پرچے میں ادبی مسائل پر مستقل کالم لکھا کرتے تھے، اس پرچے کی خاص بات مختلف شہروں کی ادبی ڈائریاں تھیں، جنوری ۱۹۶۷ء سے اس میں تخلیقی ادب کے لئے جگہ نکالی گئی، لیکن ادبی مباحث میں قدرے جارحیت پیدا ہو گئی جس نے پوری ادبی دنیا کو لرزہ براندام کر دیا اور رسالہ "اردو زبان" طعن و دشنام کا ہدف بننے لگا۔ ۱۹۷۰ء میں "اردو زبان" نے پہلا وقیع سالنامہ شائع کیا جو اس کے سابقہ دو خاص نمبروں یعنی "ستمبر ۱۹۶۵ء کا دفاع وطن نمبر" اور "مولانا صلاح الدین احمد نمبر" پر بازی لے گیا لیکن اس کے بعد اردو زبان تعطل کا شکار ہو گیا۔
۱۹۷۲ء میں "اردو زبان" نئی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آیا اور طغیان خیال پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا مسعود انور، اور راغب شکیب کی ادارت میں "اردو زبان" نے کامیابی کی کئی منزلیں طے کیں۔ اس نے وطن پرستی کے جذبات کو فزوں تر کیا، وطن عزیز کی دھرتی کو مقدس امانت قرار دیا۔ شاعری میں اندر کی آواز سننے کی طرح ڈالی اور لفظ کو گنجینۂ اسرار قرار دیا۔ "دبستان سرگودھا" کی تحریک اس پرچے سے ہی پروان چڑھی۔ راغب شکیب کراچی چلے گئے تو "اردو زبان" کو پرویز بزمی اور ایم ڈی شاد مرتب کرنے لگے۔ اس دور میں "اردو زبان" نے متعدد خاص نمبر شائع کئے۔ اس کا "انشائیہ نمبر" خصوصی دلچسپی سے پڑھا گیا۔ اردو زبان اب بھی شائع ہو رہا ہے لیکن اس کی اشاعت باقاعدہ نہیں۔ مجموعی طور پر "اردو زبان" شدید رد عمل کا پرچہ ہے۔ یہ ادبی معاشرے کے

معائب اور ناہمواریوں کو آشکار کرنے میں گہری دلچسپی لیتا ہے۔ ادیب کو قومی افتخار شمار کرتا ہے اور اس سے اعلیٰ اخلاق اور کردار کی توقع رکھتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی بڑا ادیب اپنے بلند منصب سے گر جاتا ہے تو احتجاج کی پہلی آواز "اردو زبان" کے صفحات ہی سے ابھرتی ہے اور پورے برصغیر میں سنی جاتی ہے۔ "اردو زبان" ادیب کو حزب اختلاف کا فرد تسلیم کرتا ہے لیکن اس نے اختلاف کے لئے شائستگی کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ ان آثار کی موجودگی میں "اردو زبان" سرگودھا ایک انوکھا، نادر اور منفرد پرچہ نظر آتا ہے۔

"کتاب"۔ لاہور

لاہور سے ماہنامہ "کتاب" ابن انشا کی نگرانی اور سید قاسم محمود کی ادارت میں ستمبر ۱۹۶۶ء میں جاری کیا گیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد مطالعہ کتب کو فروغ دینا اور پڑھنے والوں کی راہنمائی کرنا تھا۔ چنانچہ اس پرچے میں کتاب اور مصنف کے علاوہ کتاب سازی، اور کتاب فروشی کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ علمی و ادبی اداروں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ اشاعت کتب کی رفتار اور قیمتوں کے جزر و مد کے علاوہ کتابوں کی نمائشوں اور اس صنعت کے بارے میں مختلف مذاکروں کے رپورتاژ پیش کئے جاتے ہیں۔ مصنفین کے علاوہ ادبی اداروں کے سربراہوں، لائبریریوں اور ناشرین حتیٰ کہ کاتبوں کے متعدد تعارفی انٹرویو "کتاب" میں شائع کئے جا چکے ہیں۔ اس لحاظ سے "کتاب" ایک بے حد متنوع ادبی پرچہ ہے اور اس کی تکنیکی نوعیت اس کی دلچسپی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس پرچے کے تنوع کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صفدر ادیب صاحب نے ایک پرچے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا حامد علی خان، حمید احمد خان، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے ممتاز ادبا سے ان کے بچپن کی عادات مطالعہ پر انٹرویو پیش کیا۔ ستار طاہر نے نوبل انعام یافتہ کتابوں پر ایک طویل سلسلہ مضامین لکھا، میرزا ادیب نے اپنی پسندیدہ کتابوں کا نچوڑ ایک مقالے میں پیش کیا۔ ایک دفعہ ایک دلچسپ فیچر یہ پیش کیا کہ "اگر ایک ویران جزیرے میں آپ کو صرف تین کتابوں کے ساتھ نظر بند کر دیا جائے تو آپ کی پسندیدہ تین کتابیں کون کون سی ہوں گی؟" کتابوں کی تعارفی تقاریب کی ابتدا اور فروغ میں بھی رسالہ "کتاب" کے ادارے کا حصہ گراں قدر ہے۔ ان تقاریب میں جو تعارفی مضامین پڑھے جاتے تھے "کتاب" انہیں اگلے ماہ تزک و احتشام سے مصور صورت میں پیش کرتا تھا۔

رسالہ "کتاب" کو صحت مند خطوط پر استوار کرنے میں ابن انشا اور سید قاسم محمود نے ابتدائی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ مختلف اوقات میں ان کی معاونت صفدر ادیب، عبدالستار

چودھری ' ستار طاہر ' عزیز ہمدانی اور عدیم ہاشمی جیسے ادبا نے کی ' ۱۹۷۲ء میں ذوالفقار احمد تابش مدیر اور عطش درانی نائب مدیر مقرر ہوئے ' کتاب میں ذوالفقار احمد تابش کا دور ادارت سب سے طویل اور زرخیز ہے ۔ " فرض کیجئے کہ ... " کا سلسلہ انہوں نے ہی شروع کیا تھا۔ "یاد رفتگاں " کو انہوں نے مزید تقویت اور باقاعدگی عطا کی ' " تعلیمی پالیسی نمبر " کے بعد ہر تین ماہ کے بعد " تبصرہ نمبر " کے سلسلے کا اجرا بھی انہیں کے عہد ادارت کا ایک اہم واقعہ ہے ۔ انہوں نے غیر ملکی ادب کے تعارف کے علاوہ اردو ادب کی اہم کتابوں پر تجزیاتی مضامین کا طویل سلسلہ شائع کیا ۔ ان میں ہاجرہ مسرور کے ڈراموں کی کتاب "وہ لوگ" عبدالعزیز خالد کی " مہا بھارت کتھن مالا" وزیر آغا کی " گھاس میں تتلیاں" ڈاکٹر ملک حسن اختر کی کتاب "تہذیب و تحقیق" صلاح الدین عادل کا ناول "مصائب و آفات کو آلام کیا" سلیم آغا قزلباش کی کتاب "انگور کی بیل" وغیرہ چند اہم مطالعے ہیں۔ "کتاب" کا "بچوں کا ادب نمبر" اور "دیوان غالب نمبر" اس کے دو قابل ذکر اہم کارنامے ہیں' رسالہ "کتاب" اب بھی باقاعدگی سے چھپ رہا ہے۔ اس کی ادارت میں محمد علی چراغ اور محمد اکرم کامل' ذوالفقار احمد تابش صاحب کی معاونت کرتے ہیں ۔ قومی کتاب مرکز کا یہ رسالہ اگرچہ سرکاری مزاج رکھتا ہے لیکن اس کی ادبی جہت زیادہ نمایاں ہے اور اس کی خدمات ادب کا مدار عام ادبی رسائل سے مختلف ہے۔

" اسلامک ایجوکیشن " ۔ لاہور

سہ ماہی جریدہ " اسلامک ایجوکیشن " کے بانی ڈاکٹر محمد رفیع الدین تھے ' اس کا اجرا آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کے زیر اہتمام جنوری ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ اس جریدے کا مقصد مفکرین اسلام کی علمی کاوشوں کا تحقیقاتی اور معلوماتی جائزہ اور دور حاضرہ کے مسائل پر اسلامی راہنمائی تھا ۔ اس کے مدیر مظفر حسین اور معاون فضل الٰہی تھے ' مضامین کی نوعیت علمی ' ادبی اور تحقیقاتی ہے۔ "مارکسیت کا مطالعہ " از ڈاکٹر محمد رفیع الدین ' " معاشیات سیاسیہ کا قرآنی تصور " از سید اللہ بخش اور " بلا سود بنکاری " از ڈاکٹر ایم ڈی قریشی جیسے عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پرچے میں اظہار و تبصرہ کا دائرہ وسیع تھا ۔ اس پرچے نے علمی حلقوں میں خرد افروزی کے زاویے کو نمایاں کرنے میں اہم خدمات سر انجام دیں ۔

" داستان " ۔ پشاور

ماہ نامہ " داستان " پشاور ۱۹۶۷ء میں زندگی اور فن کی ترجمانی کے لئے میدان عمل میں آیا تھا

، ادارہ میں احمد فراز، راحت لودھی اور محمد طیب صدیقی شامل تھے، لیکن ادارت کے عملی فرائض احمد فراز نے ہی ادا کئے اور اب " داستان " کی یہ اہم اشاعت انہیں کے نام سے منسوب ہوتی ہے۔
"داستان" کی ایک منفرد خوبی اس کا منظوم اداریہ ہے اس میں ایوب خان کے عہد حکومت میں طاری ہونے والی خاموشی کے خلاف آہنگ احتجاج نمایاں نظر آتا ہے۔ تاہم اس اداریے کا اسلوب علامتی ہے اور بات کو رموز کے پردے سے نکالنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اس اداریے سے "داستان" کا مزاج تو متعین کیا جا سکتا ہے لیکن اغراض و مقاصد واضح نہیں ہوتے۔

" داستان " کی ابتدا ایک ماہ نامے کے طور پر کی گئی تھی لیکن اس کی قابل ذکر اشاعت صرف ایک ہے اس پرچے میں فیض احمد فیض، احمد ظفر، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، ریاض انور، قدوس صہبائی کی تخلیقات کے علاوہ جمیل ملک کا مقالہ " قطعہ کا دریچہ " اور احمد ندیم قاسمی کا انتخاب کلام شامل کیا گیا ہے جس سے " داستان " کی ترقی پسندانہ روش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تاہم اس دریچے سے ن۔ م۔ راشد، شاہد احمد دہلوی، جمیلہ ہاشمی، رئیس امروہوی سے بھی ملاقات کی جا سکتی ہے۔ شمیم احمد کا مقالہ " جدید شاعری کے منادین سے " شدید ترین رد عمل ظاہر کرنے والی تحریر ہے۔ اثر فاروقی کا مزاح نامہ " صدارت " میں حقیقت کو ترچھی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس پرچے کے دوسرے قلمکاروں میں جوگندرپال، رضی عزیزی، روحی کنجاہی، افضل منہاس، کشور ناہید، اقبال صفی پوری، مرزا محمود سرحدی، رشیدہ رضویہ، منصور قیصر اور سجاد حیدر شامل ہیں، قاسم حسرت، احمد تنویر، اقبال منہاس، معین تابش اور محمود اقبال اس دور کے نئے لکھنے والے ہیں جو داستان میں سینئر ادبا کے ساتھ موجود ہیں، پشاور سے "داستان" کی اشاعت ایک اہم ادبی واقعہ شمار کیا گیا۔ "سنگ میل" کے بعد اس پرچے کی پذیرائی بھی وسیع ادبی حلقوں میں ہوئی لیکن بوجوہ " داستان " جاری نہ رہ سکا۔ حال ہی میں تاج سعید نے پشاور سے " داستان " کے نام سے ایک نیا پرچہ جاری کیا ہے۔ اس کا ایک شمارہ منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ پرچہ پیش کش کی ندرت اور مضامین کے تنوع سے متاثر کرتا ہے۔

" المعارف " ۔ لاہور

ماہنامہ " المعارف " ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کا ترجمان اور رسالہ " ثقافت " کا متبنیٰ علمی ادبی دینی اور ثقافتی جریدہ ہے۔ اس کا اجرا جنوری ۔ فروری ۱۹۶۸ء کے مشترکہ شمارے سے کیا گیا اور نئے نام کی ضرورت علمی مقاصد کی پوری ترجمانی کے لیے ضروری تصور کی گئی۔ چنانچہ پہلا پرچہ جو خاص نمبر کی صورت میں پیش کیا گیا ادب کی طرف زیادہ راغب نظر آتا ہے اس پرچے میں جائزہ نگاری

کو بھی نمایاں فوقیت دی گئی ہے ۔ سید وقار عظیم نے "اردو ادب" کا' سعید احمد نے "بنگلہ ادب" کا' عبدالصمد خان نے "پشتو ادب" کا جائزہ پیش کیا ہے۔ "المعارف" کی دوسری اہم تبدیلی یہ ہے کہ اب اس میں اصناف شعر کو بھی جگہ دی جانے لگی' چنانچہ فضل احمد کریم فضلی' احسان دانش' خلیفہ عبدالحکیم کی غزلیں بھی ہمیں شریک اشاعت نظر آتی ہیں۔ "المعارف" میں مطبوعات پر تبصرہ نگاری کو مزید وسعت دی گئی اور ارباب ادب کے ذوق مطالعہ کو مہمیز لگانے کے لئے علمی اور ادبی رسائل کے مضامین کا اجمالی تعارف بھی پیش کیا جانے لگا ۔ محمد سرور جامعی کی ادارت اور شیخ محمد اکرام کی نگرانی میں شائع ہونے والا یہ ماہ نامہ در حقیقت تنقید و تحقیق ادب میں عقلی زاویوں کو روشن خیالی سے پیش کرتا تھا۔ "شہنشاہ جہانگیر کا ذوق شعروادب" ڈاکٹر ظہور الدین احمد "خلیفہ عبدالحکیم کا اسلوب تنقید از ممتاز اعجاز "اسلام کی علمی تاریخ میں عبدالحکیم سیالکوٹی کی تصانیف کا مقام" از شبیر احمد غوری "رومی کی تمثیل نگاری" از مجید یزدانی "نصیر الدین ہمایوں کا علمی ذوق" از حفیظ اللہ پھلواری "جدید سوانح نگاری" از امتیاز علی تاج "مرزا غالب نقاد کی حیثیت سے" از غلام رسول مہر "احسان دانش اور ان کی شاعری" از اختر علی "صوبہ سرحد کا پہلا اردو اخبار" از فضل حق قرشی جیسے اعلیٰ پائے کے مضامین سے "المعارف" کی ادبی جہت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

المعارف کا جریدی مزاج متعین ہے ۔ تاہم یہ جامد نظر نہیں آتا ۔ مدیران کے تغیر و تبدل سے اس کے مزاج پر بھی اثرات رونما ہوتے رہے ۔ شیخ محمد اکرام اور محمد سرور جامعی کے زمانے میں اس نے تحقیق ثقافت اور تاریخ و ادب کو اہمیت دی ' محمد سعید شیخ' محمد اسحاق بھٹی اور مولانا محمد حنیف ندوی نے تصوف اور اسلامیات کے زاویے زیادہ اجاگر کئے ۔ محمد عبداللہ قریشی نے اقبالیات کو فروغ دیا۔ "المعارف" کے مدیر اعلیٰ سراج منیر نے اس پرچے کو ایک محور علمی کی حیثیت دی ہے اور اب کتاب و سنت کے ساتھ تحقیق و ادبیات اور تاریخ و سوانح اور فلسفہ و کلام کے تحت جملہ مباحث کو عملی انداز اور ادبی اسلوب میں سمیٹنے کی کاوش کی جا رہی ہے ۔

"تخلیق" ۔ لاہور

ماہنامہ " تخلیق " لاہور اردو کے ممتاز شاعر اور ادبی صحافی جناب اظہر جاوید کی رگ جاں ہے ۔ ایک عرصے تک مختلف رسائل و اخبارات میں ادبی خدمات سر انجام دینے کے بعد اظہر جاوید نے اظہار کو وسعت اور آزادی عطا کرنے کا منصوبہ بنایا تو انہوں نے " تخلیق " جاری کیا ۔ ابتدا میں یہ پرچہ نظم و نثر کا مجموعہ تھا' لیکن ڈیکلریشن ملنے کے بعد ۱۹۶۹ء سے یہ ایک باقاعدہ ادبی جریدے کی صورت میں

شائع ہو رہا ہے۔ اس عرصے میں عذرا اصغر نے بھی ادارتی فرائض ادا کیئے اور اظہر جاوید کا ہاتھ بٹایا۔

" تخلیق " کا بنیادی مقصد اس روشنی کو پھیلانا ہے جو ادب کے بطون سے پھوٹتی ہے اور چاندنی کی طرح دل و جان کو راحت بخشتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اظہر جاوید نے ممتاز ادبا کا تعاون حاصل کیا اور تخلیق کو ایک ایسی "نرسری" بنا دیا جس میں ادب کی نئی پود پروان چڑھتی ہے۔ گذشتہ ربع صدی میں جتنے نئے لکھنے والے " تخلیق " نے روشناس کرائے ہیں اتنے شاید ضخیم اور بڑے ادبی پرچوں نے نہیں کرائے ' " تخلیق " کی دوسری منفرد عطا یہ ہے کہ اس نے ادب کی روشنی میں خواتین کو سفر کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ اردو ادب میں خواتین کی جو گہما گہمی نظر آتی ہے اس میں تخلیق کا حصہ زیادہ ہے۔ اس ضمن میں یہاں پروین عاطف ' راحت بخی ' عذرا اصغر ' خالدہ ملک ' عالیہ بخاری ہالہ ' مرحب قاسمی ' ساجدہ فرحت ' یاسمین سیف ' زہرہ جبیں ' مسرت پراچہ ' رعنا اقبال ' عبیدہ اعظم ' امینہ عنبرین ' نوید بخاری ' شاہدہ ناز ' نوشابہ خاتون ' ارجمند شاہین ' ام لیلیٰ ' عذرا مسعود ' زاہدہ ناز ' فریدہ میرزا ' روزماہ بخاری ' طاہرہ زمان اور شگفتہ نازلی کا ذکر ہی کافی ہے کہ یہ سب " تخلیق " کے صفحات سے نمایاں ہوئیں تھیں۔

" تخلیق " نے افسانہ اور نظم اور غزل کی آبیاری میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ اسے اردو کے ممتاز ادیبوں ' شاعروں اور افسانہ نگاروں کا تعاون حاصل ہے تاہم سفرنامہ اور رپورتاژ کو متعارف کرانے میں "تخلیق" کا کردار دوسری اصناف کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ پروین عاطف ' حمیدہ جبیں ' ہرچرن چاولہ ' فخر زمان اور حسین شاہد کے سفرنامے یہاں بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں ' تخلیق نے نثر میں طنزیہ ' مزاحیہ ادب پیش کرنے میں بھی گہری دلچسپی لی۔ فکر تونسوی ' ضمیر جعفری ' ضیا ساجد میرزا ریاض ' ممتاز مفتی ' سلیم آغا قزلباش ' گلزار وفا چودھری اور عطاء الحق قاسمی کے نادر طنزیے اور خاکے تخلیق کے وسیلے سے ہی ادبی دنیا تک پہنچے۔ " تخلیق " کے صفحات پر مجھے مرزا غالب کے اسلوب میں خطوط کی پیروڈی لکھنے کا شرف حاصل ہوا اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک چلتا رہا۔ "تخلیق" نے طنز یاتی تبصرے کا ایک انداز ستار طاہر کے بطون سے دریافت کیا۔ ان کے " فٹ نوٹس " اس قسم کی پہلی اور شاید آخری تحریریں ہیں۔ جو "تخلیق" نے پیش کیں اور جرأت مندی کا ثبوت دیا۔

" تخلیق " کے بڑے کارناموں میں ۱۹۸۴ء کا "کہانی نمبر" اور ۱۹۸۸ء کا "سندھی ادب و ثقافت نمبر" ہے۔ کہانی نمبر میں صرف اردو کی کہانیاں پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس میں سندھی ' بلوچی ' پنجابی ' کشمیری ' اور پشتو کے علاوہ روسی ' چینی ' فلسطینی اور ڈچ زبان کی کہانیوں کے تراجم بھی شائع کیئے گئے۔ اردو افسانے کی صورت حال پر " تخلیق " کا مذاکرہ بھی ماضی اور حال کے افسانے کو ہم رشتہ کر دیتا ہے۔ مقالات کے حصے میں " اردو افسانے کی کروٹیں " از انور سدید اور "جدید علامتی

افسانہ" از عتیق احمد شامل تھے ' سندھی ادب و ثقافت نمبر اس وقت شائع کیا گیا جب قومی مطلع فرقہ وارانہ اور علاقائی تعصبات سے گرد آلود تھا ' تخلیق نے اس تعصب کو دور کرنے اور قومی محبت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ۔ قومی پریس میں اس نمبر کی آواز بہت دیر تک سنی جاتی رہی ۔ سندھی ادب و ثقافت نمبر کی تدوین میں مرحب قاسمی نے اظہر جاوید کی معاونت کی لیکن "تخلیق" کی ادب نگاری اور ترتیب میں محترمہ عذرا اصغر کی خدمات زیادہ ہیں انہوں نے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۴ء تک "تخلیق" کے ساتھ بے حد مخلصانہ تعاون کیا۔

۱۹۸۴ء میں کہانی نمبر کی اشاعت کے بعد "تخلیق" نے قدرے غیر ادبی لیکن حسن آفریں صورت اختیار کر لی تھی ' تین سال کے بعد "تخلیق" کو احساس ہوا کہ باطن روشن ہو تو چہرے کو خوبصورت بنانے کے لئے غازے کی ضرورت نہیں ہوتی ' اس کا دوسرا فعال اور تابندہ دور "سندھی ادب و ثقافت نمبر" سے شروع ہوا ۔ تخلیق اپنے مخصوص متوازن و معتدل اسلوب میں ادب کی شبانہ روز خدمت میں مصروف ہے اور اظہر جاوید اس کے لئے تن من دھن سب کچھ صرف کر رہے ہیں وہ اردو و ادب کی ساتھ پنجابی زبان و ادب بیش بہا خدمت بھی سرانجام دے رہے ہیں ۔ اردو ادب کے پرچے میں پنجابی ادب کی پیشکش محض ندرت نہیں بلکہ اظہر جاوید کے اس موقف کا عملی اظہار ہے کہ مقامی زبانوں کا میل جول اردو سے بڑھانا ضروری ہے ۔ "سندھی ادب ثقافت نمبر" کے پس پشت بھی قومی یک جہتی کا یہی جذبہ کام کر رہا تھا۔

"تعمیر ملت" ۔ منڈی بہاؤالدین

ہفتہ وار "تعمیر ملت" سید سجاد ابنالوی کی ادارت میں ۱۹۶۵ء میں منڈی بہاؤالدین ضلع گجرات سے جاری ہوا۔ اس کا مقصد علاقائی سطح پر صحافتی خدمات سرانجام دینا تھا۔ ۷ دسمبر ۱۹۶۹ء کے پرچے سے اس نے ادب کے مقاصد کی تکمیل کا عہد بھی کیا اور ماہانہ ادبی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا اور اس مقصد کے لئے "نئے لکھنے والوں کی انجمن" راولپنڈی کے ارکان رشید امجد' اعجاز راہی ' رشید نثار ' ماجد الباقری ' سمیع آہوجہ اور مظہر الاسلام کا تعاون حاصل کر لیا۔ "پنڈی نامہ" کے تحت اس انجمن کی سرگرمیوں کی نشرو اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ۔ ماہنامہ "تعمیر ملت" کا پہلا پرچہ خاصہ ہنگامہ خیز تھا ۔ رشید نثار کا مقالہ "ادب میں منافقت کا مسئلہ" اور مظہر الاسلام کا مضمون "ادب میں تعلقات عامہ کا مسئلہ" نے نہ صرف فوری توجہ حاصل کی بلکہ قہوہ خانوں کی بحث کو سرگرم بنانے میں بھی یہ مضامین مفید اور کامیاب ثابت ہوئے "تعمیر ملت" کے اس ہنگامہ خیز مزاج کو اعجاز راہی کے مضمون "ادب کا بکا ہوا آدمی" رشید نثار کے "شعر میں مابعد الطبیاتی رجحان" منصور قیصر کا "ولیی ٹرانسٹر اور

بدیسی آوازیں" نے بھی قائم رکھا، "تعمیر ملت" کا اداریہ "احوال مسدس" میں بھی ادب کے چبھتے ہوئے مسائل کو موضوع بنایا جاتا تھا "تعمیر ملت" نے جدیدیت کے رویے کو قبول کیا اور تخلیقات شعر و نثر میں نئے تجربات کو اہمیت دی، نیا افسانہ جس کا مرکز راولپنڈی بن رہا تھا اس پرچے میں فروغ پذیر نظر آتا ہے۔ رشید امجد، مظہرالاسلام، سمیع آہوجہ، محمد منشا یاد، ہارون رشید کی نئی افسانوی تحریریں اسی پرچے میں منظر عام پر آیا کرتی تھیں۔ نئے لکھنے والوں کے علاوہ "تعمیر ملت" کو وزیر آغا، جیلانی کامران، منیر نیازی، منظور عارف، شہزاد احمد، مظہر امام، صبا اکرام، ادیب سہیل اور مظفر حنفی جیسے ممتاز ادیبوں کا تعاون بھی حاصل تھا، اس پرچے نے نئے ادب کو متعارف کرانے اور مطلع پر نئی روشنی ہویدا کرنے میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں، تاہم پرچہ تسلسل اشاعت برقرار نہ رکھ سکا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے خلاف ادبی حلقوں میں جو شدید رد عمل پیدا ہو گیا تھا اس نے "تعمیر ملت" کو دل برداشتہ کر دیا اور کچھ عرصہ کے بعد ماہانہ ادبی اشاعتوں کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ صرف ۳۴ صفحات کے اس ادبی جریدے نے جو قیامتیں برپا کیں وہ اب تاریخ ادب کا حصہ بن چکی ہیں۔

"تحریریں"۔ لاہور

لاہور سے زاہدہ صدیقی نے ۱۹۷۰ء میں ماہنامہ "تحریریں" جاری کیا تو ان کا مقصد ایک صاف ستھرا ادبی اور معیاری رسالہ پیش کرنا تھا جو اہل ذوق کو ہر ماہ بلند پایہ ادبی تحریریں مطالعے کے لئے پیش کر سکے، زاہدہ صدیقی کو اس مشکل کام میں حفیظ صدیقی صاحب نے عملی تعاون فراہم کیا اور "تحریریں" کے کئی اچھے پرچے شائع کیے۔ "تحریریں" کا سب سے بڑا کارنامہ "عبدالعزیز خالد نمبر" ہے۔ جو خوبصورت کتابت و طباعت میں تین جلدوں میں شائع ہوا۔ مواد کے لحاظ سے بھی یہ ایک عمدہ پرچہ تھا۔ بعد میں اسی پرچے کے مواد سے "ارمغان عبدالعزیز خالد" کی ترتیب میں معاونت حاصل کی گئی "تحریریں" کے متعدد ضخیم سالنامے بھی اس کی وقیع اشاعتیں شمار کی جا چکی ہیں۔ اس پرچے نے جن اختراعات کو فروغ دینے کی کوشش کی ان میں فرویات، یک مصرعی نظمیں، نثری شاعری کا ذکر غیر اہم نہیں۔

"تحریریں" میں جو ادب پیش کیا جاتا ہے اس میں مشرقی اقدار اور جمالیاتی زاویوں کو ملحوظ نظر رکھا جاتا ہے۔ اس پرچے نے نعت، حمد اور منقبت کے فروغ میں خاطر خواہ خدمات سرانجام دی ہیں، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر وزیر آغا، عارف عبدالمتین، سیف الدین سیف، ڈاکٹر احسان الحق، آثم میرزا، شیر افضل جعفری، حفیظ الرحمٰن احسن، حکیم افتخار فخر، امجد طفیل، قدسیہ ہما، فرخندہ لودھی، قیوم راہی

، اسلم کولسری ، آغا یمین ، اطہر صدیقی ، محمد اظہار الحق کا اس پرچے کو مستقل تعاون حاصل رہا ہے لیکن اب کچھ عرصے سے "تحریریں" کی اشاعت بے قاعدہ سی ہو گئی ہے۔

"تلاش" ۔ لاہور

جنوری ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر ایس آئی سرور نے ماہنامہ "تلاش" لاہور سے جاری کیا ۔ ان کے معاونین میں عابد حسین ، ظفر چشتی اور امجد حسین شامل تھے ، "تلاش" کا خیال تھا کہ معاشرے میں بے راہ روی ادب کے وسیلے سے پھیلائی جا رہی ہے ۔ جس کا سدباب ضروری ہے ۔ حافظ عبدالرحمٰن کا مقالہ "انسان کی روحانی تسکین" پروفیسر ناظر کا مقالہ "انصاف افلاطون کی نظر میں" ڈاکٹر سرور کا ڈاکٹر جاوید اقبال سے انٹرویو اس پرچے کے متذکرہ اصلاحی زاویے پیش کرتے ہیں ، یہ پرچہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکا ۔ کچھ عرصے کے بعد "تلاش" کے نام سے ایک نیا پرچہ لاہور سے ڈاکٹر طارق عزیز نے جاری کیا ۔ لیکن چند اشاعتوں کے بعد یہ بھی بند ہو گیا۔

"لکیریں" ۔ راولپنڈی

ماہنامہ "لکیریں" کے مدیر سبط احمد تھے اور مجلس مشاورت میں اختر ہوشیار پوری ، افضل منہاس اور نثار ناسک کے نام شامل ہیں ، جنوری ۱۹۷۰ء میں "لکیریں" کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس کے پس پردہ یہ احساس موجود تھا کہ راولپنڈی ادب کی تخلیقی سرگرمیوں میں کسی بھی بڑے شہر سے پیچھے نہیں لیکن اس شہر سے کوئی باقاعدہ ادبی رسالہ شائع نہیں ہوتا ۔ چنانچہ "لکیریں" کی صورت میں لکھنے اور پڑھنے والوں کو ۱۹۷۰ء کے نئے سال کے تحفے کے طور پر پہلا باقاعدہ ادبی ماہنامہ پیش کیا گیا ۔ "بسم اللہ" کے تحت ادب میں فروغ پانے والی "ادبی سیاست" کو ہدف ملامت بنایا گیا سبط احمد نے لکھا کہ:

"ہمارے لکھنے والے ادب لکھنے کی نسبت "ادبی سیاست" میں زیادہ سرگرمیوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں .. موجودہ دور میں ادب کے نام پر بے شمار "بے ادبیاں" ہو رہی ہیں ۔ ادب میں ہر گروہ میں چھوٹے چھوٹے کئی گروہ بنتے جا رہے ہیں ۔ رات بھر میں امیر بن جانے کی وبا کے ساتھ ساتھ رات بھر میں "عظیم" بن جانے کا مرض بھی زوروں پر ہے"

"لکیریں" نے لکھا کہ "ہم ادب میں منافقت اور مصلحت پسندی کے قائل نہیں ۔ ہم

"لکیریں" سے نئے ادب اور مثبت نئی ادبی تحریکوں کی ترویج و فروغ کا کام لیں گے"

ماہنامہ "لکیریں" کے پہلے پرچے میں مشتاق قمر کا مقالہ "اردو ادب میں قزاقی کی روایت" اور کمار پاشی کا مضمون "غلط طرفداری کی ایک اور مثال" پیش کئے گئے، اس مزاج اور رویے کو شورش ملک نے "پروموٹر کا مسئلہ" منصور قیصر نے "تنہائی کے تین رویے" اور نذیر قیصر نے "کالی سفید جرابیں" میں قائم رکھا، آغا خالد سعید کا مقالہ "جھوٹے لوگوں کے بارے میں سچی باتیں" اور مقصود زاہدی کا "تنقید اور تنقیص" کے حدود اظہار میں یہ مزاج موجود ہے۔ چنانچہ "لکیریں" کو دلچسپی سے پڑھا گیا اور اس نے جن ناہمواریوں کو اجاگر کیا تھا بعض شخصیات نے اسے ہدف ملامت بھی بنایا۔

رسالہ "لکیریں" پرانے خس و خاشاک کو ہٹا کر اپنی راہ الگ تراش رہا تھا، اس نے نظم، افسانہ اور کتاب کے تجزیاتی مطالعوں کا سلسلہ شروع کیا اور نثار ناسک کی نظم "پرادھ کا گیت" کمار پاشی کی کتاب "سیاہ بر سفید" اور کلام حیدری کے افسانے "اسیر" کے تجزے پیش کئے۔ "آج کا فنکار" کے تحت احمد شمیم، قتیل شفائی اور خلیل رامپوری کا خصوصی تعارف کرایا گیا۔ تخلیقی اصناف کے لئے نسبتاً جدید رویوں کو فروغ دینے کی کاوش کی گئی۔ اس باب میں ہمیں ریاض مجید، باقر علیم، شریف خالد، فاروق حسن، کمار پاشی، شمس نغمان، اسرار عظمت، پرکاش فکری، ضیا شبنمی، عدیم ہاشمی، کیف انصاری، وقار عزیز، مشتاق قمر، ہارون رشید، سیف الرحمٰن سیفی، حمید سہروردی، علی امام اور سلیم الظفر کے نام نمایاں نظر آتے ہیں، مجموعی طور پر "لکیریں" نئے لکھنے والوں کا ترجمان تھا، لیکن اس پر ان اختراعات اور جدتوں کا پرتو نمایاں ہے جو "ادبی دنیا" اور "اوراق" میں آزمائی جا رہی تھیں۔ "لکیریں" ایک بے حد کامیاب اور نئے مزاج کا پرچہ تھا۔ اس کے پہلے پرچے پر جو "داد اور بے داد" ملی وہ ۲۳ خطوط پر محیط ہے اور انور مسعود، ماجد صدیقی، خلیل رامپوری، سلیم اختر، محمد منشایاد، ظفر اقبال، غلام رسول طارق، سلیم بے تاب اور ناصر زیدی نے مختلف نقاط پر بڑی دلچسپ بحث پیدا کی ہے۔ ان جدتوں کے باوجود "لکیریں" زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا۔

"متاع کارواں" ۔ سکھر

"متاع کارواں" سکھر سے سید احمد زیدی نے ۱۹۷۰ء میں خدمت ادب کے بلند عزائم سے جاری کیا تھا ۔ اس کا دوسرا مقصد عوام کی سماجی اور سیاسی راہنمائی بھی تھا ۔ چنانچہ ادبی شعبہ الگ ترتیب دیا گیا اور اس کے مدیر ضیاء الرحمٰن ضیا مقرر ہوئے ۔ انہوں نے "متاع کارواں" کو ادبی مزاج میں ڈھالنے کے لئے بلند پایہ ادبا کا تعاون حاصل کیا اور نواح سکھر کے لکھنے والوں کو خصوصی اہمیت

دی، ان ادبا میں آفاق صدیقی، محسن بھوپالی، شیخ عبدالرزاق راز، منظر ایوبی، حسن شاہ جلالی رضوان، حسن سوز، سلطانہ مہر، ثاقب بختیاری، غریب اداس پوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

"متاع کارواں" کا مقصد صاف ستھرا ادب پیش کرنا تھا لیکن سالنامہ ۱۹۷۳ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی سیاسی روش کو پسند نہ کیا گیا اور یہ تیسرے سال کے آغاز ہی میں منفی تنقید کا نشانہ بن گیا، سید احمد زیدی نے لکھا ہے کہ:

"متاع کارواں" کا یہ سال ایک طوفانی اور ہیجانی سال تھا۔ گوناگوں حوادث سے بر سر جنگ رہنا اور بچ نکلنا اس کی سخت جانی کی دلیل ہے" اس دور میں اقتصادی کمزوری کے ساتھ ادبی متاع تخلیق کی کمیابی کا احساس بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں "متاع کارواں" نے سالنامہ پیش کیا ہے۔ لیکن اس میں ادبی نصب العین کی ناکامی کا اعتراف بھی موجود ہے۔ چنانچہ لکھا گیا کہ:

"ہمارا ذہن اندیشوں سے خالی نہ تھا۔ لیکن شاید اس کے پر پرواز کوتاہ تھا اور وہ ان تمام خطرات کا احاطہ نہ کر سکتا تھا جو لاحق تھے، کچھ عرصہ تک نا مساعد حالات سے جنگ کرنے کے بعد ہم ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔"

اسی سال دسمبر ۷۴ء میں "متاع کارواں" کا ایک خاص نمبر رضوان صاحب نے شائع کیا اور اس کے بعد یہ پرچہ معدوم ہو گیا۔

"متاع کارواں" ابتدا میں ڈیمائی سائز اور مختصر ضخامت میں پیش ہوتا تھا، دو افتادہ شہر کے ادبی پرچے کی حیثیت میں اسے اہمیت ملنا شروع ہو گئی تھی، مارچ ۱۹۷۳ء میں اس کا سائز بڑا کر دیا گیا اور چند مستقل عنوانات "معاشرہ"، "وادی مہران"، "ذرا ٹھہریئے آپ غلطی تو نہیں کر رہے" کا اضافہ کیا گیا۔ کراچی اور لاہور کے ادیبوں۔۔۔ حفیظ جالندھری، ہاشم رضا، رئیس امرہوی، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر وزیر آغا، عدم، احسان دانش، اظہر جاوید، عذرا اصغر، وزیری پانی پتی، کامل القادری۔۔ کا تعاون بھی حاصل کیا گیا اسے دور نو کا نقطۂ آغاز قرار دیا گیا۔ تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ مصاحبے، انشائیے، علاقائی ادب، طنز و مزاح، سائنس فکشن وغیرہ کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا گیا۔ "ولی کے سن وفات پر ایک اور نظر" از فیضان دانش "ادب میں انسان دوستی کی مثال" از وزیری پانی پتی "بدن دریدہ پر ڈاکٹر کریم الدین احمد کا تجزیہ "سیموئیل بیکٹ ایک مطالعہ" از نسیم نیشو فوز "میکبتھ اور شعر کی اہمیت" از ممتاز احمد خان "متاع کارواں" کے آخری دور کے چند قابل ذکر مضامین ہیں۔ ان سب کوششوں کے باوجود "متاع کارواں" زیادہ دیر تک اپنا ادبی سفر جاری نہ رکھ سکا۔

"طلوع افکار" ۔ کراچی

۱۹۷۰ء میں ماہنامہ " طلوع افکار " کراچی کی ابتدا حسین انجم نے کی تھی ' اس کے ابتدائی منتظم سید سبط حسن تھے ' مدیران میں جوش ملیح آبادی ' ڈاکٹر شوکت سبزواری ' محمد احسن فاروقی ' سید محمد باقر شمس اور ڈاکٹر شگفتہ موسوی کے نام شامل ہیں ' ادارۂ تحریر میں احمد رشدی اور سردار منیر احمد کے نام نظر آتے ہیں ' لیکن ان میں مستقل نام صرف حسین انجم کا ہے ' اور یہ تا حال قائم ہے ۔ اس تمام عرصے میں " طلوع افکار " کے فعال مدیران میں تغیر و تبدل ہوتا اور مدیران کی تبدیلی کے ساتھ ہی پرچے کے مزاج کا زاویہ بھی تبدیل ہو جاتا رہا۔ چنانچہ ابتدائی دور میں " طلوع افکار " ترقی پسند نظریات کا حامی اور سرگرم مبلغ تھا ' اس کے لکھنے والوں میں عتیق احمد ' رئیس فروغ ' محمد علی صدیقی اور ریاض صدیقی نمایاں تھے ' ۱۹۷۳ء میں وزیری پانی پتی اور مخدوم منور نے اس کا رخ جدیدیت کی طرف کر دیا اور اس کے ساتھ ہی کلاسیکی ادب کے لئے جگہ بھی نکالی ۔ چنانچہ اب اس میں وزیر آغا ' رشید نثار ' فاروق عثمان ' لطیف عارف ' سلیم احمد ' شمیم ترمذی ' فرخ درانی ' ماجد الباقری کی شرکت بڑی بامعنی ہے اور اب "طلوع افکار" اس لئے مؤثر خیال انگیز اور فعال پرچہ نظر آتا ہے کہ اس پر کسی مخصوص قسم کی نظریاتی قدغن عائد نہیں اور یہ ادبی زاویے کے ہر مبحث کو شریک اشاعت کرنے پر آمادہ ہے " اصول اور تنقید اصول " پر ابو محمد سحر " کافر دہلوی " پر غبار یاور اور " لکھنؤ کی شاعری " پر محمد باقر شمس کے مقالات شائع ہوئے تو "طلوع افکار" نے احتشام حسین اور سجاد ظہیر کی وفات پر ان کے لئے خصوصی اشاعتیں بھی پیش کیں ' اور پھر "جنس اور ادب نمبر" بھی شائع کیا جو ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔

"طلوع افکار" نے اپنی زندگی میں متعدد عروج و زوال کے موسم دیکھے ہیں اور یہ خاصہ گرم سرد چشیدہ ادبی جریدہ ہے ۔ محمود ہیمانی کی ادارت میں " سر آغا خان نمبر " کی اشاعت اس کی زندگی اور جہت کا ایک اہم واقعہ ہے ۔ تعطل کے چند وقفوں کے بعد " طلوع افکار " کی اشاعت میں اب پھر باقاعدگی آ گئی ہے اور یہ اپنے سابقہ ترقی پسند مزاج کی طرف لوٹ آیا ہے ۔ اب اس کے ادارہ تحریر میں مظہر جمیل ، مسلم شمیم اور ریاض صدیقی شامل ہیں اور ان کے معاونین حسن ناصر اور جاوید انجم ہیں۔ "طلوع افکار" نے ظہیر کاشمیری ' سبط حسن اور حسن حمیدی پر جامع اور بامعنی اشاعتیں پیش کی ہیں ' اس کے لکھنے والوں میں احمد ہمدانی ' جوگندر پال ' نجم الحسن رضوی ' عتیق احمد ' ڈاکٹر ش اختر ' دامق جونپوری ' محسن احسان ' حزیں لدھیانوی ' مظہر جمیل ' نقاش کاظمی ' نعیم آروی ' کوکب جمیل ' ممتاز احمد خان ' مقصود زاہدی اور عارف شفیق شامل ہیں ' "طلوع افکار" نے اپنا دامن سب اصناف ادب کے لئے کشادہ کر رکھا ہے۔

الفاظ - کراچی

ضخیم ادبی پرچوں کے دور میں نسیم درانی نے ۱۹۷۱ء میں کراچی سے جدید ادب کا نمائندہ رسالہ "الفاظ" نکالا۔ اگرچہ "الفاظ" کی ماہانہ اشاعت باقاعدہ نہیں تاہم یہ گذشتہ ۱۷ سالہ سے جدید ادب کی تخلیقات اور لکھنے والوں کے ایک بڑے طبقے کو متعارف کرانے میں پیش پیش ہے۔ "الفاظ" کی منفرد عطا یہ ہے کہ اس نے اپنی ضخامت کی مختصر حدوں میں سمٹ کر بھی متعدد ادبا کا ادبی تشخص قائم کرنے میں بہت اچھی خدمت سرانجام دی' اس ضمن میں سلیم احمد' احمد ہمدانی' کرارنوری' جیلانی بانو' خواجہ احمد عباس' فرید جاوید' رسا چغتائی' سرشار صدیقی' فارغ بخاری اور سلیم اختر پر "الفاظ" کے گوشے ان کے فکر و فن کو سمجھنے میں معاونت کرتے ہیں۔ "الفاظ" نے نئے ادیب کو قلم کا اعتماد حاصل کرنے میں ہمیشہ مدد دی ہے' اور افسر آذر' حسن اکبر کمال' احمد ہمدانی' مشرف احمد' سحر انصاری' کرار نوری' قمر جمیل' عبیداللہ علیم' جمیل اختر جیسے ادبا پر مشتمل "الفاظ" کا ایک مضبوط حلقہ بھی بنایا ہے۔ "الفاظ" نے اردو افسانے کی ابعاد کو روشن کرنے' نثری نظم کو متعارف کرانے اور جدید نظم کی تحریک کو فروغ دینے کی سعی بھی کی ہے۔ چنانچہ یہ پرچہ صرف نسیم درانی کا پرچہ نظر نہیں آتا بلکہ اس کے پس پشت پورا ایک حلقہ تحریکی صورت میں موجود ہے۔ "الفاظ" اردو کا خاموش خدمت گزار ہے اس کے تنقیدی مضامین میں نو کیلا پن نمایاں ہوتا ہے۔ اس نے پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کے موضوعات کو اہمیت دی' علامتی افسانے پر جاندار بحثیں شائع کیں اور یوں ادب کے پورے منظر کو نئے تصورات سے آشنا کرانے کی عملی جدو جہد کی۔ رضیہ انوار رضی' سیما احمد' (اب سیما شکیب)' اقبال قمر' شاہدہ تبسم' عارف شفیق' ماہ طلعت زاہدی' طاہر آفریدی' ن۔م۔دانش' رضوانہ شمیم' طارق بشیر کی بہت سی ابتدائی تحریریں "الفاظ" کے صفحات پر ہی ابھری تھیں۔

"آرٹس انٹرنیشنل" - کراچی

اردو میں "آرٹس" کے موضوع پر ایک فکر انگیز مگر سادہ رسالہ پیش کرنا نسیم درانی کے ذہن کی اختراع تھی اور اس میں مصور جمیل نقش کا عملی تعاون بھی شامل تھا۔ ۱۹۷۰ء میں اس پرچے کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا' لیکن شائع ہوتے ہی تعطل اشاعت کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد "آرٹس انٹرنیشنل" کو زندہ رکھنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی اور اب یہ لمبے وقفوں سے شائع ہونے والا فن کا

ایسا رسالہ ہے جس میں فنی موضوعات پر اردو کے ادبا مقالات پیش کرتے ہیں ' اب تک جو مضامین چھپ چکے ہیں ان میں نسیم درانی کا " پال کلی کا فن " زوار حسین کا " تاثر پسند تحریک " محبوب اللہ مجیب کا " مغل تعمیرات کا فنی پہلو " آغا بابر کا " جرمن بیلے کی انجمن آرائی " شمس کنول کا " رقص کا فن " نسیم نیشوفوز کا " فلم اور ادبی اقدار " نوشاد علی کا " کلاسیکی موسیقی " سمیع انور کا " عبدالرحمٰن چغتائی " شاہد سلیم کا " شاکر علی " اور ابوالکلام کا مقالہ " ٹیگور کی مصوری " چند ایسے مقالات ہیں جن سے اس رسالے کے تنوع اور وسیع المجتی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ "آرٹس انٹرنیشنل" زیبائش سے محروم ہونے کے باوجود ایک زیبا جریدہ ہے ۔ اس کا خاکی کھردرا سرورق اپنے اندر نان کمرشل جاذبیت رکھتا ہے ۔ "آرٹس انٹرنیشنل" کی خیال انگیزی متاثر کرتی ہے لیکن اس کی اشاعت کے طویل وقفے اس کے اثر و عمل کو محدود کر رہے ہیں ۔

"شام و سحر" ۔ لاہور

جنوری ۱۹۷۴ء میں ماہنامہ " شام و سحر " کا لاہور سے اجرا شیخ صفدر علی نے کیا ' اس کے مدیران معاون خالد شفیق بٹ اور آتش رومانی تھے " شام و سحر " نے ادب کے ذوق کی پرورش کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور اسے خالد بزمی ' نظیر لدھیانوی ' طفیل دارا ' راجہ رشید محمود ' عارف شفیق ' لطیف ساحل ' رشید کامل اور متعدد کلاسیکی روایت کے ادیبوں کا تعاون حاصل تھا ۔ اس کا ایک رخ مذہب کی طرف بھی تھا ۔ خالد شفیق نے "شام و سحر" کے سالناموں کو نعت کے لئے وقف کیا اور پانچ ضخیم اور اعلیٰ پائے کے نعت نمبر شائع کئے اب خالد شفیق کی جگہ شبیہ الحسن رضوی نے لے لی ہے ۔ ان کے عہد ادارت میں شخصیات پر مختصر ضخامت کے نمبر چھاپنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے ۔ "شام و سحر" نے اب تک ظہیر کاشمیری ' عظیم قریشی ' شکیب جلالی اور ساحر لدھیانوی پر چند اچھی اشاعتیں پیش کی ہیں ۔ "شام و سحر" نے تا حال باقاعدگی اشاعت کی روایت کو قائم رکھا ہوا ہے ۔

"پاکستانی ادب" ۔ کراچی

ماہنامہ " پاکستانی ادب " نومبر ۱۹۷۴ء میں سعیدہ گزدر ' فہمیدہ ریاض اور مجاہد علی کی ادارت میں کراچی سے جاری ہوا ۔ اس پرچے کی نظریاتی جہت کا مرکز و محور سید سبط حسن تھے ' چنانچہ پہلے پرچے میں ہی اس کی ترقی پسندانہ روش ان الفاظ میں آشکار کر دی گئی ۔

" ہم کیا چاہتے ہیں ؟ وہی جو پاکستان کا ہر محب وطن چاہتا ہے ۔ یعنی ایسا ادب جو زندگی کا ترجمان اور نقاد ہو ' البتہ زندگی وہ بھی ہے جس کے شجر حیات میں حسن کے پھول کھلتے ہیں اور وہ بھی جو آکاس بیل کی طرح میوہ دار درختوں کا رس چوس لیتی ہے۔"

" پاکستانی ادب " کو احساس یہ تھا کہ ہر ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر نظریاتی جنگ میں شامل ہے ۔ چنانچہ اس جنگ میں " پاکستانی ادب " بھی شریک ہو گیا اور اس نے ایسی تخلیقات اور مضامین کی اشاعت کا بالخصوص اہتمام کیا جن سے ترقی پسند نظریات کو فروغ مل سکتا تھا ' اس ضمن میں مجتبٰی حسین کا مقالہ " تحریک اور ادب " نجم حسین سید کا "سادھو سے سورما تک" سبط حسن کا " پاکستانی تہذیب کی پہچان " زبیر صدیقی کا " غرور عشق کا بانکپن" عابد حسن منٹو کا "موجودہ دور میں ترقی پسند ادب کے تقاضے" احمد سلیم کا "پنجابی زبان میں احتجاجی ادب کی روایت" میر احمد حسن رضوی کا "اعتماد کا بحران" کو یہاں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

" پاکستانی ادب " کی نظموں ' غزلوں اور افسانوں کے تخلیق کار بھی بیشتر اس تحریک کے متاثرین تھے ۔ ان میں فیض احمد فیض ' نجم حسین سید ' فارغ بخاری ' علی سردار جعفری ' حزیں لدھیانوی ' حسن اعرانی ' سعیدہ گزدر ' محمد علی صدیقی ' الطاف احمد قریشی ' امر جلیل ' حسن عابدی کے نام اہم ہیں ' " پاکستانی ادب " نے " نئی نسل نمبر " اور " امیر خسرو نمبر " اپنے مخصوص زاویے سے پیش کئے۔

" پاکستانی ادب " ایک اچھا صاف ستھرا نظریاتی پرچہ تھا ' اس نے نظریے کی تبلیغ کے لئے ادب کو استعمال کرنے کے سابقہ آزمودہ حربے کی تجدید کی ' اور بحث و نظر کا اچھا معیار پیش کیا ۔ لیکن بوجوہ یہ پرچہ بھی زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا اور بند ہو گیا ۔

"سورج " ۔ لاہور

تسلیم احمد تصور نے جنوری ۱۹۷۱ء میں ماہنامہ " سورج " طلبہ کی طرف سے عوام کی خدمت میں پیش کیا ۔ "سورج" کی مجلس ادارت میں شبیر احمد جوش ' عابدہ گل ' شیریں فاروقی ' اور جمیل انجم قاضی شامل تھے ' اور اس میں کشور ناہید ' احمد ندیم قاسمی ' سلیم طاہر ' نشاط فاطمہ ' جیلانی کامران اور عاصی کرنالی کے مضامین شریک اشاعت ہوتے تھے۔ "سورج" تجرباتی قسم کا پرچہ تھا ۔ اس کی ادبی جہت بہت زیادہ نمایاں نہیں تھی ۔ تسلیم احمد تصور نے اسے صوری اور معنوی لحاظ سے خوبصورت بنانے کی پوری کوشش کی ۔ یہ پرچہ بھی جلد ہی منظر ادب سے غائب ہو گیا ۔

"اسلامی تعلیم" ۔ لاہور

" اسلامی تعلیم " آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کا دو ماہی رسالہ تھا ۔ یہ مارچ ۱۹۷۲ء میں لاہور سے جاری ہوا ۔ اس کا بنیادی مقصد جدید علمی تحقیقات کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی ازلی و ابدی صداقت کی وضاحت و تشریح تھا ۔ اس میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین ' مظفر حسین شیخ ' یوسف قرضاوی ' ڈاکٹر محمد ریاض خان ' ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے مضامین شائع ہوئے ۔ ادارت کے فرائض سید اللہ بخش گیلانی اور مظفر حسین انجام دیتے تھے ۔ " اسلامی تعلیم " فکر و نظر کو سیراب کرنے والا جریدہ تھا ۔ اقبالیات اس کا ایک اہم موضوع تھا ۔ ڈاکٹر محمد ریاض کا مقالہ " اقبال کا تصور توحید " اس پرچے ہی میں شائع ہوا تھا ۔

"غالب" ۔ کراچی

سہ ماہی جریدہ " غالب " کراچی سے ادارہ یادگار غالب کے زیر اہتمام جنوری ۱۹۷۵ء میں مرزا ظفر الحسن نے جاری کیا فیض احمد فیض اس کے مدیر اعلیٰ قرار پائے ۔ لیکن پرچے کی ہیئت اور اسلوب ترتیب پر مرزا ظفر الحسن حاوی نظر آتے ہیں ۔ " غالب " کے پہلے اداریے میں انہوں نے لکھا کہ "رسالہ نکالنا ادارے (یادگار غالب) کی ایک آئینی ذمہ داری تھی جو مالی مشکلات کی وجہ سے آج تک پوری نہ کی جا سکی، مگر آج پوری کی جا رہی ہے.. تمام تلخ تجربوں کے باوجود ایک نئی شمع روشن کرنی تھی سو وہ آج روشن ہوئی... جس طرح ادارے اور لائبریری نے ادبی دنیا میں چھوٹا سا مقام پیدا کیا ہے کوشش کی جائے گی کہ یہ جریدہ بھی کوئی حیثیت حاصل کر لے"(۵۱)

مرزا ظفر الحسن کی محنت اور ایچ نے " غالب " کو ایک منفرد جریدہ بنایا اور ادبی دنیا میں اس نے ایک جداگانہ حیثیت بھی حاصل کر لی " غالبیات " اس پرچے کا ایک منفرد اور مخصوص موضوع تھا جس میں تحقیق و تنقید غالب کو اہمیت دی جاتی تھی ۔ " غالب " کے ہر پرچے میں کچھ صفحات فیض صاحب کے لئے مختص کے جاتے تھے اور اس میں فیض صاحب کے تازہ کلام کے علاوہ ان کی نثر بھی پیش کی جاتی تھی "غالب" میں ادیبوں کے خطوط اور ان کی یادیں جمع کرنے کی کاوش بھی کی گئی ' اس ضمن میں سجاد ظہیر ' اور قاضی عبدالغفار کے خطوط اور محمد ایوب قادری اور عرش ملسیانی کی یاد نگاری کی مثال دی جا سکتی ہے ۔ ایک اہم عنوان " پرانے شاعر نیا کلام " تھا جس کے تحت ممتاز محقق مشفق

خواجہ کے تحقیقی مضامین چھپتے تھے ۔ یہاں جسونت سنگھ پروانہ عرف کاکا جی کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے جو راجہ بنی بہادر کے بیٹے اور عہد مصحفی کے شاعر تھے ۔ ان کا تعارف مشفق خواجہ نے اس انداز میں کرایا کہ وہ عصر حاضر کے بہت سے معروف شعرا سے بھی ممتاز نظر آنے لگے ۔

"غالب" میں طنز و مزاح کی اس روایت کو پروان چڑھانے کی سعی کی گئی جس میں دل روتا ہے لیکن لب مسکراتے ہیں ' مرزا ظفر الحسن اور یوسف ناظم نے چند اعلیٰ پائے کے مزاح پارے پیش کیے ۔ "کتاب اور کتب خانہ " کے زیر عنوان ایک مفید سلسلہ کتب خانوں کا تعارف تھا ۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ کا مضمون " میرے کتب خانے میں کیا ہے؟" اس کی ایک عمدہ مثال ہے ۔ تحقیقی ذیل میں ڈاکٹر گوپی چند کا "امیر خسرو کا ہندوی کلام" ڈاکٹر عبدالرزاق کا "ذوق کے اولین استاد" ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا "کیا نسخہ امروہہ جعلی ہے" نے اس پرچے میں تلاش نوادرات میں حصہ لیا ۔

غالبیات کی طرح اقبالیات بھی رسالہ " غالب " کا ایک اہم موضوع تھا ۔ اقبال کے جشن صد سالہ کی رعایت سے " غالب " نے مشفق خواجہ اور ڈاکٹر معین الدین عقیل کی معاونت سے ایک "اقبال نمبر" شائع کیا جو ایسے مضامین پر مشتمل تھا جو اپنے وقت کے معروف و محترم رسائل میں شائع ہوئے تھے لیکن اب عام لوگوں کی دسترس سے باہر تھے۔ اس ضمن میں آغا حیدر حسن مرزا ' سکندر علی وجد ' عبدالقادر سروری ' ظہیر الدین احمد ' اور احضاد حسین کے ساتھ فیض احمد فیض ' فروغ احمد ' نجیب جمال ' مختار صدیقی اور پاشا رحمٰن کے مضامین کی اشاعت بھی کی گئی ۔ ستمبر ۱۹۷۷ء میں "اقبال نمبر" اس کا آخری شمارہ تھا ۔ ۱۹۸۴ء میں " غالب " کو جاری کرنے والے دو بانی ارکان یعنی مرزا ظفر الحسن اور فیض صاحب بھی دنیا سے رخصت ہو گئے ۔

" غالب " کا دوسرا دور جولائی تا دسمبر ۱۹۸۷ء اور جنوری تا جون ۱۹۸۸ء کی مشترکہ اشاعت سے ۱۹۸۸ء میں ہوا۔ اب یہ ششماہی جریدہ ہے اور اس کے مدیران مختار زمن اور مشفق خواجہ ہیں۔ اداریہ میں مختار زمن نے لکھا کہ:

" جس عظیم شخصیت کے نام پر یہ ادارہ (یادگارر غالب) قائم کیا گیا ہے وہ تو ایسے جگرے کا آدمی تھا کہ شمع ماتم خانہ کو برق سے روشن کرتا تھا ۔ لہٰذا اس کے نام کا رسالہ اس کے نام کی طرح زندہ و پائندہ رہنا چاہئے ۔ مشکلات خواہ کتنی ہوں رسالہ " غالب " کا اجراء علمی و ادبی دنیا کا ایک قرض ہے جسے چکانا ضروری ہے "

" غالب " کا یہ شمارہ متعدد زاویوں سے متاثر کرتا ہے ۔ اس میں غالب کے علاوہ فیض ' صادقین ' ابوالفضل صدیقی ' اور مرزا ظفر الحسن کے لئے گوشے مخصوص کئے گئے ۔ "اشخاص و اذکار" کے تحت "پیر حسام الدین راشدی" پر شان الحق حقی "قاضی عبدالودود" پر گیان چند اور "ڈاکٹر عندلیب

شادانی" پر نظیر صدیقی نے چند عمدہ شخصیت اور فن نامے پیش کئے گئے۔ محمد حسن عسکری کے سبط حسن کے نام نادر خطوط منظر عام پر لائے گئے۔ بحث و نظر کے حصے میں حیات اللہ انصاری کا مقالہ "افسانوی اصناف ادب" جگن ناتھ آزاد کا "ظفر کی شاعری اور میں" اور ڈاکٹر حنیف فوق کا مقالہ "تجدید اور تحدید" ان موضوعات کو نئے انداز اور زاویوں سے پیش کرتے ہیں۔

رسالہ "غالب" کی یہ ابتدا نئے خوش آئند دور کا آغاز ہے۔ اس پرچے میں تخلیقی اصناف کے لئے گنجائش نہیں۔ لیکن پرچے کے لئے جو مقالات منتخب کئے گئے ان میں سوانحی اور تاریخی مواد افسانے جیسا پر لطف اور لذیذ ہے اور قاری اس کا ایک ایک لفظ پڑھنے میں انبساط محسوس کرتا ہے۔

"احساس" ۔ پشاور

۱۹۷۵ء میں جب ویت نام کی جنگ اختتام کو پہنچ گئی اور دنیا کو امن اور سکون کا سانس لینے کی مہلت ملی تو پشاور سے مسرت خاطر غزنوی کی ادارت میں "کلچرل فیملی میگزین" کے طور پر ماہنامہ "احساس" کا اجرا ہوا۔ اس کی پہلی اہم اشاعت "جنگ نمبر" تھی جس میں ویت نام کی جنگ کے پس منظر اور اثرات کو اجاگر کرنے کے علاوہ ادیبوں اور شاعروں کے رد عمل کو اہمیت دی گئی تھی' اور جنگ کی تباہ کاری کا عکس مصوری اور شاعری کے علاوہ افسانے کے قالب میں بھی پیش کیا گیا۔ اشفاق احمد کے انوکھے رسالہ "داستان گو" کی طرح "احساس" بھی ایک منفرد پرچہ تھا اور اس کا استقبال بھی بڑی خندہ پیشانی سے کیا گیا۔ اس کے پس پردہ مدیر خاطر غزنوی تھے انہوں نے "احساس" کو عالمی نوعیت کا پرچہ بنانے کی کوشش کی اور تراجم کو پیش کرنے میں زیادہ دلچسپی لی۔ چنانچہ جاپان' فرانس' کیوبا' چیکو سلاو یکیہ' جرمنی' روس اور امریکہ کے ادبی شہ پاروں کے پہلو بہ پہلو پاکستان کا تخلیقی ادب بھی شائع ہوتا تو موازنہ کرنے کی سہولت میسر آجاتی۔ نیز دنیا کے ادب سے آگہی کا موقعہ بھی ملتا۔ "احساس" نے ایک مخصوص حلقہ اثر پیدا کیا لیکن یہ حلقہ شاید زیادہ وسیع نہیں تھا اس لئے "احساس" کی باقاعدہ اشاعت میں رخنہ پڑنے لگا اور کچھ عرصے کے بعد "احساس" خاص نمبروں کا پرچہ بن گیا اس ضمن میں احساس کا "مولانا رومی نمبر" "ماؤزے تنگ نمبر" "کہانی نمبر" "اقبال نمبر" "رقص و موسیقی نمبر" اور "عالمی کہانی نمبر" خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کے لئے خاطر غزنوی نے اعلیٰ معیار کا مواد فراہم کیا' متعدد موضوعات پر نیا کام کرایا اور یوں اردو ادب کو عالمی ادب کے شانہ بشانہ رونمائی کا موقعہ دیا۔ "احساس" کی سب سے انوکھی پیش کش "نودمیدہ" تھی جس میں پشاور اور نواح پشاور کے نئے شعرا کا تعارف بالکل نئے انداز میں کرایا گیا تھا اور ان کی شاعری کا ایک نمائندہ انتخاب بھی پیش کیا گیا تھا۔

"احساس" کی ادبی عطا منفرد نوعیت کی ہے۔ اس نے لکھنے والوں کو نئی جہتیں دیں اور پڑھنے والوں کو رسمی قسم کی تحریروں سے نکال کر غیر معمولی عالمی شہ پاروں کے مطالعے کا عادی بنانے کی کوشش کی۔ لیکن ۱۹۸۱ء کے بعد یہ پرچہ بھی بے قاعدگی اشاعت اور مالی عدم توازن کے علاوہ خاطر غزنوی صاحب کی منصبی اور سماجی مصروفیات کا شکار ہو گیا۔

"جدید ادب" ۔ خان پور

ماہنامہ "جدید ادب" کے نام سے ایک دور افتادہ شہر خان پور سے حیدر قریشی نے ایک فعال اور ادبی لحاظ سے سرگرم جریدہ جاری کیا، تو اہل ادب نے اس پرچے کی طرف حیرت سے دیکھا اور بہت تھوڑے عرصے میں "جدید ادب" کو اہمیت کا مقام مل گیا، صفدر صدیق رضی اور فرحت نواز "جدید ادب" کے مرتبین میں شامل تھے اور یہ ادب کی ایک ایسی نئی جماعت تھی جس کے خلوص و خدمت نے اپنے لئے نئی راہیں تراش لیں۔

"جدید ادب" نے ادب کے تازہ مسائل کو اہمیت دی، نیا افسانہ، نئی نظم، ہائیکو، آزاد غزل کے موضوعات پر معنی خیز مباحث پیدا کئے، پاکستانی ادب اور تہذیب کے موضوع پر ڈاکٹر سید عبداللہ، شمیم احمد اور وزیر آغا کے مضامین پیش کئے۔ "فن اور شخصیت" اس کا ایک مخصوص حصہ تھا، جس کے تحت ممتاز مفتی، جیلانی کامران، مظہر امام، شمیم احمد، جمیل جالبی، اور متعدد دوسرے ادیبوں پر گوشے پیش کئے گئے۔ ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال پر ایک خصوصی اشاعت چھاپی گئی، خصوصی مطالعے کے تحت احمد ظفر، اظہر ادیب، مناظر عاشق ہرگانوی، فرحت نواز، ثمینہ راجہ اور متعدد دوسرے شعرا اور شاعرات کی پانچ یا چھ غزلیں اور نظمیں اور ان پر تعارفی مضامین پیش کئے گئے۔ "جدید ادب" کا رجحان واضح طور پر وزیر آغا کے دبستان سرگودھا کی طرف تھا، اس لئے اس نے طغیان فکر و نظر پیدا کیا اور اس کی صدائے بازگشت پورے برصغیر میں سنی گئی۔ حیدر قریشی نے خان پور چھوڑا تو یہ پرچہ بھی بند ہو گیا۔

"مجلّہ تحقیق" ۔ لاہور

کلیہ علوم اسلامیہ و ادبیات شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۷۸ء میں "مجلّہ تحقیق" جاری کیا گیا اس کا مقصد علوم شرقیہ سے متعلق اساتذہ کے تحقیقی کارناموں کی اشاعت تھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی مجلّہ تحقیق کے پہلے مدیر مقرر ہوئے' انھوں نے اس پرچے کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

" پاکستان وجود میں آنے کے بعد ہمارے تحقیقی مجلّے ایک ایک کر کے دم توڑ چکے ہیں۔ لے دے کے ایک رسالہ " اردو " گردش حالات کا مقابلہ کر رہا ہے۔ لیکن اس کا موضوع بھی بیشتر اردو ادب کی تحقیق تک محدود ہے۔ "صحیفہ" دس برس کی تحقیقی زندگی کے بعد اب ایک ادبی پرچے میں منتقل ہو چکا ہے.. پنجاب یونیورسٹی نے اساتذہ کے تحقیقی مقالات کو شائع کرنے کے لئے اس جریدے کا ڈول ڈالا ہے"

"مجلّہ تحقیق" میں عربی' فارسی' اردو' پنجابی' اسلامیات' اقبالیات' تالیف و ترجمہ اور اردو معارف اسلامیہ کے سرمایۂ تحقیق کو شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا اور اس کا اولیں معیار بھی ڈاکٹر وحید قریشی نے پہلے شمارے میں قائم کر دیا اس پرچے میں مشفق خواجہ کا مقالہ " شاہ قدرت اللہ قدرت " ڈاکٹر وحید قریشی کا " خط بہار " ڈاکٹر نسرین اختر کا " منصور حلاج رومی کی نظر میں " ڈاکٹر بشیر حسین کا "کلام محمود کے نادر لغات و اصطلاحات"۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا "مکاتیب اقبال پر ایک تنقیدی نظر" اور سید محمد اکرم کا مقالہ "شیدا فتح پوری" شائع ہوئے۔ "مجلّہ تحقیق" کا دائرہ عمل چونکہ وسیع تھا' اس لئے اس کے بعد کے شماروں میں متعدد نئے موضوعات کو سمیٹنے کی کوشش بھی کی گئی۔ اس ضمن میں "سراج الاخبار" پر فضل حق قرشی کا تحقیقی مقالہ "جنگ نامہ احمد شاہ درانی" پر محمد اقبال مجددی کا مقالہ' ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کا "الخصائص الصغریٰ کا مقدمہ اور متن" ڈاکٹر عبدالشکور احسن کا "فارسی قونیات" تحقیقی نوادرات کا درجہ رکھتے ہیں۔ "مجلّہ تحقیق" کی اشاعت اب خاصی بے قاعدہ ہو گئی ہے۔

"نئی نسلیں" - کراچی

کراچی سے " نئی نسلیں " کے نام سے ایک جدید وضع کا ماہ نامہ مئی ۱۹۷۸ء میں ذکاء الرحمٰن نے جاری کیا۔ اس کے ادارتی شعبہ میں نگار یاسمین ان کی معاون تھیں۔ " نئی نسلیں " کا پہلا باقاعدہ شمارہ ستمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ ذکاء الرحمٰن نے لکھا کہ:

" نئی نسلیں " دوسرے بے شمار ادبی جریدوں کی طرح محض ایک ادبی جریدہ نہیں ہے اور نہ ہی معروف ادبی نظریوں کے ان گنت مبلغوں میں سے ایک مبلغ ہے ... اس کی پشت پر نظریے اور عملیے سے تشکیل پائی ہوئی ایک پوری مابعدالطبیعات ہے"

"نئی نسلیں" نے ادبی پیشہ وری کے خلاف آواز بلند کی، لیکن اس کے ساتھ ہی تہذیب کے اس عمل کو بھی اختیار کیا جو نوجدیدیت کے نام پر افتخار جالب نے جاری کیا تھا، اس پرچے کے لکھنے والوں میں افتخار جالب، عبیداللہ علیم، زاہدہ حنا، ثروت حسین، سمیع آہوجہ، نسرین انجم بھٹی، شائستہ حبیب، اظہر نیاز، افضال احمد سید، صغیر ملال شامل تھے، اس پرچے میں نئے خیال کو نئی ہیت اور نئے انداز کے علاوہ نئی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی، اہل قلم کا انداز جارحانہ اور استدلال غیر متوازن تھا۔ چنانچہ "نئی نسلیں" کے اثر و عمل کا دائرہ بھی محدود ہو گیا اور چند اشاعتوں کے بعد ہی "نئی نسلیں" معدوم ہو گیا۔ یہ پرچہ ادب اور فن کا خوبصورت امتزاج پیش کرتا اور ذہن کو نئے خطوط پر منقلب کرنے کی سعی کرتا رہا۔ لیکن اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ "نئی نسلیں" کو تجرباتی قسم کا پرچہ کہنا ہی مناسب ہے۔

"اظہار" ۔ کراچی

کراچی سے ۱۹۷۹ء میں ماہنامہ "اظہار" منظر عام پر آیا اس کی ترتیب و تدوین کریم بخش خالد کے سپرد تھی۔ "اظہار" حکومت سندھ کے شعبہ مطبوعات و اطلاعات کا جریدہ ہے۔ بظاہر اس کے پیش نظر "ماہ نو" کی طرح ادب کی خدمت ہے لیکن اس پر سرکاری مہر اس قدر پختہ لگی ہوئی ہے کہ ادبی مزاج پوری طرح نکھر نہیں سکا، اس کے لکھنے والوں میں اس دور کے بیشتر نئے اور پرانے ادبا شامل ہیں لیکن یہ سب مل کر بھی "اظہار" کی شخصیت کو نکھار نہیں سکے، اور باقاعدہ چھپنے کے باوجود "اظہار" کا حلقہ اثر محدود ہے۔

"محراب" ۔ لاہور

۱۹۷۸ء میں لاہور سے احمد مشتاق اور سہیل احمد خان نے منتخب غیر مطبوعہ ادبی تحریروں کا کتابی سلسلہ "محراب" جاری کیا تو اس کا ایک بنیادی مقصد "حلقہ ارباب ذوق" کے جریدہ "نئی تحریریں" کے تجربے کو نئے خطوط پر آراستہ کرنا تھا، یہ کتابی سلسلہ جریدی نوعیت کا تھا، ابتدا میں "محراب" کا پرچہ بالعموم ایک سال کے وقفے سے شائع ہوتا تھا۔ لیکن پھر اس میں تعطل واقع ہونے لگا۔ لیکن "محراب" چونکہ کتابی نوعیت کا سلسلہ تھا اس لئے زمانی توقف اس کی اہمیت پر اثر انداز نہیں ہوا اور ضخیم ادبی پرچوں کی طرح "محراب" جب بھی منظر ادب پر طلوع ہوتا ہے تو یہ ادبی دنیا کا ایک اہم

اشاعتی واقعہ بن جاتا ہے۔

" محراب " کے مدیران نے کبھی اداراتی شذرہ نہیں لکھا ' اس لیے " محراب " کے مقاصد اشاعت ظاہر نہیں ہوتے تاہم اس کا ایک داخلی مزاج ہے اور اس کا ذاتی تشخص بھی مرتب ہوتا ہے۔ "محراب" جدیدیت کو محمد حسن عسکری کے زاویوں سے قبول کرتا اور باطن کی روحانی آواز پر گوش تخلیق وا کرتا ہے۔ "محراب" نے ہیئت و اظہار کے تجربات کو فرانسیسی تخلیق کاروں کے اسلوب میں فروغ دینے کی کوشش کی اور ادب کو اشتہاری پمفلٹ بننے کی اجازت نہیں دی' انتظار حسین' محمد سلیم الرحمن' صلاح الدین عادل' منیر نیازی' صلاح الدین محمود' جیلانی کامران' محمد اسحاق میر' اعجاز احمد' شمیم حنفی' سلیم احمد' مظفر علی سید' فاروق حسن اور منیر الدین احمد "محراب" کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

"محراب" ادب میں داخلی انقلاب اور خاموش تغیر کا علمبردار نظر آتا ہے۔ مرتبین نے اگرچہ کوئی راہ متعین نہیں کی لیکن ان کا مزاج اس جریدے کی منتخب تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ "محراب" نے ادیب کو نمایاں کرنے کے بجائے فن پارے کی روشنی کو منعکس کرنے کی کوشش کی ہے' اور جہاں ادیب کو موضوع بنایا گیا ہے وہاں بھی ذاتی کارگزاریوں کے گوشوارے فراہم کرنے کے بجائے فن پاروں کے مدار میں بحث کی گئی ہے۔ محراب کا انداز تجزیاتی ہے۔ اس ضمن میں "بستی" پر آفتاب احمد اور مظفر علی سید کے مضامین' انتظار حسین کا مقالہ "افسانہ اور چوتھا کھونٹ" رضی عابدی کا مقالہ "فیدریکو گار سیالورکا" کتھا سرت ساگر پر شمیم حنفی کا مقالہ "ساز انا البحر" ناصر کاظمی کے بارے میں شیخ صلاح الدین کی باتیں اور ڈاکٹر گوپی چند کا مقالہ "نیا افسانہ علامت' تمثیل اور کہانی کا جوہر" "محراب" کے چند بے حد خیال انگیز مندرجات ہیں "محراب" نے جدید افسانے کے فروغ کے لئے ۱۹۸۵ء میں ایک مخصوص شمارہ پیش کیا جس میں انور عظیم' سریندر پرکاش حسن منظر' انور سجاد' انتظار حسین' سری کانت درما' خالدہ حسین' فلینری اوکانر' خورخے لوئیس بورخیس' غسان کنعانی' پیٹر بجسل اوریا کوف لنٹ کی نئی تخلیقات اور تراجم پیش کیے گئے' ساگر سرحدی کے ڈرامے اور حسن منظر کے افسانے کی پیشکش میں بھی "محراب" کو انفرادیت حاصل ہے۔ شاعری کے حصے میں اردو شعرا کے علاوہ غیر ملکی شاعری کو متعارف کرانے پر زیادہ توجہ صرف کی گئی' اس سلسلے میں محمد سلیم الرحمن اور زاہد ڈار نے گراں قدر خدمات سر انجام دیں۔ "محراب" کا آخری شمارہ ۱۹۸۸ء کے لگ بھگ شائع ہوا تھا۔ لیکن یہ سرکاری ڈیکلریشن کے تحت معین وقت پر چھپنے والا باقاعدہ ادبی رسالہ نہیں' اس لئے یہ کسی وقت بھی مطلع ادب پر ظاہر ہو کر نئی روشنی پھیلا سکتا ہے۔

"معاصر" ۔ لاہور

اکتوبر ۱۹۷۹ء میں لاہور سے حبیب اللہ خان نے "معاصر" جاری کیا، تو اسے غیر مطبوعہ تحریروں کا مجموعہ نظم و نثر شمار کیا گیا لیکن اس کی وضع اور قطع ایک ضخیم ادبی جریدے کے مشابہ تھی اور اس کے مدیران اعزازی عطاء الحق قاسمی اور سراج منیر تھے ۔ "حرف آغاز" میں عطاء الحق قاسمی نے لکھا کہ:

"یہ مجموعہ نظم و نثر مدیر کہلانے کے شوق میں مرتب نہیں کیا گیا بلکہ اپنے نظریات کو عملی شکل میں دیکھنے کی خواہش اس کا محرک بنی ہے ۔"

قاسمی صاحب نے مزید وضاحت کی کہ "دراصل ہم بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں جو ادب کو کوکا کولا کی طرح محض فرحت بخش نہیں سمجھتے بلکہ اس کے سوا بھی کچھ سمجھتے ہیں" چنانچہ "معاصر" ادب کو کوکا کولا کے سوا کچھ اور سمجھنے کی خواہش کی تکمیل ہی نظر آتا ہے ۔ اس ادارے میں مدیر "معاصر" نے ادب اور نظریے کی بحث بھی اٹھائی اور اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں لکھا کہ:

"ہمارے نزدیک ادب کو نظریے کا تابع تو ہونا چاہئے لیکن اسے "تابعدار" بہر حال نہیں ہونا چاہئے ۔ کچھ لوگوں کے نزدیک نظریہ میاں خوجی کی قرولی ہے جسے وہ بات بے بات پر نیام سے نکالنے لگتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ رویہ بھی درست نہیں ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ادب میں نظریہ صحیح راستے سے داخل ہونا چاہئے کیوں کہ بصورت دیگر جو ادب تخلیق ہو گا وہ "خلاف وضع فطری" ادب ہی کے زمرے میں شمار ہو گا ۔ اسے نظریاتی ادب قرار دینا ادب اور نظریے دونوں کے ساتھ زیادتی ہو گی"(۵۴)

"معاصر" کی ضخیم ادبی دستاویز میں ادب اور نظریہ دونوں موجود نظر آتے ہیں، اس کے لکھنے والوں میں قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، شفیق الرحمٰن، ضمیر جعفری، محمد خالد اختر، سلیم احمد، فروغ احمد، احسان دانش، قیوم نظر اور مجید امجد جیسے نامور ادبا شامل ہیں جو نہ صرف ادب اور نظریے کا شعور رکھتے ہیں بلکہ ادب میں نظریے کو صحیح راستے سے داخل کرنے کا فن بھی جانتے ہیں، چنانچہ "معاصر" کی ایک بنیادی عطا یہ ہے کہ اس میں بیشتر تحریریں ایسی ہیں جن پر "خلاف وضع فطری" تخلیقات کا گمان نہیں ہوتا۔ "معاصر" کا دوسرا ضخیم شمارہ نومبر ۱۹۸۳ء میں چار سال کے توقف سے شائع ہوا۔ اب سراج منیر "معاصر" سے الگ ہو چکے تھے۔ عطاء الحق قاسمی نے "حرف آغاز" میں "پاکستانی ادب" کی سنجیدہ بحث کو اپنے معمول کے اسلوب میں کروٹ دی اور لکھا کہ "پاکستانی ادب کے مسئلے پر چونکہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لہٰذا اس پر ابھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔" اور اس "بہت کچھ کہنے کی گنجائش" کو اپنے

اس بیان سے روشن کیا کہ:

"پاکستانی ادب کی ایک کھڑکی اگر مکے مدینے کی طرف کھلتی ہے تو اس کی ایک کھڑکی ان گلی کوچوں کی طرف بھی کھلتی ہے جن میں ہم رہتے ہیں۔ کیوں کہ پاکستانی ادب صرف آسمانی رشتوں میں نہیں، زمینی رشتوں کا بھی نام ہے" (۵۳)

انہوں نے ایک سچے پاکستانی کی حیثیت میں پاکستانی ادب اور غیر پاکستانی ادب کا مابہ الامتیاز بھی پیش کر دیا اور وضاحت کی کہ:

"پاکستانی ادب اور محکمہ اطلاعات کے "ادب" میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ پاکستانی ادیب پر یہ ذمہ داری بہرحال عائد ہوتی ہے کہ وہ قوم کو انارکی میں مبتلا نہ کرے، بلکہ انہیں مثبت قدروں کی طرف راغب کرنے والا ادب تخلیق کرے۔ کیوں کہ میں ادب کو کوکا کولا کی طرح محض فرحت بخش نہیں سمجھتا اور نہ ہی ادیب اور مالشیے کو ایک ہی قبیلے کا فرد سمجھتا ہوں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ادیب کی ذمہ داری کچھ اس کے سوا بھی ہے۔۔ پاکستانی ادب کوئی پیٹنٹ پراڈکٹ نہیں ہے، جس کی ہول سیل ڈیلری مخصوص لوگوں کے پاس ہو۔ بلکہ یہ ہمارے ادب کی رگوں میں خون کی طرح رواں ہے۔ چنانچہ مجھے اگر ایک فقرے میں پاکستانی ادب کی تعریف کرنے کو کہا جائے تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ پاکستانی ادب وہ جو غیر پاکستانی نہیں ہے۔" (۵۴)

"معاصر" کی دو اشاعتیں مجموعی طور پر ۱۷۷۲ صفحات پر مشتمل ہیں، ان میں چند غیر ملکی ادیبوں کے تراجم کے سوا سب مضامین نثر اور منظومات پاکستانی ادیبوں سے حاصل کر کے شائع کی گئی ہیں۔ اس لئے "معاصر" کو پاکستانی ادب کا جریدہ شمار کرنا بے حد مناسب ہے۔ "معاصر" کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں ادبا کے کسی خاص فرقے کو اگرچہ نمائندگی نہیں دی گئی اور ہر نوع کے ادیب کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی تاہم اس کی جہت غیر واضح نہیں۔ اس کا ایک رخ واضح طور پر پاکستان، اسلام اور اقبال کی طرف ہے۔ چنانچہ سلیم احمد اور فتح محمد ملک کے درمیان ایک مکالماتی محاربہ "اقبال اور سر زمین پاکستان" کے عنوان سے توجہ کھینچتا ہے۔ پروفیسر فروغ احمد کا مقالہ "اسلامی ادب کے تنقیدی لوازم" ڈاکٹر صفدر محمود کا "سر سید کا خواب" احسان دانش کا "مذہب کا تصور" مولانا ابوالخیر مودودی کا مقالہ "سورۂ ابراہیم" محمد حسن عسکری کا "تفسیر قرآن اور فلسفہ جدید" اس جہت کو مزید روشن کرتے ہیں، دوسری طرف "معاصر" کی رد عمل کی لہر شدید اور استدلال قدرے غیر متوازن ہے۔ اس ضمن میں رشید ملک کے دو مقالات "طلائی تثلیث" اور "وزیر آغا کا فکری سومنات" کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان مقالات میں ایک علمی بحث شعوری طور پر غیر شائستہ انداز میں ابھاری گئی ہے اور موضوع کو اجالنے کے بجائے مصنف کو رگیدنے کی کاوش کی گئی۔ "معاصر" کا دامن چونکہ دراز ہے اس

لئے اس میں متعدد ایسے مضامین موجود ہیں جن کی بازگشت دیر تک سنی جاتی رہی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رؤف انجم کا مضمون "ادب اور مسئلہ خیرو شر" سراج منیر کا "یہ رنگ اک خواب کے لئے" سلیم احمد کا "محمد حسن عسکری کا تصور روایت" محمد اکرام چغتائی کا "فتوحات مکیہ" شہزاد منظر کا "جدید افسانہ اور عصری صداقتیں" اور وحید عشرت کا "ژاں پال سارتر" بے حد خیال انگیز ہیں۔

"معاصر" نے جدید شعرا کے تعارف میں بھی نمایاں دلچسپی لی اور اختر حسین جعفری، صلاح الدین محمد، امجد اسلام امجد، خالد احمد، پروین شاکر، حسن رضوی، اختر امان، افتخار عارف، خورشید رضوی، نجیب احمد، گلزار وفا چودھری، ناہید قاسمی، جلیل عالی، ستار سید، ظفر اقبال، خالد شریف، شبنم شکیل اور عطاء الحق قاسمی وغیرہ کی متعدد شعری تخلیقات کو ایک جگہ پیش کر کے ان کے مطالعے کو آسان اور ہمہ جہت بنا دیا۔ محمد خالد اختر کے فن پر ایک گوشہ کی اشاعت بھی "معاصر" کا ایک قابل تحسین کام ہے۔ اس پرچے نے سراج منیر کو بطور افسانہ نگار متعارف کرایا۔ محسن احسان خاکہ نگار کے روپ میں ابھرے، حلقہ ارباب ذوق کی لندن شاخ کے سرکاری کاغذات کی اشاعت اس کا ایک اور تاریخی کارنامہ ہے۔ "معاصر" نے اپنی ضخامت سے ہی نہیں معیاری مندرجات سے بھی اہل ادب کو متاثر کیا اور سالنامہ "کارواں" کی طرح اس مجموعہ نظم و نثر کا ذکر بھی عرصے تک ہوتا رہا۔ دو ضخیم پرچوں کی اشاعت کے بعد یہ مطلع ادب پر ظاہر نہیں ہوا۔

"خیابان"۔ راولپنڈی

جریدہ "خیابان" نومبر ۱۹۸۰ء میں راولپنڈی سے منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے مرتبین حسن عباس رضا اور محمودیہ غازیہ تھے۔ یہ جریدہ شائع کرنے کا بنیادی مقصد صحت مند اور روشن خیال ادب کی ترویج و ترقی، پاکستانی نیشنلزم کا فروغ، اور جدید پروگریسو ادبی رجحانات اور رویوں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ مدیران نے لکھا کہ:

"آج ہم جن اندرونی اور بیرونی حالات سے دو چار ہیں ان میں ضروری ہے کہ ہم اپنے تشخص کو نہ صرف برقرار رکھیں بلکہ اسے صحیح سمت میں نمایاں کرنے اور قابل رشک بنانے کی سعی پیہم بھی کریں، پاکستان ہماری پہچان ہے، جب تک ہم اپنی زمین سے اپنی محبت کا بے پایاں اظہار اور اس کا عملی ثبوت نہیں دیں گے ہم کسی اور چیز سے چاہت کرنے کا خواب تو دیکھ سکتے ہیں، اس کی جاگتی اور ہنستی تعبیر کو گلے نہیں لگا سکتے۔"

"خیابان" کا پہلا پرچہ فیض صاحب کے نام انتساب ہے۔ اس پرچے میں ایک کشادہ نظر ادبی

جریدے کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔ تاہم اس کا نظریاتی جھکاؤ ترقی پسند ادب کی طرف زیادہ تھا۔ اس کے مضامین میں فتح محمد ملک کا "فیض اور برہم نوجوان کا المیہ" علی عباس جلال پوری کا "لوک فن" اعجاز راہی کا "پاکستانی نظم کی نئی فکری جہت" اور مرزا حامد بیگ کا "اب میرے قاتل کو چاہو" قابل ذکر ہیں' "خیابان" نے شعرا کے خصوصی مطالعے کو بھی اہمیت دی' اس کے پہلے پرچے میں احمد فراز' کشور ناہید اور سرمد صہبائی کا اور دوسرے پرچے میں صلاح الدین پرویز کا خصوصی تعارف کرایا گیا۔ فتح محمد ملک کا مقالہ "احمد فراز کا شہر آشوب" رشید امجد کا "شفقت کا سائبان" (رحمٰن شاہ عزیز) اور اشفاق حسین کا "ملکہ ترنم" بھی فن اور شخصیت کے زاویے اجاگر کرتے ہیں۔ "خیابان" میں اس دور کے بیشتر ممتاز ادیبوں نے اپنی نمائندہ تخلیقات کے ساتھ شرکت کی ہے۔ ان میں فیض احمد فیض' منیر نیازی' وزیر آغا' منظور عارف' اقبال ساجد' مسعود اشعر' احمد جاوید' مظہر الاسلام' رشید امجد' جمیل ملک' ممتاز مفتی' جوگندر پال' خالدہ حسین' احمد داؤد' آفتاب اقبال شمیم' ایوب مرزا' شاہین مفتی' منصور قیصر اور زاہد ڈار کے نام اہم ہیں۔

"خیابان" کے صرف دو پرچے دو برسوں میں شائع ہوئے۔ اس لحاظ سے اس کی حیثیت ایک سالانہ ادبی پرچے کی تھی' اس نے فکرو نظر کو تابانی عطا کی اور اپنے دامن میں اعلیٰ پائے کے جواہر پارے سمیٹ لئے۔ لیکن اس کی حیات مختصر نے اثر و عمل کا دائرہ محدود کر دیا۔

"تخلیق ادب" کراچی

"تخلیقی ادب" اگرچہ کتابی سلسلہ تھا لیکن اس کی صورت ادبی رسائل جیسی تھی اور یہ اس دور کے بعض مقبول رسائل مثلاً "نقوش" "اوراق" "نیا دور" اور "سیپ" کے ساتھ انداز پیشکش میں بھی مطابقت رکھتا تھا' مشفق خواجہ نے ۱۹۸۰ء میں اس کی پہلی کتاب میں لکھا کہ انہیں ایک غیر ملکی دوست کی فرمائش پر گزشتہ دھائی کے ادب کا ایک جائزہ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں اہل قلم نے تعاون کیا' تو انہوں نے غیر مطبوعہ تخلیقی تحریروں اور عالمی ادب کے تراجم کو بھی اشاعتی منصوبے میں شامل کر لیا' انہوں نے تخلیقی ادب سے خالص ادب کے فروغ کا کام لینے کی سعی بھی کی اور اس روشنی کو عام کیا جو اچھے ادب کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔

"تخلیقی ادب" کے تا حال پانچ شمارے چھپ چکے ہیں' ان میں ہر جلد اپنے مندرجات کی ندرت اور انوکھے پن کی وجہ سے معروف و ممتاز ہوئی اور اس پرچے کی صدائے بازگشت پوری ادبی دنیا میں سنی جاتی رہی۔ مثال کے طور پر پہلی جلد میں افسانوں اور نظموں کے علاوہ سلیم احمد کی پوری

کتاب "محمد حسن عسکری۔ انسان یا آدمی" پیش کی گئی۔ بودلیر، ایلیٹ، وہمین، ہارڈی، ہمینگوے کے تراجم کے علاوہ انشائیہ اور خود نوشت کو بطور خاص اہمیت دی گئی۔ "تخلیقی ادب" کی دوسری جلد دس سالہ ادب کے جائزوں کے لئے مخصوص کی گئی اور اس میں "ادبی رجحانات" پر "محمد علی صدیقی" "ناول" پر غیم احمد۔ افسانہ پر (شہزاد منظر) "ڈراما" پر "مرزا ادیب"۔ سفر نامہ پر "انور سدید" انشائیہ پر "جمیل آذر"۔ خاکہ نگاری پر "غلام حسین اظہر" طنز و مزاح پر "معین الدین عقیل"۔ نظم پر "احمد ہمدانی" غزل پر "نظیر صدیقی" تنقید پر "تحسین فراقی" اور اسلامی ادب پر "ڈاکٹر فروغ احمد" وغیرہ کے جائزے چھاپے گئے۔ "تخلیقی ادب" نے ادبا کے خصوصی مطالعے کے لیے شخصیت اور فن پر مبنی گوشوں کا سلسلہ بھی شروع کیا، جن میں خطوط کی اشاعت کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی گئی۔ اس ضمن میں میرزا یگانہ، ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل الدین عالی، محمد حسن عسکری، ابن انشا، ایلیٹ کے گوشوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ "تخلیقی ادب" نے نوادرات کی تلاش میں بھی گہری دلچسپی لی۔ اس ضمن میں محمد حسن عسکری کے خاکوں کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

ضخیم ادبی پرچوں نے رسائل سے وقت کی پابندی کی روایت چھین لی تھی "تخلیقی ادب" نے اس صف میں شامل ہو کر اعلیٰ ادب پیش کرنے کا معیار قائم کیا۔ "تخلیقی ادب" کے تیسرے شمارے پر کراچی سے مشفق خواجہ نے رسالہ "اسلوب" جاری کیا "اسلوب" اپنی ہر اشاعت میں ایک مکمل کتاب پیش کرتا تھا۔ تخلیقی ادب کے آخری تین شمارے میں بھی ماہ نامہ "اسلوب" کے زیر اہتمام خاص نمبروں کی صورت میں شائع ہوئے۔ اس پرچے کی کامیابی تمام تر مشفق خواجہ اور پاشا رحمٰن کی منصوبہ بندی اور حسن ادارت کا نتیجہ ہے اور اس نے ٹھوس ادبی خدمات سر انجام دی ہیں۔ "تخلیقی ادب" میں آمنہ مشفق نے ادب کی ایک خاموش خدمت گزار کا فریضہ ادا کیا، ان کے خلوص کا نقش ہر صفحے پر موجود ہے۔

"اخبار اردو"

کراچی سے "اخبار اردو" مقتدرہ قومی زبان کے آرگن کے طور پر اور نفاذ اردو کی تحریک کو مائل بہ عمل کرنے کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اس کے پہلے مدیر ڈاکٹر معین الدین عقیل تھے۔ ۱۹۸۳ء میں مقتدرہ کا دفتر کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوا تو اس کے ساتھ ہی "اخبار اردو" کی نقل مکانی بھی عمل میں آئی۔ جنوری ۱۹۸۴ء میں اس کا دوسرا دور ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں شروع ہوا۔ شریف کنجاہی اور اختر راہی اس کے مدیران اعزازی تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے "اخبار اردو" کی تکنیکی حیثیت

کو برقرار رکھتے ہوئے اسے ایک علمی و ادبی ماہنامہ بنانے کی کاوش کی ۔ چنانچہ اس میں نفاذ اردو کے مسائل کی عوامی جہت آشکار کی گئی ۔ ارباب اردو کے انٹرویو پیش کئے گئے ۔ نفاذ اردو کے قدیم و جدید اداروں کے تعارف کرایا گیا ' ماہ نامہ "اخبار اردو" اب ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے اور نفاذ اردو کی تحریک میں ممد و معاون ہے ۔

"اردو نامہ"

ماہانہ مجلّہ " اردو نامہ " مجلس زبان دفتری کا سرکاری آرگن ہے ۔ اس کا اجرا مارچ ۱۹۸۲ء میں کیا گیا تھا اور مقصد اردو کو پنجاب میں سرکاری سطح پر نافذ کرنے کے لیے مواد اور معلومات کی فراہمی تھا۔ اس کے مدیر اعلیٰ ایڈیشنل چیف سیکرٹری پنجاب بلحاظ عہدہ ہیں۔ لیکن پرچے کی بنیادی پالیسی مدیر کے تبادلے سے اثر انداز ہوتی رہی ہے "اردو نامہ" نے اردو زبان کے موضوعات کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی ہے مثال کے طور پر "برطانوی عہد میں مشرقی علوم کی تدریس" اور "علاقائی زبانوں کے درمیان مماثلت" "وضع اصطلاحات کی ملی بنیاد" "اصطلاحات اور ان کی تفہیم" جیسے مضامین ادبی افق کو بھی روشن کرتے ہیں۔ مجلس زبان دفتری کے تحت اصطلاحات کے تراجم "اردو نامہ" میں بالالتزام شائع کیے جاتے ہیں۔

"جریدہ" پشاور

مرادن شوگر ملز کی انتظامیہ نے "قند" کی اشاعت منقطع کی تو بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ صوبہ سرحد سے ادبی جریدہ نگاری کے ایک زرخیز دور کا جسے تاج سعید نے پروان چڑھایا تھا خاتمہ ہو گیا ہے ۔ لیکن ادب کے جنون نے تاج سعید کو فارغ نہیں بیٹھنے دیا ۔ انہوں نے موسم بہار ۱۹۸۳ء میں پشاور سے "جریدہ" جاری کر دیا ' جس کی ادارت میں ان کی افسانہ نگار بیگم زیتون بانو بھی شریک تھیں ۔ "جریدہ" کے متعلق پہلی بات یہ ہے کہ یہ باقاعدہ ماہانہ رسالہ نہیں تھا لیکن مجموعہ نظم و نثر ہوتے ہوئے بھی تاج سعید نے اس میں ایک ادبی رسالے کی مہک پیدا کی اور ادبی رسالے کی مہک پیدا کرنے کے عمل کو ہی جریدہ کی اشاعت کا مقصد قرار دیا گیا ۔ دوسری بات یہ تھی کہ "جریدہ" کو معروف اہل قلم وزیر آغا ' مظفر علی سید ' عتیق اللہ ' فیض ' سہیل احمد خان ' نظیر صدیقی ' رضا ہمدانی ' مشفق خواجہ ' غلام عباس ' اظہر جاوید ' شہزاد منظر ' فارغ بخاری ' پرتو روہیلہ ' یوسف رجا ' ایوب صابر ' مسعود انور

شفقی کے غیر مطبوعہ جواہر پاروں سے سجانے کے ساتھ ساتھ ایسی اہم تحریریں بھی پیش کی گئیں جو روزانہ اخبارات کے صفحات پر چھپ کر ایک دن میں نظر سے اوجھل ہو جاتی تھیں۔ "جریدہ" کی تیسری بات یہ تھی کہ اس نے مختلف علاقوں سے شائع ہونے والی کتابوں کو نسبتاً" زیادہ اہمیت دینے کا ارادہ ظاہر کیا اور ڈرامہ کی صفت میں تھیٹر، ٹی وی اور ریڈیو کو فروغ دینے کا عہد بھی کیا، اور ادبا اور شعرا کے وسیع تر تعارف اور کلام شاعر بقلم شاعر شائع کرنے اہتمام "جریدہ" کی ایک اور منفرد خصوصیت ہے۔

"جریدہ" چونکہ ایک باقاعدہ ادبی پرچہ نہیں تھا اس لیے یہ غیر معینہ وقفے سے شائع ہوتا۔ اس کے باوجود "جریدہ" کی آمد کو ادبی دنیا میں ہمیشہ ایک تازہ اور فرحت افزا جھونکے کی حیثیت حاصل رہی اور مطبوعہ چیزوں کی شمولیت کے باوجود اس کے تجرباتی سلسلوں کو تحسین کی نظر سے دیکھا گیا۔ اس کی ایک خوبی تو یہی تھی کہ اس کتابی سلسلہ میں مضامین و نثر کا انتخاب کڑا اور معیار بلند تھا۔ دوسرے اس نے ابتدا میں ہی مخصوص نوع کی اشاعتیں پیش کرنے اور پوری ادبی دنیا کو مہکانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ "جریدہ" کی دوسری کتاب موسم بہار ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی اور یہ "راجندر سنگھ بیدی نمبر" تھا اس نمبر کے ترتیب و تدوین میں تاج سعید نے غیر معمولی اپج سے کام لیا اور بیدی کے بارے میں بیشتر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد فراہم کر دیا۔ ایک حصے میں کنہیا لعل کپور، پرکاش پنڈت، راجہ مہدی علی خان، ہربنس سنگھ بیدی اور مجتبیٰ حسین کے لکھے ہوئے بیدی کی شخصیت نامے پیش کیے، دوسرے حصے میں بیدی کے فن پر ڈاکٹر نذیر احمد، گوپی چند نارنگ، اصغر علی انجینئر، باقر مہدی، اوپند ناتھ اشک اور انوار احمد کے مضامین کو جگہ دی، بیدی کے دس افسانوں مثلاً "جوگیا" "گرہن" "ایک باپ بکاؤ ہے" "متھن" "صرف ایک سگریٹ" وغیرہ کا تجزیہ نامور نقادوں سے کرایا گیا، بیدی کی چند گم شدہ تحریروں کی بازیافت کی گئی۔ چنانچہ یہ خاص نمبر ادبی جریدہ نگاری کا ایک اہم واقعہ بن گیا۔ ممتاز افسانہ نگار جو گندر پال نے لکھا کہ "اسطرح کے کاموں کی بدولت ہی انسانی حسن کی روایتیں ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن کے تسلسل کا سماں باندھ پاتی ہیں۔" (۵۵)

"جریدہ" کی تیسری کتاب موسم گرما ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی اس کی خصوصیت سندھی، بلوچی، پنجابی، اور کشمیری ادب کو تراجم کے وسیلے سے اردو میں پیش کرنا تھا۔ رضا ہمدانی، آفاق صدیقی، مسعود ہاشمی، اور کامل القادری نے علاقائی زبانوں کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا، دوسرے حصے میں ایک گوشہ اقبال کے لیے اور ایک گوشہ رفتگان کے لیے وقف کیا گیا، جس میں فیض، بیدی، سلیم احمد، یوسف کامران، سلمان بٹ، اور رحیم گل کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ "جان پہچان" کا حصہ منصور قیصر، اسرار زیدی، مظفر علی سید، خاطر غزنوی، وزیر آغا اور جمیل ملک پر مضامین کے لیے وقف تھا،

اور تازہ ناول مثلاً "میرا گاؤں" از غلام الثقلین نقوی "سنگ زیست" سائرہ ہاشمی "جنت کی تلاش" از رحیم گل اور "دھواں" از زیتون بانو کے تجزیاتی مطالعے اس "جریدہ" کی ایک اور خصوصیت ہے۔ "جریدہ" ۱۹۸۶ء کی نوعیت اس کی سابقہ سب اشاعتوں سے جداگانہ تھی اس میں ڈرامے کے فن' فنکار اور ڈرامہ نگار اور ڈرامے کی کتابوں پر خصوصی مضامین پیش کیے گئے' فکشن' طنزو مزاح' انشائیہ' شاعری' تراجم' تنقید و تحقیق' اور شخصیت و فن کی کتابوں پر مبسوط تبصروں' تلخیص اور اقتباسات کے لیے وقف کیا گیا۔ "جریدہ" کی پانچویں کتاب ساون بھادوں ۱۹۸۷ء میں چھپی۔ اس میں جلیل حاشمی اور ہرمن ہیس کا ترجمہ ازانور زاہدی کی دو پوری کتابیں چھاپی گئیں۔ ایک حصہ یاد رفتگاں کے لیے اور دوسرا علاقائی ادب کے لیے وقف کیا گیا۔ معمول کے حصہ میں مضامین' ڈرامے' افسانے اور شاعری کے لیے اعلیٰ تخلیق پارے پیش کیے گئے اور یہ سب تحریریں ایسی تھیں جن سے ماہانہ ادبی رسالے جیسی مہک آتی تھی۔

"جریدہ" کی مجموعی کارگزاری پر نظر ڈالی جائے تو اسے تاج سعید کی ادبی صحافت کی ایک غیر معمولی تجربہ گاہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسے ایک سالانہ ادبی پرچے کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔ لمبے وقفے کے بعد منظر پر آنے کے باوجود یہ عمل اور رد عمل بھی مرتب کرتا رہا اور لکھنے والوں نے اسے نہ صرف پسند کیا بلکہ اسے اپنی نمائندہ تحریروں سے بھی نوازا۔ "جریدہ" نے ڈرامے کے فن کو فروغ دینے کے علاوہ ادیب اور کتاب دونوں کے تحسین آمیز زاویے ابھارنے کی کوشش کی اور اب اس کی پانچ اشاعتوں کو مستقل نوعیت کی کتابوں کی حیثیت حاصل ہے۔ تاج سعید کے تجربے عام مدیران جرائد سے بہ لحاظ نوعیت الگ اور بلحاظ افادیت گراں قدر ہیں۔

"راویت" لاہور

۱۹۸۳ء میں محمد سہیل عمر نے تاریخ فکر میں بنیادی تبدیلیاں لانے والی تحریروں کا انتخاب عمل میں لانے کے لیے "روایت" کا اجرا کیا۔ "روایت" کا موقف یہ تھا کہ کہنے کی ہر بات کہی جا چکی ہے۔ یہ معاملہ الگ ہے کہ ہر کسی نے ہمیشہ اسے سمجھا بھی ہو۔ چنانچہ "روایت" نے نئے حقائق پیش کرنے کے بجائے دانش کی تفہیم کے لیے دوبارہ گھڑی ہوئی چابیاں فراہم کرنے کی جدو جہد کا آغاز کیا تاکہ ان حقائق کی بازیافت کی جا سکے جو روح انسانی کے جوہر میں ابدی اور لافانی طور پر نقش ہیں۔ "روایت" نے لکھا کہ عقل و خرد کو جملہ سطحوں پر اور تمام جہات سے مخاطب کرنا اور اس ذریعے سے آج انسان کے تمام جائز سوالات اور اشکالات کا جواب دینا ہمارا مقصد ہے۔ (۵۶)

"روایت" کا ایک بنیادی مقصد روح کے بند دریچوں کو کھولنا تھا، چنانچہ مابعد الطبیاتی حقائق کو پرکھنے، مختلف صورتوں، راویتوں اور تاریخی پس منظروں سے دریافت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا، فکری نوعیت کے اس کام میں محمد سہیل عمر صاحب کو جعفر معین الدین، سراج منیر، عبدالروف، تحسین فراقی، محمد اکرام چغتائی، نعمانہ عمر، سرفراز احمد، جمال پانی پتی، آغا ضیا الرحمٰن اور محمد اسلم سہیل کا تعاون حاصل تھا، روایت کے پہلے پرچے میں مابعد الطبیعاتی مضامین --- "انسان اور یقین" از شیخ عیسیٰ نور الدین "مشرق مابعد الطبیعات" از عبدالواحد یحییٰ اور "فلسفہ" شہادت از" ذہین شاہ تاجی" سے اس پرچے کا متصوفانہ مزاج متعین ہوتا ہے۔ محمد حسن عسکری کے خطوط بنام، شمس الرحمٰن فاروقی "اسلامی تہذیب، جدید تہذیب اور ادب" از سلیم احمد "جدیدیت چند تصریحات" از سراج منیر جیسے مضامین سے روایت کا ادبی زاویہ اجاگر ہوتا ہے۔ اس پرچے کا عالمی سطح پر واضح جھکاؤ رینے گینوں اور مارٹن لنگ جیسے مغربی متصوفین کی طرف اور ملکی سطح پر حسن عسکری اور سلیم احمد کی طرف تھا چنانچہ "روایت" شمارہ ۳۔ ۴ سلیم احمد کے لیے وقف کیا گیا اور یہ ایسی یادگار اشاعتیں ہیں جن کے بغیر سلیم احمد کے فکر و فن کی پوری تفہیم ممکن نہیں۔

"روایت" کے سلسلے کے دوسری کتاب اس لحاظ سے زیادہ اہم ہے کہ اس میں ادب کو متحرک قوت کے طور پر زیادہ استعمال کیا گیا اور اس میں تخلیقی ادب کے شاہ پاروں کو بھی نمائندگی دی گئی۔ روایت ۲ کی شاعری میں واصف علی واصف، احمد جاوید، سراج منیر، علی اکبر عباس، جعفر بلوچ، اور محمد اظہار الحق شامل ہیں۔ ایک تجزیاتی مطالعہ انجم رومانی کی شاعری کے بارے میں ہے۔ لیکن ادبی مضامین پر تحقیق کے عناصر غالب نظر آتے ہیں۔ محمد اکرام چغتائی کا مقالہ "مکتوبات واجد علی شاہ" جادو ناتھ سرکار کا" "ماثر عالمگیری" اور تحسین فراقی کا "عجائبات فرنگ" اس سلسلے کے تخلیقی نوع کے گراں قدر مقالات ہیں، لیکن اس کا مزاج در حقیقت رینے گینوں کے مضمون "دنیائے جدید کا بحران" سدی نوح کا "دین اور دنیائے جدید" سلیم احمد کا "اسلامی نظام" اور ہسٹن سمتھ کے مضمون "حقیقت گم گشتہ" سے متعین ہوتا ہے۔

"روایت" فکری نوعیت کا ایک ایسا کتابی جریدہ ہے جو ذہن و خیال کو متحرک کرتا ہے اور موجود کا باطن کی روشنی میں تجزیہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس قسم کے رسائل اردو میں بہت کم شائع ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی اہمیت اور ضروریات اور مقصدیت سے انکار ممکن نہیں، محمد سہیل عمر جن عزائم کو لے کر میدان عمل میں آئے ہیں وہ ان کے ایمان و ایقان کا حصہ ہیں اور توقع ہے کہ وہ اس فکری تحریک کی روایت کو زندہ رکھیں گے۔ دوسری طرف حقیقت یہ بھی ہے کہ "روایت" "سلیم احمد نمبر" ۱۹۸۷ء کے بعد کوئی پرچہ شائع نہیں ہوا۔

"مطلع" خانیوال

۱۹۸۴ء میں خانیوال سے طاہر نسیم کا ادبی جریدہ "مطلع" عصری ادب میں نئے دن کا استعارہ بن کر آیا۔ طاہر نسیم نے مطلع جاری کرتے وقت مضافاتی ادیبوں کی محرومی کا نعرہ نہیں لگایا بلکہ ادب کے ایک خدمت گزار کی حیثیت میں معاصر ادیبوں کو اپنے اظہار کے لیے ایک ادبی فورم فراہم کر دیا۔ اس کے پہلے پرچے پر رسالہ " ادبی دنیا " اور " اوراق " کے اثرات نمایاں ہیں۔ "مطلع" نے بھی قدیم کو محبت سے گلے لگانے اور جدید کے خیر مقدم کا رویہ اختیار کیا اور ۱۹۸۸ء تک اسے ایک ایسا جریدہ بنا دیا جس کے اوراق عصری ادب کا مخزن تھے، اس پرچے میں جو خیال انگیز مقالات چھپے ان میں جیلانی کامران کا، "فیض نو آزاد قوموں کا سوانح نگار" شہزاد منظر کا "منٹو اور عسکری" جمیل جالبی کا "جوش ملیح آبادی فن اور شخصیت"۔ مرزا حامد بیگ کا "شاعرانہ خیال کی منطق"۔ علی تنہا کا "جمیلہ ہاشمی ایک تاثر" قابل ذکر ہیں۔ افسانوں میں "مطلع" جدیدیت کے اس رخ کو پیش کرتا ہے، جس کے تحت کہانی اپنا چہرہ قائم رکھتی ہے اور تاثر پیدا کرنے میں صورت واقعہ، کردار اور ماحول معاونت کرتے ہیں۔ طارق محمود، آصف فرخی، سلام بن رزاق، شہزاد منظر، مظہر الاسلام، ڈاکٹر حسن منظر، محمد سعید شیخ اور انوار احمد اس نوع کے افسانے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ "مطلع" نے خصوصی گوشوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ "مطلع" کا پہلا گوشہ اشاعت نمبر۴ (فروری ۱۹۸۷ء) مرتضیٰ برلاس کے لیے وقف کیا گیا۔ اوز اس میں احسان دانش، وزیر آغا، فارغ بخاری، افضل مرزا، فیاض تحسین اور انور جمال کے مضامین شامل ہیں۔ "مطلع" نے سفرنامہ اور انشائیہ کے نئے رویوں کو ظاہر کرنے میں بھی عمدہ خدمات انجام دی ہیں۔ "مطلع" بظاہر چھوٹے شہر کا پرچہ ہے اور بے قاعدگی سے شائع ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کی خدمات کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔

"اردو ادب" ۔ راولپنڈی

ماہنامہ " اردو ادب " اپریل ۱۹۸۲ء میں اقبال حسین کی ادارت میں راولپنڈی سے جاری ہوا، اس کے مدیر اعزازی بشیر سیفی تھے اور وہی عملی طور پر اس کی ادبی حکمت عملی وضع کرتے تھے۔ "اردو ادب" کی نمود ایک معمول کے رسالے کے طور پر ہوئی تھی، لیکن ہر دو ماہ کے بعد جب اس کی باقاعدہ اشاعت ہونے لگی تو اس پرچے نے اہل ادب کو متوجہ کر لیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل ملک، ضمیر جعفری، رشید امجد، احسن علی خان، اکبر حمیدی، محمد فیروز شاہ، آصف فرخی، نسیم سحر، انوار فیروز، خاور اعجاز، اختر

ہوشیار پوری، صبا اکرام، جعفر شیرازی، ممتاز احمد خان، محمد منشا یاد، احمد ظفر، توصیف تبسم کے مضامین، نظمیں، غزلیں اور انشائیے اس پرچے میں باقاعدگی سے چھپنے لگے۔ "اردو ادب" نے انشائیہ اور ہائیکو کی اصناف میں خصوصی دلچسپی لی اور ایک وضعدار اور بامعنی "ہائیکو نمبر" پیش کیا۔ "اردو ادب" کا خطوط کا حصہ اس کی کامیابی اور مقبولیت کا آئینہ دار ہے۔ "اردو ادب" لکھنے والوں کا پرچہ تھا۔ اس لئے زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکا۔ ۱۹۸۶ء کے لگ بھگ یہ پہلے بے قاعدگی اشاعت کا شکار ہوا اور پھر بند ہو گیا۔

"ادبیات"۔ اسلام آباد

جون ۱۹۸۵ء میں اسلام آباد میں "کل پاکستان اہل قلم کانفرنس" منعقد ہوئی تو صدر پاکستان نے افتتاحی خطبے میں اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ "ایک ادبی اور تحقیقی صحیفے کا اجرا اکادمی ادبیات پاکستان کے اساسی منشور میں شامل تھا لیکن اس پر بوجوہ عمل نہیں کیا گیا"، سہ ماہی "ادبیات" اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے جولائی ۱۹۸۷ء میں اسلام آباد سے جاری کیا گیا۔ اس کے نگران اکادمی ادبیات کے صدر نشین پروفیسر پریشان خٹک تھے، مدیر اعلیٰ ضمیر جعفری اور مدیر منتظم غلام ربانی آگرد مقرر ہوئے، ادارت کے فرائض خالد اقبال یاسر کے سپرد ہوئے، اس پرچے کے لئے جو مجلس مشاورت قائم کی گئی، اس میں علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، سجاد حیدر، محسن احسان اور عبداللہ جان جمال دینی کے اسمائے گرامی شامل ہیں

"ادبیات" صوری و معنوی لحاظ سے ایک بے حد خوبصورت پرچہ ہے، اسے ملک بھر کے تمام اہم ادیبوں کا تعاون حاصل ہے۔ اب تک اس کی پانچ ضخیم اشاعتیں، جن کے مجموعی صفحات بارہ صد سے زائد ہیں منظر عام پر آ چکی ہیں "ادبیات" نے نہ صرف معنوی تنوع پیدا کیا ہے بلکہ اس نے ہر طبقۂ خیال کے ادیب اور ہر صنف ادب کے شاہپاروں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ تحقیق و تنقید کے زاویے سے ڈاکٹر آفتاب احمد کا "غالب کی بزم خیال" وقار احمد رضوی کا "قومی یک جہتی میں زبان اور ادب کا کردار" ڈاکٹر سلطانہ بخش کا "اردو داستانوں میں مزاح کا مشرقی مزاج" جابر علی سید کا "طباطبائی کی شرح دیوان غالب" مسعود قریشی کا "سلطان باہو نظم معریٰ کا پہلا شاعر" ڈاکٹر محمد ریاض کا "بیدل۔ فکر و فن" فرمان فتح پوری کا "اردو ہائیکو کا منظر و پس منظر" افضل پرویز کا "مرزا صاحباں" مرزا حامد بیگ کا "فورٹ ولیم کالج" ڈاکٹر جمیل جالبی کا "ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے افکار" مقبول عامر کا "ایک صاحب طرز پشتو شاعر" محمد علی صدیقی کا "طنز و مزاح کے دفاع میں" چند

اچھے مقالے ہیں ۔ " ادبیات " نے نئی اصناف ادب کو متعارف کرانے میں بھی خصوصی دلچسپی لی ہے ۔ چنانچہ انشائیہ کی صنف میں ڈاکٹر وزیر آغا کا انشائیہ " دنیا خوبصورت ہے " اکبر حمیدی کا " نئے موسموں کے پرندے " پیش کئے گئے ہیں اور انہیں ارشد میر ، مسرت لغاری ، مختار زمن اور صدیق سالک کے طنزیہ مزاحیہ مضامین سے الگ رکھا گیا ہے ۔ " ادبیات " نے علاقائی زبانوں کے ادب کو تراجم کے ذریعے پیش کیا ہے اور یوں قومی یک جہتی کے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ رجحان افسانوں ، نظموں ، سفرناموں ، خود نوشت سوانح میں بھی نظر آتا ہے ۔ اس بنیادی مقصد کے سوا تا حال " ادبیات " کی کوئی مخصوص جہت نمایاں نہیں ہوئی ، بعض نظریاتی پرچوں کی طرح جانبداری اس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی ، اس لئے "ادبیات" کو ایک ایسی مجلس ادب کی حیثیت حاصل ہے جہاں پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں کے سب ادیب آپس میں ملاقات اور گفتگو کر سکتے ہیں ، اب تک منظر عام پر آنے والے پرچوں میں ہماری ملاقات عبدالکافی ادیب (پشتو)۔ شاہ حسین (پنجابی) تنویر عباسی (سندھی) غلام ربانی آگرد (سندھی) میر مٹھا خان مری (بلوچی) غلام حسین ساجد (پنجابی) عنایت بلوچ (سندھی) پردل خٹک (پشتو) سے ہوئی ہے ، تو بے حد مسرت محسوس ہوتی ہے ۔

" دستاویز " ۔ راولپنڈی

۱۹۷۱ء میں راولپنڈی سے " دستاویز " کے نام سے ایک پرچہ رشید امجد نے جاری کیا تھا ، اس کا مقصد ایک باقاعدہ ادبی جریدے کی طرح ادب کی فضا کو منقلب کرنا ، نئی تحریروں کو منظر عام پر لانا اور ہیئت و خیال کے نئے نئے تجربوں کو آزمانا تھا ، رشید امجد نے اس مقصد کے لئے ڈاکٹر وزیر آغا ، سمیع آہوجہ ، اعجاز فاروقی ، سرمد صہبائی ، منیر احمد شیخ ، سرور کامران ، اعجاز راہی ، رشید نثار جیسے ادبا کا قلمی تعاون حاصل کیا اور موضوعات پر آزادانہ اظہار خیال کی طرح ڈالی ۔ " دستاویز " لکھنے والوں کا پرچہ تھا اور لکھنے والوں کے حلقے ہی میں پڑھا جاتا تھا ، اس کی نوعیت تجرباتی تھی ، اس لئے یہ زیادہ عرصے تک چل نہ سکا ۔

" دستاویز " کا نسبتاً فعال دور ۱۹۸۵ء میں شروع ہوا ۔ اب رشید امجد نے احمد جاوید اور ابرار احمد کے تعاون سے " دستاویز " کو ایک ضخیم کتابی سلسلہ کی صورت دی اور اس کے دو معرکہ آرا شمارے قدرے لمبے وقفوں سے پیش کئے ، یہ تجربہ اگرچہ سابقہ تجربے ہی کی توسیع ہے تاہم اس میں مضامین کا تنوع زیادہ ہے ، اصناف کی بوقلمونی دیدنی ہے ، اردو ادب کے ساتھ عالمی ادب کو اہمیت دی گئی ہے ۔ افسانے کے ساتھ افسانہ فہمی کی گنجائش نکالی گئی ہے ۔ مصنف شناسی کے ساتھ کتاب شناسی

کی طرح ڈالی گئی ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ " دستاویز " نے عمل اور رد عمل کی لہروں کو پکڑنے اور مباحثہ کو صحت مند خطوط پر ابھارنے کی سعی کی ہے۔ موضوعات کا تنوع اس حقیقت سے آشکار ہے کہ اس میں ڈاکٹر وحید قریشی کا " تحریک پاکستان کے ثقافتی عوامل " مظفر علی سید کا " ترجمے کی جدلیات " ڈاکٹر مبارک علی کا " برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات۔ " شہزاد منظر کا " مغرب اور تیسری دنیا کا ناول " اور رشید امجد کا " للہ عارفہ۔ ایک جائزہ " شامل ہیں مصنف شناسی کے سلسلے میں قرۃالعین حیدر پر فتح محمد ملک کا مقالہ' مرزا یگانہ پر ڈاکٹر شمیم حنفی کا' جمیل جالبی پر نوازش علی کا اور منٹو پر حامدی کاشمیری کا مقالہ پیش کیا گیا۔ ان ضخیم پرچوں میں کم و بیش دو صد ادبا نے شرکت کی' ان میں قدرت اللہ شہاب' ممتاز مفتی' وزیر آغا' میرزا ادیب' اشفاق احمد' حیات اللہ انصاری' رام لعل' سکریتا پال' منیر احمد شیخ' خالدہ حسین' منشا یاد' سلام بن رزاق' آفتاب اقبال شمیم' جیلانی کامران' ادیب سہیل' کشور ناہید' جمیل یوسف' ضیا جالندھری' ڈاکٹر وحید قریشی' توصیف تبسم' خاطر غزنوی' مظہر امام' ڈاکٹر اے بی اشرف کے نام اور تخلیقات نظم و نثر اہم ہیں۔

" دستاویز " کا شمار ایسے ادبی جرائد میں کرنا چاہئے جو مدیر کو بطور زیرک' خلاق اور دانشور کی حیثیت میں پیش کرتے ہیں' اس کا ترتیب دیا ہوا پرچہ ادب میں ہوا کے نئے جھونکے لاتا ہے اور اس کی تخلیقات عرصے تک موضوع بحث بنی رہتی ہے۔ " دستاویز " میں اعجاز راہی کا سفر نامہ " عمان کا قیدی " اردو فکشن میں جدیدیت کے موضوع پر ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر سکریتا پال کا مکالمہ۔ پدما پچدیو کی راجندر سنگھ بیدی سے گفتگو' جدید علامتی کہانی پر حیات اللہ انصاری کا مقالہ' ممتاز مفتی کی خود نوشت نوع کی افسانوی تحریر " ایلی الکھ نگری " اشفاق احمد کا افسانہ " جیون جوت " فیض کے خطوط صوفی تبسم کے نام' منشا یاد کا افسانہ " گرم اور خوشبودار چیزیں " فہیم اعظمی کے تعارفی صنف " تونکا " چند ایسی ہی تحریریں ہیں۔ " دستاویز " کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اختلاف رائے کو خنک مزاجی سے قبول کرنے کی طرح ڈالی اور ادیب کو اپنی بات آزادی سے کہنے کا حق دیا' یہی وجہ ہے کہ " دستاویز " نے ایک نظریاتی ادبی پرچے کی طرح مقبولیت حاصل کی اور علمی حلقوں میں سرگرم بحث کا موضوع بنا رہا۔

" صلائے عام " ۔ کراچی

سہ ماہی " صلائے عام " ڈاکٹر یونس حسنی کی ادارت میں جنوری ۱۹۸۵ء میں کراچی سے جاری ہوا۔ عام ادبی پرچوں کے مزاج سے قطع نظر " صلائے عام " نے اپنا ایک خاص انداز مکمل کتابیں پیش

کر کے پیدا کیا۔ اردو افسانے کے فروغ میں "صلائے عام" نے خصوصی دلچسپی لی اور ایک پرچہ فردوس حیدر اور امراؤ طارق کی افسانہ نگاری کے تفصیلی تعارف کے لئے وقف کیا۔ ابو شعیب بزمی کا تنقیدی سلسلہ "سخنہائے گفتنی" "صلائے عام" کی ایک خصوصیت تھی اور اس میں نامور شعرا کی فنی خامیوں کو اجاگر کیا جاتا تھا "صلائے عام" کے لکھنے والوں میں نیرنگ نیازی ' دل ایوبی ' اختر ہوشیار پوری ' شاہدہ تبسم ' عطا حسین کلیم ضبط سہارن پوری ' سرفراز شاہد ' فردوس حیدر اور امراؤ طارق شامل تھے ' "صلائے عام" ایک صاف ستھرا ادبی پرچہ تھا۔ لیکن یہ ایک سال سے زیادہ عمر نہ پا سکا۔

"سوہدرہ گزٹ" ۔ سوہدرہ

پریس کلب سوہدرہ ضلع گوجرانوالہ کے زیر اہتمام "سوہدرہ گزٹ" کا اجرا جنوری ۱۹۸۵ء میں ہوا۔ اس ادارت حکیم راحت نسیم سوہدروی کے سپرد تھی اور محمود احمد کاشمیری ان کے معاون مدیر تھے' اس جریدہ نے سوہدرہ اور اس کے گرد نواح کی مردم خیز زمین کی تاریخ' تہذیب اور شخصیات کے حالات محفوظ کرنے کی کاوش کی' اس کے مزاج میں تحقیق کا عنصر نمایاں ہے۔ کچھ عرصے کے بعد "سوہدرہ گزٹ" میں علمی' ادبی اور مذہبی مضامین کی شرکت بھی قابل قبول ہو گئی۔ اس ضمن میں "ظفر علی خان اور ان کا عہد" از اکرم رضا "افغان کی اصلیت اور تاریخ" از عبدالعزیز فاروق "آنند رام مخلص" از انجم رحمانی "کلیات فائز" "از مرزا نظام الدین بیگ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ "سوہدرہ گزٹ" اب بے قاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ تاحال اس کے چھ شمارے چھپ چکے ہیں۔

"کتاب شناسی" ۔ اسلام آباد

اسلام آباد کے ادبی جریدہ "کتاب شناسی" کی حدود اشاعت عام ادبی پرچوں سے مختلف تھیں ' اس پرچے نے ان مراحل کو روشن کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جو تخلیق کار کے ذہن سے کاغذ پر اترنے اور کتابت و تہذیب ' طباعت و تجلید اور اشاعت و تعلیم کی کٹھن منزلوں سے عبارت ہیں۔ اس پرچے کی ادارت اختر راہی اور عارف نوشاہی نے سرانجام دی اور اس کے جملہ عملی مراحل میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی شامل رہے۔ اس پرچے نے قدیم کتابوں کے متون ' فن کتاب سازی پر مقالات اور کتابوں پر تفصیلی تبصروں کو زیادہ اہمیت دی۔ محقق شناسی کو بھی ایک موضوع خاص کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ مظہر محمود شیرانی کا مقالہ "حافظ محمود شیرانی بطور کتاب شناس" ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا "احمد بخش یکدل لاہوری کے علمی آثار" اور ڈاکٹر محمد سلیم اختر کا مقالہ "شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی کی ایک نو دریافت

تالیف تحفتہ الوالاۃ و نصیحتہ الرحیتہ دالرعاۃ"۔۔ کا یہاں حوالہ دینا ضروری ہے۔ تیکنیکی زاویۓ سے اوا کٹے اسلانا پا کامقالہ "ہرات کے فن تجلید پر چند آرا" اشرف علی کا "دستاویزات اور مخطوطات کی حفاظت" اور "گجرات کے جلد ساز" نئی وضع کے معلوماتی مقالات ہیں۔ تاحال کتاب شناسی کے دو شمارے شائع ہوئے ہیں۔

"کتاب شناسی" نسبتاً "کم معروف پرچہ ہے۔ اس کی افادیت اور ضرورت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں کتاب اور کتاب سازی کے فن سے دلچسپی ہے۔

"ابلاغ"۔ پشاور

پشاور سے ۱۹۸۶ء میں "ابلاغ" کے نام سے ایک ادبی پرچہ سیدہ حنا اور نسرین سروش نے جاری کیا' اس کے معاونین میں فریدہ نور اور احمد پراچہ شامل ہیں لیکن پس پردہ مدیر کے طور پر حامد سروش صاحب نے زیادہ خدمات سرانجام دیں۔ ابلاغ نے بنیادی طور پر پشاور کو اس کا گم شدہ ادبی مقام دلانے اور اس خطے کے ادیبوں کو برصغیر میں وسیع پیمانے پر متعارف کرانے کی کوشش کی چنانچہ فارغ بخاری اور فہمیدہ اختر پر گوشے مخصوص کئے گئے اور رضا ہمدانی' یوسف رجا چشتی' قیوم مروت' فضل حسین صمیم' شمشاد رعنا' قلندر مومند' عزیز اختر وارثی' اشراف حسین احمد' ایوب صابر کی تخلیقات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا۔ "ابلاغ" کا دائرہ اشاعت صرف پشاور کے ادبا تک محدود نہیں ہے۔ اس پرچے نے تھوڑے سے عرصے میں برصغیر کے بیشتر نامور ادبا مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ' ڈاکٹر وزیر آغا' جوگندر پال' بلراج کومل' اختر ہوشیار پوری' اظہر جاوید' فرخندہ لودھی' جمیل ملک' انوار فیروز' نظام صدیقی' ساحل احمد' عذرا اصغر کا تعاون حاصل کر لیا۔ سیدہ حنا کے اداریوں نے ادبی معاشرے کے معائب کو بالخصوص نشان زد کیا' ابلاغ کا خطوط کا حصہ جاندار اور صحت مند مباحث کو کروٹ دیتا ہے۔ یہ جریدہ پاکستان کے شمال مغربی حصے سے اردو ادب کی خاطر خواہ اور قابل تحسین خدمت سرانجام دے رہا ہے۔

"تحقیق"۔ حیدر آباد

رسالہ "تحقیق" سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا شعبہ جاتی تحقیقی مجلہ ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان اور مسز رابعہ اقبال کی مشاورت اور ڈاکٹر نجم الاسلام کی ادارت میں اس کی تاسیس مئی

۱۹۸۷ء میں عمل میں آئی۔ اس کا بنیادی مقصد شعبہ اردو میں متعین اساتذہ کے تحقیقی کارناموں کو منظر عام لانا ہے، تاکہ تحقیق کے ذریعے قوم کے علمی سرمائے میں توسیع کا فرض بھی انجام دیا جاسکے "تحقیق" کے تاحال دو شمارے شائع ہوئے ہیں' اس لحاظ سے اسے ایک سالانہ ادبی و تحقیقی جریدہ کی حیثیت میں قبول کرنا چاہئے۔ ان دو اشاعتوں میں جو مقالات پیش کئے گئے ہیں۔ وہ بے حد وقیع اور اردو ادب کے کئی گوشوں کو منور کرتے ہیں' اصول تحقیق کے باب میں ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان نے "تحقیق کے بنیادی لوازم" کا تعین کیا ہے' ڈاکٹر نجم الاسلام نے قدیم طرز تحقیق کے نقوش روشن کئے ہیں مسز رابعہ اقبال نے "رسالہ عصمت کا پاکستانی دور" فہمیدہ شیخ نے "اردو خاکہ نگاری۔۔۔ ایک مطالعہ" اور "اردو تحقیق کی جائزہ نگاری" ڈاکٹر سید عطاء الرحیم نے "تحقیقی مقالات کی تکنیک" عبدالحق نے "موادی تجزیہ" ڈاکٹر سعدیہ نسیم نے "سے" کا مطالعہ' عتیق احمد جیلانی نے "تذکرہ و تاسی" اور "معارف غالبیات" اور ظفر اقبال صاحب نے "مصحفی کا ایک شاگرد" جیسے مقالات تحقیق لکھے ہیں رسمیات تحقیق کے ضمن میں سید جمیل احمد رضوی "اشاریہ سازی" اور ڈاکٹر نجم الاسلام کا "رسمیات مقالہ نگاری" بھی اہم مضامین ہیں۔

"تحقیق" تیکنیکی نوعیت کا پرچہ ہے۔ اس نے بالعموم ایسے موضوعات کو مس کیا ہے' جنہیں ادبی رسائل اشاعت کے لئے قبول نہیں کرتے' یہ موضوعات نئے اور انوکھے ہیں۔ اس لحاظ سے "تحقیق" کی خدمات کا اعتراف بھی خاصے بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے رسالہ "اردو" میں لکھا ہے کہ "اسے پاکستان میں اردو تحقیق کی مجلاتی سرگرمیوں میں ایک خوش آئند اضافہ قرار دینا چاہئے"

"غنیمت"۔ لاہور

لاہور سے زمان کنجاہی نے ۱۹۸۷ء میں غنیمت کنجاہی کی یاد میں ایک ادبی جریدہ "غنیمت" کے نام سے جاری کیا۔ اس کی صورت علمی و ادبی تحریروں کے منتخب مجموعے کی تھی' اب تک اس کے چار شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ضخامت اگرچہ ستر صفحات سے متجاوز نہیں ہوئی' تاہم اس پرچے کی پذیرائی مناسب طور پر ہو رہی ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں عبدالعزیز خالد' سرمد صہبائی' اظہر جاوید' مسعود ہاشمی' عذرا اصغر' منشا یاد' اعزاز احمد آذر' اکبر حمیدی' راشد مفتی' گلزار بخاری' اقبال کوثر شامل ہیں' "غنیمت" نے ادب کے ساتھ ادیب کو بھی اہمیت دی ہے۔ اظہر جاوید پر یونس بٹ کا خاکہ' اعزاز احمد آذر کا مخصوص گوشہ کی مثال یہاں پیش کی جاسکتی ہے۔

"دائرے" ۔ کراچی

"دائرے" کا افتتاحی شمارہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا ۔ حسنین کاظمی کی ادارت اور ممتاز مرزا اور مشرف احمد کی معاونت سے یہ خوبصورت ادبی جریدہ دادا بھائی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام جاری کیا گیا ہے ۔ "دائرے" نے ایک سال کے عرصے میں اپنے اثر و عمل کا دائرہ خاصہ وسیع کر لیا ہے اور اب اس کے تنوعات اور اختراعات میں بھی دلچسپی لی جا رہی ہے ۔ تنقید کے حصے میں حیات اللہ انصاری کا مقالہ "افسانے میں دیو مالا" منظور حسین شور کا "احساس کمتری کے نفسیاتی عوامل" سحر انصاری کا "شبلی کا اسلوب تنقید" انجم اعظمی کا "ادب میں کمٹمنٹ" ڈاکٹر عارفہ فرید کا "فلسفہ زبان عام" ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا "اردو دانشوری کا جائزہ" مرزا خلیل احمد بیگ کا "اسلوبیاتی کی تنقید" اور جوگندر پال کا "اردو فکشن کی تنقید میں تشدد" چند ایسے مضامین ہیں جن کی بازگشت وسیع تر ادبی حلقوں میں سنی گئی دائرے نے مرثیہ کی تنقید کو خصوصی اہمیت دی ہے ۔ مشرف احمد نے ادبا کے تجزیاتی انٹرویو لینے اور ان کے باطن کو کھنگالنے کا سلسلہ شروع کیا ہے ۔ غالب ' اقبال اور سیرت نبوی کے گوشوں کو بھی خصوصی دلچسپی سے پڑھا گیا ۔ حال ہی میں ادبا کے مستند حالات ان کے اپنے قلم سے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے ۔ ان سب خصوصیات کی بنا پر "دائرے" کو ایک ایسا ماہ نامہ قرار دیا جا سکتا ہے جو ادب میں ایک خاموش تحریک برپا کر سکتا ہے ۔ اب تک اس نے جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ معیار اور مقدار دونوں زاویوں سے قابل قدر ہیں ۔

○
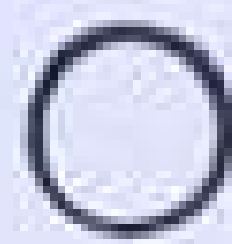
حوالہ جات

۱۔ "روداد سفر" کشور ناہید "چالیس سالہ نمبر" "ماہ نو"

۲۔ محمد طفیل نے "نقوش" کے اجراء کے بارے میں لکھا ہے کہ کبھی احمد ندیم قاسمی ریڈیو پاکستان پشاور میں ملازم تھے۔ میں لاہور میں تھا خط کے ذریعے طے پایا کہ ایک خالصتاً علمی و ادبی پرچے کی بسم اللہ کی جائے۔ ("نقوش"۔ شمارہ ۲۹ ' ۳۰ ' ص۔۴)

۳۔ "نقوش" "محمد طفیل نمبر" شمارہ ۱۳۶۔ ص ۳۳

۴۔ "نقوش" شمارہ ۳

۵۔ "نقوش" شمارہ ۱۳۶۔ ص ۲۲

۶۔ محمد طفیل نے علیحدگی کا پس منظر یوں بیان کیا ہے۔ "اس کے کچھ عرصہ بعد میرے اور مدیران "نقوش" کے درمیان ادبی نظریات کے سلسلے میں اختلافات پیدا ہو گیا۔ میں نے دوستانہ انداز میں ان کی خدمت میں چند تجویزیں پیش کیں جو قبول نہ ہوئیں' یوں میری نالائقی سے معاملہ فہمی سے "نقوش" ان لائق مدیروں سے ہاتھ دھو بیٹھا" ("نقوش" ۲۹۔ ص ۴)

۶ الف۔ جاوید طفیل "نقوش" ۱۳۶۔ ص ۴۔ ۱۹۸۷ء

۷۔ ایضاً"

۸۔ "نقوش" ، "طفیل نمبر"۔ ص ۵۹۴

۹۔ محمد طفیل "طلوع"" "میر تقی میر نمبر" اکتوبر ۱۹۸۰ء

۱۰۔ بحوالہ "نقوش" شمارہ ۱۱۰۔ ص ۱۴

۱۱۔ "قندیل" ۴ جنوری ۱۹۴۹ء

۱۲۔ محمد عارف قریشی "ادبی و علمی رسائل۔ پاکستان میں اردو" ص ۷۸۴۔ پشاور ۱۹۶۶ء

۱۳۔ حرف آغاز "سنگ میل" مارچ ۱۹۷۶ء

۱۴۔ سعادت حسن منٹو "قلم تھلے"" "اردو ادب نمبر۱" ص ۴

۱۵۔ شیخ عبدالقادر "مخزن" دور رسوم کا آغاز۔ جنوری ۱۹۴۹ء ص ۳

۱۶۔ "مخزن" کا آخری پرچہ جون ۱۹۵۱ء میں چھپا اور اس "مخزن" کی بندش کا اعلان بھی کر دیا گیا۔

۱۷۔ محمد عارف قریشی "پاکستان میں اردو" ص ۷۸۰

۱۸۔ قیوم نظر "نئی تحریریں" نمبر۱ ص ۶

۱۹۔ یونس جاوید۔ حلقہ ارباب ذوق۔ ص ۹۷

۲۰۔ "ثقافت" جنوری ۱۹۵۵ء ص ۳ تا ۵۔ لاہور

۲۱۔ عابد علی عابد "صحیفہ" نمبر۱۔ ص ۷۔ جون ۱۹۵۷ء

۲۲۔ ایضاً"

۲۳۔ سید امتیاز علی تاج "صحیفہ" شمارہ ۴۰۔ ص ۵

۲۴۔ "نصرت" ۲۰ دسمبر ۱۹۵۸ء۔ ۱۹۵۸ء ص ۴

۲۵۔ حرف آغاز۔ شمارہ ۵۔ ص ۳۔ دسمبر ۱۹۶۴ء"

۲۶۔ ارشد کاکوی "ندیم" جنوری ۱۹۶۰ء

۲۷۔ پرویز شاہدی نے یہ رائے "نذرالسلام نمبر" پر دی تھی۔ (انور سدید)

۲۸۔ نعیم صدیقی۔ اداریہ "سیارہ" اگست ۱۹۶۲ء

۲۹۔ فضل من اللہ "سیارہ" شمارہ خاص نمبر۔ ص ۹۔ لاہور ۱۹۷۶ء

۳۰۔ اداریہ "آرگس" شمارہ اول۔ ص ۱۷۔ لاہور ۱۹۶۲ء

۳۱۔ "آرگس" اشاعت اگست، ستمبر ۱۹۶۴ء۔ ص ۱۱

۳۲۔ حرف اول۔ احمد ندیم قاسمی "فنون" شمارہ اول۔ ۱۹۶۳ء

۳۳۔ مضمون کے آخر میں "ترجمہ" درج ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ اصل مصنف کون ہے۔ (انور سدید)

۳۴۔ سید عبداللہ "فنون" شمارہ خاص (۲) ص ۳۰۷۔ جولائی ۱۹۶۳ء

۳۵۔ "فنون" شمارہ خاص (۲) ص ۴۔ ۱۹۶۳ء

۳۶۔ شہزاد احمد "فنون" شمارہ خاص (۴)۔ ص ۲۸۷

۳۷۔ "ندیم" حرف اول۔ شمارہ ۷۔ ص ۱۳۔ دسمبر ۱۹۶۶ء

۳۸۔ حرف اول۔ شمارہ ۷۔ ص ۱۳۔ دسمبر ۱۹۶۶ء

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ ایضاً

۴۱۔ حمید احمد خان "فنون" سالنامہ ۱۹۶۹ء۔ ص ۴۶۱

۴۲۔ نسیم درانی اداریہ "سیپ" شمارہ اول۔ ص ۸۔ ستمبر ۱۹۶۲ء

۴۳۔ "سیپ" شمارہ ۵۔ ص ۳۰

۴۴۔ "سیپ" شمارہ ۳۰۔ ص ۱۸

۴۵۔ "سیپ" شمارہ ۵۶۔ ص ۱۵

۴۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا "اوراق" شمارہ اول "پہلا ورق" ص ۵۔ جنوری ۱۹۶۶ء

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ عارف عبدالمتین۔ حوالہ ایضاً۔ ص ۶

۴۹۔ وزیر آغا "پہلا ورق" "اوراق" مارچ ۱۹۷۲ء۔ ص ۴

۵۰۔ ایضاً "اوراق" ستمبر ۱۹۷۵ء۔ ص ۵

۵۱۔ مرزا ظفر الحسن "غالب" جنوری ۱۹۷۵ء ص ۱۔ کراچی

۵۲۔ عطاء الحق قاسمی۔ حرف آغاز "معاصر" نمبر ۱۔ (صفحہ نمبر درج نہیں) "معاصر" نمبر ۱ کا اداریہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو لکھا گیا تھا۔

۵۳۔ ایضاً حرف آغاز "معاصر" نمبر ۲۔ ص ۱۱۔ "معاصر" نمبر ۲ کا اداریہ ۱۰ اگست ۱۹۸۳ء کو لکھا گیا۔

۵۴۔ ایضاً ص۔ ۴۲

۵۵۔ "جریدہ" موسم بہار ۱۹۸۶ء۔ ص ۲۔ پشاور

۵۶۔ "روایت" شمارہ ۱۔ ص ۹۔ لاہور ۱۹۸۳ء

ساتواں باب

راہ نوردان شوق

اردو زبان کے ادبی رسائل کی تاریخ اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ ان کی اشاعت میں بالعموم ایسے ادبا نے سرگرمی سے حصہ لیا جن کے نزدیک اشاعت ادب ایک قومی اور تہذیبی مشن کی تکمیل کے مترادف تھا۔ ہماری ادبی صحافت سے سرسید ' مولانا ابو الکلام آزاد ' ظفر علی خان ' میاں بشیر احمد ' مولانا صلاح الدین احمد ' شاہد احمد دہلوی ' نیاز فتح پوری ' حکیم یوسف حسن' میرزا ادیب اور اب ڈاکٹر وزیر آغا' ڈاکٹر جمیل جالبی' ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور احمد ندیم قاسمی جیسے مدیران جرائد ابھرے ہیں تو ان سب میں یہ قدر مشترک نمایاں ہے کہ یہ تخلیق کار ادب کی شمع کو روشن رکھنے کے آرزو مند تھے اور انہیں تہذیب کا پیمبر شمار کرنا چاہئے۔ ادبی رسالے کی اشاعت ان کے لئے کبھی نفع بخش کاروبار ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی آمدنی اکثر ادبی رسالہ کھا جاتا رہا اور مسلسل نقصان اٹھانے کے باوجود یہ لوگ علم کی اس شمع کو بجھانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ "ساقی" "ادبی دنیا" "نیرنگ خیال" اور "نگار" جیسے رسائل کو طویل عمر نصیب ہوئی تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے مدیران ایثار کرنے والے ادبا تھے' ادبی رسالے کی اشاعت ان کے لئے پیشہ نہیں تھا' یہ ان کا عشق تھا اور وہ اسکی آبیاری اپنے خون جگر سے کرتے رہے۔

میں نے اوپر چند ایسے مدیران جرائد کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ادبی رسالے کی اشاعت کو زندگی بھر کے مشن کے طور پر قبول کیا اور اس سے تادیر روگردانی اختیار نہیں کی ۔ اس کڑے سفر میں ہمیں متعدد ایسے رسائل بھی نظر آتے ہیں جو خدمت ادب کے صالح اور مثبت جذبات لے کر میدان عمل میں آئے ' ادب کی قندیل کو خلوص نیت اور صادق جذبے سے روشن کیا' ابتدائے اشاعت کے مرحلے پر بلند بانگ دعوے بھی کئے لیکن تادیر استقلال کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ میں اس قسم کے مدیران جرائد کو "راہ نوردان شوق" سے تشبیہ دیتا ہوں۔ اردو ادب میں بہت سے رسائل ایسے ہیں جن کے اجراء میں مدیران کے ذوق و شوق کا عمل دخل زیادہ نظر آتا ہے لیکن جب دو چار پرچوں کی اشاعت کے بعد پرچے کی اقتصادیات اپنے نوکیلے ناخن دکھانے شروع کر دیتی ہے تو آمدنی اور خرچ کا توازن بگڑ جاتا

ہے۔ پہلے رسالہ التوائے اشاعت کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر ایک دن اچانک دنیا سے یوں رخصت ہو جاتا ہے کہ گردو پیش میں کوئی ماتم گسار بھی نظر نہیں آتا۔ اس قسم کے رسائل کی حیثیت جگنوؤں کی طرح ہے' تاہم ان کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ زیر نظر باب میں اس قسم کے کم عمر رسائل کا تذکرہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

اس باب کے مطالعے میں ایک یہ بات نظر آئے گی کہ بہت سے رسائل ادب کے غیر معروف اور دور افتادہ مقامات سے جاری ہوئے۔ آزادی کے بعد جب سرکاری اجازت نامے کا حصول ایک مشکل کام بن گیا تو یاران شوق نے کتابی سلسلوں کی اشاعت کا راستہ نکال لیا' ان میں سے بعض کتابی سلسلے مثلاً "محراب" "خیابان" "کلاسیک" "تخلیقی ادب" "دستاویز" نے تو اپنے دامن میں ایسے جواہرپارے پیش کئے کہ اردو ادب پر ان کے مستقل اثرات ثبت ہوئے۔ ان کا ذکر گذشتہ باب میں کیا گیا ہے۔ ان گنت کتابی سلسلے ایسے بھی تھے جن کو بڑے شہروں کے ممتاز ادبی جرائد کے خلاف ایک ردعمل کی حیثیت دی جا سکتی ہے' اس قسم کے جرائد نے چھوٹے شہروں کے ادیبوں کو اشاعتی سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کی اور بہت سے نئے لکھنے والوں کو قلم کا اعتماد عطا کیا' تاہم یہ کتابی سلسلے بھی زیادہ دیر تک چل نہ سکے۔ صرف حسین سحر کا رسالہ "اہل قلم" اور حیدر قریشی کا "جدید ادب" جو نسبتاً لمبے عرصے سے چھپ رہے ہیں۔ باقی سب شعلہ مستعجل ثابت ہوئے۔ اس باب میں ان قسم کے رسائل کی ادبی عطا کا اعتراف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"فردوس"۔ کراچی

جنوری ۱۹۴۸ء میں ملا واحدی نے کراچی سے اپنا ادبی مجلّہ "فردوس" جاری کیا اور اس میں "نظام المشائخ" دہلی کے ادبی مزاج کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے لکھنے والوں میں مشتاق احمد زاہدی' خواجہ محمد شفیع' پنڈت کیفی' فدا علی خنجر' خواجہ حسن نظامی' ماہر القادری' قیسی رام پوری اور اکبر شاہ نجیب آبادی کے نام اہم ہیں۔ اس پرچے نے تہذیب ادب اور زبان اردو کو فروغ دینے کی سعی کی لیکن بدلے ہوئے حالات میں یہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکا۔

"لالہ زار"۔ لائل پور

"لالہ زار" جنوری ۱۹۴۸ء میں لائل پور سے جاری ہوا۔ اس کے حلقہ ادارت میں تجمل ہاشمی' وارث الجیلانی اور یونس ادیب شامل تھے۔ لکھنے والوں کا ایک واضح حلقہ بنانے میں "لالہ زار" نے نمایاں محنت کی۔ اے ظہیر کاشمیری' میرزا ادیب' شاد امرت سری' منیر نیازی' حمید کاشمیری' عاشور

کاظمی اور اکمل علیمی کا تعاون حاصل ہوگیا۔ "لالہ زار" نے ارتقائے عمل کو جاری رکھنے کے لئے نئے تجربات کا خیر مقدم کیا لیکن ماضی سے بغاوت نہیں کی۔ ۱۹۵۶ء میں سالنامہ کی اشاعت اس کی ادبی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس سالنامے میں فیض احمد، صوفی تبسم، مجید امجد، کنہیا لعل کپور، ہاجرہ مسرور، عارف عبدالمتین، اشفاق احمد، احسان دانش، سلیم الرحمان اور عرش صدیقی نے شرکت کی تھی۔ "لالہ زار" کی آمدنی کا ذریعہ معمے نظر آتی ہے معموں کا سلسلہ چند برس تک تو کامیابی سے چلا لیکن جب ناکام ہوگیا تو "لالہ زار" کی بندش پر منتج ہوا۔

"فانوس" ۔ لاہور

پندرہ روزہ "فانوس" لاہور کے مدیر نسیم ایم اے تھے لیکن اس کی ادبی نگہداشت طفیل ہوشیار پوری نے کی۔ یہ ادبی جریدہ جنوری ۱۹۴۸ء کو لاہور سے جاری ہوا۔ لکھنے والوں میں عبدالمجید بھٹی، اختر انصاری اکبر آبادی، خلیق قریشی، عبدالحمید عدم اور حرماں خیر آبادی کے نام اہم ہیں۔ فانوس نے ادب کی خدمت ایک معمول کے پرچے کے طور پر کی۔ اس کا منفرد نقش تلاش کرنا ممکن نہیں۔

کاروان ۔ کراچی

مکتبہ عظمت کے زیر اہتمام ۱۹۴۸ء میں بیگم کوکب شادانی نے ماہنامہ "کاروان" کراچی کا اجراء کیا تو اس کے لئے اقبال کا یہ شعر بطور لوح اس پر درج کیا۔

نگہہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

کاروان میں سراج الدین ظفر، ہوش تیموری، سلام مچھلی شہری، سیف الدین سیف، فراق، اثر اور مجاز نے شرکت کی ہے لیکن "کاروان" کی اشاعت شوق ادارت کا نتیجہ نظر آتی ہے، اس لیے یہ زیادہ دیر تک مطلع ادب پر چمک نہ سکا۔

ماہنامہ "انیس" ۔ لاہور

ماہنامہ "انیس" کے مدیر مسئول سید مظفر جعفری تھے، مدیران اعزازی میں مشکور حسین یاد اور

ہوش ترمذی کا نام شامل تھا۔ "انیس" ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا' اس کا مقصد عام ادبی رسائل کی طرح علم و ادب کی سب اصناف کی خدمت و اشاعت تھا' تاہم اس نے مرثیہ نگاری اور میر انیس کے فن کے فروغ میں زیادہ دلچسپی لی۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں "انیس" نے ایک ضخیم "محرم" نمبر شائع کیا اور مئی جون ۱۹۵۰ء میں سالنامہ پیش کیا۔ "انیس" کے لکھنے والوں میں ماہر القادری' نجم آفندی' شرف نوگانوی' شیر افضل جعفری' جوہر نظامی' اثر لکھنوی اور فضا جالندھری کے نام اہم ہیں۔

"نفسیات"۔ لاہور

شیر محمد اختر "ہمایوں" سے علیحدہ ہوئے تو انہوں نے لاہور سے جدید وضع کا ایک ماہنامہ "نفسیات" جنوری ۱۹۴۸ء میں جاری کیا۔ اس کے ادارہ میں فہمیدہ ملک اور اختر رضی شامل تھے۔ "نفسیات" کا بنیادی مقصد فرائڈ' ایڈلر اور ینگ کے نفسیاتی مطالعوں کو اردو دان طبقے سے وسیع پیمانے پر متعارف کرانا اور اس نو دریافت علم سے ادب اور ادیب کے داخل کو دریافت کرنا تھا۔ اس ضمن میں اختر رضی کے مقالہ "میراجی کی نظموں میں نفسیاتی اشارے" کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو ستمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا اور وسیع حلقے میں پڑھا گیا۔

"احساس"۔ لاہور

۱۸۴۸ء میں پندرہ روزہ "احساس" میں انور جلال شمزہ نے ادب اور مصوری میں امتزاج پیدا کرنے کی سعی کی اس میں ادب کے ساتھ مصوری کے شاہکار اور مضامین بھی شائع کئے۔ مضامین کی پیشکش میں بھی جدید مصورانہ نقطہ نظر جو شمزہ کے ساتھ مخصوص تھا پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ انور جلال کی اپنی ادبی تحریریں بھی "احساس" میں دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔ لیکن "احساس" عوامی تعاون حاصل نہ کر سکا اور جلد ہی بند ہو گیا۔

"جدوجہد"۔ لاہور

ماہنامہ "جدوجہد" لاہور سے ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا تھا لیکن اسے ادبی صورت جنوری ۱۹۵۹ء میں اختر واصفی صاحب نے دی۔ اختر واصفی عروضی مزاج کے شاعر تھے اور رموز فن پر ہمیشہ کڑی نظر

رکھتے تھے انہوں نے "جدوجہد" میں عہد حاضر کے شعراء کے فنی عیوب کی نشاندہی کرنے میں گہری دلچسپی لی اور اکثر اوقات بڑے بڑے شعرا کی اصلاح کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔ اس پرچے میں اگرچہ مولانا عرشی، اعجاز حسین رضوی، بھگوان شاد، حاجی لق لق، مولانا سالک، فراق گورکھ پوری کا کلام باقاعدگی سے چھپتا تھا لیکن اس کی زیادہ اہمیت "ہم سخن فہم ہیں" سے تھی۔ "جدوجہد" میں اس کے نام کی رعایت سے بھی تحریک نظر نہیں آتی، چنانچہ ستمبر ۱۹۶۰ء میں اس پر اضمحلال کے آثار نمایاں ہوئے اور مارچ ۱۹۶۱ء میں غلام غوث مدیر اعزازی نے اس کی ادبی حیثیت ختم کر دی۔

"معمار ادب"۔ لائل پور

نومبر ۱۹۵۹ء میں اشرف گوہر نے لائل پور سے ماہ نامہ "معمار ادب" جاری کیا، تو ان کے پیش نظر یہ حقیقت بھی تھی کہ ادب کی اشاعت منافع بخش کاروبار نہیں۔ انہوں نے جلب زر سے بچنے کی کوشش کی اور اپنے خلوص کی اساس پر چند اچھے پرچے شائع کئے۔ اس پرچے کے لکھنے والوں میں پروفیسر شور، سجاد رضوی، فراق گورکھ پوری، شہزادہ حسن، غلام ربانی تاباں، روش صدیقی، خیر بہوروی اور اختر علی صابری کے نام اہم ہیں، لیکن یہ پرچہ بھی ادب کے لئے زیاں کا کاروبار جاری نہ رکھ سکا اور اقتصادی کمزوری ہی اس کی بندش کا سبب بن گئی۔

"کارواں" کراچی

رسالہ "کارواں" کراچی سے جنوری ۱۹۵۱ء میں شاہد حسین رزاقی اور نظر حیدر آبادی کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ حیدر آباد دکن کی یادوں کو زندہ رکھنے اور اس خطے کے ادیبوں کی ادبی تخلیقات پیش کرنے میں "کاروان" نے خصوصی خدمات سرانجام دیں۔ "کارواں" کا سب سے بڑا کارنامہ ستمبر اکتوبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت پر مشتمل "حیدر آباد نمبر" ہے۔ یہ پرچہ تمام تر حیدر آباد ادبا نے لکھا اور اس خطے کی تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں کو منور کیا۔ چند مضامین کے عنوان یہ ہیں "دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا" از عبدالقادر سروری۔ "اردو میں سائنس کی تعلیم" از آفتاب حسن "حیدر آباد کی صحافت" از بدر شکیب "دکنی ثقافت اور رسم و رواج" از نصیرالدین ہاشمی "داستان ادب حیدر آباد" از ڈاکٹر زور "حیدر آباد نمبر" کی اشاعت کے بعد "کارواں" زیادہ دیر تک زندہ نہ رہا۔ "کارواں" کے لکھنے والوں میں سکندر علی وجد، حبیب اللہ رشدی، وحیدہ نسیم، بشیر النسا بیگم بشیر، ابراہیم جلیس اور مظفر حسین

شمیم شامل تھے۔

"شاہ وار" ۔ لاہور

ماہ نامہ "شاہوار" جنوری ۱۹۵۱ء میں سید عاشور کاظمی کی ادارت میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے لکھنے والوں میں کمال احمد رضوی امجد حسین، اختر گوبند پوری، میرزا ادیب، منصور قیصر، فکر تونسوی، شور علیگ جیسے ممتاز ادبا کے نام شامل ہیں، جنوری ۱۹۵۶ء میں "شاہوار" کا "افسانہ" نمبر کتابی سائز میں شائع ہوا اور اس میں بیشتر نئے افسانہ نگاروں کو جن میں اکمل علیمی، اعجاز رضوی، بشارت انور، فاروق عادل اور ریاض بٹالوی شامل ہیں، شائع کیا۔ "شاہوار" ایک مالیاتی کمپنی "شاہکار لمیٹڈ" کے تعاون سے شائع ہوتا تھا۔ یہ کمپنی ختم ہوئی تو شاہوار بھی بند ہو گیا۔

"سات رنگ" ۔ منٹگمری

ہفت روزہ "سات رنگ" اگرچہ ضلعی پرچہ تھا لیکن اسے مجید امجد اور منیر نیازی کی ادارت نے چار چاند لگا دیئے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا دائرہ اثر وسیع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، چنانچہ ۱۹۵۳ء میں "سات رنگ" لاہور منتقل ہو گیا اور اس کی ادارت میں منظور ممتاز، منیر نیازی کا ہاتھ بٹانے لگے، لیکن "سات رنگ" متلون مزاج ثابت ہوا اور بہت جلد ادب سے غائب ہو گا۔ "سات رنگ" کی اب تاریخی حیثیت یہ ہے کہ اسے منیر نیازی مرتب کرتے تھے اور اس کے ساتھ کبھی مجید امجد وابستہ تھے۔

"سیارہ" ۔ کراچی

ماہنامہ "سیارہ" کراچی کا طلوع فروری ۱۹۵۳ء میں ہوا۔ یہ مصور پرچہ عزیز احمد کی نگرانی میں ادارہ منصور کے اہتمام سے شائع ہوتا تھا۔ پرچہ خوبصورت اور مضامین کے لحاظ سے بھی دلکش تھا لیکن اسے عوامی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں اس کی ادارت نذیر احمد نے سنبھال لی۔ کچھ عرصے کے بعد ممتاز حسین مدیر مقرر ہوئے لیکن یہ پرچہ مطالعے کا وسیع حلقہ پیدا نہ کر سکا اور اپنی صوری خوبصورتی کے باوجود ابتداء ہی میں تنزل کا شکار ہو گیا۔

"زندگی" ۔ پشاور

پشاور سے ماہنامہ "زندگی" کا اجراء فروری ۱۹۵۳ء میں ہوا۔ اس کے ادارے میں کمال حیدر آبادی، انیس غزنوی اور یوسف النساء بیگم کے نام شامل تھے، زندگی کے کا ادبی روپ خاطر غزنوی نے نکھارا، جو نومبر ۱۹۵۳ء میں شریک ادارت ہوئے۔ "زندگی" کا "جشن ماہتاب نمبر" (مارچ ۱۹۵۴ء) اور "آٹوگراف نمبر" یادگار پرچے ہیں۔

"لوح و قلم" ۔ پشاور

پشاور کا ہفت روزہ "لوح و قلم" ادبی مزاج کی کی آبیاری کرتا تھا۔ اس کا اجرا عارف ندا نے یکم مارچ ۱۹۵۵ء کو کیا۔ دو تین سال تک یہ پرچہ زندگی کی تگ و دو میں مبتلا رہا۔ اپریل ۱۹۵۵ء میں اس کا "اقبال نمبر" شائع ہوا۔ لیکن اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

"صادق" ۔ لاہور

ہفت روزہ "صادق" لاہور سے سید عابد علی عابد اور قاسم محمود کی ادارت میں جنوری ۱۹۵۶ء میں جاری ہوا تھا، یہ ایک خالص ادبی ہفت روزہ تھا، جسے مولانا غلام رسول مہر، مولانا حامد علی خان، مولانا صلاح الدین احمد، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کے علاوہ جدید ادبا، قیوم نظر، انجم رومانی، یوسف ظفر، سجاد رضوی، سردار انور کا تعاون بھی حاصل تھا، "صادق" کا مزاج کلاسیکی تھا۔ اس نے ادب میں جمالیاتی زاویہ ابھارنے اور حسن کی قدروں کی افزائش کی، چنانچہ معنوی لحاظ سے ہی نہیں یہ پرچہ صوری طور پر بھی بے حد جاذب نظر تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء کو اس نے معمول کی اشاعت کو "اقبال نمبر" کا عنوان دیا اور اس میں بشیر احمد ڈار، چودھری محمد حسین، کلیم الرحمٰن، آغا صادق، عبدالقادر حسن اور بلقیس عابد علی عابد کے مضامین شائع کئے۔ "صادق" کی سالانہ قیمت صرف ۶ روپے تھی، لیکن یہ پرچہ ایک سال سے بھی زیادہ زندگی حاصل نہ کر سکا۔

"ادب" ۔ کراچی

۱۹۵۶ء میں " ادب " کے نام سے کراچی سے ایک نیا پرچہ رحیل آذری' انجم سلمانی اور انجم شیرازی نے جاری کیا۔ اس نے ادبی فرقہ بندیوں سے الگ رہ کر ادب کی خدمت کرنے کی جد و جہد کی لیکن نظموں' غزلوں اور افسانوں کا عام معیار کامیابی کا ضامن نہ ہو سکا۔

"ادبیات" ۔ چکوال

چکوال ضلع جہلم سے مارچ ۱۹۵۶ء میں ماہنامہ "ادبیات" جاری کیا گیا۔ اس کے مدیران ریاض چشتی اور جمیل ہاشمی کے پیش نظر اردو ادب کو جدید اور صحت مند خطوط پر آگے بڑھانے کا مقصد عظیم تھا' اس پرچے کو ابتدا میں کرم حیدری صاحب کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ مولوی عبدالحق' سید علی عباس جلال پوری' ڈاکٹر محمد باقر اور عبدالسلام خورشید نے تہنیت کے پیغامات بھیجے' ادبیات کو عزیز ملک' یوسف ظفر' ریاض ہمدانی' حمید جعفری' ماہر القادری' عاصی کرنالی' جمیل ملک اور شوکت واسطی کا تعاون حاصل تھا' لیکن یہ پرچہ اپنے عزائم کو کامیابی سے ہم کنار نہ کر سکا۔ اور چند اشاعتوں کے بعد ہی بند ہو گیا۔

"کاروان" ۔ کراچی

کراچی سے نومبر ۱۹۵۶ء میں یاور دہلوی کی ادارت میں ایک جدید وضع کا رسالہ "کاروان" جاری ہوا۔ اس کے لکھنے والوں میں اس دور کے بیشتر جدید ادبا۔۔۔۔ کرشن چندر' احمد علی' ابن انشا' ساقی فاروقی' میرزا ادیب' ہاجرہ مسرور' محمد حسن عسکری' افضل پرویز' شاذ تمکنت' خلیل الرحمٰن اعظمی' سعادت حسن منٹو' عزیز احمد' ابراہیم جلیس اور شوکت صدیقی شامل تھے۔ "کاروان" نے نومبر ۱۹۵۷ء میں اپنا سالنامہ پیش کیا جس میں بعض چھپے ہوئے مضامین بھی شامل تھے۔ اس میں ایک عنوان تھا "عسکریت کیا ہے"۔ محمد حسن عسکری نے "میں اور میرا فن" کے عنوان سے اور ممتاز حسین نے "کردار نگاری" کے موضوع پر مقالہ لکھا' باقی صدیقی کا غنائیہ "موسیقار" اور ریحان صدیقی کی طویل نظم "قافلہ موسم گل" اس کے اہم حصے تھے۔ عزیز احمد کا مزاح نامہ "قصہ حلقہ اصحاب طوق" ایک نادر چیز ہے۔ "کاروان" نے معیاری مضامین پیش کئے لیکن اسے طول اشاعت نصیب نہیں ہوئی۔

"لوح و قلم" ۔ کراچی

۱۹۵۶ء میں جاری ہونے والا کراچی کا "لوح و قلم" دو ماہی جریدہ تھا۔ یہ نئے لکھنے والوں کا پرچہ تھا اور اسے مولوی عبدالحق' اور سید ہاشم رضا کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا۔ "لوح قلم" کا "شہید نمبر ۱۹۵۹ء" اس کی ایک قابل ذکر اشاعت ہے۔

"نوائے اقبال" ۔ لاہور

"نوائے اقبال" کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ شیخ عزت اللہ نے مئی ۱۹۵۶ء میں لاہور سے جاری کیا تھا' اس پرچے کا مقصد "اقبالیات" کا فروغ عام تھا۔ پہلے پرچے کو "اقبال نمبر" کے طور پر شائع کیا گیا اس میں "اقبال کا فلسفہ عمل" از شیخ غلام محی الدین خلوت' "اقبال کا نظریہ سیاست" از شیم جالندھری' "اقبال کا قیام لاہور" از شیخ عزت اللہ شامل ہیں۔ معنوی اور صوری لحاظ سے "نوائے اقبال" معمولی قسم کا پرچہ تھا۔ اس لئے چل نہ سکا۔

"مشرق" ۔ کراچی

کراچی سے "مشرق" کے عنوان سے ایک ماہنامہ افتخار احمد اور نہال احمد کی ادارت میں مارچ ۱۹۵۷ء میں جاری ہوا ۔ مدیران نے اسے "اک جذبۂ منزل اک ذوق فرواں" کا تقاضہ قرار دیا۔ ادب کے معیار کو بلند کرنے اور ایسی تہذیبی اقدار کو روشن کرنے کے لئے جن سے بے اعتنائی برتی جا رہی تھی "مشرق" نے آغاز اشاعت کیا۔ اس پرچے کو فیض' عابد علی عابد' عبدالحمید عدم' شوکت تھانوی' حمایت علی شاعر' مظہر امام' کرشن چندر' جعفر طاہر' ڈاکٹر محمد باقر جیسے ادبا کا تعاون ابتدا ہی میں حاصل ہو گیا۔ لیکن پرچہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا۔

"پیام عمل" ۔ لاہور

ماہنامہ "پیام عمل" امامیہ مشن لاہور کے تبلیغی اور جماعتی مقاصد کے لئے ۱۹۵۷ء میں جاری

کیا گیا تھا۔ اس کے سرپرست مولانا محمد جعفر زیدی اور نگران جسٹس جمیل حسین رضوی تھے' ہر سال محرم کے موقع پر "پیام عمل" میں مرثیہ کے فن پر قابل قدر مضامین پیش کئے جاتے تھے' اس کا ایک بڑا کارنامہ جنوری فروری ۱۹۷۳ء کی اشاعت پر مشتمل انیس نمبر ہے جس کی ترتیب و تدوین میں مولانا فاضل لکھنوی اور ضمیر اختر نقوی کے علاوہ سید کوثر حسین صاحب نے بھی ہاتھ بٹایا۔ اس خاص نمبر کی شہرت ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالہ "انیس کا غم"۔ انتظار حسین کے "انیس کے مرثیے میں شہر"۔ سرشار صدیقی کے "میر انیس کی منظر نگاری"۔ یوسف جمال انصاری کے مقالہ "میر انیس کی رباعیات" کی وجہ سے دور دور تک پہنچی۔ کسریٰ منہاس' ڈاکٹر محمد اسلم فرخی' سید وقار عظیم اور فاضل لکھنوی کے مضامین کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس کا دوسرا کارنامہ "دبیر نمبر" ہے جسے کوثر حسین نے مرتب کیا۔ اب یہ جریدہ تبلیغی مقاصد میں سرگرم عمل ہے۔

"خیال"۔ لاہور

ماہ نامہ "خیال" لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے اجرا میں ناصر کاظمی اور انتظار حسین شریک تھے' جو ادب میں "نئی نسل" کا نعرہ لے کر آئے تھے اور "خیال" کی ترتیب اپنے مزاج کے مطابق کرنا چاہتے تھے' خیال کا اہم ترین کارنامہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر ایک یادگار اشاعت ہے۔

"فطرت"۔ لاہور

ماہنامہ "فطرت" علم و ادب کی نئی اور پرانی قدروں کا نقیب تھا۔ یہ پرچہ مارچ ۱۹۵۷ء میں رفیق احمد اور لطف المنان ساحر کی ادارت میں جاری ہوا۔ ابتدا میں اسے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ آغا بابر کا افسانہ "بیوگی" جیلانی کامران کا رپورتاژ "زمین کے سینے سے" عابد علی عابد کا تاثر یہ "اگر میں تان سین کے عہد میں ہوتا" اور یوسف ظفر کی نظم "ابررواں" "فطرت" ہی میں شائع ہوئی تھی۔ فطرت تجرباتی پرچہ تھا۔ اس نے ہیئت' اسلوب اور معنی کے تجربوں کے علاوہ صوری تجربے کرنے کی کوشش بھی کی لیکن یہ تجربہ تادیر کامیاب ثابت نہ ہو سکا۔

"نیا پیام" - لاہور

ادب، تعمیر اور زندگی کا ترجمان پندرہ روزہ "نیا پیام" لاہور سے ۱۹۵۷ء میں محمد اکرم نے جاری کیا تھا۔ اس نے زندگی کے تعمیری پہلو کو نمایاں کرنے اور سماجی ناہمواریوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی، ادب اس کا ایک اضافی زاویہ تھا۔ اور اس کے تحت ہر پرچے میں غزلیں، نظمیں اور افسانے پیش کئے جاتے تھے، جن کی اپیل عوامی نوعیت کی ہوتی تھی۔ "نیا پیام" کا "رفعت سلطان نمبر" اور "ثاقب سلیمانی نمبر" اس پرچے کی دو اہم اشاعتیں ہیں۔ ان پرچوں میں ڈاکٹر سید عبداللہ، فیض احمد فیض، مجید امجد، وزیر آغا، احسان دانش، حبیب اشعر، رحمٰن مذنب جیسے ادبا نے شرکت کی ہے۔ "نیا پیام" میں شوق، پیشہ اور پیامبری کے عناصر مدغم ہو گئے ہیں۔

"اندازے" - لاہور

۱۹۵۸ء میں "اندازے" نسل نو کے ترجمان کی حیثیت میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے مرتب مقبول عزیز تھے لیکن ج۔ ک۔ کے حروف میں اس کی ادارت کی ساری ذمہ داری جیلانی کامران سرانجام دیتے تھے، "اندازے" اس اضطراب کا عکاس تھا جو اس دور کے نئے لکھنے والوں کے دلوں میں پرورش پا رہا تھا اور اپنے تخلیقی اظہار کے لئے نئی ہیتیں اور اسالیب تلاش کررہا تھا۔ اس پرچے کے لکھنے والوں میں سلیم الرحمٰن۔ انور سجاد، ریاض قادر، توفیق رفعت، عدیم راوی، اور شفقت تنویر مرزا کے نام اہم ہیں۔ جیلانی کامران "شاعری کے نئے موڑ کی تلاش" میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ "ایک یاداشت۔۔۔ ایک کتبہ" میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کے بارے میں رد عمل کا مثبت اظہار کیا ہے۔ "اندازے" نے ہیئت کے تجربوں کو نئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ رشتہ مضبوط خطوط پر استوار نہ ہو سکا۔ چنانچہ چند اشاعتوں کے بعد ہی "اندازے" کی اشاعت منقطع ہو گئی۔

"نقیب" - لاہور

ماہنامہ "نقیب" لاہور سے ستمبر ۱۹۵۸ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر کے زریں صاحب تھے، اس کا مقصد موجودہ ادبی اور معاشرتی تقاضوں کے مطابق ایک ادبی پرچہ پیش کرنا تھا۔ اس پرچے نے اپنا مزاج عوامی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی لیکن زیادہ عرصے تک کوئی قابل ذکر کارنامہ سر

انجام نہ دے سکا۔

"حرف و حکایت"۔ لاہور

عبداللہ بٹ نے "حرف و حکایت" کے نام سے ایک علمی، ادبی اور ثقافتی جریدہ ۱۹۵۹ء میں جاری کیا۔ عبداللہ بٹ ایک کامیاب صحافی اور لاہور کی مجلس آرا شخصیات میں شمار ہوتے تھے، ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور ان میں بیشتر اس دور کے نامور لکھنے والے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "حرف و حکایت" کی کاروباری حیثیت مستحکم نہ ہو سکی۔ اس پرچے کے لکھنے والوں میں امجد نجمی، باری علیگ، عبدالمجید بھٹی، عبدالحمید عدم، راغب احسن اور اکرام جاوید شامل تھے۔ ۱۹۶۴ء کے بعد اس کی اشاعت متزلزل ہو گئی۔

"نگارش"۔ کراچی

کراچی سے ماہنامہ "نگارش" مئی ۱۹۱۰ء میں جاری ہوا۔ اس کے مینجنگ ایڈیٹر قیصر انجم تھے۔ جنوری ۱۹۶۴ء میں "نگارش" کا ایک شاندار "افسانہ نمبر" شائع ہوا جس میں افسانہ نگاروں کے خود نوشت حالات نے خصوصی توجہ حاصل کی۔ زکی انور، جوگندپال، قاسم محمود، رام لعل، بانو قدسیہ، اقبال متین، انور خواجہ اور شفیع عقیل کے افسانوں کے علاوہ کرشن چندر، ستم پرکاش شوق کا انٹرویو خاصے کی چیز ہے۔

"افکار نو"۔ لاہور

ماہنامہ "افکار نو" محمد ارشد خان بھٹی کے اہتمام سے لاہور سے جون ۱۹۶۰ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کا مقصد ادب کے وسیلے سے اخلاقی، ثقافتی اور روحانی ارتقا کے مدارج طے کرنا تھا۔ اس کے لکھنے والوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، فرمان فتح پوری، احسان دانش، اثر صہبائی، ماہر القادری، خالد بزمی اور تبسم کاشمیری کے نام نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ پرچہ متوقع کامیابی حاصل نہ کر سکا اور دوسری جلد کے بعد ہی ۱۹۶۱ء میں مطلع ادب سے غائب ہو گیا۔

"حیات جاوداں"۔ لاہور

لاہور سے ماہنامہ "حیات جاوداں" جنوری ۱۹۶۱ء میں جاری ہوا' یہ "مجلس تعمیرو فکر و کردار" کا ترجمان رسالہ تھا۔ ادارت کے فرائض میاں عبدالرشید سرانجام دیتے تھے۔ چند مخصوص سماجی مقاصد کے پیش نظر "حیات جاوداں" نے اخلاقی نظموں اور فکری مضامین کی اشاعت میں زیادہ دلچسپی لی۔ مئی ۱۹۶۱ء میں اس کا مختصر سا "اقبال نمبر" اس کی ایک خاص اشاعت ہے۔ "حیات جاوداں" کے اثر و عمل کا دائرہ محدود تھا۔

"مشعل راہ"۔ کراچی

کراچی سے ماہنامہ "مشعل راہ" اگست ۱۹۶۱ء میں جاری ہوا اس کے مدیر اعلیٰ خورشید احمد اور معاون مدیر محمود فاروقی تھے۔ لکھنے والوں میں فروغ احمد' اسعد گیلانی' ابن سلیم' محمود فاروقی' لالہ صحرائی' ضیاء الرشید' افتخار اعظمی' عامر عثمانی' محسن انصاری اور سید غلام سمنانی شکیب کے نام نمایاں ہیں۔ "مشعل راہ" کا مقصد اسلام اور نظریہ پاکستان کا فروغ تھا۔ اس پرچے نے علمی اور ادبی وضع کو قائم رکھا اور بحث و نظر کو خنک مزاجی سے پیش کیا۔

"شاداب"۔ پشاور

پشاور سے "شاداب" محمد یوسف شاد' عبداللطیف' شمیم بھیروی اور محمد اشرف طارق کی ادارت میں جنوری ۱۹۶۲ء میں جاری ہوا تھا۔ یہ پندرہ روزہ پرچہ تھا لیکن بالعموم اس کی دو اشاعتیں یکجا کر کے چھاپی جاتی تھیں' اس پرچے میں پشاور اور نواح پشاور کے ادیبوں کو نسبتاً زیادہ نمائندگی دی گئی' چنانچہ جلیل حشمی' شاکر اللہ' فرید عرش' مجید شاہد' خلش آفریدی' محمد شمس الدین صدیقی' افضل حسین اظہر' احمد پراچہ کے نام اس پرچے میں نمایاں ہیں۔ مارچ ۱۹۶۳ء میں "شاداب" کا خاص نمبر شائع ہوا جو صرف ۵۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ "شاداب" نے ادبی صحافت کے ذریعے اردو اور پشتو کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی لیکن اس کا دائرہ اثر و عمل وسیع نظر نہیں آتا۔ شاداب کا ادبی سفر بھی بے جہت معلوم ہوتا ہے۔

"منشور" - لاہور

پندرہ روزہ ادبی جریدہ "منشور" جنوری ۱۹۶۲ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر راجہ عبدالحمید تھے، اس پرچے نے اوسط درجے کا علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے قارئین کی ذہنی آبیاری کی، اور ادب کے ساتھ معاشرتی تعلیم کو بھی اپنے مقاصد میں شامل کر لیا۔ اس کے لکھنے والوں میں کرشن چندر، کشور ناہید، عاصم گیلانی، علی احمد جلیلی، اور آثم فردوسی شامل تھے۔

"احوال" - لاہور

ادبی ہفت روزہ "احوال" اکتوبر ۱۹۶۲ء میں محمد شریف خان کی ادارت میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس رسالے نے خالص پاکستانی فکر و اخلاق کی داغ بیل ڈالنے کا تہیہ کیا تھا اور اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد باقر، نظر حیدر آبادی، عزیز حاصل پوری، عبدالحمید عدم سے منظومات و مضامین حاصل کر کے شائع کیے، لیکن یہ پرچہ ادبی لحاظ سے کوئی جہت واضح نہ کر سکا۔

"منشور" - کراچی

ماہنامہ "منشور" کراچی ایرویز ایمپلائز یونین کا ترجمان تھا۔ یہ جنوری ۱۹۶۳ء میں جاری ہوا۔ سبط اختر نے اسے ادبی پرچہ بنانے کی کوشش کی اور فروری ۱۹۶۹ء میں "منشور" کا "غالب نمبر" شائع ہوا۔ "منشور" حیات و کائنات کا ترجمان تھا لیکن اس پر ٹریڈ یونین کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔

"نگارستان" - کراچی

ماہنامہ "نگارستان" کراچی مئی ۱۹۶۳ء میں شفیق احمد کی ادارت میں جاری ہوا اس کے انتظامی امور لئیق قریشی کے ہاتھ میں تھے۔ انہوں نے اسے ایک مقبول عام پرچہ بنانے کی کوشش کی۔ ابراہیم جلیس کا طنزیہ مضمون "تکیہ کلام" شام بارک پوری کا افسانہ "جنگلی پھول" اور حبیب جالب کی نظمیں اس پرچے کی نمایاں تحریریں ہیں۔ تجارتی نوعیت کے اس پرچے کے ادبی اثرات خاصے محدود ہیں اس پرچے نے دوسرے رسائل سے مضامین حاصل کرنے اور انہیں مکرر شائع کرنے کے رجحان کو

بھی تقویت دی ہے۔ جو چنداں قابل تعریف نہیں۔

"عالمگیر" ۔ پشاور

پشاور سے رسالہ "عالمگیر" میاں نعیم رضا کی ادارت میں جنوری ۱۹۶۵ء میں جاری ہوا۔ اس کا مقصد نواح پشاور کی علمی و ادبی فضا پر اردو ادب کے صحت مند اثرات مرتب کرنا تھا۔ لیکن اسے لکھنے والوں کا اچھا حلقہ میسر نہ آ سکا۔ چنانچہ تیسرے سال اشاعت ہی میں اس کے قدم اکھڑ گئے۔

"عکس لطیف" ۔ کراچی

ماہ نامہ "عکس لطیف" نومبر ۱۹۶۵ء میں کراچی سے جاری ہوا۔ اس پرچے کے مدیر شور صہبائی تھے۔ اس کا مقصد قارئین کے ادبی ذوق کی تشنگی کو بجھانا اور تنقیدی و تخلیقی مضامین پیش کرنا تھا۔ مئی ۱۹۶۹ء میں "عکس لطیف" نے "شمارۂ غالب" پیش کیا۔ اس کے لکھنے والوں میں مجتبیٰ حسین، ضیاء الحسن موسوی، شور علیگ، فاضل لکھنوی اور امیر امام شامل تھے لیکن یہ شمارۂ خاص غالب کا واضح نقش ابھارنے میں قاصر رہا۔

"زاویے" ۔ حیدر آباد

ماہنامہ "زاویے" نے جون ۱۹۶۵ء میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کے مدیر حسن ظہیر تھے "زاویے" بیدار ادب کا نقیب تھا اور اس نے ادب کی سب اصناف کی آبیاری تازہ افکار سے کرنے کی کوشش کی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "زاویے" کی ماہانہ اشاعتوں کو صرف معمول کی حیثیت حاصل تھی، اس کی ادبی زندگی کا اہم واقعہ 'سالنامہ ۱۹۶۶ء' کی اشاعت ہے۔ اس خاص نمبر میں نئے اور پرانے لکھنے والوں کی ایک خوبصورت کہکشاں مرتب کی گئی ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کا مقالہ "ناول کا طرز ادا" ریاض صدیقی کا "غالب کے فکروفن کے چند پہلو" ڈاکٹر اسلم فرخی کا "سیماب اکبر آبادی کے فنی نظریات" اور نظر کامرانی کا "میر صاحب" اس پرچے کے چند اچھے مقالات ہیں۔ "زاویے" میں مصطفےٰ زیدی، الطاف مشہدی، پروفیسر شور، محسن بھوپالی، ادیب سہیل، حسن حمیدی، سلطان جمیل نسیم، رفعت اور شایان احمد مدنی جیسے اہل قلم کے مضامین شائع ہوئے "قومی یک جہتی میں علاقائی ادب کا

کردار" کے موضوع پر مذاکرے میں اسلم انصاری ' جیلانی کامران اور احمد ندیم قاسمی کے خیالات پیش کیے گئے۔ "زاویے" نے حسن انتخاب اور حسن ترتیب کا اعلیٰ معیار پیش کیا تھا ' یہی وجہ ہے کہ اس پرچے کی صدائے بازگشت اب بھی ادبی دنیا میں سنی جاتی ہے۔

"نئی سحر"۔ جڑانوالہ

جڑانوالہ سے "نئی سحر" کے نام سے ایک ادبی جریدہ جون ۱۹۶۶ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر محمد اقبال طپش تھے اور مدیران اعزازی میں ایس اختر جعفری اور محمد افضل ملک کے نام شامل تھے ' مدیران نے غرض اشاعت کے تحت لکھا کہ وہ ادب جہاں سے روح عصر کی عکاسی اور ماحول اور وقت کی ترجمانی کا فریضہ ادا کریں گے۔ اس پرچے میں محمد افضل ملک کا مقالہ "المیہ کا تصور" اختر جعفری کا "پیام اقبال" دو اچھے مضامین تھے۔ افسانوں کے حصے میں اے حمید ' ممتاز مفتی ' میرزا ادیب اور انجم پرواز کے افسانے شامل ہیں۔ "نئی سحر" کا صرف ایک ہی پرچہ شائع ہوا۔

"دائرے"۔ کراچی

۱۹۷۳ء میں کراچی سے "دائرے" زندہ ادب کا ترجمان بن کر ظاہر ہوا۔ اس کے مدیر ضیا کیانی تھے "دائرے" کا قصد ادب کے وسیلے سے ذہنی گھٹن رفع کرنا اور ادیب کے اختیار کو آزمانا تھا ' لیکن "دائرے" کے مضامین میں اس جہت کی طرف کوئی نمایاں پیش قدمی نظر نہیں آتی ' لکھنے والوں میں محمد احسن فاروقی ' حمید کاشمیری ' قیوم راہی ' ناصر زیدی ' اطہر پرویز ' حسن اکبر کمال ' شمیم نوید جون ایلیا اور اقبال صفی پوری کے نام اہم ہیں۔ "تنقیدی اصول اور اردو نقاد" محمد احسن فاروقی کا ایک فکر انگیز مضمون ہے جو "دائرے" میں شائع ہوا۔ "دائرے" کی زندگی چند پرچوں تک محدود ہے۔

"گل فشاں"۔ لاہور

ماہنامہ "گل فشاں" ممتاز شاعر سیف زلفی کے فکرونظر کا نقیب تھا۔ یہ پرچہ لاہور سے ۱۹۶۷ء میں جاری ہوا۔ سیف زلفی نے اسے ایک خوبصورت اور فکر انگیز ادبی صحیفہ بنانے کی پوری کوشش کی اور احمد ندیم قاسمی ' مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی ' ڈاکٹر وزیر آغا ' انجم رومانی ' شہزاد احمد اور متعدد نامور

ادبا کا تعاون حاصل کر لیا۔ "گل فشاں" کا "غالب نمبر" جو دو جلدوں میں شائع ہوا اس کی ایک یادگار اشاعت ہے۔ "گل فشاں" میں ادیبوں کا تعارف بڑے خوبصورت انداز میں کرایا جاتا تھا۔ "گل فشاں" کا خیر مقدم ادبی حلقوں میں وسیع پیمانے پر ہوا لیکن یہ تادیر جاری نہ رہ سکا۔

"ارباب قلم" کراچی

اقبال شوقی اور شبنم رومانی کی ادارت میں شائع ہونے والا جریدہ "ارباب قلم" اسی نام کی انجمن کا ترجمان تھا۔ "ارباب قلم" پاکستان فروغ ادب کے لیے مذاکرے، مشاعرے، ادبی جلسے، مسالمے اور تعزیتی مجالس ملک کے مختلف ادبی مقامات پر منعقد کرتی تھی، ارباب قلم کتابی نوعیت کا جریدہ تھا جس کی دو دلنواز اشاعتیں منظر عام پر آئیں ان پرچوں میں جوش ملیح آبادی، عبدالعزیز خالد، وزیر آغا، شبنم رومانی، سیدہ حنا، عارف عبدالمتین، سلطانہ مہر اور متعدد دوسرے ادبا کی تخلیقات شائع ہوئیں۔ لیکن "ارباب قلم" بہت جلد مالی پریشانیوں کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء کے بعد اس کا کوئی پرچہ نہیں چھپا۔

"بہار نو"۔ کراچی

کراچی سے "بہار نو" مئی ۱۹۶۹ء میں اشر بدایونی کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس کے لکھنے والوں میں انجم فوقی، الیاس عشقی، ہادی مچھلی شہری، جام نوائی، حسن انصاری، شاد عارفی شامل تھے۔

"محور حیات"۔ آلو مہار (سیالکوٹ)

مئی ۱۹۶۷ء میں آلو مہار (سیالکوٹ) سے ماہانہ "محور حیات" جاری ہوا۔ اس کی ادارت خلیفہ محمد سعید اور پروفیسر سلطان بخش سرانجام دیتے تھے۔ اس پرچے کے لکھنے والوں میں احسان دانش، کوثر نیازی، نورالحسن ہاشمی، مفتاح الدین ظفر اور محمد ارشد بھٹی شامل ہیں۔ اس پرچے کا مقصد ادب کے ذریعے بلند اخلاق تعمیر کرنا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء میں اس کا "تعمیر اخلاق کانفرنس نمبر" شائع ہوا۔

"حروف" کراچی

انور شعور نے کراچی سے ۱۹۷۰ء میں "حروف" جاری کیا اور اسے علم وادب، سماج اور ثقافت کا نمائندہ بنانے اور ادبی موضوعات پر مختلف مباحث ابھارنے کی کوشش کی۔ "دور حاضر میں ادب کا سب سے بڑا مسئلہ" کے موضوع پر مذاکرے میں سحر انصاری، ممتاز حسین، عبادت بریلوی، وزیر آغا، افتخار جالب اور متعدد دوسرے ادیبوں نے سرگرم حصہ لیا۔ تنقید کے حصے میں بھی خاصہ تنوع اور بوقلمونی تھی، لیکن یہ جاندار پرچہ اکتوبر ۱۹۷۰ء کے بعد نظر نہیں آیا۔

"جام جم" - کراچی

ماہنامہ "جام جم" کراچی سے ڈاکٹر یاور عباس کی ادارت میں اپریل ۱۹۷۱ء میں جاری ہوا۔ انہوں نے اسے ادبی اور سائنسی جریدہ بنانے کی کوشش کی اور مقصد اردو میں اظہار کی وسعتوں کا اثبات تھا۔ "جام جم" کو ابواللیث صدیقی، نسیم امروہوی، حسنین کاظمی، جگر مراد آبادی، شاعر لکھنوی، عابد حشری، جیسے ادبا کا تعاون حاصل تھا۔ یہ پرچہ شاعری اور تنقیدی مضامین کے لیے مختص کیا گیا۔ سائنسی مضامین کی کمی ڈاکٹر یاور عباس نے پوری کی، اسے "نقش" کے مدیر شمس زبیری صاحب کی مشاورت بھی حاصل تھی لیکن "جام جم" کامیابی حاصل نہ کر سکا اور چند اشاعتوں کے بعد ہی بند ہو گیا۔

"سرحد" - کراچی

ماہنامہ "سرحد" کراچی سے فروری ۱۹۷۴ء میں جاری ہوا۔ یہ پرچہ محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا۔ ادارت کے فرائض طارق بن یوسفی سرانجام دیتے تھے۔ لکھنے والوں میں مالک رام، ابوسلمان شاہجہان پوری، محمد ایوب قادری، اور اشرف ندوی شامل ہیں۔ اس پرچے نے پاکستان کی تاریخ، ثقافت، زبان اور ادب کی ترجمانی کا عہد کیا تھا۔ لیکن یہ بیل پروان نہ چڑھ سکی، ثناء الحق کا مقالہ "انگریزی عہد میں سندھ کے کتب خانے" الحاج محمد زبیر کا "علی گڑھ میں میرے بائیس سال" اور ابوسلمان کا "عبید اللہ سندھی کی قرآنی خدمات" چند اچھے مضامین ہیں۔

"احساسات" ۔ لاہور

ماہنامہ "احساسات" ڈاکٹر تبسم رضوانی کی ادارت میں جولائی ۱۹۷۰ء میں جاری ہوا۔ اس کا مقصد لکھنے والوں کو اظہار کے لیے مناسب میدان فراہم کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے نظم و نثر کے لیے نئے اور پرانے ادبا کا تعاون حاصل کیا۔ اس کا ایک دلچسپ کارنامہ ستمبر۱۹۶۵ء میں "پھل آگروی نمبر" ہے جس میں صلاح الدین ناسک' اقبال احمد راہی' عطاالحق قاسمی' اظہر جاوید' حبیب قریشی اور خالد یزدانی نے حضرت "پھل آگروی" پر مضامین لکھے۔ ستمبر۱۹۷۵ء کا پرچہ "احساسات" کا آخری شمارہ نظر آتا ہے۔

"اقدار" ۔ سیالکوٹ

"اقدار" اپریل ۱۹۷۴ء میں حلقہ ارباب قلم سیالکوٹ کے زیر اہتمام نکلا' اس کے مدیر خواجہ اعجاز احمد بٹ تھے' اعجاز بٹ نے "اقدار" پاکستانی عوام کے جذبات' احساسات اور افکار کا ترجمان بنانے کی کوشش کی' انہوں نے ادبی موقف کا اظہار "پہلا لفظ" میں یوں کیا "ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسی ادب کو دوام حاصل ہو سکتا ہے جس کی جڑیں اپنی دھرتی میں ہوں اور دھرتی کی مٹی کی خوشبو اس کی رگوں میں دوڑ رہی ہو ۔۔ ادب میں کسی قسم کے نعرے یا پروپیگنڈے کی گنجائش نہیں"
"اقدار" کے مضامین پر نظر ڈالیں تو اس کا فکری اور ادبی زاویہ بوقلموں نظر آتا ہے "ہم کیسا ادب چاہتے ہیں" کے عنوان سے ایک مذاکرہ ترتیب دیا گیا۔ ایک باب صرف افسانچوں کے لیے مرتب کیا گیا جس میں جوگندرپال' آغا سہیل' نریش کمار شاد' ریاض سوجانوی' شاہد رضا اور خواجہ اعجاز احمد بٹ نے شرکت کی' ایک حصے میں زاہدہ صدیقی کی شاعری کا خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا۔ شعرا کی فہرست میں اختر احسن' منیر نیازی' حفیظ صدیقی' محمد علوی' رشید نثار' ظفر اقبال' محمود شام' ناصر زیدی' مرتضیٰ برلاس' سلیم احمد اور طفیل دارا کے نام شامل ہیں۔ مقالات کے حصے میں ڈاکٹر وزیر آغا' طفیل دارا' خواجہ اعجاز احمد بٹ نے شرکت کی' "اقدار" کی ترتیب' معیار اور پیشکش بہت اچھی تھی لیکن اس کا صرف ایک پرچہ چھپ سکا۔

"پہچان" ۔ فیصل آباد

۱۹۷۵ء میں فیصل آباد سے "پہچان" کے عنوان سے مسعود مختار نے ایک کتابی سلسلے کا آغاز کیا'

جس میں حلقہ ارباب ذوق لائل پور میں پڑھی گئی تخلیقات کا انتخاب پیش کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے کے صرف دو مجلّے شائع ہوئے۔ ان میں انور محمود خالد کا مقالہ "ادب اور پاکستانیت" اعجاز وقار کا "سلیم۔۔ جذباتی لمحوں کی بے تاب اوج" تنقیدی اعتبار سے اچھے مضامین تھے' شاعری کی ذیل میں ریاض مجید' احسن زیدی' حسن اختر جلیل' اقبال نوید' زاہد فخری' ارشد جاوید' ظہیر پراچہ' شفقت ہاشمی' افتخار فیصل اور مشتاق باسط کی تخلیقات پیش کی گئیں۔

"ادارک"۔ سیالکوٹ

"ادراک" سیالکوٹ کا ہفتہ وار ضلعی پرچہ تھا۔ ۱۹۷۸ء میں رخسانہ آرزو نے اس کا دوماہی ادبی ایڈیشن جاری کیا۔ اس پرچے کا بنیادی مقصد اقبال کے افکار کا فروغ اور شہر اقبال کی ادبی سرگرمیوں کی اشاعت تھا' لیکن ان مقاصد کی تکمیل نہ ہو سکی۔ شاید "ادارک" کو قارئین کا تعاون حاصل نہ ہو سکا۔

"قیادت"۔ راولپنڈی

راولپنڈی سے پندرہ روزہ "قیادت" ۱۹۷۶ء میں جاری ہوا' یہ سیاسی مزاج کا پرچہ تھا۔ اس کے مدیر ایس ایم شاد تھے۔ اپریل ۱۹۷۹ء میں "قیادت" نے ادب کی طرف بھی خصوصی پیش قدمی کی اور زاہدہ صدیقی کی ادارت میں ایک خاص نمبر پیش کیا۔ اس پرچے میں زاہدہ صدیقی کی شاعری پر ایک گوشہ مخصوص کیا گیا جس میں جیلانی کامران' فرخندہ لودھی' عذرا اصغر' اور تحسین فراقی نے شرکت کی' اقبالیات کے وقیع حصے میں عبدالعزیز خالد کی نظم' محمد عبداللہ قریشی' جگن ناتھ آزاد' اور سخاوت علی خسرو کے مضامین اہم ہیں۔ فردیات' نثری شاعری اور نفسیات کے حصے الگ مرتب کیے گئے۔ "قیادت" کی یہ تجرباتی اشاعت ادبی معمول کے پرچوں سے بالکل الگ ہے۔ لیکن اس خاص نمبر کے بعد اس ادبی تجربے کی تجدید نہیں کی گئی۔

"قرطاس"۔ گوجرانوالہ

گوجرانوالہ کے ہفت روزہ "احباب" نے ۱۹۷۹ء میں اس اخبار کا ایک دوماہی ادبی ایڈیشن نکالنے

کا فیصلہ کیا تو اس کی اعزازی ادارت جان کاشمیری کے سپرد کی ' اور اس کا ادبی تشخص قائم کرنے کے لیے اسے " قرطاس " کے نام سے موسوم کیا ۔ جان کاشمیری نوجوان شاعر اور مشاعروں اور ادبی حلقوں کے معروف شخصیت ہیں ۔ انہوں نے پورے ملک کے ادیبوں سے رابطہ قائم کر کے عمدہ معیار کی تخلیقات حاصل کر لیں ۔ گوجرانوالہ کے وسیع ادبی حلقے سے استفادہ کیا اور "قرطاس" کو شہر شہر ادبی سرگرمیوں کا نقیب بنانے کی کوشش کی ' چنانچہ چند اشاعتوں کے بعد اس پرچے نے ادبا کی توجہ حاصل کر لی ۔ جناب احسان دانش نے فرمایا کہ:

"قرطاس" جس بااصولی اور پامردی سے چھپ رہا ہے وہ سب جان کاشمیری کی شب و روز محنت کا نتیجہ ہے ۔ یہ عوامی رسالوں کی طرح سوقیانہ اور عریاں مضامین سے بے نیاز ہے "

اس قسم کی آرا کا اظہار "یاران نکتہ داں" میں محسن احسان ' تنویر ظہور' خواجہ عبدالروف ناز ' اور مسعود ہاشمی صاحب نے بھی کیا ہے ۔ "قرطاس" نے نومبر ۱۹۷۹ء ایک ضخیم اشاعت پیش کی ' اس میں ڈاکٹر وزیر آغا کا مقالہ " تبسم رضوانی کی غزل ۔ " احسان دانش کا "محاورہ کا مسئلہ" عارف عبدالمتین کا "مسجد قرطبہ" انور سدید کا "انشائیہ اور تسلسل خیال" تبسم کاشمیری کا "اقبال کی شاعری کا تشکیلی دور" جابر علی سید کا "ایڈیٹر اور میں" شائع ہوئے ۔ یہ پرچہ کامیابی سے اپنا ادبی سفر طے کر رہا تھا لیکن پھر اچانک بند ہو گیا ۔

"آگہی" ۔ بہاولپور

"آگہی" دسمبر ۱۹۸۰ء میں اسلوب پبلی کیشنز بہاول پور کے زیر اہتمام شائع ہوا ۔ اس کے مدیران اظہر ادیب ' ممتاز عاصم ' اور افتخار قیصر تھے ۔ " آگہی " کے اجرا میں اس رد عمل کا شاخسانہ نظر آتا ہے جو چھوٹے شہروں کے ادیبوں کے دلوں میں پرورش پا رہا تھا ۔ اظہر ادیب نے لکھا کہ :

"ہمارے جنون کو ہوا دینے میں --- بڑے شہروں کے ان دانش وروں کا بھی حصہ ہے جنہوں نے ادب کو وراثت میں ملنے والی سجادہ نشینی سمجھ رکھا ہے اور چھوٹے شہروں کے ادیبوں کو اچھوت سمجھنا جن کا شیوہ ہے "

اس پرچے کی پہلی اشاعت میں حیدر قریشی ' نقوی احمد پوری ' فرحت نواز اور آسی خانپوری ' کی شاعری کا تعارف کرانے کے علاوہ ممتاز عاصم ' طلعت فاطمہ رضوی ' ممتاز عاصم اور پرویز بزمی کے مضامین پیش کیے گئے ' ان سب کا تعلق چھوٹے شہروں سے ہے ۔ مضامین میں "ادب میں اسلامی اقدار کا احیا" از سید عبداللہ "ادیب اور معاشرہ" از وزیر آغا ' ادیب اور مملکت" از ابوالخیر کشفی "تعلیم اور تخلیقی

سفر" از شریف کنجاہی خیال افروز ہیں۔ اسلوب پبلی کیشنز نے ایک اور شمارہ جولائی ۱۹۸۲ء میں "دریافت" کے نام سے پیش کیا۔ جس میں ایک گوشہ "بلراج کومل" کے لیے مخصوص کیا گیا' شیر افضل جعفری' اکبر حمیدی اور ثاقب قریشی کے خصوصی مطالعے پیش کیے گئے۔ اس کے قلم کاروں میں میرزا ادیب' رفعت سلطان' پرویز بزمی' جوگندر پال' امراؤ طارق' آثم میرزا' اور ڈاکٹر وزیر آغا شامل ہیں۔

"ادراک" ۔ ملتان

ملتان سے "ادارک" کا اجرا نومبر ۱۹۸۱ء میں عمل میں آیا۔ اس کے مرتبین محمد اشرف' امیر علی عباس اور فہیم اصغر تھے' لیکن اس کے پس پردہ مدیر نذیر قیصر تھے پہلے پرچے میں "جدید اردو ادب میں انسان کا تصور" کے عنوان سے مذاکرے میں جیلانی کامران اور انتظار حسین کے مضامین شائع ہوئے' جابر علی سید کا مقالہ "نئی شعری معنویت کا مسئلہ" اور مجید امجد کی ایک غیر مطبوعہ غزل اس کی خاص ادبی چیزیں ہیں' ۱۹۸۱ء کے بعد "ادراک" مطلع ادب پر ظاہر نہیں ہوا۔

"اہل قلم" ۔ ملتان

حسین سحر اور مقبول احمد کی ادارت میں مجلّہ "اہل قلم" ملتان سے ستمبر ۱۹۸۱ء میں جاری ہوا۔ اس کی مجلس مشاورت میں عاصی کرنالی' سلیم اختر کیانی اور اقبال ارشد شامل تھے۔ "اہل قلم" کو زندہ تحریروں کا مجموعہ شمار کیا گیا اور ابتدا میں اسے دبستان ملتان کے نمائندہ ادیبوں کی تخلیقات کے لئے وقف کیا گیا۔ چنانچہ پہلے شمارے میں جابر علی سید' مقصود زاہدی' عرش صدیقی' اصغر علی شاہ' ماہ طلعت زاہدی' شمیم ترمذی' اقبال ساغر صدیقی' نوشابہ نرگس' ارشد ملتانی' انوار احمد' مقصود زاہدی' ثمر بانو ہاشمی' جاوید اختر بھٹی' انور زاہدی' ڈاکٹر اسد اریب کے مضامین شریک اشاعت ہیں اور یہ سب ملتان کے رہنے والے ہیں۔ "اہل قلم" نے اس پابندی کو سختی سے قبول نہیں کیا اور آئندہ شماروں میں متعدد ایسی تخلیقات کو پیش کیا جو مکانی اعتبار کے بجائے ادبی لحاظ سے اہم تھیں۔

مجلّہ "اہل قلم" نے اپنے دامن میں جملہ اصناف ادب کو سمیٹنے کی کاوش کی ہے۔ تنقید کے حصے میں جو مضامین شائع ہوئے ان میں "کلیم الدین احمد کا تنقیدی جائزہ" از جابر علی سید۔ "اردو اور اہل یورپ" از ولی مظہر۔ "سندھی ادب کا تاریخی جائزہ" از وفا راشدی۔ "اقبال اپنے ملفوظات کے آئینے میں" از خالد بزمی۔ "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" "کلیرنس سیل" اور "ہواؤں کے بھنور" کے

تجزیاتی تنقید نامے قابل ذکر ہیں "اہل قلم" نے "انشائیہ" کے فروغ میں گراں قدر حصہ لیا اور شمیم ترمذی، اسلام تبسم، شاکر حسین شاکر، سلیم مجوکہ کی انشائی خصوصیات کو اجاگر کیا۔ "اہل قلم" کو نواح ملتان میں ایک راہنما ستارے کی حیثیت حاصل ہے۔ اب تک "اہل قلم" کی آٹھ اشاعتیں چھپ چکی ہیں۔

"پہچان"۔ خان پور

۱۹۸۱ء میں جاری ہونے والا "پہچان" عکاس پبلی کیشنز خان پور کا ادبی ترجمان تھا۔ اس کے مدیر ارشد خالد اور معاونین شاہد شاہی اور خالد ندیم تھے، اس پرچے میں اردو کے ساتھ سرائیکی ادب کی پہچان کرانے کی کوشش بھی کی گئی اور اس اقدام کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے بہت سراہا۔ پہچان کے ساتھ جن ادیبوں نے قلمی تعاون کیا، ان میں بلراج کومل، رام لعل نابھوی، ارشد میر، حیدر قریشی، اکبر حمیدی، خیال امروہوی، زہیر کنجاہی، انور جمال اور شہباز نقوی کے نام اہم ہیں۔ ارشد خالد نے ادیبوں کے انٹرویو حاصل کئے، ممتاز عاصم نے "ادبی کسوٹی" کے تحت کھرا کھوٹا چھانٹنے کی سعی کی۔ "پہچان" کا دوسرا پرچہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد یہ نظر نہیں آیا۔ جون ۱۹۸۵ء میں اسی ادارے نے "عکاس" کے نام سے ایک رسالہ پیش کیا جو معنوی طور پر "پہچان" ہی کا نیا روپ تھا۔ اس پرچے میں رام ریاض، خادم رزمی اور نرگس شیخ پر خصوصی مطالعے اور ہائیکو کے لئے ایک گوشہ مخصوص کیا گیا۔

"مثبت"۔ چیچا وطنی

الادب پبلی کیشنز چیچا وطنی کے تحت سہ ماہی "مثبت" کا آغاز ۱۹۸۲ء میں شکیل سروش اور راشد منہاس نے کیا تھا۔ حیدر قریشی، رفعت کیانی، مختار ترابی، شوذب کاظمی، ادریس قمر اور مقبول گوہر ان کے معاونین میں تھے۔ "مثبت" کے پہلے پرچے میں شہزاد احمد، وزیر آغا، مظہر امام، انور جمال، جابر علی سید، خیال امروہی، تاثیر وجدان، خادم رزمی، سلطان رشک، فرحت نواز جعفر شیرازی اور علامہ ذوقی مظفر نگری کی تخلیقات شائع ہوئیں۔ ایک خصوصی مطالعہ کا موضوع "لفظوں کا کوزہ گر ضیا شبنمی" ہے۔ "مثبت" نے چھوٹے شہروں کے ادیبوں کو متعارف کرانے کا عزم کیا تھا لیکن یہ ارادہ جلد ہی ٹوٹ گیا۔

"ادوار" ۔ خان پور

"ادوار" آسی خان پوری اور صفدر صدیقی رضی کا ادبی مجلّہ تھا جس کی ترتیب میں نزدوش ترابی اور حفیظ شاہد نے بھی معاونت کی ' اردو کے جدید دور کی غیر مطبوعہ نگارشات پر مشتمل یہ جریدہ خان پور سے جاری ہوا ۔ ممتاز مفتی کا مضمون "شام آگئی گاؤ ملتانی" کلام حیدری کا "پریم چند کے افسانے" جابر علی سید کا "دل گدازی" اس پرچے کے چند اچھے مضامین ہیں۔ شمیم احمد' لئیق بابری' سحر انصاری' الطاف پرواز' فکر تونسوی' سہیل اختر' منشا یاد' سید جاوید اختر' عبدالوحید اور منصور قیصر جیسے ادبا نے اس میں شرکت کی۔ لیکن "ادوار" کا دوسرا پرچہ شائع نہ ہو سکا۔ اس ضمن میں "اظہاریہ" میں آسی خان پوری کا یہ جملہ بے حد معنی خیز ہے کہ "کسی ادبی انتخاب کا پیش کرنا حکمت و حماقت کے بین بین ہے"۔ "ادوار" ادبی سیاست اور گروہ بندی کا شکار نظر آتا ہے۔

"سائبان" ۔ ملتان

"سائبان" ۱۹۸۲ء میں ملتان سے مجموعہ نظم و نثر کی صورت میں سامنے آیا۔ اس کے مدیر محمد اظہر سلیم مجوکہ تھے ' حسین سحر' سرفراز قریشی' رضی الدین رضی ' اطہر ناسک ' عذرا بتول ' عامر شیرازی اس پرچے میں نمایاں نظر آتے ہیں ' عارف عبدالمتین ' اے ۔ بی اشرف ' انوار احمد ' اقبال ساغر صدیقی ' تحسین فراقی ' حفیظ صدیقی ' ڈاکٹر مقصود زاہدی اور انور جمال کی تخلیقات "سائبان" کے سائے میں جلوہ افروز ہیں ' لیکن یہ ادبی مجلّہ بھی زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہا ۔ ۱۹۸۴ء میں "سائبان" کا ایک خصوصی شمارہ نکلا جس میں ایک گوشہ منیر نیازی کے لئے مرتب کیا گیا ۔ اے ۔ بی ۔ اشرف کا لندن کا تاثر نامہ اور گل رعنا کا جعفر شیرازی سے انٹرویو اس کے خاص مندرجات تھے ۔

"تحریر" ۔ جڑانوالہ

جڑانوالہ ضلع فیصل آباد کا رسالہ " تحریر " مجلس ادب جڑانوالہ کا ادبی ترجمان تھا ' اور اس میں مجلس ادب کے احباب کی تحریروں کا انتخاب شائع ہوتا تھا ۔ مرتبین میں رشید احمد گوریجہ اور منظور عباس ازہر شامل تھے ' اس کی پہلی اشاعت ۱۹۸۲ء میں معرض وجود میں آئی ' مارچ ۱۹۸۴ء کی اشاعت کو سالنامہ کا نام دیا گیا اور اس میں عبدالعزیز خالد ' فرخ راجہ ' رشید احمد گوریجہ ' حسن اختر جلیل ' فراز

صدیقی ' خالد یزدانی ' قیصر امین الدین ' جوہر نظامی اور عظمت اللہ خان کی تحریریں پیش کی گئیں "تحریر" تحصیل ہیڈ کوارٹر سے شائع ہونے والا ادبی پرچہ تھا۔ جو چار اشاعتوں کے بعد مطلع ادب سے غائب ہو گیا۔

"احباب" - کراچی

کراچی کا سہ ماہی رسالہ "احباب" انجمن احباب جے پور کا ترجمان تھا اور یہ جنوری ۱۹۸۳ء میں ابو خالد صدیقی کی ادارت میں جاری ہوا۔ "خاطر احباب" کے تحت اس کا مقصد جے پور کے پختہ فکر اہل قلم کی تخلیقات کی اشاعت کے علاوہ راجستھان کے نئے لکھنے والوں کا تعارف بھی تھا ' "احباب" کے صفحات پر جے پور کی علمی و تہذیبی زندگی کے علاوہ مسلمانوں کی ملی و سیاسی تاریخ کے لئے مواد فراہم کرنے کا عہد بھی کیا گیا ' لیکن پہلے پرچے میں تاریخی مضامین کم کم نظر آتے ہیں ' ابو خالد صدیقی نے اسے ادبی رسالہ بنانے کی زیادہ کاوش کی ہے۔ اس پرچے میں الیاس عشقی ' نصیر آرزو ' عابد علی عابد اسدی ' راشد اسدی ' ساجد اسدی ' عصمت عزیز ' واقف جے پوری ' اور انجم عزیزی کی تخلیقات پیش کی گئی ہیں "احباب" کا پہلا پرچہ اپنا منفرد زاویہ نہیں نکھار سکا۔ اس کی موعودہ مخصوص جہت بھی نکھر کر سامنے نہیں آ سکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے احباب جے پور کا بھرپور تعاون بھی حاصل نہیں ہو سکا۔ اس لئے سہ ماہی "احباب" ابتدا میں ہی زوال آمادہ ہو گیا اور ادب پر کوئی جاندار نقش پیدا نہ کر سکا اس کے معاونین میں پروفیسر طاہر حسین نقوی ' پروفیسر عبدالقیوم خان ناطق اور حکیم عبدالوہاب کے نام شامل تھے۔

"لفظ ہمارے" لودھراں

"لفظ ہمارے" ۱۹۸۳ء میں مبشر وسیم لودھی نے لودھراں سے جاری کیا اور اسے ڈاکٹر اے بی اشرف ' سعادت سعید ' سہیل اختر ' احسن علی خان ' انوار احمد ' عذرا اصغر ' عرش صدیقی ' کشور ناہید ' احمد ندیم قاسمی ' عارف عبدالمتین ' اقبال ساغر صدیقی ' بیدار سرمدی ' سلمان بٹ ' جعفر شیرازی ' اور محمد امین کے علاوہ متعدد نئے ادیبوں نے تعاون فراہم کیا۔ "لفظ ہمارے" نے ایک خوبصورت "نعت نمبر" بھی پیش کیا لیکن یہ چند بے قاعدہ اشاعتوں کے بعد اپنا وجود زندہ نہ رکھ سکا۔ لودھراں کو ادبی افق پر نمایاں مقام دینے میں "لفظ ہمارے" کا بہت حصہ ہے۔

"پہچان" ۔ کراچی

فرید احمد کا ماہنامہ "پہچان" ادب اور ادیب دونوں کو منفرد زاویوں سے عوام سے متعارف کراتا رہا ہے ۔ اس کا اجرا جنوری ۱۹۸۳ء میں ہوا "جان پہچان" "یاد رفتگاں" "اور ادب" اس کے مستقل عنوانات تھے ۔ "پہچان" نے ممتاز ادیبوں کی بازیافت میں خصوصی خدمات سرانجام دیں ۔ چنانچہ منٹو ' محمد علی جوہر ' سہیل بخاری ' سیماب اکبر آبادی اور عطیہ فیضی پر "پہچان" نے بہت سا نیا سوانحی مواد فراہم کیا ۔ حمید کاشمیری ' خواجہ حمید الدین شاہد ' رشید نثار ' سہیل اختر ' ارشاد چغتائی ' نصراللہ خان ' منیر احمد شیخ ' شکیلہ رفیق اور کرنل غلام سرور اس کے رفیقان قلم تھے ۔ "پہچان" عوامی نوعیت کا پرچہ تھا ' فرید احمد خان نے اسے ادبی انسائیکلو پیڈیا بنانے کی کوشش کی ' لیکن اب یہ پرچہ تعطل اشاعت کا شکار ہو گیا ہے ۔

"تلاش" ۔ لاہور

طارق عزیز نے ۱۹۸۳ء میں ادبی ' ثقافتی اور سماجی موضوعات کی نئی تحریروں کی اشاعت کے لئے لاہور سے کتابی سلسلہ " تلاش " جاری کیا ' ان کے معاونین میں کرامت بخاری ' سعادت سعید ' قائم نقوی اور اکرم ناصر شامل تھے ' طارق عزیز نے آغاز سفر میں لکھا کہ:

" ہر تشنگی دو بوند پانی کو ترس رہی ہے ۔ ہر کوئی کسی نہ کسی تلاش میں ہے ' مجھے بھی تلاش ہے امن کی ' روشنی کی ' کھلی فضاؤں کی ' اچھے دنوں کی ... "

" تلاش " کے اس سفر میں ادب کو ایک آلہ کار کی حیثیت دی گئی اور لمبے وقفوں سے طارق عزیز نے "تلاش" کے چار جاندار ' منفرد اور خیال انگیز شمارے شائع کئے۔ اس پرچے میں "تلاش" کی کوئی واضح جہت تو آشکار نہیں ہوتی تاہم ادبی زاویئے سے اس کے انٹرویو طغیان اظہار پیدا کرنے میں خاصے معاون نظر آتے ہیں ۔ ان میں ادیب کی ذاتیات اور ادب کی سماجیات کو زیادہ اہمیت دی گئی ۔ اس ضمن میں انور سجاد ' اشفاق احمد اور سلیم اختر کے مکالموں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے ۔

" تلاش " نے متعدد ادبا کے خصوصی مطالعے پیش کئے ۔ ان میں سہیل احمد خان' حسن رضوی' طارق عزیز' اعتبار ساجد کے نام قابل ذکر ہیں۔ تلاش نے اگرچہ ممتاز ادبا مثلاً ظہیر کاشمیری' عبدالعزیز خالد' منیر نیازی' میرزا ادیب' شہزاد احمد' اشفاق احمد کو نمایاں حیثیت دی ہے تاہم اس پرچے

نے تصویر کو ادب اور ادیب دونوں کو نمائش کا وسیلہ بنایا اور متعدد نوواردان ادب مثلاً یوسف عباس' رضی حیدر' اکرم سلیم' فرخندہ شمیم' رخشندہ مرزا' ناہید نیازی' عارفہ صبح خان' سحرش ہما اور نسرین بھٹی کو متعارف کرایا۔ غیر ادبی موضوعات کی آمیزش نے اس کا ادبی مزاج مجروح کیا اور "تلاش" پر ایک کمرشل پرچے کا لیبل لگ گیا۔

"فروغ" گوجرانوالہ

گوجرانوالہ سے "فروغ" کے نام سے ایک کتابی سلسلے کا اجرا ۱۹۸۴ء میں محمد اقبال نجمی' امجد حمید محسن اور بشیر عابد نے کیا' ارشد میر' عارف عبدالمتین' سلیم اختر فارانی' گلزار بخاری' راز کاشمیری' اطہر صدیقی اور عزیز لدھیانوی نے اس مجلّے سے قلمی تعاون کیا۔ لیکن دو اشاعتوں کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

"خلش" ۔ کھاریاں

۱۹۸۴ء میں "خلش" کے نام سے حاجی گل بخشالوی نے کھاریاں سے ایک ادبی سلسلہ جاری کیا تو اس کے لئے بڑے شہروں کے بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی' انہیں اس پرچے کے لئے علامہ انیس لکھنوی کی سرپرستی بھی دستیاب تھی اور بہت جلد انہیں وزیر آغا' رئیس امروہوی' ماجد صدیقی' رفعت سلطان' ناصر زیدی' حکیم افتخار فخر کی تخلیقات بھی حاصل ہو گئیں لیکن طباعت معیاری نہیں تھی۔ کتابت غیر دلکش تھی۔ اس پر مستزاد حاجی گل بخشالوی کی ذاتی پریشانیاں۔ شمارہ ۳ میں درج ہے کہ "چوروں نے ان کی دکان میں نقب لگا کر ۴۵ ہزار روپے کی مالیت کا مال اڑا لیا"۔ کچھ ادبی مخالفتیں رنگ لائیں۔ نتیجتہ" "خلش" چند اشاعتوں کے بعد بند ہو گیا۔ "خلش" کی ایک قابل ذکر اشاعت "فیض نمبر" ہے جو اپریل ۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آئی۔

"شعور" ۔ سانگلا ہل

سانگلا ہل جیسے دور افتادہ مقام سے مشتاق احمد نے "شعور" جاری کیا تو ان کا مقصد ایسے ادیبوں کو اشاعتی سہولتیں فراہم کرنا تھا جو بڑے شہروں کے بڑے ادبی پرچوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے

تھے "شعور" ادب کا بلند معیار قائم نہ کر سکا ۔ اسے بڑے لکھنے والوں کا تعاون بھی تادیر حاصل نہ ہو سکا چنانچہ چند اشاعتوں کے بعد شعور کی اشاعت معطل ہو گئی ۔

"صدرنگ" ۔ راولپنڈی

"صدرنگ" بزم احباب قلم راولپنڈی کے نوجوان ادیبوں کا ترجمان تھا ۔ اس کی ادارت علی اصغر ثمر کرتے تھے لیکن اس کی ادبی سرپرستی کا فریضہ ممتاز ادیب رشید نثار نے سرانجام دیا ۔ اس پرچے میں جمیل یوسف ' کرنل غلام سرور ' زینت قاضی ' نجمی صدیقی ' اسحاق آشفتہ ' رشید نثار اور بشارت علی سید کے علاوہ متعدد نئے لکھنے والوں کے رشحات قلم اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ "صدرنگ" صوری اعتبار سے جاذب نظر نہیں تھا ' معنوی اعتبار سے بھی اس کا معیار مناسب مقام حاصل نہ کر سکا۔

"پہچان" ۔ گوجرانوالہ

ستمبر ۱۹۸۵ء میں شیخ آفتاب احمد نے گوجرانوالہ سے "پہچان" جاری کیا اور اس سہ ماہی ادبی جریدے کو قومی ادب کا ترجمان اور نوبہ نو تخلیقات کا مرقع بنانے کی کوشش کی ۔ ان کے مدیر معاون محمد احمد شاد تھے ۔ "پہچان" نے ڈاکٹر وزیر آغا ' شیر افضل جعفری ' عاصی کرنالی ' رشید کامل ' خالد بزمی اور خواجہ حمید یزدانی جیسے ادبا کے پہلو بہ پہلو متعدد نئے لکھنے والوں کو متعارف کرانے میں گہری دلچسپی لی ۔ " پہچان " کے لکھنے والوں کی کہکشاں روشن نظر آتی ہے ۔ لیکن پڑھنے والوں کا وسیع حلقہ اسے میسر نہ آ سکا اور چند اشاعتوں کے بعد پرچہ بند ہو گیا ۔

"حروف" بہاولپور

خورشید ناظر اور انور صابر صاحب نے زندہ اور تازہ تحریروں کا مجموعہ " حروف " نومبر ۱۹۸۳ء میں بہاولپور سے جاری کیا ۔ یہ جریدہ اس ردعمل کی پیداوار تھا جو ادبی دنیا میں بڑے شہروں کی اجارہ داریوں کے خلاف چھوٹے شہروں میں پرورش پا رہا تھا ' چنانچہ ایک ادارتی شذرہ "سخن" میں سوال اٹھایا گیا کہ:

"آج کے تخلیق کار کے لئے کسی بزعم خود ادبی وڈیرے" سے اپنے ہونے کی سند لینا کیوں ضروری ہے؟ ہمارے خیال میں فن کی تخلیق سچے جذبوں کے زیر اثر ہوتی ہے اور ایسی تحریر جو کسی مخصوص مفاد کے حصول یا کسی دھڑے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وجود میں لائی جائے' اسے جلد ہی وقت کے ہاتھ موت کا رزق بننا پڑتا ہے۔ آج ہمارے اردگرد اسی قسم کا ادب تخلیق ہو رہا ہے' کیوں کہ اچھے اچھے قلم کار نہ تو خود کو کسی "سید" یا "پٹھان" کا ادبی مزارعہ کہلوائے بغیر اپنے حروف کی خوشبو ان کے جائز وارثوں تک پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی ادیبوں اور شاعروں کے لئے فراہم کی جانے والی مراعات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک آ پہنچی ہے کہ ادب کی ترویج کے لئے قائم ہونے والے سبھی ادبی اداروں اور ذرائع ابلاغ نے خود کو انہیں ادبی وڈیروں کے احکامات کی تعمیل کے لئے وقف کر لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی نظریں نام نہاد ادبی مراکز سے باہر نہیں نکل پاتیں۔"

"حروف" کے رد عمل میں اگرچہ تلخی اور شدت زیادہ تھی لیکن ادبی حلقوں میں اسے بالعموم تحسین کی نظر سے دیکھا گیا۔ محسن احسان' جابر علی سید' اقبال ساغر صدیقی' اور محمد منشا یاد کے علاوہ متعدد ادبا نے جن میں سے بیشتر کا تعلق ادب کے اہم مراکز سے تھا' اس اقدام کو بے حد سراہا۔ منصور قیصر نے لکھا کہ " ادب کے نام پر لوگ جو کمال دکھا رہے ہیں' وہ حیران کن بلکہ پریشان کن ہے۔ میں "حروف" کے ہر شمارے میں اپنی شرکت کو اعزاز سمجھتا ہوں۔"

"حروف" نے ابتدائی شماروں میں جابر علی سید کے مقالہ "ارجوزہ سے قطعہ تک" پر ایک جاندار بحث استوار کی جس میں عابد صدیقی' اور شارق انبالوی نے شرکت کی۔ "حروف" میں بہاول پور کے قرب و جوار کے ادبا نے زیادہ حصہ لیا۔ چنانچہ خیال امروہوی (لیہ) انوار احمد (ملتان) شیر افضل جعفری (جھنگ) بیدل حیدری (کبیر والہ) آسی خان پوری (رحیم یار خان) قمر رضا شہزاد (خانیوال) جعفر شیرازی (ساہی وال) نقوی احمد پوری (احمد پور شرقیہ) گفتار خیالی (دائرہ دین پناہ) اظہر ادیب (خان پور) شارق انبالوی (کروڑ لعل عیسن) کے نام یہاں بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں' تاہم "حروف" نے نامور اور ممتاز ادبا کا تعاون حاصل کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی اور محسن احسان' رضا ہمدانی' پروفیسر عتیق احمد' ظہور نظر' فارغ بخاری' شہاب دہلوی' شبنم شکیل' اور مظفر وارثی کے مضامین نظم و نثر کو نمایاں طور پر پیش کیا۔ یہ سب ادب کے بڑے نام ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں لاہور اور کراچی جیسے بڑے ادبی مراکز کے بڑے ادبا کے نام نسبتاً کم ہیں۔

"حروف" نے تنقیدی مضامین اور تخلیقی اصناف نظم و نثر کی پیشکش میں روایتی صورت برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن نئی اصناف ہائیکو اور انشائیہ کو زیادہ اہمیت دی۔ " درفش عروض " کے

عنوان سے علم عروض کو مفصلات کے لوگوں سے متعارف کرانے کا فریضہ ادا کیا۔ علامہ اقبال کا میر سراج الدین کے نام ایک غیر مطبوعہ خط پیش کیا۔ ن۔ م۔ راشد کا ایک غیر مطبوعہ انٹرویو جو خیال امروہوی نے ایران میں لیا تھا شائع کیا۔ " فن اور شخصیت " کے تحت ظہور نظر اور سہیل اختر کے خاکے لکھوائے ' محمد خالد اختر ' اقبال ساغر صدیقی ' عابد صدیق ' ابن الامام شفتر' سلمان بٹ اور انور جمال کی انشائیہ نما تحریروں کو فوقیت دی' عابد صدیق کے مقالہ "غالب کی نعتیہ شاعری" طاؤس بانہالی کے "کشمیری شاعری میں قدیم اور جدید کی بحث" مسعود ہاشمی کے مقالہ "بارہ ماسہ" عتیق احمد کے مقالہ "کرشن چندر کا فکری سفر" اور انوار احمد کے مقالہ "میرزا ادیب کے افسانے" کو اس پرچے کی وقیع مندرجات کا درجہ حاصل ہے۔

۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۸ء تک "حروف" کے صرف چار پرچے شائع ہوئے ' جولائی ۱۹۸۷ء میں "غزل نمبر" کی اشاعت کا اعلان کیا گیا تھا جو تا حال شائع نہیں ہوا چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ "حروف" نے ابتدا میں جس سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا وہ اب سرد پڑ چکا ہے۔

"رسالہ" ۔ حیدر آباد

حیدر آباد کا "رسالہ" جو دسمبر ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آیا حلقہ جلیسان ادب کا ترجمان تھا۔ اس کے مرتبین میں حبیب ارشد' عتیق جیلانی اور قمر مشتاق شامل تھے۔ ۲۸۷ صفحات پر مشتمل اس کتابی سلسلے کی سب سے بڑی خوبی "گوشہ سلیم احمد" تھا جس میں سلیم احمد کے فن اور شخصیت کے علاوہ سلیم احمد کی ایک طویل غیر رسمی گفتگو اور ان کی چند غیر مطبوعہ تخلیقات مثلاً "چراغ نیم شب" "اقبال ایک شاعر" (مقالہ) اور "ستارہ یا پرچھائیں" (مقالہ) بھی پیش کی گئی تھیں۔ مضامین کے حصے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا مقالہ "طلسم ہوشربا" ۔ شمیم احمد کا "بدباطنی کی شناخت"۔ سعادت سعید کا "میرا جی کی شاعری" اور مشرف انصاری کا ناول "میرا گاؤں" پر غلام الثقلین نقوی کا تجزیہ' اقبالیات کے سلسلے میں ڈاکٹر وحید عشرت' جگن ناتھ آزاد اور نظیر صدیقی کے مقالات بے حد اہم ہیں۔ "رسالہ" کو اردو کے بیشتر نامور لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا' ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی بڑے پیمانے پر ہوئی۔ لیکن رسالہ ایک اعلیٰ اشاعت کے بعد ہی دم توڑ گیا اور دوبارہ شائع نہیں ہوا۔

"عہد" ۔ ملتان

ملتان سے جاوید اختر بھٹی نے "عہد" کے نام سے ایک ادبی مجلہ ۱۹۸۵ء کے لگ بھگ جاری کیا۔ اور یہ جاوید اختر بھٹی کے مزاج کے مطابق طغیانی نوعیت کا جریدہ تھا۔ مثلاً اس کے مارچ ۱۹۸۷ء پرچے میں سلیم اختر صاحب کے ایک انٹرویو مطبوعہ "تلاش" لاہور کے جواب میں ایک انٹرویو چھاپا گیا اور ادبی معاشرے کے متعدد معائب اور ناہموریوں کو اجاگر کیا گیا۔ "عہد" نوجوان ادیبوں کا پرچہ تھا۔ اس میں رضی الدین رضی، شاکر حسین شاکر، قمر رضا شہزاد اور ممتاز حیدر ڈاہر جیسے سرگرم نوجوانوں کی تخلیقات پیش کی جاتی رہیں۔ جن سے شدید رد عمل بھی پیدا ہوا۔ "عہد" اب عرصے سے شائع نہیں ہوا۔

"صدف" خانیوال

خانیوال کا ادبی مجلہ "صدف" کو نمائندہ ادبی تحریروں کے ترجمان کا اعزاز حاصل تھا، ساجد نجمی، قمر رضا شہزاد اور حسنین اصغر تبسم نے ادبی خدمت اور ذاتی شوق کی تکمیل کے لئے اسے ۸۵-۱۹۸۴ء میں جاری کیا۔ لیکن یہ پرچہ مرضی وار چھپتا رہا۔ مارچ ۱۹۸۶ء اور نومبر ۱۹۸۷ء میں اس نے دو خاص اشاعتیں پیش کیں اور ان میں علی سردار جعفری، قمر جمیل، وزیر آغا، کشور ناہید، جعفر شیرازی، ضمیر جعفری، ڈاکٹر منیر الدین احمد، شہزاد منظر، رشید امجد، صبا اکرام، اے خیام اور منصور قیصر کی تخلیقات شائع کیں اور ملتان ڈویژن سے متعدد نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا۔ "صدف" میں جو چند اچھے مضامین چھپے ان میں "فیض کے سیاسی افکار" از شہزاد منظر "معاشرہ، مسائل اور ادب" از عتیق احمد۔ "وزیر آغا کی نظموں کا فکری پس منظر" از رشید امجد "مجید امجد کے توسط سے" از غلام دستگیر ربانی ۔ "اردو میں پاکستانی لوک ادب کے تراجم" از انوار احمد کا شمار کیا جا سکتا ہے "صدف" لمبے عرصے کے بعد چھپنے والا جریدہ ہے۔ اس لئے اس کا اثر و عمل قدرے محدود ہے۔ ایک عرصے سے اس کا کوئی پرچہ نہیں چھپا۔

"دریافت" ۔ کراچی

" دریافت " کے نام سے وزیری پانی پتی اور مخدوم منور نے ۱۹۸۶ء میں ایک کتابی سلسلے کا اجرا کیا اور اسے رئیس فروغ کے ادبی آئیڈیل کا ترجمان قرار دیا گیا ہے ۔ اس پرچے میں نثری نظم کو فروغ دینے اور اس صنف کے مسائل زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ۔ قمر جمیل ' عذرا عباس ' سید ساجد ' شائستہ حبیب کا تعاون "دریافت" کو حاصل تھا ۔ " دریافت " کے صرف تین شمارے تا حال شائع ہوئے ہیں ' آخری شمارہ نمبر ۳ (اکتوبر ۸۶ء) کو شمیم احمد کے اختلافی مقالہ " کانٹے دوڑتی ہے ماہی بے آب مجھے " کی وجہ سے متنازعہ بن گیا اور اس نے ادبی دنیا میں شدید قسم کی جارحانہ گونج پیدا کی ' رئیس فروغ ' فہیم اعظمی اور فارغ بخاری کے تفصیلی مطالعے اور گوشہ جوش ملیح آبادی "دریافت" کے خاص مندر جات تھے۔ شہزاد منظر' شہناز نور' حسن سوز' رحمٰن فراز' محمود واجد' جعفر شیرازی' رضی الدین رضی' اکرم کلیم۔ نور الہدیٰ سید' مشرف احمد' ماجد الباقری اور اکرم کلیم نے "دریافت" کے ساتھ پرخلوص قلمی تعاون کیا ہے۔

"گہر آب" ۔ ساہی وال

۱۹۶۸ء میں ساہی وال سے جعفر شیرازی نے "گہر آب" ادبی سیریز کے طور پر جاری کیا اور اس کی ادارت کے فرائض گل رعنا قزلباش کو سونپے۔ "گہر آب " کے لئے جو مجلس مشاورت مرتب کی گئی اس میں اکرم کلیم ' شمع خالد اور در شہوار کے نام شامل ہیں ' "گہر آب " تخلیقی ادب پاروں سے ایک خوش حال اور صحت مند معاشرے کی تشکیل کا آرزو مند ہے ۔ اس نے ادب سے گردوپیش کی عکاسی کا کام لینے کی کوشش بھی کی ہے اور اس سے روحانی سمتوں کا تعین بھی کیا ۔ "گہراب " کی پرواز عمودی بھی ہے اور یہ افقی پیش قدمی کو بھی ترجیح دیتا ہے ۔ چنانچہ اس کے صفحات پر ہر طبقہ خیال کے ادیب کو نمائندگی دینے اور "گہراب" کو فکر و خیال کے ایک آزاد فورم کا درجہ دینے کی کاوش نمایاں ہے ۔ اس نے ادب کے ساتھ ادیب کے مجموعی ادبی اثاثے پر نظر ڈالنے کے لئے مخصوص گوشوں کا سلسلہ شروع کیا اور مرتضیٰ برلاس ' آنس معین اور سعید احمد شیخ پر نمائندہ گوشے پیش کئے "گہراب" کے تنقیدی حصے میں ڈاکٹر ملک حسن اختر' ڈاکٹر وزیر آغا' ڈاکٹر مقصود زاہدی' فخر الدین بلے' محمد اسلام تبسم' ناصر بشیر' قرۃ العین طاہرہ' محمد انتصار الحق' سجاد حیدر' عارف عبدالمتین اور انور جمال کے مقالے چھپ چکے ہیں "گہراب" نے انشائیہ کے فروغ میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں ۔ اس کی منفرد خصوصیت

نئی خواتین کی ادبی سرپرستی ہے۔ "محراب" کے ہر نئے پرچے میں چند نئی خواتین کو بالالتزام متعارف کرایا جاتا ہے۔ عصمت ڈاہری، مصباح مرزا، شہابہ گیلانی، شبہ طراز، مسرت پروین نیلم، مینا ہاشمی، رخسانہ لودھی، سعدیہ منور، حسین بانو کے قلم کو "محراب" نے زیادہ اعتماد عطا کیا ہے۔ "محراب" کے تاحال چھ شمارے چھپ چکے ہیں، بے قاعدہ ادبی پرچوں کی صف میں "محراب" کو لمبے وقفے کا ایک باقاعدہ ادبی جریدہ شمار کیا جا سکتا ہے، جو مفصلات کا پرچہ ہونے کے باوجود توجہ کھینچتا ہے اور بالعموم مقامی افسروں کی سرپرستی میں چھپتا ہے۔

"کلاسیک" ۔ راولپنڈی

"کلاسیک" کے عنوان سے احمد داؤد اور ظہیر الدین احمد نے ایک کتابی جریدہ جنوری ۱۹۸۶ء میں جاری کیا، چھ صد سے زائد صفحات کے اس پرچے میں شعر و ادب کو فنون لطیفہ، ثقافت اور جمالیاتی اظہار سے مربوط کرنے کی کوشش کی گئی اور چند معروف لکھنے والوں کے ساتھ ان لوگوں کو زیادہ منور کیا جنھوں نے گزشتہ چند سالوں کے دوران اپنی انفرادیت قائم کی تھی "کلاسیک" تازہ وار دان ادب کا پرچہ تھا۔ ان میں سے انور زاہدی، علی امام نقوی، اعجاز راہی، اسلم سراج دین، محمود احمد قاضی، اظہر نیاز، سلام بن رزاق، مسعود منور، نسیم نیشو فوز، زمان ملک، ظفر خان نیازی، اصغر ندیم سید، ابرار احمد، منظر امکانی کے نام اب خاصے معروف ہو چکے ہیں "کلاسیک" کا تنقید کا حصہ نسبتاً زیادہ جان دار تھا اور یہ ایک خاص نقطہ نظر کے مضامین پر مشتمل تھا۔ انور سجاد کا مقالہ " تخلیقی غلامی اور سیاسی اندیشے" خالدہ حسین کا "چالیسواں سال عرف اردو افسانے کا بحران" ڈاکٹر انوار احمد کا " نئے اردو افسانے میں کرداروں کے نام کا مسئلہ " " منٹو اور تحریک آزادی " از جیلانی کامران کو بطور حوالہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ن۔ م۔ راشد کے خطوط اپنی پہلی بیگم کے نام اور مکالمہ مابین گوپی چند نارنگ و مسعود منور بھی اس پرچے کی تابانی میں اضافہ کرتے ہیں۔

"کلاسیک" میں رد عمل کی رو تیز نظر آتی ہے۔ اس نے معاشرے کی بے ربطی، انتشار اور دوغلے پن کو آشکار کرنے کی کوشش کی لیکن یہ موثر تحریک نہیں بن سکا۔

...

"انتخاب" ۔ سیالکوٹ

غیر مطبوعہ ادبی تحریروں کا ادبی مجلّہ " انتخاب " کا پہلا شمارہ ۱۹۸۷ء میں اور دوسرا ۱۹۸۸ء میں

شائع ہوا۔ اس کے مدیر تاب اسلم ہیں۔ یہ مجلّہ بھی ابلاغ عامہ کے اس جانبدارانہ رویے کے خلاف احتجاج کی آواز تھی جس کے تحت صرف بڑے شہروں کے بڑے ادیبوں کو نوازا جاتا تھا' چنانچہ ریاض حسین چودھری نے مہمان مدیر کی حیثیت سے "ادب کی سلطنت میں قد آور بونوں کا راج" کے زیر عنوان لکھا :

"مضافات کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کیا جاتا ہے اور تو اور نعت کے معاملے میں بھی یہ صاحبان اقتدار ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتے اور ایسے ایسے لوگوں کو نعت گو بنا کر پیش کرتے ہیں جنھوں نے تبرکاً" اور تکلفاً" ایک آدھ نعت ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے کہہ رکھی ہے۔ اپنے دوستوں کے نام مرتب کرنے کو ہم نے تنقید اور ان کی تشہیر کو فروغ ادب کا نام دے رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ادب کے نام پر ہو رہا ہے۔ آیئے ایک بار پھر سوچیں اور اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں"

"انتخاب" میں اگرچہ بڑے شہروں کو بھی نمائندگی دی گئی ہے لیکن مضافات کے ادیبوں کی تعداد زیادہ اور معیار اعلیٰ نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں علی تنہا کا افسانہ "ماجد بھائی کا گھر" ناصر ہیرا کا "شکستہ قبروں کا نوحہ" آثم میرزا کا "رنگ چاہتوں کے" آسی ضیائی کا مقالہ "اردو نام کے معنویت" مصلح الدین سعید کا "دشت بے سراغ کا ساز" ارشاد متین کا "کئی دنوں کا دن" جان کاشمیری کا انشائیہ "وغیرہ وغیرہ" اکبر حمیدی کا "شادی میں شرکت" ریاض حسین چودھری' جعفر شیرازی' کاوش بٹ' آصف ثاقب' خلیل رامپوری' مختار کریمی' جان کاشمیری' اور محمود رحیم کو نمایاں نمائندگی ملی۔ "انتخاب" مضافات کا صاف ستھرا ادبی پرچہ ہے لیکن اس کی اشاعت میں طویل وقفے آتے ہیں۔

"دید شنید" ۔ لاہور

"دید شنید" نے جنوری ۱۹۸۷ء میں رفیق ڈوگر کی ادارت میں آغاز سفر کیا۔ یہ سیاسی اور سماجی جریدہ ہے' تاہم اس میں ایک حصہ ادب کے لیے بھی وقف کیا جاتا ہے۔ ابن سبیل اور ملتانی کے مستقل کالم ادبی صورت حال ہی کے مظہر تھے' ان کا اسلوب چوٹیلا اور طنز گہری تھی۔ ابتدائی چند پرچوں میں غالب کے اسلوب میں پیروڈی بھی پیش کی گئی' کتابوں پر تبصروں کے علاوہ ڈاکٹر ملک حسن اختر' قدرت اللہ شہاب' صابر لودھی' اشرف قدسی' کے تنقیدی و تخلیقی مضامین نے "دید شنید" کے ادبی مزاج کی آبیاری کی' حالیہ دور میں "دید شنید" کا ادبی پہلو دب گیا ہے۔

"نایاب" ۔ کوہاٹ

کوہاٹ جیسے دور افتادہ مقام سے احمد پراچہ نے " نایاب " کے نام سے ایک ادبی سیریز کا اجرا کیا اور اسے زندہ اور جاندار تحریروں کا آئینہ دار بنانے کی کوشش کی ' احمد پراچہ نے علاقائی ادب اور بالخصوص پشتو ادب کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی گراں قدر کاوش کی ہے ۔ " نایاب " کا ایک بڑا کارنامہ " ایوب صابر نمبر " کی اشاعت ہے ۔ یہ ایک ایسے ادیب کو خراج تحسین تھا جس نے پشتو اور اردو دونوں زبانوں کی خدمت کی۔ " نایاب " کے لکھنے والوں میں پروفیسر پریشان خٹک ' اخگر سرحدی ' شجاعت علی راہی ' مقبول عامر ' انجم یوسف زئی ' عذرا اصغر 'نسرین سروش ' سیدہ حنا اور حامد سروش کو اہمیت حاصل ہے ۔ "نایاب" کی اشاعت خاصی بے قاعدہ اور غیر معین ہے ۔ تاہم ایک مخصوص دائرے اور محدود وسائل میں یہ اردو ادب کی قابل تحسین خدمت سرانجام دے رہا ہے ۔

"شعور" ملتان

ناصر بشیر رخسانہ لودھی اور اکبر ملک کی مشترکہ کاوشوں سے " شعور " کے نام سے ایوان ادب میں ایک منفرد آواز ملتان سے ۱۹۸۸ء میں ابھری ' تاحال اس کے دو شمارے چھپ چکے ہیں ' اور نقش ثانی نقش اول سے بہت بہتر نظر آتا ہے ۔ " شعور " کی ایک خاص پیش کش "گوشہ عروض " ہے ۔ شاعری کے حصے میں ملتان کے شعرا میں سے رضی الدین رضی ' بیدل حیدری اور انور جمال کی متعدد تخلیقات کی اشاعت سے ان کے تفصیلی مطالعے کا موقعہ فراہم کیا گیا ہے ۔ ممتاز ادبا میں سے ڈاکٹر وزیر آغا ' ڈاکٹر اے بی اشرف ' انوار فیروز ' ریاض مجید ' محمد افسر ساجد اور حزیں لدھیانوی کی شرکت نے " شعور " کو منور کیا ہے۔

"جہان اردو" لاہور

" جہان اردو " کے مقاصد میں اقلیم ادب کے ان نمائندوں کی تخلیقات پیش کرنا تھا جو بیرونی ممالک بالخصوص خلیج کے ممالک میں آباد ہیں ۔ اس کے مدیر باقی احمد پوری خود بھی بیرون پاکستان کام کرتے ہیں ۔ انہوں نے " جہان اردو " لاہور سے جاری کیا تو اس میں کویت کے اردو شاعروں کے لیے ایک گوشہ مخصوص کیا ۔ دوسری طرف بیرونی ممالک میں اردو کی بستیاں آباد کرنے والے ادیبوں کے

ذوق کی آبیاری کے لیے اردو کے ممتاز ادبا کی تخلیقات اور مضامین بھی پیش کیے۔ "جہان اردو" کا ایک شمارہ جولائی ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس پرچے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا مقالہ "جدید تنقید کا امتزاجی اسلوب" سلیم آغا قزلباش کا "انشائیہ کیا ہے"؟ اور قرۃ العین حیدر سے سکریتا پال کا انٹرویو (ترجمہ مسعود انور) خاصے اچھے مضامین ہیں۔ افسانہ نگاروں میں جوگندر پال، رحمان مذنب، غلام الثقلین نقوی، فرخندہ لودھی، جاوید اختر بھٹی اور نور پرکار کے نام نظر آتے ہیں۔ انشائیہ، شاعری اور طنز و مزاح کا حصہ بھی بے حد دقیع ہے۔ "جہان اردو" کی اشاعت باقی احمد پوری کے شوق کی آئینہ دار نظر آتی ہے اور شاید اسی لیے یہ صرف ایک اشاعت ہی میں اپنی رونمائی کر سکا۔ اس پرچے کی ترتیب و تدوین میں رضی الدین رضی نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

"ندرت"۔ ملتان

"ندرت" ملتان کے مدیران شفیق آصف اور سرور نعمی تھے۔ ۱۹۸۸ء میں پہلی اشاعت پر "ندرت" نے اپنی پیشانی پر "ادب میں تازہ جذبوں کی پہچان" کا طغرہ سجایا اور دوسرے جریدے میں منیر نیازی، عرش صدیقی، اقبال ارشد، محمد افسر سجاد، ڈاکٹر انوار احمد، عاصی کرنالی، حفیظ تائب، حسین سحر اور رضی الدین رضی کی تحریریں پیش کیں۔ گوشہ انور جمال "ندرت" کی ایک خاص پیش کش تھی۔ "ندرت" کے سامنے بظاہر ستائش کی تمنا تھی اور نہ صلے کی پروا اور مقصد سنجیدہ، جدید اور نسبتاً صالح ادب پیش کرنا تھا، لیکن بوجوہ ان مقاصد کے حصول میں پرچے کی عدم اشاعت آڑے آگئی۔

"پاکستانی فلسفہ" لاہور

پاکستانی فلسفہ اکادمی لاہور کے زیر اہتمام "پاکستانی فلسفہ" کا پہلا شمارہ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے مدیر ڈاکٹر وحید عشرت ہیں اور جریدے کو پاکستان میں خرد افروزی کی تحریک کا داعی قرار دیا گیا ہے۔ اداریہ میں لکھا گیا ہے کہ "پاکستانی فلسفہ" اگرچہ بنیادی طور پر پاکستانی قوم کی فکری اور نظریاتی بنیادوں کو متشخص کرنے کی سعی سے عبارت ہے، تاہم اس کی وسعت اور پھیلاؤ نوع انسانی کے تمام فکری حاصلات کے مطالعہ، تجزیہ اور تفہیم تک پھیلا ہوا ہے اور یہ ایک ایسا فورم ہے جو ہر دور، ہر قوم اور تہذیب و تمدن کے فکری اور ذہنی حاصلات کا مطالعہ کرے گا۔[۱]

اس سہ ماہی پرچے میں ڈاکٹر عارفہ فرید کا مقالہ "فلسفہ اور اسلوب" ڈاکٹر وحید عشرت کا "فلسفے

کی نئی تنقید" فرتھجوف شوآن کا "اعتباریت کے تضادات" شاہدہ ارشد کا "موت وجودیوں کی نظر میں" نسیم اختر کا "عصری فلسفے کا دبستان" اور پروفیسر نعیم احمد کا "فلسفہ یونان کا دیومالائی پس منظر" خیال انگیز اور فکر افروز مقالات ہیں اور اس حقیقت کو آشکار کرتے ہیں کہ اس نوع کے زیادہ سے زیادہ مقالات فکر کی روشنی اور خردافروزی کی تحریک کو مؤثر انداز میں پھیلا سکتے ہیں۔ لیکن "پاکستانی فلسفہ" کا دوسرا شمارہ تاحال نہیں چھپا۔

○

حوالہ جات

۱۔ وحید عشرت "پاکستانی فلسفہ" شمارہ اول۔ ص ٦۔ لاہور ۱۹۸۸ء

آٹھواں باب

خواتین کے لیے رسائل

برصغیرپاک و ہند کے قدیم تہذیبی معاشرے میں عورت خاتون خانہ تھی' اسے علم کے حصول کے کشادہ اور وافر مواقع میسر نہیں تھے۔ تعلیم اگر کچھ تھی تو وہ خانہ دار قسم کی اور ابتدائی مذہبی کتب تک محدود تھی' انیسویں صدی کے وسط میں جب نئی طرز کے مدارس قائم ہوئے تو عورتوں کی تعلیم کی ضرورت کو بھی محسوس کیا گیا' اور ایسی کتابوں کی تالیف و تصنیف میں دلچسپی لی گئی جن کے مطالعے سے عورتوں کی ذہنی اور مجلسی تربیت کی جاسکتی تھی۔ گارساں دتاسی نے ۵ دسمبر ۱۸۵۳ء کے خطبے میں مولوی کریم الدین کی تحسین اس لیے بھی کی ہے کہ انہوں نے عورتوں کی تعلیم پر ایک کتاب لکھی تھی اور بقول گارساں دتاسی "یہ وہ مسئلہ ہے جس کے متعلق ہندوستان میں بہت غفلت برتی جاتی ہے"(۱) کریم الدین کی ایک اور کتاب تذکرۃ النسا میں ہندی شاعرات کے علاوہ ایشیا' افریقہ اور یورپ کی ان نامور عورتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جنہوں نے کسی فن میں ناموری حاصل کی یا جنہوں نے مستقل حکمرانی کی۔ انگریزی حکومت نے معلمات کے لیے نارمل سکول قائم کرائے اور ۱۸۵۱ء میں تعلیم نسواں کی تحریک چل پڑی۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۶۴ء کے خطبے میں لکھا ہے کہ:

"کلکتہ میں بیتھم سکول لڑکیوں کی تعلیم کے لیے پہلے سے موجود ہے۔ اس کی بدولت بنگالی لڑکیوں کی تعلیم اور اخلاق پر ممکنہ اچھا اثر پڑے گا۔ کلکتہ میں نیز دوسرے مقامات پر ایسی یورپین خواتین موجود ہیں' جو بطور خدمت یا کچھ تنخواہ لے کر زنانے میں جا کر ہندوستانی عورتوں کو تعلیم دیتی ہیں۔ لاہور میں تعلیم نسواں کو خوب ترقی ہو رہی ہے۔ یہ تعلیمی تحریک بڑی حد تک بابا خان سنگھ کی جدوجہد اور شفقت کا نتیجہ ہے۔ پنڈت رام دیال نے لڑکیوں کے لیے پہلا قاعدہ لکھا ہے۔"(۲)

گارساں دتاسی کے خطبہ ۱۸۶۵ء کے مطابق اس وقت صرف پنجاب میں لڑکیوں کے مدرسوں کی تعداد ۲۶۳ تھی اور ان میں ۱۳ ہزار سے زائد لڑکیاں تربیت پا رہی تھیں۔(۳) اس دور میں معاشرتی اور سماجی بہبود کے لیے جو انجمنیں مختلف شہروں میں قائم ہوئیں ان میں سے بیشتر نے تعلیم نسواں کے فروغ میں گہری دلچسپی لی اور بنارس آگرہ' دہلی اور لکھنؤ جیسے مرکزی شہروں میں لڑکیوں کے متعدد

مدارس کھل گئے اور اب تعلیم نسواں کے لیے مناسب مفید اور دلچسپ کتابوں کی شدید کمی محسوس کی جانے لگی ۔ اس ضرورت کو صوبہ شمال مغربی کے گورنر سرولیم میور اور ڈائریکٹر تعلیمات نے محسوس کیا اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے نہ صرف مصنفین کی حوصلہ افزائی کی بلکہ ۱۸۶۴ء میں "داستان جمیلہ خاتون" کے نام سے خود بھی ایک سبق آموز کتاب لکھی ۔ " رسوم ہند " (۱۸۶۸ء) کے چند قصوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی معاشرتی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے اور ایسی رسوم کا تذکرہ خصوصی طور پر ملتا ہے جن پر طبقہ نسواں کاربند تھا۔

سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے بھی معاشرتی ترقی کے لیے عورتوں کی ذہنی بیداری کو اہم تصور کیا۔ وہ اسلامی تعلیمات کے لیے عورتوں کو علم سے بہرہ ور کرنا ضروری خیال کرتے تھے ۔ تاہم یہ ادبا پردے کی حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے اور عورتوں کے لیے نئے طریقہ تعلیم کے برعکس پرانے طریقہ تعلیم کے حامی تھے ۔ رفقائے سرسید میں سے مولانا حالی نے " مناجات بیوہ " اور " چپ کی داد " جیسی نظمیں لکھیں۔ جن میں عورتوں کی مظلومیت کا نقشہ مراۃ پیرائے میں کیا گیا ہے اور ان کے لیے علم حاصل کرنے کی آواز بھی اٹھائی گئی ہے۔ مولوی نذیر احمد دہلوی نے مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) میں خانہ دار عورت کو مرد کے معاملات حیات میں مشیر و معاون بننے کی ترغیب دی "بنات النعش" (۱۸۷۳ء) میں انہوں نے عورت کے معلوماتی افق کو وسیع اور روشن کیا اور توبتہ النصوح (۱۸۸۸ء) میں معاشرتی معائب سے تربیت اولاد کا موضوع ابھارا جس کی ذمہ داری عورت نے سنبھالی تھی اور جس کے لیے تعلیم ضروری تھی۔ مولانا حالی کی کتاب " مجالس النسا " (۱۸۷۴) عورتوں کا معاشرتی مقام متعین کرنے اور ان کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کی طرف ایک راست قدم کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں افسانوی ہیئت کا سہارا لینے کے باوجود عورتوں کے مسئلے کو استدلال اور منطق سے ثابت کیا گیا ہے۔ حالی کے اس مثبت عمل نے توجہ بھی حاصل کی اور اسے فروغ بھی حاصل ہوا۔ اس دور میں تعلیم نسواں کی تحریک کو عام کرنے اور عورتوں کی تربیت کے مقاصد کے پیش نظر رسائل کے اجرا کی ضرورت محسوس کی جانے لگی اور عیسائی مشنریوں کی طرف سے ۵ مارچ ۱۸۸۴ء کو لکھنؤ سے اردو اور ہندی میں پندرہ روزہ " رفیق نسواں " اصلاحی اور تبلیغی ضرورتوں کے لیے جاری کیا گیا۔

"اخبار النساء" دہلی

مولوی سید احمد دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ" کا شمار ان زعمائے ادب میں ہوتا ہی جنہوں نے عورتوں کی تعلیمی اور سماجی ترقی میں گہری دلچسپی لی اور ان مقاصد کے حصول کے لیے یکم اگست ۱۸۸۴ء کو رسالہ

"اخبار انساء" جاری کیا جسے خواتین کے لیے پہلا باقاعدہ رسالہ شمار کرنا چاہیے ۔ یہ رسالہ مہینے میں تین بار شائع ہوتا تھا ۔ ضخامت ۸ صفحات تھی، مضامین میں عورتوں کی خانہ داری کے امور کے علاوہ ان کی تعلیمی حالت سدھارنے کی کوشش کی جاتی تھی ۔ "اخبار النساء" نے مشرقی تہذیب کی نگہداشت کی اور قدامت جہالت اور کم علمی کے اندھیروں کو دور کرنے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں ۔ مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ "اس میں عورتوں کے مضامین بھی ہوتے تھے "(۴) اور انہیں تلقین کی جاتی تھی کہ وہ حیا اور شرافت کا دامن نہ چھوڑیں اور خانگی مناقشات سے بچیں ۔ اس میں دلی کی زبان کو صحت اور صفائی سے پیش کیا جاتا تھا اور یہ سید احمد دہلوی کے منفرد ادبی اسلوب کا آئینہ دار تھا۔ "اخبار النساء" چونکہ خواتین کا پہلا ادبی رسالہ تھا اس لیے اس پر پھبتیاں بھی کسی جاتی رہیں۔ مولانا رازق الخیری نے لکھا کہ "اخبار النساء" کو اخباروں کی جورو" کہا جاتا تھا لیکن مولوی سید احمد دہلوی اس کا برا نہیں مناتے تھے۔

"تہذیب نسواں"۔ لاہور

پنجاب میں تعلیم و بہبود نسواں کی تحریک کو جن لوگوں نے فروغ دیا، ان میں سید ممتاز علی کو یہ اہمیت بھی حاصل ہے کہ انہوں نے " تہذیب نسواں " کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو اپنے ادارہ دارالاشاعت لاہور سے جاری کیا اور اس میں عورتوں کے سماجی، تہذیبی، مذہبی اور فکری مسائل کو زیر بحث لانے کا سلسلہ وسیع پیمانے پر شروع کر دیا ۔ سید ممتاز علی کا مقصد خواتین کو صرف امور خانہ داری سے آشنا کرنا نہیں تھا، انہوں نے عورت کی ادبی صلاحیتوں کو بیدار کیا اور اپنے مسائل کو خود اپنی نظر سے دیکھنے کا ادراک عطا کیا ۔ ان کی اس قسم کی مساعی کو سید احمد خان، مولانا حالی اور نذیر احمد دہلوی کے علمی، فکری اور اصلاحی کاوشوں کا منطقی نتیجہ قرار دیا گیا ہے ۔ تاہم سید ممتاز علی کی حدود عمل بچوں اور عورتوں تک محدود تھیں، اس لیے ان کے بنا کردہ رسائل "تہذیب نسواں" اور "پھول" کو ان طبقات کی خدمات کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی ۔

"تہذیب نسواں" ۱۹۴۹ء تک باقاعدگی سے چھپتا رہا ۔ اس کے حلقہ ادارت میں مولانا عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج اور احمد ندیم قاسمی جیسے ممتاز ادبا شامل رہ چکے ہیں۔ "تہذیب نسواں" کو ایک ایسے ادبی پرچے کی حیثیت حاصل ہے جسے مرد ادبا مرتب کرتے تھے لیکن جس کی جہت بہبودی نسواں کی طرف تھی۔ اس نے عورتوں کی ذہنی بیداری، شعور کی پختگی، تعلیم میں پیش قدمی اور مسائل حیات میں براہ راست شرکت کے رجحانات کو تقویت دی "تہذیب نسواں" کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ نصف

صدی تک عورتوں کے حقوق کی نگہداشت کرتا رہا اور ہر پڑھے لکھے گھرانے میں خواتین کے ذوق مطالعہ کا جزولاینفک بن گیا۔ "تہذیب نسواں" خواتین کے قلم کو خصوصی اعتماد عطا کیا اور ثابت کر دیا کہ اعلیٰ درجے کی انشاپردازی صرف مردوں کا خاصہ نہیں بلکہ اس میں خواتین بھی اپنا تخلیقی کردار خاطرخواہ طور پر سرانجام دے سکتی ہیں۔ "تہذیب نسواں" اس دور میں نئی لکھنے والی خواتین کے لیے راہنما ثابت ہوا۔ اس رسالے نے ان کی تخلیقی سرگرمیوں کے لیے پہلی سیڑھی کا کام دیا۔ اس کے صفحات سے نذر سجاد حیدر، محمدی بیگم، حجاب امتیاز علی، زبیدہ زریں، جمیلہ بیگم، سنجیدہ اشرف علی، سلطانہ آصف فیضی، صغرا ہمایوں جیسے متعدد نئے نام ابھرے "ولایتی معلومات" "دسترخوان پر" اور "محفل تہذیب" اس پرچے کے چند مستقل عنوانات تھے۔

"خاتون"۔ علی گڑھ

علی گڑھ سے ماہ نامہ "خاتون" جنوری ۱۹۰۴ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر شیخ محمد عبداللہ تھے جو تعلیم نسواں سیکشن کے سیکرٹری بھی تھے۔ اس رسالہ کا مقصد مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی خواتین میں علمی مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس میں بالعموم ایسے علمی مضامین پیش کئے جاتے تھے، جن کے مطالعے سے خواتین کے خیالات درست ہوں، عمدہ تصنیفات پڑھنے کی ضرورت محسوس ہو اور ذہنی افق روشن ہو سکے۔ سید خورشید علی کا مضمون "جاپان کی لڑکیاں" مولانا حالی کا "قرون اولیٰ کی حق گوئی اور حق پسندی" مولانا محمد اسلم جے راج پوری کا مقالہ "حضرت اسما"۔ رابعہ بیگم کا "اسلام کی بے تعصبی" بنت نذر الباقر کا افسانہ "ہائیں تم بھی انہیں کی بیوی ہو" مولانا محمود الحق کا مقالہ "کتب بینی" رابعہ سلطان بیگم کا مضمون "سیاروں کی کانفرنس" چند ایسے ہی مضامین ہیں جن میں نئے تصورات کی طرف پیش قدمی کے آثار نظر آتے ہیں، "النساء" اور "تہذیب نسواں" کی طرح رسالہ "خاتون" نے اس دور کی مسلمان عورتوں کو روشن خیال بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ "خاتون" کے ادارتی شذرے سے اس کی اشاعتی حکمت عملی کے نقوش یوں سامنے آتے ہیں۔

"خاتون" ایک ماہوار رسالہ ہو گا جس میں صرف عورتوں کے مضامین ہوا کریں گے۔ تعلیم نسواں کی ضرورت مختلف پیرایوں میں ثابت کرنے کے علاوہ ہماری بڑی کوشش یہ ہو گی کہ ہم عورتوں میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کی جو ان کی ذات اور ان کی حالت کے مناسب ہوں گے شائع کریں۔"

اس رسالے کے لکھنے والوں میں مرد بھی شامل تھے۔ جن میں مولوی احتشام الدین، محمد انعام الحق دہلوی، لطافت حسین شاہ، مولوی کرامت حسین اور نذیر ہاشمی کے اسما نمایاں ہیں۔ ان کے ساتھ

مس نصیرالدین حیدر، فاطمہ بیگم صاحبہ، اور مسز جے بیگ صاحبہ جیسی خواتین کے نام بھی دستیاب ہیں۔ "خاتون" نے اصلاح خواتین اور حقوق نسواں کے لئے اپنی آواز مؤثر انداز میں اٹھائی اور یہ چند برس تک اپنی خدمات کامیابی سے سرانجام دیتا رہا۔

"مشیر مادر" ۔ لاہور

ہفتہ وار " تہذیب نسواں " کی کامیاب تحریک سے متاثر ہو کر مولوی ممتاز علی نے دار الاشاعت لاہور سے ۱۹۰۵ء میں ایک ماہ نامہ " مشیر مادر " کے نام سے بھی جاری کیا اور اس کی ادارت کے فرائض بیگم ممتاز علی سرانجام دیتی تھیں ۔ اس رسالے میں بڑی عمر کی خواتین کے لئے ادب فراہم کیا جاتا تھا ۔ " مشیر مادر " ایک سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا ۔ جنوری ۱۹۰۸ء میں یہ رسالہ دوبارہ جاری ہوا لیکن اس دفعہ بھی اسے طویل عرصہ اشاعت نصیب نہ ہوئی ۔

"پردہ نشین" ۔ آگرہ

"پردہ نشین" کے نام سے خواتین کا ایک ماہنامہ مئی ۱۹۰۷ء میں آگرہ سے جاری ہوا ۔ اس کی مدیرہ مسز خاموش تھیں ۔ " رسم و رواج " اور " دو دو باتیں " اس پرچے کے مستقل عنوانات تھے ۔ امور خانہ داری کے علاوہ معاشی اور معاشرتی موضوعات پر بھی مضامین اس پرچے میں چھپتے تھے ۔ لکھنے والوں میں خواتین کے علاوہ مرد بھی شامل تھے ۔ اس رسالے کے آثار حیات ۱۹۱۵ء تک ملتے ہیں ۔

"شریف بی بی" ۔ لاہور

لاہور سے خواتین کا ماہنامہ " شریف بی بی " جولائی ۱۹۰۹ء میں منشی محبوب عالم کی نگرانی میں جاری ہوا ۔ اس رسالے میں بنت سید نذر الباقر، مسز عبدالقادر، اہلیہ بابو علی احمد، مس جے سی فلچر، بیگم عبدالستار نے خواتین کے موضوعات پر مضامین لکھے ہیں، تربیت اطفال، خواتین کا لباس، عورتوں کے توہمات، تعلیم کی ضرورت جیسے موضوعات پر سہل اور آسان زبان میں مضامین پیش کئے جاتے تھے، ہندوستان اور یورپ کی ممتاز عورتوں کے کارناموں کو یہ پرچہ خصوصیت سے اجاگر کرتا تھا لیکن لہجہ خاصہ جذباتی ہوتا تھا جو عورتوں کو بہت متاثر کرتا تھا ۔

"سہیلی" - دہلی

ہفتہ وار "سہیلی" راشد الخیری کی ادارت میں ستمبر ۱۹۱۵ء میں دہلی سے جاری ہوا۔ اس پرچے کو رسالہ "عصمت" کے ضمیمے کی حیثیت حاصل تھی اور اس کے بیشتر مضامین مولانا راشد الخیری مختلف نسوانی قلمی ناموں سے خود لکھتے تھے۔ "سہیلی" زیادہ عرصے تک چل نہ سکا۔ اس کا دوسرا دور ستمبر ۱۹۲۲ء میں شروع ہوا لیکن یہ بھی محدود عرصہ اشاعت کا دور تھا۔

"النساء" - حیدر آباد

صغریٰ بیگم حیا حیدر آباد کی ترقی پسند اور روشن مزاج خاتون تھیں۔ وہ شاعرہ بھی تھیں اور نثر نگار بھی، یورپ کے سفر سے واپس آئیں تو انھوں نے اپنا سفر نامہ ادبی اسلوب میں لکھا اور خواتین کے لئے "مدرسہ صفدریہ" جاری کیا۔ ماہ نامہ "النساء" صغریٰ بیگم حیا کا ایک اور ادبی کارنامہ ہے۔ یہ ماہ نامہ ۱۹۱۹ء میں حیدر آباد دکن سے جاری ہوا اور خواتین کے لئے قومی سطح پر خدمات سرانجام دیتا رہا۔ "تہذیب نسواں" کی طرح "النساء" نے بھی خواتین میں ادب پڑھنے اور لکھنے کا شائستہ ذوق پیدا کیا۔

"نسائی" - دہلی

دہلی کا پندرہ روزہ "نسائی" طبقہ نسواں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا آرزو مند تھا۔ اس کے مدیر قاری عباس حسین تھے جن کی ادارت میں دہلی سے اخبار "قوم" اور "تمدن" شائع ہوتے تھے "نسائی" ۱۸ نومبر ۱۹۱۹ء کو جاری ہوا اور اس نے مستورات کی دانش کے مطابق عام فہم، سادہ اور سلیس زبان میں حالات حاضرہ اور معلومات عامہ کے علاوہ موضوعات سیاسیہ پر مضامین پیش کئے۔ سماجی آگہی کو فروغ عام دینے میں "نسائی" کی خدمات قابل قدر ہیں۔

"خادمہ" - حیدر آباد

"خادمہ" کے نام سے ایک نسوانی جریدہ حیدر آباد دکن سے مریم بیگم صاحبہ نے ۱۹۲۲ء میں

جاری کیا۔ مریم بیگم ایرانی انسل تھیں لیکن حیدر آباد میں بیاہی گئی تھیں اور غزل میں کہتی تھیں۔ انسوں نے " خادمہ " کو اوسط درجے کی تعلیم یافتہ خواتین کا پرچہ بنانے کی سعی کی اور حسب ضرورت مرد ادیبوں سے بھی مضامین حاصل کئے ' اس رسالہ نے عورتوں کی خانگی زندگی کے بہبود میں نسبتاً" زیادہ دلچسپی لی۔

"حور" ۔ کلکتہ

ماہ نامہ " حور " بیگم قتیل انصاری نے ستمبر ۱۹۲۳ء میں کلکتہ سے جاری کیا تھا اس کے پہلے شمارے میں "حور" کی تعریف میں علامہ جمیل مظہری کی ایک نظم چھپی اور مقبول ہوئی۔ اس کا ایک خاص نمبر ۱۰۰ صفحات پر مشتمل تھا ' لیکن یہ رسالہ ۲ سال سے زیادہ عمر نہ پا سکا۔

"معین نسواں" ۔ علی گڑھ

جون ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ سے ماہ نامہ " معین نسواں " عطیہ بیگم کی ادارت میں جاری ہوا ' ان کے شوہر حافظ علی بہادر ان کے شریک ادارت تھے۔ یہ مصور رسالہ دلچسپ مضامین اور معلومات افزا مقالات سے بھرپور ہوتا تھا۔ افسانہ اور ڈرامہ کی اصناف کے علاوہ اس پرچے میں لطائف و ظرائف پیش کرنے کی کاوش بھی کی گئی۔

اس سال پیلی بھیت سے ماہ نامہ " حرم " بیگم عبدالغفور کی ادارت میں اور ملتان سے ماہ نامہ " سرتاج " محترمہ امتیاز فاطمہ بیگم تاج کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ دونوں پرچے حقوق نسواں کے حامی تھے ' مغربی تعلیم کے معائب کو نمایاں کرتے تھے۔ علمی تہذیبی اور معاشرتی مضامین کی اشاعت کے علاوہ امورخانہ داری پر بھی مناسب توجہ دیتے تھے۔ رسالہ " سرتاج " ۱۹۲۸ء میں لاہور منتقل ہو گیا۔ اس کی سرپرستی بیگم سر محمد شفیع نے کی تھی لیکن اس کا عرصہ اشاعت طویل نہیں ہے۔

"احمدی خاتون" ۔ قادیان

قادیان کے ماہ نامہ "احمدی خاتون" کا مقصد عورتوں میں دینداری کو فروغ دینا اور تعلیمی ذوق پیدا کرنا تھا۔ اس کے مدیر شیخ یعقوب علی تراب احمدی تھے ' اس پرچے نے خواتین کو شریف بیوی ' سعادت

مند بیٹی اور سلیقہ شعار ماں بننے کی تربیت دی۔

متذکرہ بالا پس منظر میں اب ہم ایسے پرچوں کا ذکر کریں گے جو آزادی سے قبل جاری ہوئے لیکن جن کا زمانہ اشاعت آزادی کے بعد تک قائم ہے۔

"عصمت"۔ کراچی

"عصمت" خواتین کا سب سے قدیم پرچہ ہے۔ اس کی ابتدا مولانا راشد الخیری نے ۱۹۰۸ء میں کی تھی، اس کا مقصد خواتین کو روشن خیال بنانا اور تعلیم کو عام کرنا تھا۔ "عصمت" نے اصلاح نسواں کی تحریک کا علم بلند کیا اور اس میں ایسے مضامین کو فوقیت دی جو ہلکے پھلکے انداز میں خواتین کے ذوق کی آبیاری کرتے، مطالعے کی عادت ڈالتے اور ادب کے ذریعے داخلی طور پر انہیں مائل بہ اصلاح بھی کرتے تھے، راشد الخیری کی وفات کے بعد ۱۹۳۶ء میں "عصمت" کی ادارت ان کے فرزند رازق الخیری نے سنبھالی۔ ۱۹۴۷ء میں "عصمت" اور رازق الخیری دلی سے کراچی آ گئے، "عصمت" کو اب نئے ماحول اور نئے حالات کا سامنا تھا لیکن اس نے حالات کے سامنے سپر ڈالنے کے بجائے اصلاح و ارتقا کے مشن کو جاری رکھا اور نہ صرف خواتین کی ذہنی اور ادبی آبیاری میں گراں قدر حصہ لیا بلکہ متعدد خواتین میں لکھنے کا ذوق بھی پیدا کیا۔ چنانچہ "عصمت" کو اگر خواتین ادیبوں کی نرسری شمار کیا جائے تو یہ درست ہو گا۔ مولانا رازق الخیری کی وفات کے بعد صائمہ خیری "عصمت" کی مدیر ہیں۔

"عصمت" بظاہر معمول کا پرچہ ہے۔ لیکن اس نے خواتین کی مزاج سازی میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں، اردو زبان و ادب میں اتنی طویل عمر کسی اور پرچے نے نہیں پائی، اس پرچے کی ترتیب و تدوین میں اب "عصمت" کی تیسری نسل شریک ہے۔ "عصمت" کے یادگار نمبروں میں "طلائی جوبلی" نمبر ۱۹۵۸ء اور "الماسی جوبلی" نمبر ۱۹۶۸ء شامل ہیں، ان پرچوں میں مولانا رازق الخیری نے "عصمت" کی داستان حیات پر جو مضمون سوانحی صورت میں لکھا ہے اسے ان خصوصی شماروں کا حاصل شمار کیا جا سکتا ہے۔

"سہیلی"۔ لاہور

ماہ نامہ "سہیلی" لاہور سے ۱۹۲۴ء میں زہرہ بتول کی ادرت میں جاری ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں اس

کی ادارت خدیجہ بیگم نے سنبھال لی ۔ رسالہ سہیلی " ادبی دنیا " اور " نیرنگ خیال " کی طرح جہازی سائز میں چھپتا تھا ۔ کتابت طباعت اجلی ہوتی اور اسے تصویروں سے آراستہ کیا جاتا تھا ۔ اس پرچے نے عورتوں میں علمی لگن پیدا کرنے اور تعلیمی بیداری کو روبہ عمل لانے میں گراں قدر خدمات سر انجام دیں ۔

۱۹۲۸ء رسالہ " سہیلی " کا ایک شاندار سالنامہ شائع ہوا ۔ لکھنے والوں میں ظفر علی خان ' ساغر خلیلی ' خضر بانو خیری شامل تھے ۔ اس پرچے نے آداب معاشرت پر زیادہ توجہ دی ' اور انعامی مقابلے بھی منعقد کئے جن کا مقصد خواتین میں ادبی ذوق کی افزائش تھا ۔ " سہیلی " ایک مقبول عام پرچا تھا اور گھر گھر میں پڑھا جاتا تھا ۔

"مسلمہ" ۔ لاہور

۱۹۳۱ء میں خواتین کا ادبی ماہ نامہ " مسلمہ " لاہور سے عنایت عارف کی ادارت میں جاری ہوا ' حمیری خانم اور نصیر بانو سبزواری " مسلمہ " کی معاون مدیرہ تھیں ۔ نامور اور ممتاز لکھنے والوں میں سے عندلیب شادانی ' خالد بزمی ' ماہر القادری ' فیض لدھیانوی ' نشتر جالندھری ' مجید لاہوری ' اور چراغ حسن حسرت کا تعاون " مسلمہ " کو حاصل تھا ۔ چنانچہ خواتین کے ساتھ ان ادبا کے ممتاز مضامین کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا جاتا تھا ۔ اس پرچے کا بنیادی مقصد خواتین کی ادبی آبیاری تھا اور یہ اس میں کامیاب نظر آتا ہے ۔

"زیب النساء" ۔ لاہور

لاہور سے " زیب النساء " ۱۹۳۴ء میں جاری ہوا ۔ اس کا بنیادی مقصد مسلمان خانہ دار خواتین کی ادبی اور سماجی راہنمائی تھا اور اس مقصد کو اس رسالے نے بڑی خوش اسلوبی سے حاصل کیا ' متعدد نسلوں کے لکھنے والے "زیب النساء" میں پروان چڑھے اور اسے ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری نسل کے قارئین نے بھی پسند کیا ۔ "زیب النساء" نے خواتین کے جذباتی ادب کو پروان چڑھانے میں خصوصی خدمات سرانجام دی ہیں ' اس میں لکھنے والی خواتین کا ایک مخصوص حلقہ ہے جس میں وحیدہ نسیم ' رضیہ بٹ ' بشریٰ رحمن ' عفت موہانی ' ثریا یاسمین فریال ' رابعہ سجاد ' شعور فاطمہ ' سلمیٰ اعوان ' اسماء غنی اور سلطانہ فخر کے نام اہم ہیں ۔ "زیب النساء" کے افسانہ نمبر اور

سالنامے خاصے کی اشاعتیں ہوتی ہیں اور خواتین اسی رسالے کا شدت سے انتظار کرتی اور گہری دلچسپی سے پڑھتی ہیں۔ "زیب النساء" طویل عمر پانے والا خواتین کا مقبول جریدہ ہے جو ادب کی جہت کو بھی فروغ دے رہا ہے۔

"صنف نازک" ۔ لاہور

خواتین کے رسالہ "صنف نازک" نے اصلاح کے ساتھ تفریحی ضروریات پوری کرنے کی کوشش بھی کی۔ یہ پرچہ ۱۹۳۵ء میں عنایت احمدی بیگم کی ادارت میں نکلا اور یہ پنجاب کے مقبول نسوانی رسائل میں شمار کیا جاتا تھا۔

"اختر" ۔ لاہور

ماہ نامہ "اختر" محمد علی برق اور فاطمہ بیگم کی ادارت میں لاہور سے مئی ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا تھا اور ستمبر ۱۹۳۸ء تک شائع ہوتا رہا۔ یہ معمول کا پرچہ تھا جو عورتوں کو سماجی حوادث سے کہانیوں کے ذریعے باخبر رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"خاتون سرحد" ۔ پشاور

"خاتون سرحد" کے نام سے شیریں تاج صاحب نے پشاور سے ۱۹۳۸ء میں ایک ماہ نامہ جاری کیا، اس پرچے نے سرحد کی روشن خیال خواتین میں سیاسی اور سماجی بیداری کی لہر پیدا کرنے کی سعی کی، شیریں تاج غازی عبدالرحمٰن کی ہمشیرہ تھیں جو جنگ بلقان میں ہندوستانی طبی مشن کے ساتھ گئے تھے اور شہید ہوگئے تھے۔ اس رسالے نے قومی مقاصد کی ترویج و اشاعت میں سرگرم حصہ لیا۔

"انیس نسواں" ۔ لاہور

شیخ محمد اکرم رسالہ "عصمت" دہلی کے بانی مدیران میں سے تھے۔ وہ آزادی و تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے اور خواتین کو روشن خیال بنانے میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں

نے اپنی بیگم کی ادارت میں " انیس نسواں " کے نام سے ایک ماہ نامہ لاہور سے جاری کیا اور اپنے متذکرہ نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ رسالہ تا دیر نہ چل سکا۔

"رفیق نسواں"۔ لاہور

لاہور کا ماہ نامہ " رفیق نسواں " ۱۹۳۹ء میں حمیدہ خانم کی ادارت میں نکلا، یہ خواتین کا تعلیمی اور اصلاحی رسالہ تھا اور ان کے ذوق ادب کی تسکین کے لئے سبق آموز کہانیوں کی اشاعت میں پیش پیش رہتا تھا۔

"حرم"۔ لاہور

ماہ نامہ " حرم " ظہیرہ بدر کی ادارت میں ۱۹۴۷ء میں جاری ہوا۔ اس کا مقصد عورتوں میں نئے احساس کی روح کو بیدار کرنا اور ان کی ادبی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا اور معاشرے میں ایک باوقار مقام عطا کرانا تھا۔ "حرم" کو عام رسائل کی بہ نسبت طویل زندگی اور خواتین کی پسندیدگی کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے اخلاقی مقاصد کو مرد لکھنے والوں نے بھی قبول کیا اور ایم اسلم، نظر زیدی، عبدالصمد، ذوقی مظفر نگری، محمد علی چراغ، مظفر عزیز، سبطین شاہجہانی، اکبر کاظمی، جعفر شیرازی، اور ظفر عسکری نے مستقل تعاون فراہم کیا۔ "حرم" کو ادب کی دہلیز کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس باب سے گزر کر اعلیٰ ادب کی منزل آتی ہے۔ چنانچہ اس پرچے نے ہلکے پھلکے اور لطیف ادب کی پیش کش سے نازک ذہنوں کی آبیاری کی سعی مسلسل تا دیر جاری رکھی۔

"حور"۔ لاہور

خواتین کا مقبول رسالہ " حور " ۱۹۴۰ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیران اعزازی میں جہاں بانو اور زیب عثمانیہ شامل تھیں، اس پرچے میں بقول اختر شیرانی " آغوش طور میں لہلہانے اور دامان حور میں جگمگانے والے جلووں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔" اس کا مقصد خانہ دار خواتین کو سماجی ضرورتوں میں راہنمائی فراہم کرنا اور ادبی ذوق کی آبیاری تھا۔ حور نے خواتین کی فنی معلومات میں بھی اضافہ کیا ان کی ذہنی راہنمائی کی، زندگی کی کئی ایک مشکلات کو حوصلے اور پامردی سے حل کرنے کا

ولولہ عطا کیا اور انہیں لکھنے کی تربیت بھی دی ۔ اس کے لکھنے والوں میں لطیف انور ، اکرم طاہر ، ذکاء الرب رباب ، نظر زیدی ، فضا جالندھری ، جیسے ادبا شامل ہیں ، اپریل ۱۹۶۵ء میں "حور" کا "سلور جوبلی نمبر" شائع ہوا اس کے متعدد سالناموں نے بھی مقبولیت حاصل کی ۔ " حور " نے لکھنے والی خواتین کے کئی انعامی مقابلے بھی منعقد کئے " حور " بدلے ہوئے حالات کے مطابق اپنی وضع اور مزاج میں نمایاں تبدیلی عمل میں لاتا رہا ۔ یہ رسالہ اب بھی خواتین میں بے حد مقبول ہے اور اپنے مقاصد کے حصول میں کوشاں ہے ۔

"نسوانی دنیا" ۔ لاہور

ماہ نامہ " نسوانی دنیا " ترقی پسند خیالات کا حامی رسالہ تھا ۔ اس کے پس پردہ مدیر تو عبداللہ ملک تھے لیکن سرورق پر عائشہ عبداللہ کا نام چھپتا تھا ۔ اس کی ابتدا ۱۹۴۶ء میں ہوئی اور انقلابی نوعیت کے ترقی پسندانہ مضامین کی وجہ سے اس نے نسوانی حلقوں کے علاوہ مردوں کو بھی چونکا دیا ، چنانچہ اس پر شدید رد عمل کا اظہار کیا گیا یہ پرچہ ایک سال کے عرصے میں ہی دم توڑ گیا ۔

"خاتون پاکستان" ۔ کراچی

ماہ نامہ " خاتون پاکستان " کراچی سے ۱۹۴۷ء میں جاری ہوا ۔ اس کے مدیر شفیق بریلوی تھے ۔ ادارہ تحریر میں مسرت جہاں اور طلعت شہناز کے نام شامل ہیں ۔ " خاتون پاکستان " پاکستانی خواتین کے نئے صحت مند تقاضوں کا ترجمان تھا ۔ اس پرچے میں مظفرانساء صدیقی ، جیلانی بانو ، واجدہ تبسم ، طلعت شہناز ، جیسی اعلیٰ پائے کی لکھنے والی خواتین کے علاوہ مرد ادیبوں نے بھی شرکت کی ۔ چند اہم نام مولوی عبدالحق ، حمید کاشمیری ، قیصر تمکین ، غبار یاور ، فضا ابن فیضی ، تمنا عمادی ، عبدالعزیز فطرت ، اختر ہوشیارپوری ، عبدالحمید عدم ، یاور عباس ، شاہد احمد دہلوی ہیں۔

"خاتون پاکستان" نے ۱۹۶۱ء میں ہر سال ایک "رسول نمبر" پیش کرنے کی روایت قائم کی ۔ ۱۹۶۴ء میں جو "رسول نمبر" شائع ہوا اس کی ضخامت ۹۹۲ صفحات تھی ۔ اس پرچے میں حضورؐ کی سیرت طیبہ کے روشن نقوش کو پیش کرنے کی سعادت مولانا ابوالا علی مودودی ، امین احسن اصلاحی ، سید حسن مثنیٰ ندوی ، ملا واحدی ، ابوالکلام آزاد جیسے ادبا کے علاوہ سعیدہ عروج مظہر ، بیگم ہرمزی قدوائی ، ممتاز جہاں بیگم صدیقی اور عائشہ صدیقی عثمانی نے بھی حاصل کی ، "رسول نمبر" میں نعتوں کی اشاعت کا

خصوصی اہتمام کیا گیا اور اس میں غیر مسلم شعرا مثلاً فراق، کیفی، درگا سہائے سرور، ہری چند اختر، کشن پرشاد شاد، کے علاوہ متعدد غیر معروف شعرا کی نعتیں بھی پیش کی گئیں۔

"خاتون مشرق" ۔ لاہور

نصیر آرزو کا رسالہ "خاتون مشرق" کراچی سے اپریل ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا۔ خواتین کی ادبی اور سماجی خدمت "خاتون مشرق" کا نصب العین تھا۔ مئی جون ۱۹۴۹ء میں اسکا "اقبال نمبر" شائع ہوا۔ "خاتون مشرق" اپنا کوئی منفرد نقش قائم نہیں کر سکا۔

"حجاب" ۔ کراچی

کراچی سے نومبر ۱۹۴۸ء میں صغیرہ خاتون حسرت نے ماہ نامہ "حجاب" نکالا۔ ان کے پیش نظر خواتین کے ذوق کی پرورش اور ادب کی اشاعت تھی لیکن اسے زیادہ تعاون حاصل نہ ہو سکا۔

"نشیمن" ۔

جنوری ۱۹۴۹ء میں مسرور فاطمہ خانم نے کراچی سے خواتین کا رسالہ "نشیمن" جاری کیا۔ یہ پرچہ اصلاحی رجحانات کا حامل تھا لیکن اس میں مقصد کو ادبی اسلوب میں پیش نہ کیا جا سکا۔ اس پرچے کی نثر و نظم کا معیار بھی کمزور تھا۔ اس لئے قبول عام حاصل نہ کر سکا۔

"عفت" ۔ لاہور

جنوری ۱۹۵۵ء میں لاہور سے ادارۂ خواتین کے زیر اہتمام ماہ نامہ "عفت" کا اجرا ہوا۔ اس کے ادارۂ تحریر میں عبدالوحید خان اور حمیدہ بیگم شامل تھیں۔ اس رسالے کا مقصد مسلم معاشرہ میں خواتین کے اعزاز و احترام کو اسلامی قدروں کے مطابق فروغ دینا تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ماہر القادری، امین احسن اصلاحی، کوثر نیازی، زیب عثمانیہ، سلمیٰ یاسمین نجمی، خلیل حامدی، ابن فرید، نثار فاطمہ کے مضامین کی اخلاقی جہت بالخصوص متاثر کرتی ہے۔ "عفت" کا سالنامہ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۴ء

کے مضامین میں سے خدیجہ مستور کا " عورت اور ظلم " قیوم نظامی کا " اسلام میں عورت کا مقام " شمسہ کرمانی کا " مسلمان عورتیں میدان جنگ میں " چند ایسے مضامین ہیں جن سے " عفت " کے مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"سہیلی" ۔ لائل پور

"سہیلی" کے نام سے ایک ماہ نامہ ۱۹۵۵ء میں لائل پور سے جاری ہوا اور دو سال کے بعد بند ہو گیا۔ پھر اسی نام سے یہ رسالہ ۱۹۷۳ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ لیکن اس دفعہ بھی یہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکا۔

"زینت" ۔ کراچی

کراچی کا رسالہ " زینت " معاشرتی ادبی اور اصلاحی پرچہ تھا۔ ۱۹۵۶ء میں اس کی ادارت عبدالرؤف عروج کرتے تھے۔ مئی جون ۱۹۵۷ء میں اس کا "جنگ آزادی نمبر ۱۸۵۷ء" شائع ہوا۔ کچھ عرصے کے تعطل کے بعد " زینت " کراچی دوبارہ مطلع ادب پر طلوع ہوا۔ اب اس کے مدیر شفاعت احمد تھے۔ ۱۹۶۷ء میں اس کی پہلی جلد مکمل ہوئی۔ اس کے بعد اشاعت بے قاعدہ ہو گئی۔ "زینت" نے خواتین کو ادب عالیہ سے روشناس کرانے کی کوشش کی اسے بعض بڑے ادبا کا تعاون بھی حاصل تھا۔ لیکن مسلسل اشاعت اسے نصیب نہ ہو سکی۔

"عکس نو" ۔ لاہور، کراچی

ماہ نامہ " عکس نو " مارچ ۱۹۵۶ء میں حسن زمانی عالمگیر کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس کے ابتدائی پرچوں میں سید وقار عظیم، حجاب امتیاز علی، حامد علی خان، عابد علی عابد، امتیاز علی تاج، قاضی محمد اسلم، شوکت تھانوی، عبدالرحمن چغتائی، کنہیا لعل کپور، بی اے ہاشمی جیسے ادبا کے نام نظر آتے ہیں اور ایک خاتون کے زیر ادارت چھپنے کے باوجود اس کی ادبی شان اور معیار اس دور کے دوسرے پرچوں سے کم نظر نہیں آتی، لیکن یہ معیار زیادہ دیر تک قائم نہ رکھا جا سکا اور اس میں ممتاز ادبا کے بجائے نئے لکھنے والوں کے نام اور تحریریں زیادہ نظر آنے لگیں، کچھ عرصے کے بعد "عکس نو" کراچی منتقل کر دیا

گیا اور اسے سالناموں کی اشاعت سے سنبھالا دینے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صوری اور معنوی خوبیاں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئیں اور ۱۹۷۱ء کے بعد اس کے اثر و عمل کا دائرہ محدود ہو گیا۔

"بانو" - لاہور

ماہنامہ "بانو" لاہور سے ۱۹۵۷ء میں محمد نعیم شرقپوری کی ادارت میں جاری ہوا ۔ یہ ادارہ "شمع" کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا اور خواتین کے مزاج کے مطابق حسن و آرائش کو پیش نظر رکھتا تھا۔ ہلکے پھلکے افسانے اور جذبات کو متاثر کرنے والی نظموں کو اس پرچے میں نمایاں طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اسلامی تعلیمات کو "بانو" نے فروغ دینے کی پوری کوشش کی اور یہی اس کی خصوصیات ہیں۔

"بتول" - لاہور

خواتین کا علمی ، ادبی اور اصلاحی جریدہ "بتول" نومبر ۱۹۵۷ء میں لاہور سے جاری ہوا ۔ اس کی مدیرہ حمیدہ بیگم اور صفیہ سلطانہ تھیں ۔ عفت موہانی ، ثریا بتول ، سلمیٰ یاسمین نجمی ، ام زبیر اور نیر بانو اس کے لکھنے والوں کی صف میں شامل ہیں۔ اس پرچے میں مولانا مودودی ، اسعد گیلانی ، اور مریم جمیلہ کے مضامین کو خصوصیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ "بتول" کا مقصد خواتین میں اسلامی تعلیمات و اصول تہذیب کو فروغ دینا ہے۔ تاہم غزل ، افسانہ اور نظم کے علاوہ تنقیدی مضامین کو بھی نمایاں جگہ دی جاتی تھی اور یوں "بتول" کو خواتین کے ادبی معاون کی حیثیت بھی حاصل ہے۔

"صبح نو" - راولپنڈی

سہ ماہی "صبح نو" راولپنڈی سے صفیہ شمیم ملیح آبادی کی ادارت میں ۱۹۵۸ء میں جاری ہوا ۔ یہ خالصتاً ادبی پرچہ تھا اور اس کے مندرجات میں مرد اور عورت کی امتیازی صنفی حیثیت کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کے پذیرائی عورتوں اور مردوں کے حلقوں میں یکساں طور پر ہوئی ۔ جون تا اگست ۱۹۵۸ء کے بعد اس کا کوئی پرچہ نہیں چھپا۔

"سفینہ" ۔ کراچی

ماہ نامہ "سفینہ" انجمن ترقی اردو خواتین پاکستان کا ادبی ترجمان تھا ۔ اس کے ادبی مشیر راغب مراد آبادی اور ظفر اقبال ظفر تھے ادارہ تحریر میں انیس راغب اور نفیس راغب کے نام نمایاں ہیں ۔ اس پرچے نے خواتین میں ادبی ذوق پیدا کرنے کی کاوش کی لیکن اس کے قلمی معاونین میں زیادہ تر مرد ادبا شریک نظر آتے ہیں ۔ "سفینہ" کا بہت سا حصہ راغب مراد آبادی لکھ ڈالتے تھے ۔ نمایاں قلم کاروں میں ضمیر جعفری ' احسان فاروقی ' سلطان زبیری ' جمیل نقوی ' سروری عرفان اللہ ' امید رضوی ' اختر نوگانوی شامل ہیں ۔ "سفینہ" نے جنوری ۱۹۶۰ء میں آغاز اشاعت کیا تھا ۔ ۱۹۶۴ء تک اس کے آثار حیات نمایاں نظر آتے ہیں ۔

"تہذیب" ۔ لاہور

ماہ نامہ "تہذیب" لاہور سے اپریل ' ۱۹۶۰ء میں شیخ نیاز احمد کے اہتمام سے جاری ہوا ۔ اس کی مدیرہ عصمت بشیر تھیں ۔ یہ معنوی طور پر خواتین کا معاشرتی اور ادبی جریدہ تھا ۔ اس میں عورتوں کی دلچسپی کے مضامین اور ان کی معاشرتی ضرورتوں کے مطابق فیچر پیش کئے جاتے تھے "تہذیب" اگرچہ خواتین کا رسالہ تھا لیکن اس میں ظفر عسکری ' شرون کمار ورما ' جون ایلیا ' محسن بھوپالی ' اکبر کاظمی ' روحی کنجاہی ' لطیف انور ' عظیم واسطی ' نثار ناسک ' اور اثر صہبائی جیسے ادبا بھی شرکت کرتے تھے ۔ مستقل عنوانات میں " ناقابل فراموش " اور " آپ بیتی " تھے ۔ " میں اکثر گنگناتی ہوں " میں خواتین کے پسندیدہ اشعار کا انتخاب پیش کیا جاتا تھا ۔ ۱۹۶۶ء میں عصمت بشیر کے ساتھ عشرت رحمانی بھی ادارت میں شامل ہیں لیکن اب پرچہ زوال آمادہ نظر آتا ہے ۔

"رباب" ۔ لاہور

ماہ نامہ " رباب " کی ادارت زبیدہ انصاری نے سرانجام دی ۔ یہ رسالہ جون ۱۹۶۴ء میں عورتوں کی خدمت کے جذبے سے میدان عمل میں آیا لیکن تھوڑے سے عرصے کے بعد ہی مطلع ادب سے غائب ہو گیا ۔

"العلیم" - کراچی

خواتین کا رسالہ "العلیم" کراچی سے دسمبر ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر فریدہ احمد کی ادارت میں جاری ہوا۔ "العلیم" نے جدید ادب کے ساتھ خواتین کو اسلام کی معاشرتی اقدار سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور ہر چمن سے گلہائے تازہ جمع کئے "العلیم" میں جہاں جوش ملیح آبادی کی نظمیں چھپیں وہیں وزیر آغا کا انشائیہ بھی شائع ہوا اور ابن صفی کے جاسوسی افسانے کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ "العلیم" نے خواتین کی ذہنی آبیاری کرنے کی کوشش کی لیکن یہ سلسلہ تادیر چل نہ سکا۔

"اخبار خواتین" - کراچی

"اخبار خواتین" کے نام سے ایک معلوماتی ادبی اور سماجی نوعیت کا ہفت روزہ مطبوعات مشرق کے زیر اہتمام کراچی سے فروری ۱۹۶۶ء میں جاری ہوا اس کے ابتدائی مدیران حسن عابدی اور ارشاد احمد خان تھے۔ لیکن اس کی نسوانی جہت کو ش۔ فرخ نے زیادہ استحکام دیا۔ "اخبار خواتین" عورتوں کا ایک مکمل میگزین ہے جس میں امور خانہ داری سے لے کر امور سیاست تک سب زیر بحث آتے ہیں، اس پرچے نے عہد حاضر کی خواتین میں افسانے، سفر نامے، نظمیں اور کالم لکھنے کا ذوق پیدا کیا اور پڑھی لکھی خواتین کو روشن خیال بنانے کی سعی کی۔ اخبار خواتین شاید عورتوں کا پہلا ہفت روزہ ہے جو تجارتی امور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے اور مضبوط مالی بنیادوں پر استوار ہے۔ گزشتہ ۲۲ سال سے یہ پابندی وقت سے شائع ہو رہا ہے اور خواتین کا کثیر الاشاعت ہفت روزہ شمار ہوتا ہے۔

"زینت" - سیالکوٹ

سیال کوٹ سے خواتین کے لئے ایک خوبصورت ماہنامہ جنوری ۱۹۶۷ء میں "زینت" جاری ہوا۔ اس کے مدیر اسلم ملک تھے۔ ان کی ادبی معاونت، طاہرہ ارشد، حمیدہ رضوی، بسمل شاہین اور محمودہ شیخ نے کی۔ "آغاز سفر" کے تحت اسلم ملک نے لکھا کہ:

"زینت" کے اجراء کا مقصد اردو ادب کو حقیقی طرز احساس میں پیش کرنا ہے اور ہم نے اس کے لئے ان ادیبوں کا تعاون حاصل کیا ہے جو اپنے تجربات سے سچائی کے ساتھ آنکھیں ملانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ انہیں کے تجربات کے اظہار سے ہم زندگی کو ایک نئی قوت آغاز دیں سکیں گے۔ "زینت"

کے مستقل عنوانات میں معاشرتی بہبود، اسلامیات، نفسیات، حکایات اور منظومات کے علاوہ صحت و زندگی اور خورد و نوش وغیرہ شامل تھے۔ اس پرچے نے رضیہ فصیح احمد، واجدہ تبسم، زہرہ نگاہ، زاہدہ صدیقی، عرفانہ عزیز، فہمیدہ ریاض، روحی کنجاہی، خدیجہ مستور، کشور ناہید، صدیقہ بیگم سیوہاروی، نجمہ انوار الحق، ادا جعفری، رشیدہ سلیم سیمیں، کا تعاون حاصل کیا اور اہل ادب کے سامنے اعلیٰ پائے کی تخلیقات اور مضامین اس طرح پیش کئے کہ "زینت" خواتین کا معیاری ادبی ماہ نامہ بن گیا لیکن چند سالوں کے بعد زیاں کا یہ کاروبار بند کر دیا گیا۔

"فخر خواتین" ۔ لاہور

ماہ نامہ "فخر خواتین" لاہور سے ستمبر ۱۹۷۰ء میں جاری ہوا ۔ اس کی مدیرہ فخر النساء تھیں، مجلس مشاورت میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، الطاف فاطمہ، اے حمید اور میرزا ادیب کے نام شامل ہیں، لیکن اس کی مزاج سازی میں ایم منشا چودہری کا عمل دخل زیادہ نظر آتا ہے۔ مس شمیم چودھری نے اس کی ادبی جہت مستحکم کرنے کی کوشش کی اور اے۔ حمید، قیوم راہی، آمنہ ابوالحسن، راحت بخی کے افسانوں اور احسان دانش، ناصر کاظمی، ساغر صدیقی اور شہزاد احمد کی منظومات سے پرچے کو سجانے کا کام لیا "فخر خواتین" کو ایک ایسا ماہ نامہ قرار دیا گیا جسے مرد بھی پڑھ سکتے تھے ۔ جون ۱۹۷۱ء کا پرچہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ مجوزہ مقاصد حاصل نہیں کر سکا اور اضمحلال اس پر طاری ہو گیا جو بالآخر بندش پر منتج ہوا۔

"چلمن" ۔ لاہور

ماہ نامہ "چلمن" لاہور سے عابدہ جعفر کی ادارت اور ظفر اللہ خان کی نگرانی میں جنوری ۱۹۷۰ء میں جاری ہوا ۔ اس پرچے نے خواتین کی ذہنی اور فکری بیداری کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی ۔ افسانوں اور نظموں میں اخلاقیات کے روشن زاویے پیش کئے۔ اس پرچے کو قبول عام حاصل ہوا اور خواتین کے ایک بڑے طبقے نے اس کے اثرات قبول کئے۔

"دوشیزہ" ۔ کراچی

کراچی سے ماہ نامہ " دوشیزہ " ۱۹۷۱ء میں جاری ہوا اس کے مدیر سید شان احمد تھے ۔ کچھ عرصے کے بعد مجلہ "درویش" بھی اس میں ضم کر دیا ۔ ماہ نامہ " دوشیزہ " نے تعلیم یافتہ خواتین کو ادبی اور تفریحی مواد فراہم کرنے کی کوشش کی۔

"آواز" ۔ کراچی

"آواز" فہمیدہ ریاض کا ماہ نامہ تھا جو کراچی سے ۱۹۷۳ء میں جاری ہوا ۔ " آواز " سیاسی نوعیت کا پرچہ تھا ' اس نے پاکستان کے سیاسی افق پر عورت کی آواز ابھارنے اور اسے بلند سماجی مقام دلانے کی جدوجہد کی ۔ " آواز " کی آزادہ روی اور آزادہ خیالی کو خوش نظری سے قبول نہیں کیا گیا ۔ جنوری فروری ۱۹۸۱ء کا شمارہ مشترکہ شائع ہوا ۔ اس کے بعد " آواز " کے آثار نظر نہیں آتے ۔

"آنگن" ۔ لاہور

ماہ نامہ "آنگن" لاہور افریشیا پبلی کیشنز کے زیر اہتمام مئی ۱۹۷۵ء میں جاری ہوا۔ اس کی مدیرہ اردو اور پنجابی کی ممتاز افسانہ نگار رفعت تھیں ۔ انہوں نے اس کی ادبی جہت کو نمایاں کرنے کی پوری کوشش کی اور اس کے ساتھ "آنگن" کو "زیب النساء" "حور" اور "حرم" کی طرح خواتین کا ایک نمائندہ رسالہ بنانے کے لئے اس میں مقبول عام سلسلے بھی جاری کیے۔ اس سے "آنگن" کو قبول عام تو حاصل ہو گیا' لیکن اس پر عمومیت غالب آگئی۔ جس سے اس کی انفرادیت بری طرح مجروح ہوئی۔
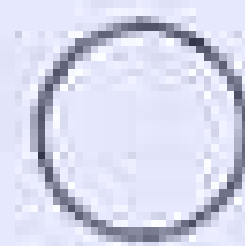
حوالہ جات

۱۔ "خطبات گارساں دتاسی" ص ۳۵۔ کراچی ۱۹۷۹ء

۲۔ ایضاً" ۔ ص ۴۱۷

۳۔ ایضاً" ۔ ص ۴۱۷

۴۔ مولانا امداد صابر "تاریخ صحافت اردو" جلد سوم۔ ص ۳۵۳

نواں باب

طنز و مزاح کے رسائل

گزشتہ اوراق میں لکھا جا چکا ہے کہ ادبی رسالہ عوام الناس کی ادبی ضرورتوں اور جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرنے کے علاوہ ان کے فکری افق کو وسیع کرتا اور ان کے ذہن کو نئی روشنی سے منور کرتا ہے۔ ادبی رسالہ تہذیب کی نشاۃ ثانیہ برپا کرنے کا وسیلہ بھی ہے' اس سے ذہنی انقلاب کی راہ بھی ہموار کی جا سکتی ہے' اور اس سے زمانے کے میلانات' سوچ کے دھارے' رجحانات کی افزائش اور تحریکوں کے فروغ و عمل کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ ادبی جریدہ نگاری ایک ایسا سنجیدہ عمل ہے جس کے مقاصد میں قومی اور بین الاقوامی اجتماعی شعور کو مرتب کرنا بھی شامل ہے لیکن یہ ایسا عمل ہے جس میں انسان ہمہ وقت مشین کی طرح مصروف نہیں رہ سکتا اور کبھی کبھی اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ پاسبان عقل سے دامن چھڑا کر زندگی کے مناظر و اشیا پر ایک مسکراتی نظر بھی ڈال سکے' فطرت اور انسان کی بوالعجبیوں پر ہنس سکے اور سنجیدہ مطالعے سے ابھرنے والے ٹھوس مسائل کی سنگلاخیت کو دور کرنے کے لئے جسم و جاں کو قہقہے کی تازہ آکسیجن فراہم کر سکے۔ وزیر آغا نے لکھا ہے کہ:

"انسان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سنجیدگی کو چند لمحات کے لئے ہی سہی' سانپ کی کینچلی کی طرح اتار پھینکتا ہے اور ہنسی جیسے خالص حیاتیاتی تعیش سے زندگی کی کھردری سطح کو ہموار کر لیتا ہے۔" (۱)

اور یوں وہ زندگی کے عمل میں شامل ہونے اور ادب کے نکات و رموز پر غور کرنے کے لئے تازہ دم ہو جاتا ہے۔

ادبی رسائل کے مدیران نے قارئین کی اس تفریحی ضرورت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ وہ سنجیدہ ادب سے جو تہذیبی مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے پھولوں کی ایک ایسی پگڈنڈی تیار کرنا بھی ضروری ہے جس پر چل کر قارئین تھکاوٹ کے بجائے تازگی اور لطافت محسوس کریں۔ چنانچہ ادبی صحیفہ نگاری کے ہر دور میں سنجیدہ مسائل نے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا اور اس قسم کے مضامین نثر و نظم کو اتنا پسند کیا گیا کہ طنز و مزاح کے علیحدہ

رسائل جاری کرنے کی ضرورت بھی محسوس کی جانے لگی۔ زیر نظر باب میں اردو کے ایسے رسائل کا تذکرہ و تجزیہ مقصود ہے جنھوں نے ملک و قوم میں مسکراہٹیں تقسیم کرنے کا فریضہ اختیار کیا اور روتے بسورتے لوگوں کو چند لمحوں کے لئے تازگی' لطافت اور طراوت عطا کی۔ ان رسائل نے ادبی مزاح کو صحافتی مزاح سے علیحدہ پنپنے کا موقعہ دیا اور ہنگامی ناہمواریوں کے مقابلے میں ایسی انسانی حماقتوں کو موضوع اظہار بنایا جن سے پیدا ہونے والی شگفتگی سدا بہار تھی۔

طنزیہ و مزاحیہ صحافت کا پس منظر

یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ ادب پارے کے داخلی نظام میں طنز و مزاح سے پیدا ہونے والی لطافت ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ طنز و مزاح کے اس قسم کے مظاہر ہر زبان اور ہر دور کے ادب میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ انیسویں صدی میں "اودھ پنچ" کا اجرا ہوا تو اس نے مزاح اور طنز کو مقصد نظر بنانے کی کوشش کی' سماجی ناہمواریوں' قدامت پرستی اور مغرب کی کورانہ تقلید پر ایسی شدید ضرب لگائی کہ بے اعتدالیاں روشن ہو گئیں اور قہقہوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ "اودھ پنچ" ۱۸۷۷ء میں منظر عام پر آیا تھا' یہ شدید رد عمل کا پرچہ تھا۔ اس کا مقصد اس خس و خاشاک کو دور کرنا تھا جو انگریزی تہذیب کے فروغ سے مشرق کے معاشرے میں افراط سے پیدا ہو رہا تھا۔ "اودھ پنچ" کے مدیر سجاد حسین خود بھی مزاح نگار تھے اور انھوں نے شاعروں اور مضمون نگاروں کا ایک ایسا مؤثر حلقہ بھی پیدا کیا جو طنز و مزاح کے جملہ حربے استعمال کرنے میں طاق تھا۔ اس جریدے سے اکبر الہ آبادی' رتن ناتھ سرشار' عبدالغفور شہباز' تربھون ناتھ ہجر' احمد علی شوق' جوالا پرشاد برق' نواب محمد آزاد اور احمد علی کسمنڈوی جیسے مزاح نگار منظر عام پر آئے۔ ان ادبا نے موازنہ' مبالغہ' تحریف' رمز' رعایت لفظی' مزاحیہ کردار' صورت واقعہ' پھبتی' ہجو استہزا تک سب حربے بقدر ذوق و ظرف استعمال کئے اور جہاں اپنے مخالفین کو تہ تیغ کرنے کی کوشش کی وہاں قارئین کو ظرافت طبع کا سامان بھی فراہم کیا اور رائے عامہ کو منقلب کرنے کی سعی بھی کی "اودھ پنچ" کا لہجہ درشت' اور وار تیکھا تھا۔ اس نے زہرناکی اور جوابی حملے کا قاتلانہ انداز اختیار کیا اور اکثر اوقات کردار شکنی کے حربے کو بھی استعمال کیا۔ تاہم "اودھ پنچ" کی اس عطا سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے ایک شکست خوردہ قوم کو اپنی حالت زار دیکھنے اور پھر اسی پر قہقہہ لگانے کا حوصلہ دیا۔ پنچ نے طنز و مزاح کا معیار تو بلند نہیں کیا لیکن اسے ایک باقاعدہ فن کا درجہ دیا اور خبری صحافت میں طنز و مزاح پر مبنی صحافت کی طرح ڈالی "اودھ پنچ" اردو کا پہلا اخبار ہے جس نے طنز و مزاح کو مقصود اشاعت قرار دیا۔ طنز و مزاح لکھنے

والوں کی ایک جماعت پیدا کی اور طنز و مزاح کے مختلف اماثل کو فروغ دیا۔ "اودھ پنچ" کی اس تاریخی اہمیت کا اعتراف ہر دور میں کیا گیا ہے۔

"اودھ پنچ" کی اس تاریخی حیثیت کے علی الرغم یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اس کی اشاعت میں مغرب کے طنزیہ مزاحیہ رسائل کی تقلید کا رجحان غالب موجود تھا اور اسے انگریزی کے "پنچ" اخبار کا طرز دینے کی کوشش کی گئی۔ اس قسم کا ایک اخبار "روہیل کھنڈ پنچ" ۱۸۷۶ء میں مراد آباد سے جاری ہوا۔ اس ہفتہ وار اخبار کی ادارت منشی مہدی حسن کرتے تھے۔ یہ ظریف و لطیف پرچہ دل لگی کے تازہ بہ تازہ مضامین سے آراستہ ہو کر چھپتا اور پڑھنے والوں کو گل کی طرح کھلا دیتا۔ منشی مہدی حسن نے لکھا ہے کہ:

"ان کا نکتہ نکتہ، لفظ لفظ اپنے حسن مذاق سے تہذیب کے پیرایہ میں روتوں کو ہنساتا اور سوتوں کو جگاتا ہے" "بہار پنچ" کے نام سے ایک اور ہفتہ وار اخبار پٹنہ سے نو روز علی خان شیدا نے ۲۶ نومبر ۱۸۷۶ء کو جاری کیا۔ یہ رسالہ آٹھ صفحات پر چھپتا تھا۔ یہ رسالہ "روہیل کھنڈ پنچ" اور "بہار پنچ" کا پیش رو قرار دیا جا سکتا ہے۔ طنز و مزاح ان رسائل کا بھی مقصود تھا اور یہ روتوں کا ہنسانے کی خدمت بھی سر انجام دیتے تھے، لیکن ان کا دائرۂ اثر و عمل زیادہ وسیع نہیں، دوسرے جس شدت سے "اودھ پنچ" نے رد عمل کا اظہار کیا اور حقیقت کے سنجیدہ روپ کو قہقہے سے منقلب کرنے کی کوشش کی وہ اس دور کے دوسرے اخبارات میں نظر نہیں آتا۔ "اودھ پنچ" کی روش اگرچہ قدرے غیر صحت مند اور منفی تھی لیکن اس کا دائرہ اثر وسیع تھا اور اس کی کامیابی حیران کن تھی، اس کی تقلید بھی بڑے پیمانے پر ہوئی، چنانچہ لکھنؤ سے "سرپنچ ہند" (یکم ستمبر ۱۸۷۷ء)۔ کلکتہ سے "کلکتہ پنچ" (یکم جنوری ۱۸۷۹ء)۔ "انڈین پنچ" لکھنؤ سے (یکم مئی ۱۸۸۰ء)۔ "بنگال پنچ" کلکتہ (یکم جولائی ۱۸۸۰ء)۔ "دہلی پنچ" لاہور (یکم جون ۱۸۸۰ء)۔ "میرٹھ پنچ" میرٹھ (۱۸۸۱ء)۔ "سرپنچ" سید پور (۱۰ ستمبر ۱۸۸۲ء)۔ "مہر ظرافت" لکھنؤ (یکم ستمبر ۱۸۸۲ء)۔ "فتنہ" گورکھ پور (۸ جولائی ۱۸۸۳ء)۔ ماہنامہ "شیخ چلی" سیالکوٹ (۶ اکتوبر ۱۸۸۵ء)۔ "ملا دو پیازہ" لاہور (یکم جنوری ۱۸۸۶ء)۔ "پاٹے خان"۔ لاہور (۶ جنوری ۱۸۸۶ء)۔ "تیس مار خان"۔ لاہور (۶ جنوری ۱۸۸۶ء)۔ "ظریف الہند" میرٹھ (۱ جنوری ۱۸۸۶ء) "موج ظرافت" ہوشنگ آباد (یکم مئی ۱۸۸۶ء)۔ "مذاق کا پہلا قدم" رام پور (مئی ۱۸۸۶ء)۔ "جعفر زٹلی" لاہور (۴ مارچ ۱۸۸۷ء)۔ "دہلی پنچ" دہلی (۸ جنوری ۱۸۹۵ء)۔ "بمبئی اودھ پنچ" بمبئی (۱۸۹۶ء)۔ "قنوج پنچ" فرخ آباد (۱۸۹۰ء) جاری ہوئے اور عوام کی سرگرانی دور کرنے کی سعی کرتے رہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں "مخزن" اور "زمانہ" جیسے رسائل نے سنجیدہ فکری کو فروغ دیا تھا۔ اس صدی کے ابتدائی عشرے میں طنزیہ مزاحیہ رسائل کی شدید کمی نظر آتی ہے۔ تا آنکہ لاہور سے "ظریف" جاری ہوا۔

ماہنامہ "ظریف" دسمبر ۱۹۱۳ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر پیر زادہ عبدالرشید تھے۔ اداریے میں مقصد اشاعت کے تحت لکھا گیا کہ:

"اصحاب علم اور کام دھندے والے لوگ جب اپنے اپنے کام سے فراغت پاتے ہیں تو ان کے دماغ کو تر و تازہ ہونے کے لیے کوئی نہ کوئی تدارک ہونا لابد ہوتا ہے۔ اس لئے شگفتگی طبع کا سامان مہیا کرنا ضروری ہے اور وہ سامان محض ظرافت اور خوش طبعی ہے جس کا مترادف زندہ دلی ہے.... کوئی پرچہ اور رسالہ اب موجود نہیں جس کا کام ہمہ تن یہی ڈیوٹی انجام دینا ہو۔ چونکہ یہ جگہ خالی تھی اور اس کا پر ہونا ضرورت تھا۔ اس لئے اس پر ملک نے "ظریف" کو مامور فرمایا۔"

"ظریف" کے معاونین میں مولانا گرامی، سید احمد دہلوی، حامد حسن قادری، محوی لکھنوی، خوشی محمد ناظر اور نذیر احمد صوفی کے نام اہم ہیں۔ ظریف کے پہلے پرچے میں مولانا گرامی، ڈاکٹر اقبال، شوق قدوائی، اور حکیم برہم نے شرکت کی ہے۔ اکبر الہ آبادی کے اشعار پر رنجور عظیم آبادی نے نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن "ظریف" انیسویں صدی کے مزاح سے بلند معیار پیدا نہیں کر سکا۔ اس کا معاشرتی مزاح تلخ نگاری کا نتیجہ ہے اور اس سے زہر خند پیدا ہوتا ہے۔

"شیرازہ" - لاہور

لاہور سے ادبی اور فکاہی ہفت روزہ "شیرازہ" اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام مولانا چراغ حسن حسرت نے ۱۹۳۱ء میں جاری کیا تھا "شیرازہ" کے اجرا کا مقصد مالی منفعت نہیں تھا۔ حسرت صاحب نے اس کی اشاعت کو اپنے ادبی شوق سے تعبیر کیا ہے، جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ "شیرازہ" اس جنون ہی کا عملی اظہار تھا۔ لیکن ابتدائی کامیابی کے باوجود اسے تسلسل اشاعت نصیب ہو سکا۔ ۱۹۳۹ء میں چراغ حسن حسرت دہلی چلے گئے، تو اس کی اشاعت رک گئی۔ ۱۹۴۱ء کو نیا پرچہ منظر عام پر آیا تو مولانا نے لکھا کہ "شیرازہ" کافی مدت کے بعد شائع ہو رہا ہے، اس غیر حاضری کی وجہ ظاہر ہے، ایک تو "شیرازہ" کے نام سے ہی پریشانی کو خاص مناسبت ہے۔ اس پر کاغذ کی کمیابی قیامت ہو گئی۔ اب بڑی مشکل کے بعد کچھ کاغذ ہاتھ آیا ہے۔"

کاغذ ہاتھ آجانے کے باوجود "شیرازہ" کی اشاعت ۱۹۴۱ء کے دوران بھی باقاعدہ نہ رکھی جا سکی اور اسی بے قاعدگی اشاعت میں "شیرازہ" ایک دن منظر ادب سے غائب ہو گیا۔

ادبی اور فکاہی جرائد میں "شیرازہ" کو ایک مثالی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس پرچے نے شائستہ مزاح اور سبک طنز کو فروغ دیا۔ اس کے لکھنے والوں میں مجید لاہوری، امتیاز علی تاج، محمد فاضل،

میراجی، ایس نصیر احمد، مہندر ناتھ، خضر تمیمی، ہری چند اختر، احمد ندیم قاسمی جیسے ادبا شامل تھے، محمد فاضل "بزم لطائف" آراستہ کرتے تھے۔ سید نصیر احمد "کتابیں اور آپ" کے عنوان سے اپنے مطالعے کا احوال لکھتے "شیرازہ" میں ایسی شگفتہ تحریروں کو فوقیت دی جاتی تھی جن میں افسانے کے عناصر موجود ہوتے تھے۔ یوسف خان کمبل پوش کا سفرنامہ "عجائبات فرنگ" کے کچھ حصے "شیرازہ" نے قسط وار پیش کئے، سند باد جہازی کے "اشارات" میں جو میٹھی سی چبھن ہوتی تھی اسے قارئین بہت پسند کرتے تھے۔ "شیرازہ" نے اردو شاعری میں "بے پرکی" کی صنف کو متعارف کرنے کی سعی بھی کی۔ اس کی مثال حسب ذیل ہے۔

آقا تقی کے باغ میں سونے کا تھال ہے   اخبار میں لکھا کہ کوا حلال ہے
آقا تقی کے باغ میں گٹھلی کھجور کی   بغداد بھیجی جائے گی میتھی قصور کی

قیاس ہے کہ اس قسم کی "بے پرکی" کے موجد سند باد جہازی تھے جو لس بابا کاشمیری کی کے نام سے بے پرکی شاعری کرتے تھے۔

طنز و مزاح کے رسائل آزادی کے بعد

"چاند"۔ لاہور

آزادی کے بعد حامد حسین وحشی مارہروی نے لاہور سے "میدان صحافت کا اکلوتا شہسوار ظرافت ماہنامہ "چاند" جاری کیا۔ اس کا بنیادی مقصد ارزاں تفریحی حربوں سے خلق خدا کو قہقہہ بار کرنا ہے۔ چنانچہ "چاند" عوام کا مقبول مزاحیہ جریدہ ہے۔ "چاند" نے پھبتی، ضلع جگت، ارزاں رعایت لفظی، لطیفہ اور کارٹون پر زیادہ انحصار کیا ہے۔ اکثر ابتذال اور سستا پن "چاند" میں شعوری طور پر در آتا ہے اور ذوق لطیف کو گراں بار کر دیتا ہے۔ "چاند" کا مزاح اوچھا اور کثیف ہے۔ لہٰذا اس کی ادبی حیثیت غیر متعین ہے۔

"نمکدان"۔ کراچی

۱۹۴۸ء میں جب پاکستانی قوم آبادیوں کے تبادلے سے پیدا ہونے والے فسادات اور قتل و غارت گری سے مغلوب تھی، تو مجید لاہوری نے قوم کا غم غلط کرنے اور اس کے داخل سے بے ساختہ

مسکراہٹوں کو بیدار کرنے کے لئے کراچی سے " نمکدان " جاری کیا۔ اس رسالے کا سب سے بڑا کردار خود مجید لاہوری تھے جو نظم و نثر میں طنز و مزاح کی پھل جھڑیاں چھوڑتے، معاشرتی ناہمواریوں پر سیدھی اور تیکھی طنز کرتے اور واقعات اس طرح بیان کرتے کہ مزاح پیدا ہو جاتا۔ اس عمل میں انہوں نے اپنے ساتھ مولانا عبدالمجید سالک، نذیر احمد شیخ، ضمیر جعفری، طفیل احمد جمالی، جاوید خٹک، فدائے ادب تونسوی، شفیع عقیل، فکر تونسوی، مسعود مفتی، اسد ملتانی، منظور انور قریشی، تجمل حسین، فیض لدھیانوی، عبدالعزیز فطرت اور اے۔ ڈی۔ اظہر کو بھی شریک کیا۔ " نمکدان" دیکھتے ہی دیکھتے عوام اور خواص کا مقبول عام جریدہ بن گیا۔ جون ۱۹۵۷ء میں مجید لاہوری انتقال کر گئے تو " نمکدان" مولانا عبدالمجید سالک کی نگرانی اور محمد ارشاد خان کی ادارت میں چھپنے لگا، لیکن مجید لاہوری کے خواہر زادہ محمد رفیق صاحب اسے زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رکھ سکے۔

" نمکدان" سیاسی بازی گری کے دور میں ایک صاف ستھرا مزاحیہ ادبی پرچہ تھا۔ اس نے نظم اور نثر کی اصناف میں معاشرتی بوالعجبیوں کو نشانہ طنز بنانے کی کوشش کی، مجید لاہوری نے " نمکدان" میں "سیٹھ ٹائر جی ٹیوب جی" ۔ "بنک جی بیلنس بھائی" کو نو دولتوں کا نمائندہ، "مولوی گلشیر محمد خان" کو سیاسی لیڈروں کا اور "رمضانی" کو عوام کا نمائندہ کردار بنا کر پیش کیا اور معاشرے کی عکاسی اس طرح کی کہ یہ مزاحیہ کردار مقبول خاص و عام ہو گئے۔ " نمکدان" کی ایک اور عطا اس کے سیاسی اور معاشرتی کارٹون ہیں جنہیں کارٹونسٹ نجمی بناتے تھے۔

"قہقہہ" ۔ لاہور

ماہنامہ "قہقہہ" لاہور سے جولائی ۱۹۶۲ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر محمود دہلوی تھے، "قہقہہ" کا مقصد مسکراہٹوں اور قہقہوں کو بیدار کرنا تھا۔ تاہم اس نے اپنے دامن میں راجہ مہدی علی خان، ضمیر جعفری، فکر تونسوی، شفیع عقیل، محمود سرحدی، قاضی عبدالغفار جیسے مزاح نگاروں کے مزاح پارے شامل کرنے کی کاوش بھی کی۔ "قہقہہ" نے بھی سستے اور عام فہم قہقہہ بار مزاح کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اسے عوام تک رسائی حاصل ہوئی اور یہ مقبولیت کی منزلیں آسانی سے طے کر گیا۔ تاہم اس کی ادبی افادیت محدود ہے اور یہ ذوق سلیم کی شائستہ انداز میں آبیاری نہیں کرتا۔

"زعفران" ۔ لاہور

طنز و مزاح کا ایک عمدہ ادبی جریدہ "زعفران" لاہور سے مئی ۱۹۷۲ء میں جاری ہوا ۔ اس کے مدیر مسئول ظفر اللہ خان تھے اور اسے ادارہ " اردو ڈائجسٹ " کی تجربہ کار ٹیم کی اعانت حاصل تھی۔ "زعفران" کی مزاحی جہت کو متعین کرنے میں مشکور حسین یاد نے زیادہ حصہ لیا۔ انہوں نے "زعفران" کو قہقہہ بار بنانے کی کوشش کی اور ہنسی کی جبلت کو باندازِ دگر اکسایا۔ "زعفران" کے مضامین موضوع کو توڑنے مروڑنے ' فریق مخالف پر اچانک پھبتی کی قرولی چلانے اور لفظ کو لغوی معانی سے الگ کر کے استعمال کرنے کا رجحان نمایاں تھا۔ اس سے قہقہہ تو پیدا ہو جاتا لیکن اکثر اوقات یہ برہمی بھی پیدا کر دیتا اور لطف اندوزی کا خالص جذبہ تضحیک کے نیچے دب جاتا۔ اس کے باوجود زعفران کے بعض تجربے بہت دلچسپ ہوتے تھے۔ اس میں ایک سلسلہ بے معنی اشعار کا جاری کیا گیا جو سحر سماعت پیدا کرتا لیکن معنی کی طرف لے جانے میں معاونت نہ ملتی کارٹون اور لطیفے سے بھی اس پرچے میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی لیکن کارٹون کی لکیریں ناپختہ ہوتیں اور طنزیہ جملہ مناسب کاٹ پیدا نہ کر سکتا۔ گمان غالب ہے کہ مزاح کی عدم شائستگی کی وجہ سے "زعفران" اپنا حلقہ وسیع نہ کر سکا اور اگست ۱۹۷۳ء کے بعد اس کی اشاعت معطل ہو گئی ۔ مشکور حسن یاد نے بعد میں اپنا ذاتی رسالہ "چشمک" جاری کیا جو "زعفران" ہی کا نقش ثانی تھا اور مدیر کے ذاتی مزاح کے آورد میں اپنا مقام نہ بنا سکا ۔

"اردو پنچ" ۔ راولپنڈی

راولپنڈی سے طنز و مزاح کا مخزن "اردو پنچ" ۱۹۸۱ء میں جاری ہوا ۔ مجلس ادارت میں سید ضمیر جعفری' کرنل محمد خان' ڈاکٹر صفدر محمود اور سلطان رشک شامل تھے' ان میں سے اول الذکر تین اصحاب نہ صرف طنز و مزاح کا شائستہ ذوق رکھتے ہیں بلکہ خود بھی اعلیٰ پائے کے صاحب اسلوب اور صاحب طرز انشا پرداز ہیں ' سلطان رشک "نیرنگ خیال" میں اپنی ادارتی صلاحیتوں کا سکہ منوا چکے ہیں۔ "اردو پنچ" کے انتظامی امور ان کے پاس ہیں' مدیران نے ظرافت کو بشاشت کا سرچشمہ قرار دیا اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ بعض گھروں میں ہجوم کے باوجود زندگی نہیں ہوتی "اردو پنچ" نے اس ہجوم کو زندگی آشنا کرنے کی سعی کی۔ اس پرچے نے مزاح سے رجائیت اور تحمل کے جذبے کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی اور ایسے تحریروں سے دانستہ اجتناب کیا جن سے غصہ یا تلخی پیدا ہونے کا

اندیشہ تھا۔ مدیران نے ”اردو پنچ“ کو ایک ہلکی پھلکی منظم، لذیذ اور مفید گپ شپ بنانے کا ارادہ کیا تو ان کے اس نیک عمل کو غلام جیلانی اصغر، مرزا ظفرالحسن، صبیح محسن، شفیق الرحمٰن، اسرار اشفاق، رام لعل نابھوی، ارشد میر، رشید نثار، فکر تونسوی، دلاور فگار، انور مسعود، بلبل کاشمیری، سرفراز شاہد، مسٹر دہلوی، سلمٰی یاسمین نجمی، رحیم گل اور میاں غلام قادر جیسے مزاح نگاروں نے جاری رکھنے میں بہت معاونت کی ”اردو پنچ“ ایک بے حد کامیاب مزاحیہ پرچہ ہے، لیکن یہ باقاعدگی سے شائع نہیں ہوتا۔ دوسرے ابتدائی پرچوں میں جو معیار قائم کیا گیا تھا وہ بعد کے پرچوں میں قائم نہیں رہ سکا۔ ”اردو پنچ“ کی خوبی یہ ہے کہ اس نے بعض ایسے ادیبوں کو بھی مزاح لکھنے پر آمادہ کیا جو پہلے سنجیدہ تحریروں کے لئے معروف و ممتاز تھے۔ شان الحق حقی، بلقیس ظفر، جمیل یوسف، عزیز ملک، شیر افضل جعفری چند ایسے ہی نام ہیں۔

”ظرافت“۔ حیدر آباد

دکھی انسانیت کو مسکراہٹیں اور قہقہے دینے کے لئے ماہ نامہ ”ظرافت“ حیدر آباد سے ۱۹۸۶ء میں جاری ہوا۔ ”ظرافت“ بزم ضیائے ادب (رجسٹرڈ) کا طنزیہ، مزاحیہ، ادبی اور زعفرانی جریدہ ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ ضیاء الحق قاسمی اور نگران اعلیٰ عطاء الحق قاسمی ہیں۔ اس پرچے میں اداریہ بالعموم شامل نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ واضح نہیں کہ مدیر گرامی اسے طنز و مزاح کی کس جہت میں لے جانے کے آرزو مند ہیں۔ ”ظرافت“ کو ضمیر جعفری، دلاور فگار، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر، احمد جمال پاشا، ابن الامام شفتر، سرفراز شاہد، کلیم جلیسری اور نیاز سواتی جیسے مزاح نگاروں کا تعاون حاصل ہے لیکن معیار چاند اور قہقہہ سے بلند نہیں، ”ظرافت“ نے لطیفے اور کارٹون سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ منظومات میں بھی گد گدی کرنے کا انداز نمایاں ہے، چنانچہ ظرافت پڑھ کر آپ قہقہہ تو لگا لیتے ہیں لیکن اس سے شائستہ آسودگی نہیں ہوتی اور مزاح مائل بہ تضحیک نظر آنے لگتا ہے۔

○

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا ”اردو ادب میں طنز و مزاح“ ص ۲۸۔ لاہور ۱۹۷۷ء

دسواں باب

چند تعلیمی اداروں کے ادبی مجلّے

تعلیمی اداروں کے ادبی مجلّے اگرچہ طلبہ اور اساتذہ کی غیر نصابی سرگرمیوں کے مظہر ہوتے ہیں لیکن انہیں طلبہ کی تعلیمی زندگی تہذیبی تربیت اور مذاق لطیف کی پرورش کا ایک لازمی جز و شمار کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری نے ان کے مقصد تصنیف و تالیف میں طلبہ کی تربیت اور تنقید و تحقیق میں ان کی رہنمائی بتایا ہے (ا) تعلیمی ادارے کا مجلّہ اس ادارے سے وابستہ طلبہ اور اساتذہ کے علمی و ادبی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ اس آئینہ میں ہم تعلیم و تدریس کے شعبے سے متعلق افراد کی علمی اور ادبی تحقیق کے خد و خال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں تو دوسری طرف طلبہ میں مختلف موضوعات اور مسائل پر غور و فکر کی عادت ڈالنے اور ان میں اظہار خیال کی قوت پیدا کر سکتے ہیں۔ تعلیم اداروں کے ادبی مجلّے نئے لکھنے والوں کے لئے گہوارے کا کام دیتے ہیں اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں، غزل، نظم اور افسانہ لکھنے کی ابتدائی تربیت کے لیے یہ مجلّے مؤثر وسیلہ ثابت ہوئے ہیں اور اس آئینے میں اکثر ہونہار بروائوں کے چکنے چکنے پات نظر آ جاتے ہیں۔ یہ مجلّے ایسی تجربہ گاہیں ثابت ہوتی ہیں جن میں نوخیز تصورات پرورش پاتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو ادب کی نئی روایت کا نقطہ آغاز ثابت ہوتے ہیں۔ اساتذہ کے مضامین سے طلبہ ادب کے اس بڑے سرچشمے سے اپنا رابطہ قائم کر سکتے ہیں جو مرور ایام کو سیراب کر رہا ہے اور جس کے چند چھینٹے طلبہ کی نم آلود مٹی سے بھی برگ وبار پیدا کر سکتے ہیں۔

ایک طویل عرصے تک تعلیم اداروں کے ادبی مجلوں کو صرف طلبہ کی تخلیقی سرگرمیوں ہی کا مظہر تصور کیا جاتا رہا اور ان کی ناپختہ اور ابتدائی تحریروں ہی سے مجلّے کا پیٹ بھرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اساتذہ کے مضامین اور تخلیقات قلیل تعداد میں محض تبرک کے طور پر شامل کئے جاتے تھے، لیکن اس حقیقت کو بہت جلد محسوس کر لیا گیا کہ طلبہ کی خام اور منتشر تحریروں کو قابل اشاعت بنانا، انہیں جانچنا، پرکھنا اور معیاری صورت دینا، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور یہ کام مجلّے کے طالب علم مدیر کے بس میں نہیں۔ مدیر کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ طلبہ کی معقول یا سرقہ شدہ تحریروں کی نشان دہی کر سکے، طلبہ کی خام تحریروں سے نہ تو ان کے ذوق کی پرورش ہوتی ہے اور نہ ان کی ادبی

تربیت صحت مند خطوط پر استوار کی جا سکتی ہے۔ کالج کا مجلّہ معین وقت پر اور مناسب وقفوں سے شائع نہیں ہوتا۔ یہ سال میں ایک یا دو دفعہ ہی منظر عام پر آتا ہے۔ اس لئے اس سے ایک باقاعدہ رسالے کے مقاصد حاصل کرنا بھی ممکن نہیں اس قسم کی مشکلات نے اس تصور کو فروغ دیا کہ کالج میگزین سے اگر علم و ادب کی خدمت کا کام بھی لیا جا سکے تو یہ مجلّہ کی ایک اضافی خوبی ہو گی اور اس سے طلبہ کو معیاری ادب اور ممتاز ادبا کی نئی تحریروں تک رسائی کا موقعہ بھی مل سکے گا۔ آزادی کے بعد بعض تجارتی اداروں نے ادب کو منفعت کا وسیلہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ یہ اشاعتی ادارے ایسی کتابوں اور مضامین کی اشاعت سے گریز کرنے لگے جن سے علم و ادب کی گراں بہا خدمت تو ہوتی تھی لیکن کتاب فوری نفع لانے سے قاصر رہتی تھی۔ اس کام کو تعلیمی اداروں کے مجلّات نے اسی خیال سے قبول کر لیا کہ علم و ادب کی ٹھوس خدمت کے لحاظ سے بھی ان اداروں کی نیک نامی میں اضافہ ہو۔ اب بعض نامور اداروں کے ایسے مجلّے منظر عام پر آنے لگے جو نہ صرف ادب کے لحاظ سے معیاری تھے بلکہ ان کی اپنی ایک مستقل حیثیت بھی تھی۔

آزادی سے قبل اس روایت کو علی گڑھ اور پنجاب یونیورسٹی نے پروان چڑھانے میں سرگرم حصہ لیا اور یہ تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔ علی گڑھ میگزین میں طلبہ کے ساتھ اساتذہ کثیر تعداد میں شریک ہوتے اور یوں اس پرچے کا ادبی معیار اتنا بلند ہو جاتا کہ ادبی حلقوں میں علی گڑھ میگزین کے مضامین کا چرچا وسیع پیمانے پر ہونے لگتا۔ اور ینٹل کالج میگزین اساتذہ کی تحقیقی سرگرمیوں کے لئے وقف تھا۔ اس میں طلبہ کے مضامین کی اشاعت نہیں ہوتی تھی۔ تاہم اس نے طلبہ کو تحقیق کی روایت سے مضبوط ناتہ قائم کرنے اور انہیں اپنی نصابی ضرورتوں کے لئے نیا تحقیقی مواد فراہم کرنے میں بڑی مدد دی، گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ " راوی " اور اسلامیہ کالج لاہور کے رسالہ "کریسنٹ" کی خدمات ادب بھی روشن اور قابل فخر ہیں۔ آزادی سے قبل ان رسائل نے طلبہ کی ادبی تربیت اور مزاج سازی میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور انہیں اب نئے کالجوں کے مجلوں کے لئے تابندہ مثال کی حیثیت حاصل ہے۔ آزادی کے بعد ہمیں کالجوں کی مجلّاتی صحافت میں ادبی پیش قدمی کی رفتار روز افزوں مائل بہ ارتقا نظر آتی ہے۔ غالب اور اقبال کی صد سالہ تقریبات پر متعدد کالجوں نے اپنے خصوصی شمارے پیش کئے، بعض تعلیمی اداروں نے مخصوص موضوعات پر گراں قدر کام کیا اور یہ کام خاص نمبروں میں پیش کیا گیا۔ بعض طالب علم مدیران نے اس دور کے ممتاز لکھنے والوں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور اساتذہ کے علاوہ ان ادبا کے مضامین اور تخلیقات سے پرچے کا ادبی زاویہ روشن کر دیا۔ اب کالج میگزین طلبہ کی تخلیقی سرگرمیوں ہی کا مرقع نہیں بلکہ یہ کتابی صورت کا ایک ادبی مجلّہ نظر آنے لگا ہے۔ زیر نظر باب میں چند ایسے مجلّات کا تذکرہ مقصود ہے جن کی

ادبی خدمات کا احاطہ وسیع ہے اور جو کالج کے ماحول کے علاوہ پورے ادبی منظر کو منور کرتے ہیں۔ اس قسم کے مجلوں کو ادبی پرچوں کی صف میں باآسانی جگہ دی جا سکتی ہے۔

"راوی" ۔ لاہور

گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی مجلہ "راوی" کا پہلا شمارہ ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا ۔ اس وقت انگریزی زبان کو رائج الوقت سکے کی حیثیت حاصل تھی ' اس لئے "راوی" میں اردو زبان کو داخلے کی اجازت نہ مل سکی ۔ پہلی دفعہ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے "راوی" میں دو اوراق اردو زبان میں شائع ہوئے لیکن ۱۹۱۶ء تک " راوی " پر مدیر کا نام اردو میں درج نہیں ہوا (۲) اکتوبر ۱۹۱۹ء کے پرچے کی ادارت احمد شاہ بخاری (پطرس) نے سرانجام دی ' اور اب ان کی ادارت سے " راوی " کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے ۔ " راوی " کے مدیران میں سے جو لوگ بعد میں ممتاز اور معروف ہوئے ان میں سے تاج محمد خیال ' شیخ محمد اکرام ' ن۔ م۔ راشد ' آغا عبدالحمید ' سید محمد جعفری ' ریاض الدین احمد ' ضیا جالندھری ' مظفر علی سید ' شہزاد احمد ' حنیف رامے ' انیس ناگی ' سرمد صہبائی ' اسد اللہ غالب ' وحید رضا بھٹی ' باصر سلطان کاظمی ' اجمل نیازی ' سراج منیر ' اور محمود شام کے نام بہت اہم ہیں ۔ "راوی" میں اردو زبان میں اظہار کی ابتدا دو صفحات سے ہوئی تھی لیکن مرورایام کے ساتھ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا اور بعض پرچوں میں اردو صفحات کی تعداد دو سو صفحات سے بھی تجاوز کر جاتی رہی "راوی" کے ان صفحات میں " تازہ واردان بساط ہوائے دل " کے ساتھ ساتھ پختہ فکر اور پختہ نظر ادبا کی تحریروں کو نمایاں اہتمام سے اشاعت دی جانے لگی اور اس میں ان شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات بھی شائع ہوئیں ' جنہیں گورنمنٹ کالج سے کبھی تعلیمی رابطہ نہیں رہا تھا ۔ اس سب کا فائدہ یہ ہوا کہ "راوی" کو گورنمنٹ کالج کا مجلہ ہونے کی باوصف ایک بلند اور مقتدر ادبی جریدہ بھی شمار کیا گیا ۔ اور اس میں افسانہ ' شاعری ' تنقید اور طنز و مزاح وغیرہ سب اصناف کو نمائندگی اور اہمیت دی گئی اور اہم بات یہ ہے کہ راوی کے پہلے دور کے بعض لکھنے والے بعد میں نہ صرف گورنمنٹ کالج کے اساتذہ میں شمار ہوئے بلکہ ان لوگوں نے لاہور کی علمی اور ادبی فضا پر بھی اپنے مستقل اثرات ثبت کئے اور انہیں اردو ادب میں بھی مقام امتیاز حاصل ہوا۔ چنانچہ علی گڑھ میگزین کی طرح "راوی" کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اردو ادب کو لاہور سے کثیر تعداد میں ادبا فراہم کئے اور یوں اردو ادب کی بیشتر اہم اصناف کا دامن گلہائے تازہ سے بھر دیا ۔ اس ضمن میں یہاں امتیاز علی تاج ' آغا بابر ' ڈاکٹر محمد اجمل ' پطرس ' الطاف گوہر ' جاوید اقبال ' اشفاق احمد ' آفتاب احمد ' داؤد رہبر ' صدیق کلیم ' غالب احمد ' شہزاد احمد '

جیلانی کامران، حفیظ ہوشیارپوری، منیر احمد شیخ، غالب احمد، ظفر اقبال، کشور ناہید، محمد صفدر، سعید اختر درانی، وزیر آغا، ریاض قادر، اختر احسن، محمد منور، معین الرحمٰن، صابر لودھی، قیوم نظر، وحید قریشی، اور عظیم مرتضٰی کے اسمائے گرامی مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ "راوی" کے دامن میں متعدد ایسے ادب پارے محفوظ ہیں جن کی حیثیت اب تاریخی نوادرات کی ہے۔ مثال کے طور پر حمید احمد خان کا مقالہ "اقبال کا شاعرانہ ارتقا" علامہ اقبال کی وفات کے صرف ایک ماہ بعد مئی جون ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں چھپا تھا۔ الطاف گوہر کا مقالہ "تخلیقی عمل" غلام یزدانی ملک کا "زانتو کا قصر نشاط" اور وحید قریشی کا "تنقید اور روایت" اب نایاب مقالات میں شمار ہوں گے حافظ عبدالمجید، ریاض تاثیر، میمونہ کلثوم، اور راحیل چند ایسے افسانہ نگار ہیں جو اب افسانے کی دنیا میں نظر نہیں آتے لیکن ان کے فن کا جوہر "راوی" میں موجود ہے شیخ محمد اکرام کا "عینک پوشوں کی کانفرنس" امداد حسین کا "ہمارے گھر کا حال" ڈاکٹر محمد اجمل کا "آہ، ہماری روایات"۔ محمد عارف کا "مباحثہ سننے کا فن" اور اقبال معین کا "کچھ فارغ البالی کے بارے میں" "راوی" میں مزاح نگار کے روپ میں موجود ہیں۔ علامہ اقبال نے مارچ اپریل ۱۹۳۲ء کے شمارے کے لئے اپنے ہاتھ سے مندرجہ ذیل شعر لکھ کر "راوی" کو عطا کیا۔

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگ دوام
خدا زکردہ خود شرمسار تو گردو

راجہ غضنفر علی خان اپنے تخلص "شوق" کے ساتھ "راوی" میں شعرا کی صف میں موجود ہیں۔ راشد کی سانیٹ "اے محبت" فیض احمد فیض کی "ہم لوگ" ایس اے رحمٰن کی "جوانی" م۔ حسن لطیفی کی "رقص" اور پطرس کی نظم "دو راہا" اب شائد "راوی" ہی میں دستیاب ہیں۔ آزادی کے بعد اردو غزل کے فروغ جدید اور ارتقائے نو کی تاریخ بھی "راوی" میں محفوظ ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ شہزاد احمد نے اسے کروٹ دینے کی ابتدائی کوشش کی تھی، اس کا زمانی نقش یوں بنتا ہے۔

تمنا انتظار دوست کے بعد
کلی جیسے کوئی مرجھا گئی ہو

ضیا جالندھری ۱۹۵۰ء

حسرت سے سحر کو دیکھتی ہے
وہ شمع جو رات بھر جلی ہے

شہزاد احمد ۱۹۵۱ء

ناخن کا رنگ ، ہونٹ کی لالی حنا کی آگ
اک لالہ زار تھا مری آنکھوں کے رو برو

ظفر اقبال ۱۹۵۴ء

ایک دلچسپ انکشاف یہ بھی "راوی" ہی سے ابھرا کہ "ایسّے" کو انشائے لطیف کے علاوہ انشائیہ کے نام سے موسوم کرنے کی کاوش مارچ ۱۹۲۵ء اور دسمبر ۱۹۳۴ء میں دو دفعہ کی گئی، لیکن اس نام کو چلن نصیب نہ ہو سکا اور انشائیہ کا مزاج پوری طرح نکھر کر سامنے نہ آیا۔

آزادی کے بعد "راوی" کو خاص نمبروں کی صورت دینے کا رجحان پیدا ہوا۔ اپریل ۱۹۶۹ء میں پروفیسر محمد منور مرزا کی نگرانی میں "راوی" کا "غالب نمبر" شائع ہوا جس میں ڈاکٹر سید عبداللہ، وقار عظیم، وزیر آغا، محمد اجمل، معین الرحمٰن، سجاد باقر رضوی، غلام الثقلین نقوی کے مضامین سے تازگی پیدا کی گئی۔ "راوی" کا "صد سالہ نمبر" اس لئے اہم ہے کہ اس میں "راوی" کے مضامین کا ایک کڑا انتخاب پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی نگرانی میں "پندرھویں صدی ہجری نمبر" اور ۱۹۸۳ء میں مشرف انصاری کی نگرانی میں "مولانا محمد حسین آزاد نمبر" شائع ہوا۔ اقبالیات کو راوی میں ایک غالب موضوع کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس میں اقبال پر اہم مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، اس ضمن میں مشرف انصاری کے مقالہ "اقبال کا نظریۂ فن" احمد مکرم کا "اقبال اور تہذیب مغرب" عبدالقیوم کا "اقبال اور نوجوان"۔ محمد عبداللہ قریشی کا "اقبال کی شاعرانہ عظمت" اور سید یوسف عرفان کا "اقبال اور تلاش ذات" کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ "راوی" کی ایک اور خصوصیت گورنمنٹ کالج کے اساتذہ کی شخصیت اور کارناموں کی یاد نگاری ہے مرزا محمد منور اور صابر لودھی صاحب نے مرحوم اساتذہ علاؤالدین کلیم، ڈاکٹر نذیر احمد اور میرزا ریاض پر دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر خاکے لکھے، قاضی فضل حق پر خصوصی گوشے کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

گذشتہ دو سالوں سے "راوی" صابر لودھی صاحب کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ انہوں نے اگرچہ طلبہ پر زیادہ انحصار کیا ہے تاہم مضامین نظم و نثر کے کڑے انتخاب اور اساتذہ کی شرکت سے اس کی ادبی عظمت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

"کریسنٹ" ۔ لاہور

تعلیمی اداروں کے ادبی مجلوں میں اسلامیہ کالج لاہور کے رسالہ "کریسنٹ" کو قدامت اور علمی متانت کا اعزاز حاصل ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی مجلّہ "راوی" کی طرح "کریسنٹ" نے

بھی نئے لکھنے والوں کے لئے شمع برداری کا فریضہ سرانجام دیا اور اس کے صفحات سے مستقبل کے متعدد نئے ادبا ابھر کر سامنے آئے۔ مثال کے طور پر ۱۹۲۹ء کے سالانہ نمبر میں ہمیں خضر تمیمی اور خلیل احمد قریشی بطور مدیر نظر آتے ہیں' اس پرچے کے طالب علم قلم کاروں میں محمود نظامی (سفر دہلی کی ایک رات) ابو تمیم فرید آبادی (کالج کا ایک دن) محمد اقبال (ہندوستان کی مشترکہ زبان)اور انور علی (مرحلے کے نام نمایاں ہیں۔

آزادی کے بعد کریسنٹ نے "شبلی نمبر" "حالی نمبر" اور "تاثیر نمبر" شائع کئے۔ یہ اعتراف عظمت کی مثالیں بھی تھیں اور ان میں متذکرہ نامور ادبا کے افکار و نظریات پر تنقیدی نظر ڈالنے کی کاوش بھی کی گئی اور چند ایسے مضامین بھی پیش کئے گئے جنہیں بعد میں ادبی حوالے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ "شبلی کا اسلوب بیان" ڈاکٹر وحید قریشی کا "شبلی کی سوانح نگاری" سید احتشام حسین کا "موازنہ انیس دوبیر" وقار عظیم کا "حالی کی قصہ گوئی" مولانا صلاح الدین احمد کا "حالی کا پیغام" حمید احمد خان کا "حالی دور جدید کا پہلا شاعر" اور ڈاکٹر وحید قریشی کا مقالہ "حالی کا قیام دہلی" اس قسم کے مقالات ہیں۔ کریسنٹ کے موضوعاتی خاص نمبروں کی ترتیب و تدوین میں پروفیسر خالد بزمی صاحب نے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ انہوں نے اساتذہ اور بڑے لکھنے والوں کے ساتھ طلبہ کو بھی اعتماد قلم عطا کیا۔ اس پرچے میں خالد شفیق اظہر سہیل' تبسم رضوانی' محمود شارب اور طفیل دارا کے ساتھ ہمیں متعدد طلبہ بھی مصروف تخلیق نظر آتے ہیں۔ ان میں منظور عزمی' ریاض قدیر' وحید اطہر' عشرت زیدی' ذکی الخیری' قمر رضا' عارف مشتاق' اور اظہر علی انجم کی تخلیقات متاثر کرنے والی تخلیقات ہیں۔

"نوید صبح"۔ "ضیا بار"۔ سرگودھا

"نوید صبح" گورنمنٹ کالج سرگودھا کا ادبی مجلّہ ہے جو کم و بیش پندرہ برس (۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۹ء) تک "ضیا بار" کے نام سے چھپتا رہا تھا۔ یہ دونوں نام بنیادی طور پر ڈیمونٹ مورنسی کالج شاہ پور (سرگودھا) کے مجلّہ "ڈان" سے اخذ کئے گئے تھے' ان پرچوں کو علمی اور ادبی وقار عطا کرنے اور طلبہ کے مضامین کو بلند معیار بنانے میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر' میرزا ریاض' ڈاکٹر خورشید رضوی' ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی' سجاد نقوی' صاحبزادہ عبدالرسول اور ڈاکٹر محمد انور چودہری کا بہت حصہ ہے۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا نے مطالعات اقبال میں ہمیشہ گہری دلچسپی لی اس کالج کے مجلّہ نے اقبال کے سال پیدائش کو ان کی یاد کے لئے وقف کرنے کی تحریک پیدا کی اور ۱۹۷۳ء میں جشن صد سالہ منانے کے علاوہ "ضیا

بار" کا "اقبال نمبر" رفیع الدین ہاشمی کی نگرانی میں شائع کیا۔ اس سے قبل ایک "اقبال نمبر" میرزا ریاض کی نگرانی میں بھی چھپ چکا تھا۔ "ضیابار" کا دوسرا "اقبال نمبر" نومبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا اور اس میں اقبالیات پر سرگودہا کے ادیبوں کے تنقیدی کام پر ایک خصوصی گوشہ مرتب کیا گیا۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں اس کالج کا مجلّہ "نوید صبح" "ہجرہ نمبر" کے عنوان سے چھپا۔ "نوید صبح" کی ایک اور یادگار دستاویز "پچاس سالہ نمبر" ہے جو ۱۹۲۹ء تا ۱۹۷۹ء تک کالج کی علمی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔

"ضیا بار" اور "نوید صبح" بظاہر ایک دور افتادہ ضلع کا مجلّہ ہے لیکن اس کے مدیران نے حمید احمد خان، ڈاکٹر عابد احمد علی، ڈاکٹر وزیر آغا، بشیر احمد ڈار، محمد منور، رحیم بخش شاہین، محمد حنیف شاہد جیسے ادبا کا تعاون حاصل کیا اور معرکہ آرا اقبال نمبر شائع کئے۔

"المنار" - ربوہ

"المنار"۔ ربوہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے زیر اہتمام ۱۹۵۰ء سے شائع ہو رہا ہے۔ ابتدا میں "المنار" طلبہ اور اساتذہ کے مضامین کو فوقیت دیتا تھا اور انتخاب مضامین میں مذہبی زاویے کو اہمیت حاصل تھی لیکن ۱۹۷۶ء کے بعد "المنار" کا مزاج تبدیل ہو گیا اور اب اس میں طلبہ کی ذہنی اور ادبی تربیت کے لئے ممتاز اور نامور ادبا کی تخلیقات کو بھی اشاعت دی جانے لگی۔ کالج میگزینوں میں "المنار" کو ایک باقاعدہ ادبی رسالے کی حیثیت حاصل ہے۔

"میگزین" - کراچی

۱۹۵۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے "میگزین" جاری کیا گیا تو اس کی اہمیت کو جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی تاریخوں کے حوالے سے اس سال کا اہم واقعہ شمار کیا گیا۔ اس کے نگران ابواللیث صدیقی تھے اور ادارہ تحریر میں خواجہ تہور حسین، ابن انشا اور مشفق خواجہ کے نام نظر آتے ہیں "اشاریہ" میں لکھا گیا کہ:۔

"میگزین" کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ یونیورسٹی کے وہ طلبہ جو علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں درجہ فضیلت حاصل کر رہے ہیں یا علمی تحقیق میں مصروف ہیں ان کے افکار اور خیالات جن کے افکار کے لئے ان کی قومی زبان اردو' اختیار کی گئی ہے' اس میں شائع کیے جائیں"

" میگزین " کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں کراچی یونیورسٹی کے اساتذہ کے مضامین کی شمولیت سے معیار بلند نہیں کیا گیا بلکہ طلبہ کے مضامین سے اس کی معیار بندی کی گئی ہے۔ یہ طلبہ ایسے ہیں جو اس دور میں ادب کی ابتدائی منزل میں تھے لیکن اب علمی و ادبی حلقوں میں ممتاز اور

صاحب فکرو نظر تسلیم کئے جاتے ہیں ' ان میں اسلم فرخی ابن انشا ' مشفق خواجہ ' مہتاب ظفر ' اطہر صدیقی ' اخلاق اختر حمیدی ' شمیم جاوید ' ضمیر اظہر اور خواجہ تہور حسین کے نام اہم ہیں ۔ "میگزین" کا مقالات کا حصہ بہت وقیع ہے اس میں بیگم آصف جہاں کا مقالہ " سید احمد خان کے مذہبی خیالات کا تجزیہ " سعیدہ آصف علوی کا " اقبال کی تنقید اشتراکیت پر " خواجہ تہور حسین کا " ظفر کی شاعری " ابو سعید نور الدین کا " اقبال اور مولانا رومی " شامل ہیں ۔ یہ بے حد خیال انگیز مقالات ہیں ۔ سیدین زیدی کا رپورتاژ " مری میں ایک دن " بھی اسی صنف میں خاصے کی چیز ہے ۔

"انجمن" ۔ کراچی

ماہ نامہ " انجمن " کے نام سے ایک علمی ' ادبی اور تعلیمی ماہ نامہ مفتی انتظام اللہ شہابی کے زیر اہتمام انجمن اسلامیہ کراچی نے ۱۹۵۸ء میں جاری کیا ۔ ابتدا میں اس کی حیثیت ایک سکول میگزین کی تھی اور اس میں چند بڑے ادیبوں ' احسان الحق فاروقی ' انتظام اللہ شہابی ' ریاض الدین احمد ' ابوالحسن ندوی ' ابن فرید اور فروغ علوی کے مضامین کے ساتھ طلباء کے مضامین بھی شریک اشاعت کئے جاتے تھے ۔ مفتی صاحب کی وفات کے بعد اس کی ادارت پہلے صبا اکبر آبادی نے اور بعد میں ریاض الدین احمد نے سرانجام دی ۔ اگست ۱۹۷۳ء میں اسے ایک ادبی جریدہ بنانے کی کاوش کی گئی اور طلبہ کا حصہ محذوف کر دیا گیا ۔ اس دور میں عصمت چغتائی ' مظہر صدیقی ' ابن انشا ' وقار عظیم ' کوثر چاند پوری ' مشرف انصاری کے مضامین بالالتزام شائع کئے گئے ' ۱۹۷۴ء میں " انجمن " کا "عید نمبر" اور "قرآن نمبر" شائع ہوئے ۔ کتابت و طباعت کے لحاظ سے " انجمن " غرابت کا شکار تھا اس لئے زیادہ توجہ حاصل نہیں کر سکا ۔

"بیکن" ۔ لائل پور

"بیکن" گورنمنٹ کالج لائل پور کا ادبی مجلہ ہے ۔ ۱۹۶۱ء میں بیکن کا ایک یادگار "مقالات نمبر" منظور حسین شور کی نگرانی اور نیاز احمد کی ادارت میں شائع ہوا ۔ اس پرچے میں کرامت حسین جعفری کا مقالہ " اقبال کا فلسفہ مذہب " افتخار احمد چشتی کا " اقبال اور تحریک پاکستان " مرزا محمد منور کا " بہادر شاہ ظفر اور استاد ذوق " حفیظ الرحمن احسن کا "المتنبی اور اس کی شاعری" چند عمدہ مقالات ہیں۔ "بیکن" کے مضامین کا ایک عمدہ انتخاب ریاض مجید صاحب نے "روشنی" کے نام سے شائع کیا ہے۔

"مرّے کالج میگزین"

"مرّے کالج میگزین" یوں تو مرّے کالج کی علمی سرگرمیوں کا نقیب تھا اور سال میں صرف ایک بار چھپتا تھا لیکن ۱۹۵۵ء میں حفیظ الرحمٰن احسن کی ادارت میں اس پرچے نے ایک باقاعدہ ادبی ماہ نامے کی صورت اختیار کر لی اور ایک سال کے دوران "مرے کالج میگزین" کے پانچ پرچے مسلسل شائع ہوئے۔ ان پرچوں میں آسی ضیائی رامپوری، امین جاوید، ممتاز حسین گیلانی، افضل رندھاوا، عارف رضا، صوفی محمد اشرف اور پروفیسر سید لیاقت حسین کے مضامین نظم و نثر بے حد وقیع ہیں "مرّے کالج میگزین" اپنے اس ادبی مزاج کو آئندہ سالوں کے دوران قائم نہ رکھ سکا۔

"فاران" ـ لاہور

"فاران" اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور کے طلبہ کا علمی و ادبی ترجمان ہے۔ ایک با اختیار ادارے کی حیثیت میں اس کالج نے اپنا سفر تدریس و تعلیم ۱۹۵۸ء میں جاری کیا تھا۔ "فاران" کی اولین اشاعت ۱۹۵۹ء میں ہوئی۔ ۱۹۸۶ء میں "فاران" کا ایک خصوصی اور ضخیم شمارہ "جوبلی نمبر" کے نام سے شائع ہوا اور اس میں گذشتہ پچیس سالوں کے روز و شب کا احوال درج کرنے کے علاوہ "فاران" کی ادبی سرگرمیوں کا احاطہ بھی کیا گیا "فاران" نے نوجوانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو صیقل کیا اور متعدد نامور ادبا اور شعرا نے "فاران" کے وسیلے سے نئی نسل کے ساتھ اپنا ادبی رابطہ قائم کیا۔ سیف اللہ خالد کا یہ خیال درست ہے کہ "فاران" کی بلند پایہ تخلیقات دنیائے فکر و فن میں لائق تحسین ٹھہریں اور "کریسنٹ" اور "راوی" کی طرح "فاران" نے بھی اپنی ایک مخصوص روایت کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔

"فاران" کا پہلا پرچہ عاصم حیات نے مرتّب کیا تھا اس کی ادارت کا اعزاز بعد میں راؤ ارشاد علی خان، تبسم کاشمیری، مشتاق باسط، الطاف احمد قریشی، ناصر زیدی، تنویر ظہور، علی ظہیر منہاس اور فرخ عباس کو حاصل ہوا۔ "فاران" کے پرچوں میں حمید احمد خان "غالب کی شخصیت" وحید قریشی کا "غالب کا ایک شعر" جیلانی کامران کا "اردو غزل کا مستقبل" سجاد باقر رضوی کا "میرا جی کے گیت" اختر اقبال کمالی کا "قومی زبان کا مسئلہ" یوسف جمال انصاری کا "غالب اور نفسیات" کے مقالات محفوظ ہیں۔ "فاران" نے اقبال اور غالب شناسی کو خصوصی اہمیت دی اور متعدد پرچوں میں ان دو شعرا پر نئے

زاویوں سے مضامین پیش کئے۔ مارچ ۱۹۷۵ء کی اشاعت پروفیسر حمید احمد خان کے لئے مختص کی گئی اور اس میں یوسف جمال انصاری، عبدالحفیظ کاردار، اختر اقبال کمالی اور ابوبکر غزنوی کے مضامین پیش کئے گئے، حالیہ دور میں پروفیسر سیف اللہ خالد "فاران" کی ادبی جہت کے نگران ہیں۔ انہوں نے "فاران" کا "سلور جوبلی نمبر" پیش کر کے اس مجلّے کے وقار اور معیار میں گراں قدر اضافہ کر دیا ہے۔ "فاران" کے خصوصی شماروں میں "سیرت نمبر" اور "ہجرت نمبر" شامل ہیں۔

"پینکوما" ۔ لاہور

انجینئرنگ کالج لاہور نے ۱۹۵۹ء میں "پینکوما" کے نام سے ادبی مجلّہ پیش کیا جس کے مدیر خالد سلیم تھے۔ اس کے مضامین میں "اقبال کا نظریہ خودی" از علم الدین مقبول "تہذیب اسلامی" فضل احمد اور "امن عالم اور اسلام" غلام احمد عبداللہ قابل ذکر ہیں۔

"تعمیر نو" ۔ کراچی

رسالہ "تعمیر نو" اردو کالج کراچی کے "کل پاکستان اردو متحدہ محاذ" کا ترجمان تھا۔ اس کے نگران اعلیٰ آفتاب زبیری تھے اور مدیران محمد عمر صدیقی اور اشرف علی۔ "تعمیر نو" کا "بابائے اردو نمبر" ۶۳ - ۱۹۶۲ء اور "تحریک پاکستان نمبر" ۱۹۶۴ء خاص اشاعتیں ہیں۔

"سچل" ۔ حیدر آباد

حیدر آباد سے "سچل" سرمست کالج میگزین ۱۹۶۳ء میں ایک ضخیم سالنامے کی صورت میں شائع ہوا۔ اس کے سرپرست این داؤد پوتہ اور مدیر عبدالحسین تکرائی تھے، اس پرچے میں سندھی تخلیقات کے ساتھ اردو کی چند وقیع تخلیقات بھی شامل کی گئی ہیں۔

"برگ گل" کراچی

"برگ گل" اردو کالج کراچی کا ادبی مجلّہ تھا جس کے نگران حبیب اللہ غضنفر اور آفتاب زبیری

تھے، اس کا ایک یادگار مجلّہ "بابائے اردو نمبر" ہے جو ۱۹۶۳ء میں امراؤ طارق، متین الرحمٰن مرتضیٰ، جمیل احمد صدیقی اور عذرا کیفی نے مرتب کیا۔ اس پرچے کا ایک حصہ بابائے اردو پر انعامی مضامین کے لئے مختص تھا۔ لیکن مضامین کا زیادہ حصہ نامور ادبا نے مکمل کیا۔ ان میں ممتاز حسین، رفیق خاور، خان رشید، عباس احمد عباسی محمد ایوب اولیا کے مضامین اور اثر لکھنوی، شاد عارفی، سلام مچھلی شہری، جگن ناتھ آزاد اور رئیس امروہوی کی منظومات خراج عقیدت کی عمدہ مثالیں ہیں۔ "برگ گل" نے ایک ضخیم نمبر ۱۹۶۰ء میں "انقلاب اور فلسفہ انقلاب" کے موضوع پر پیش کیا اور اسے صدر ایوب خان کے نام سے منسوب کیا۔

"محور"۔ لاہور

"محور" پنجاب یونیورسٹی کا اردو مجلّہ ہے جسے شائع کرنے کا اہتمام سٹوڈنٹس یونین کرتی ہے۔ ابتدا میں التزام یہ رکھا گیا کہ "محور" طلبہ کا اپنا رسالہ ہو گا اور طلبہ اپنی تحریریں اس پرچے میں آزادی سے چھپوا سکیں گے لیکن کچھ عرصے کے بعد اس میں اساتذہ اور ممتاز ادبا کی شرکت بھی ضروری سمجھی جانے لگی اور "محور" ایسا پرچہ بن گیا جس میں ذہین طلبہ کے نئے تجربات کو فوقیت حاصل تھی۔ ڈاکٹر محمد اجمل، سید وقار عظیم، مختار صدیقی، عارف عبدالمتین، سجاد باقر رضوی، وزیر آغا، جیلانی کامران، افتخار جالب، اعجاز بٹالوی، سرمد صہبائی اور منیر نیازی جیسے ممتاز ادبا کی تخلیقات "محور" میں شامل کی جانے لگیں "محور" کے طالب علم مدیران میں ظفر صمدانی، صفدر سلیم، احمد یوسفی، انیس ناگی، ارشاد حسین کاظمی، افضل حسین علوی، رفیع الدین ہاشمی، عبدالغنی فاروق، امجد اسلام امجد، عطار الحق قاسمی، محمد جلیل عالی اور گلزار وفا چودھری کے نام اہم ہیں۔ اس کے صفحات سے محمود شام، گوہر نوشاہی، عقیل روبی، ریاض مجید، سہیل احمد خان، سعادت سعید، فہیم جوزی، اسلم انصاری، نوید انجم، وقار بن الٰہی، صفدر علی، ثنا شاکر، خورشید زہرا، خالد شیرازی، راشد حسن رانا، نسرین انجم بھٹی، عبداللطیف اختر اور سید سرفراز احمد کی تحریریں منظر عام پر آئیں۔ "محور" کا "جشن صد سالہ نمبر" اس کی ایک ضخیم اور معرکہ آرا اشاعت ہے۔

"مجلّہ اسلامیہ" بہاولپور

۱۹۶۳ء میں بہاولپور جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو اس کی ادبی، علمی اور فکری سر

گرمیوں کی اشاعت کے لئے ایک مجلّے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی ' چنانچہ ۱۹۶۴ء میں ایک سہ ماہی "مجلّہ" کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا ' جس کا پہلا شمارہ ڈاکٹر حامد حسین بلگرامی نے شائع کیا ۔ یہ "مجلّہ" ۱۹۶۹ء تک باقاعدہ چھپتا رہا اس کے بعد چار سال تک یہ عدم اشاعت کا شکار ہو گیا ۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں اس کا ایک شمارہ ڈاکٹر سلیم خان فارانی نے شائع کیا اس "مجلّہ" میں اسلامی موضوعات پر تحقیقی مضامین کے علاوہ نظمیں بھی پیش کی جاتی تھیں اس نے بہاولپور کے اکابر علمی کی خدمات کا تعارف کرانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

"برگ نو" ۔ لاہور

"برگ نو" دیال سنگھ کالج لاہور کا ادبی مجلّہ تھا جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ۔ اس کے نگران پروفیسر امجد الطاف تھے ۔ طلبہ میں سے مصلح الدین اور تقی شوق نے ادارت کے فرائض سرانجام دئے ۔ "برگ نو" پر ایک باوقار ادبی مجلّے کا گمان ہوتا ہے ۔ اس میں طلبہ کی شرکت محدود سی ہے اور زیادہ انحصار نامور ادبا پر کیا گیا ہے ۔ مولانا صلاح الدین احمد کا مقالہ "اقبال کا نوجوان" قیوم نظر کا "کچھ علم بیان کے بارے میں" غلام علی چودہری کا افسانہ "ایک سفر اور" عاشق محمد کی پیروڈی ' شاد امرتسری کا اوپیرا "سمسون و دلائلہ" شہرت بخاری ' اصغر سلیم ' وزیر آغا انجم ' رومانی اور منیر نیازی کی منظومات اس کی خاص چیزیں ہیں ۔ یہ پرچہ کتابی سائز ۴/۱-۴ x ۴/۱-۷ میں چھاپا گیا تھا۔ دیال سنگھ کالج سے اب مجلّہ "افشاں" شائع ہوتا ہے۔ ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں مظہر اقبال اور منیر احمد نے تاریخ کی روشن شخصیات مثلاً حضور نبی اکرمؐ" حضرت علیؓ' عمر بن عبدالعزیزؒ' قائد اعظم اور اقبال پر خصوصی مضامین شائع کئے گئے۔

"الاقتصاد" ۔ لاہور

"الاقتصاد" ہیلی کالج آف کامرس کا پرچہ ہے جس کا ایک ضخیم سالانہ نمبر جون ۱۹۶۵ء میں پروفیسر انیس احمد صدیقی کی نگرانی اور شیخ محمد پارسا کی ادارت میں شائع ہوا ۔ اس پرچے میں محمد اطہر سید کا مضمون "پریم چند" محمد شاہد نفیس کا تجزیاتی مطالعہ "نوجوانوں کی تفریح کے مشاغل" اور سید محمد ماجد کا مزاحیہ "الہ دین کا چراغ" خاصے کے مضامین ہیں ۔

"یونیورسٹی جرنل" - پشاور

"پشاور یونیورسٹی جرنل" اردو ، عربی ، فارسی اور پشتو کے ابواب پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا ابتدائی رنگ روپ پروفیسر شمس الدین صدیقی صاحب نے ابھارا تھا۔ خاطر غزنوی ، عبدالستار جوہر پراچہ ، در شہوار ابراہیم نے اس کا ادبی معیار بلند کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس جرنل میں "اردو غزل کا دکنی دور" از شمس الدین صدیقی "اردو میں ملی شاعری" از در شہوار ابراہیم اور "اردو اور پشتو کے لسانی روابط" از ڈاکٹر عبدالستار جوہر پراچہ جیسے گراں مایہ مضامین چھپ چکے ہیں۔

"صریر خامہ" - حیدر آباد

"صریر خامہ" شعبہ اردو جامعہ سندھ کا ادبی مجلہ ہے جس کے چند شمارے پروفیسر سخی احمد کی نگرانی میں چھپ چکے ہیں۔ اس کا ایک خصوصی شمارہ ۱۹۶۶ء میں وفا راشدی صاحب نے "قومی شاعری نمبر" کے عنوان سے شائع کیا اور اس میں "اسلام میں قومیت کا تصور" از مولانا مودودی "ادب اور قومیت" از محمد احسن فاروقی "قومی شاعری کا سیاسی پس منظر" از ڈاکٹر خان رشید اور "اردو شاعری میں قومی رجحانات" از محمد تقی کے مضامین کے علاوہ اقبال ، ظفر علی خان ، شبلی ، حسرت موہانی کی قومی شاعری کے تجزیاتی مطالعے پیش کئے۔ نئے شاعروں کی جدید قومی نظموں کی اشاعت اس پرچے کی ایک اور منفرد خصوصیت ہے۔ "صریر خامہ" کا یہ خاص نمبر اپنے نادر مضامین کی وجہ سے اب ایک یادگار شمارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

"مطلع نو" - بہاول پور

"مطلع نو" گورنمنٹ انٹر کالج بہاولپور کا ادبی مجلہ تھا جو ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء کے دوران اسد اریب اور بدر منیر کی ادارت میں باقاعدہ چھپتا رہا۔ طلبہ کے مضامین کے علاوہ پروفیسر عقیل روبی ، سہیل اختر ، سید محمد آصف ، عبدالسمیع اور پروفیسر اسلم ریاض کے مضامین نے اسے ایک وقیع ادبی پرچہ بنانے میں معاونت کی۔

"علم و عمل" ۔ کراچی

سالنامہ "علم و عمل" کراچی سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ۔ یہ پی ای سی ایچ ایس کالج کراچی کے طلبہ کا رسالہ تھا ۔ ادبی مضامین میں اقبال نیازی کا مضمون "اردو ادب میں انیس کا درجہ" فاخرہ محمود کا "غالب بحیثیت شاعر" اور منیر جمیل کا "اقبال کا شاہین" ممتاز نظر آتے ہیں۔

"مشعل راہ" ۔ سیالکوٹ

سیالکوٹ سے سہ ماہی "مشعل راہ" ریاست علی چودھری نے جنوری ۱۹۶۷ء میں جاری کیا۔ اس پرچے نے سیالکوٹ کے گرد و نواح میں ادب کی روشنی پھیلانے اور لکھنے والوں کی تخلیقی سرگرمیاں ابھارنے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں ۔ جنوری ۱۹۶۸ء میں "مشعل راہ" نے "مرے کالج نمبر" نکالا اور اس میں مرے کالج کے قدیم طلبہ فیض احمد فیض ، جوگندر پال ، وارث میر ، شہزادہ کبیر احمد ، کرشن موہن ، امجد درک اور اے ڈی اظہر کے مضامین پیش کئے ۔

"بزم" ۔ کراچی

۱۹۶۷ء میں سراج الدولہ کالج کراچی نے اپنا مجلہ "بزم" کے نام سے شائع کیا تو اس کے اجرا پر جوش ملیح آبادی ، سید ہاشم رضا اور ممتاز حسین نے خیر مقدم کے پیغامات بھجوائے ۔ اس پرچے کے سرپرست پروفیسر مجتبیٰ حسین اور مدیر انور سعید صاحب تھے ، ادبی اور تنقیدی حصے میں تین مقالات جو بطور خاص توجہ کھینچتے ہیں یہ ہیں "ادب اور عہد" از محمد امیر امام حر "غالب ننانوے سال بعد" از مجتبیٰ حسین اور "اردو کا ایک عوامی شاعر" از محمد رئیس اس پرچے میں طلبہ کے مضامین کو نسبتاً زیادہ شرکت کا موقعہ دیا گیا ہے ۔

"یونیورسٹی میگزین" ۔ ملتان

"ملتان یونیورسٹی میگزین" بالعموم اساتذہ اور طلبہ کے مضامین سے سجایا جاتا تھا ۔ یہ ایک ایسی ادبی تربیت گاہ تھی جس نے اردو ادب کو متعدد نئے ادبا سے روشناس کرایا ۔ مثال کے طور پر نجیب

جمال، عبدالرؤف شیخ، احمد فاروق مشہدی، روبینہ ترین، نجم اکبر، اصغر ندیم سید، طاہر سلیمی اور مختار احمد عزمی کی ابتدائی تحریریں اس میگزین ہی سے نمایاں ہوئیں۔ ۱۹۷۷ء میں "ملتان یونیورسٹی میگزین" کا "دانائے راز نمبر" شائع ہوا جس کی ادارت مختار احمد عزمی نے کی۔

"لفظ"۔ لاہور

رسالہ "لفظ" پنجاب یونیورسٹی اور یئنٹل کالج لاہور کی یونین کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۷۲ء میں جاری ہوا۔ اس کے نگران سہیل احمد خان اور مدیر مرزا حامد بیگ تھے، معاونین میں عابدہ وقار، بہادر علی، زاہدہ ملک اور عبدالسلام کے نام شامل ہیں "لفظ" کی اشاعت سے درس گاہ اور تخلیقی ادب کے درمیانی فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کی گئی یہ پرچہ مکتبی ادب کے خلاف ایک رد عمل کی حیثیت رکھتا تھا۔ "ابتدائیہ" میں کہا گیا کہ:

"جسمانی طور پر بوڑھا ہونا یا بیمار ہونا ایک حیاتیاتی عمل ہے جس پر معترض ہونا خود انسانی زندگی پر معترض ہونا ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے مکتبی حضرات کے قلم کھانستے ہیں اور ان کے لفظ مرگی کے مریض کی طرح بے ہوش ہیں۔"

"لفظ" نے ادب، شاعری اور نصاب کے نئے مفاہیم واضح کرنے کی کوشش کی اور اپنا روپ خالص تخلیقی ادبی پرچے کی صورت میں سنوارا، جس کی تزئین میں اساتذہ میں سے ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سجاد باقر رضوی، غلام حسین ذوالفقار نے اور ادبا میں سے منیر نیازی، احمد سلیم، احسان دانش، قیوم نظر، مجید امجد، سلیم شاہد، احمد مشتاق، اور صلاح الدین محمود جیسے ادبا نے حصہ لیا۔ ان کے دوش بدوش مرزا حامد بیگ، حامد جیلانی، عابدہ وقار، ناہید ندیم، ناصر بلوچ، عامر فہیم، شبیر شاہد جیسے ذہین طلبہ کی تخلیقات بھی پیش کی گئیں۔ "لفظ" ایک غیر تجارتی کامیاب ادبی پرچہ تھا۔ اس کے صرف تین یادگار شمارے چھپے۔ "جدید فارسی شاعری" پر ن۔م۔ راشد کا مقالہ "بکرم بیتال اور افسانہ" کے موضوع پر انتظار حسین کی تحریر، اور "مرثیہ" پر سجاد باقر رضوی کا مضمون "لفظ" کی چند خاص مندرجات ہیں۔

"پطرس"۔ لاہور

رسالہ "پطرس" گورنمنٹ کالج لاہور کے نیو ہوسٹل کے مکینوں کا ادبی مجلّہ ہے۔ اس کی ابتدا ۱۹۶۹ء میں ہوئی اور پہلا پرچہ محمد اجمل نیازی، اشرف عظیم اور انیس مرغوب نے مرتب کیا اس میں

ہوسٹل کے پرانے مکینوں، جسٹس ایس اے رحمٰن، حمید احمد خان، میجر جنرل سرفراز خان صفدر محمود رؤف انجم کے علاوہ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹوں میں سے صوفی تبسم، ڈاکٹر محمد اجمل اور کرامت حسین جعفری کی پرانی یادوں کی بازیافت کی گئی۔ "پطرس" کا ایک بڑا کارنامہ "ڈاکٹر نذیر احمد نمبر" کی اشاعت ہے اس نمبر میں پروفیسر محمد منور، ڈاکٹر حمید یزدانی، صابر لودھی، افضل علوی، اشفاق علی خان، فرخندہ لودھی، آغا یمین اور ڈاکٹر عبدالمجید اعوان نے ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کی حیات و شخصیت کا ایک جاذب نظر مرقع تیار کیا اور انہیں خراج تحسین ادا کیا۔

"اقراء"۔ لاہور

گورنمنٹ ایم، اے، او کالج لاہور کا مجلہ "اقرا" پروفیسر حفیظ صدیقی کی ادارت میں چھپتا ہے۔ دسمبر ۱۹۷۷ء میں "اقرا" کا ایک وقیع "اقبال نمبر" شائع ہوا اور اسے طلبہ کے لئے مشعل تحریر بنانے کے لئے عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر تاثیر، مولانا صلاح الدین احمد، جگن ناتھ آزاد، وقار عظیم، عبادت بریلوی اور ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے مضامین بھی شریک اشاعت کئے گئے۔

"علم و آگہی"۔ کراچی

"علم و آگہی" گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی کا علمی مجلہ ہے۔ اس کے مرتبین میں سب سے اہم نام ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کا ہے جنہوں نے اس پرچے کو علمی، ادبی اور افادی بنانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں مجلس مشاورت میں پروفیسر حسنین کاظمی، شفقت رضوی، آفاق ہاشمی اور ڈاکٹر انصار زاہد جیسی شخصیات شامل ہیں۔ اس پرچے نے ۷۶۔۱۹۷۳ء کے دوران برصغیر کے علمی ادبی اور تعلیمی اداروں پر چند گراں قدر اور بے حد مفید شمارے شائع کئے اور ان میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تقریباً دو سو سالہ علمی، تعلیمی، تہذیبی تاریخ کے روشن نقوش محفوظ کر دئے۔ یہ ایک ایسی تاریخ ہے جس سے اردو زبان و ادب کا دامن تا حال خالی تھا۔ اس قسم کے ایک اور جامع تصنیفی منصوبے کے تحت معرض اشاعت میں آنے والا شمارہ بانی پاکستان "قائد اعظم نمبر" تھا جو قائد اعظم کی حیات افکار اور خدمات پر ایک جامع تالیف شمار کی گئی۔ مولانا محمد علی جوہر کے صد سالہ یوم پیدائش پر "علم و آگہی" نے ایک تحقیقی اہمیت کا خاص شمارہ پیش کیا۔ مسلمانان پاک و ہند کی سیاسی جد و جہد کا جائزہ لینے کے لئے ۸۳۔ ۱۹۸۲ء میں "تحریکات ملی نمبر" شائع کیا گیا اور اس میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء،

تحریک اصلاح و جہاد، تحریک خدام کعبہ ، تحریک ریشمی رومال، تحریک ہجرت، تحریک ترک موالات پر گراں قدر تحقیقی مواد تلاش بسیار کے بعد پیش کیا گیا۔ ان نمبروں کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر ایوب قادری، ڈاکٹر معین الدین عقیل، مولانا سعید الرحمٰن علوی بھی عمل معاونت کی۔ "علم و آگہی" نے بلا شبہ اپنی نوعیت کے منفرد اور اعلیٰ نمبر چھاپے ہیں اور ان سے نہ صرف طلبہ راہنمائی حاصل کر رہے ہیں بلکہ تحقیق اور تنقید ادب میں بھی انہیں حوالے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس پرچے کا "پاکستان میں تعلیم و تدریس۔۔۔ مسائل اور مشکلات اور ان کا حل" نمبر بھی ایک مفید اور یادگار اشاعت ہے جو ۸۷۔۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آئی۔

"مہک" گوجرانوالہ

"مہک" گورنمنٹ کالج گوجرانولہ کا مجلّہ ہے۔ اس جریدے نے ۷۵ ۔ ۱۹۷۴ء میں ایک اعلیٰ پائے کا "اقبال نمبر" پیش کیا اور تبرکات ، نوادرات ، نگارشات ، اعترافات اور تاثرات کے زیر عنوان علامہ اقبال کے فکر و فن پر بہت سا قیمتی مواد جمع کر دیا ۔ اس پرچے میں بہت سے سابق مضامین مثلاً ڈاکٹر تاثیر کا "اقبال کا نظریہ فن اور ادب" میاں بشیر احمد کا "رومی اور اقبال" حسن نظامی کا "اقبال سے میرے تعلقات" تلوک چند محروم کا "اقبال انار کلی میں" وغیرہ کو مکرر اشاعت حاصل ہوئی ہے ۔ ایک حصہ اساتذہ اور طلبہ کے مقالات کے لئے بھی وقف کیا گیا ہے تاہم اس کی سب سے بڑی خدمت اقبال پر بکھرے ہوئے مواد کو ایک ہی جلد میں پیش کرنا ہے اور یہ سب کام طلبہ نے سرانجام دیا ہے ۔

۷۷ ۔ ۱۹۷۶ء میں "مہک" نے "قائد اعظم نمبر" شائع کیا اور اس میں زیادہ تر اساتذہ اور طلبہ کے مضامین پیش کئے۔ "مہک" کا سب سے بڑا کارنامہ "گوجرانوالہ نمبر" ہے اس پرچے میں اس شہر کی تاریخی ، تہذیبی ، علمی اور ادبی تاریخ کی اہم شخصیات کا احوال درج کیا گیا ہے ۔ اس نمبر کو تاریخی حیثیت حاصل ہے اور یہ گوجرانوالہ کی تحقیق میں ایک معاون دستاویز ہے ۔

"کاروان" ۔ گوجرانوالہ

گورنمنٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ کا ادبی مجلّہ "کاروان" کے نام سے شائع ہوتا ہے ۔ جولائی ۱۹۷۶ء میں اس کا خصوصی شمارہ شائع ہوا ۔ جس میں ملک افتخار احمد کا مقالہ "قائد اعظم اور نظریہ

پاکستان" جاوید اقبال چودھری کا "امتیار علی تاج - ایک جائزہ" امین خیال کا "یعقوب انور غزل کے آئینے میں" اور محمود احمد قاضی کا افسانہ "انسان" قابل ذکر ہیں۔ اس پرچے میں اسرار احمد خان' راز کاشمیری' غلام حسین اور محمد سلیم غوری کی منظومات بھی توجہ کھینچتی ہیں۔

"دبستان" - لاہور

"دبستان" گورنمنٹ سائنس کالج لاہور کا ادبی مجلّہ ہے۔ اس نے ۱۹۷۷ء میں عمر فیضی کی نگرانی اور خالد عمر گل کی ادارت میں "قائد اعظم نمبر" پیش کیا اور اس میں مختار مسعود' جیلانی کامران' انتظار حسین' عبدالسلام خورشید' رئیس احمد جعفری' اور ذوالفقار بخاری کے مضامین شائع کئے۔

"ایچی سونین" - لاہور

"ایچی سونین" ایچی سن کالج لاہور کا ادبی مجلّہ ہے - ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کی نسبت سے اس مجلّہ نے ایک ضخیم "اقبال نمبر" شائع کیا جس کی ادارت ارشد اقبال ملک اور سہیل احمد کبیر نے کی۔

"محمل" - لاہور

"محمل" اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور کا ادبی مجلّہ ہے - اس کی نگرانی محترمہ الطاف فاطمہ کے سپرد تھی' چنانچہ اس کا ادبی معیار موزوں اور خاطر خواہ نظر آتا ہے - اس پرچے نے زیادہ توجہ طالبات کی تحریریں پیش کرنے پر صرف کی "محمل" کا ۱۹۷۷ء کا "اقبال نمبر" اس کا ایک قابل ذکر کام ہے - اس پرچے میں مس فیض بتول کا مقالہ "رومی و اقبال" ڈاکٹر زاہدہ پروین کا "اقبال کا نظریہ وحدت الوجود" الطاف فاطمہ کا "خضر راہ کی ڈکشن' علامت اور استعارہ" خاصے کی چیزیں ہیں -

"ارتکاز" - اسلام آباد

"ارتکاز" قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد کا ادبی مجلّہ ہے - اس کا ایک وقیع اور ضخیم خاص نمبر

محمد داؤد خان نے ۱۹۷۸ء میں پیش کیا اور اس میں " ذکر و فکر " اور " اساس پاکستان " کے تحت فکری مضامین کے علاوہ ایک گوشہ اقبالیات بھی مرتب کیا۔ اس حصے میں ڈاکٹر محمد اجمل، فتح محمد ملک کے علاوہ اقبال کے بارے میں قائد اعظم کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔

"کاروان"۔ جھنگ

"کاروان" گورنمنٹ کالج جھنگ کا ادبی مجلہ ہے۔ محمد حیات خان سیال کی ادارت میں اس پرچے نے طویل عرصے تک نمایاں ادبی خدمات سر انجام دیں۔ ۱۹۷۸ء میں "کاروان" نے "اقبال نمبر" شائع کیا۔ اساتذہ میں سے سمیع اللہ قریشی، ابوبکر صدیقی، حیات خان سیال، رئیس زیدی، حسن محمود اقبال، جہانگیر عالم اور محمد فیروز نے اقبالیات کے متنوع گوشوں کو منور کیا۔ "کاروان" کا "قائد اعظم نمبر" (۱۹۷۶ء) بھی اس کی ایک ممتاز اشاعت ہے۔ ۱۹۸۱ء کا شمارہ "نعت نمبر" کے طور پر پیش کیا گیا جس میں ۹۹ شعرا کی نعتیں چھاپی گئیں۔

"سرسیدین"۔ راولپنڈی

فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج راولپنڈی کے ادبی مجلہ " سرسیدین " کو ادبی جہت دینے اور اسے قومی سطح کا جریدہ بنانے میں ممتاز افسانہ نگار رشید امجد کی مساعی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں، انہوں نے طلبہ کے خام مضامین کی تزئین و اشاعت کرنے کے بجائے طلبہ تک قوم کی ادبی سرگرمیوں کا نچوڑ پہنچانے کی کوشش کی اور اس منصوبے کے تحت پہلے علامہ اقبال پر ایک خصوصی اشاعت پیش کی اور بعد میں تعلیمی صورت حال کا جائزہ ملک گیر سطح پر لیا "سرسیدین" کے ان دونوں مجلوں کی پذیرائی بڑے پیمانے پر ہوئی اور یہ حوصلہ افزائی ہی پاکستانی ادب کے ایک جامع نمائندہ اور با معنی انتخاب کے تالیفی منصوبے کا سبب بنی۔ " پاکستانی ادب " کی پہلی جلد کی ابتدا میں چیف ایڈیٹر ملازم حسین ہمدانی صاحب نے لکھا کہ " تعلیمی اداروں کے مجلّے عموماً " طلبہ ہی کی تخلیقی کاوشوں تک محدود ہوتے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ قومی سطح کی تخلیقی سرگرمیوں کو بھی طلباء اور دوسرے ادب دوستوں تک پہنچانے کی سعی کریں.. ہم نے اس نیک خواہش کے ساتھ اس کی ابتدا کی ہے کہ دوسرے بڑے ادارے اس روایت کو آگے بڑھائیں گے۔ "

"سرسیدین" نے " پاکستانی ادب " کا انتخاب چھ ضخیم جلدوں میں پیش کیا۔ زمانی اعتبار سے یہ

انتخاب ۱۹۴۷ء سے لے کر زمانہ حال تک کے ادب کا احاطہ کرتا ہے۔ لیکن زمانی تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے ۱۹۴۷ء سے پہلے کی چند اہم تصنیفات کو بھی اس میں جگہ دی گئی اس لحاظ سے یہ انتخاب اب تک اس نوع کے پرچوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

"سرسیدین" کی پہلی جلد میں پاکستانی ثقافت کی شناخت ' ادب کی روایت ' مسائل ' ان کا تجزیہ اور مختلف اصناف ادب پر تنقید کی گئی ' دوسری جلد میں پاکستان کے نثری ادب کا اور تیسری میں شعری ادب کا انتخاب پیش کیا گیا۔ چوتھی جلد پاکستان کے بصری فنون کے لئے وقف کی گئی ' پانچویں جلد اردو ادب کی تنقید و تحقیق کے لئے اور چھٹی ڈرامے کے لیے مختص کی گئی ' اس منصوبے کی ابتدا ۱۹۸۱ء میں ہوئی اور ڈرامے پر آخری جلد ۱۹۸۷ء میں مکمل ہوئی۔ "سرسیدین" نے اپنے دامن میں مختلف موضوعات کے جواہر پارے اتنی بڑی تعداد میں سمیٹے کہ اس سے پاکستانی ادب کے پورے خد خال ' پاکستانی سوچ کا انداز اور اس کی فکری اقدار اور رد عمل کی تخلیقی نوعیت مرتب ہو جاتی اس کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ بہت سے بکھرے ہوئے نوادرات کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے جس سے اہل تحقیق و تنقید کو کئی نئے منصوبوں پر کام کرنے کی سہولت میسر آ جاتی ہے۔ اس انتخاب کا آغاز ملازم حسین ہمدانی صاحب کی سربراہی میں ہوا لیکن سربراہان ادارہ تبدیل ہوتے رہے آخری جلد کی اشاعت کے وقت محمد امین بھٹی پرنسپل تھے ' لیکن اس منصوبے کی مرکزی شخصیت پروفیسر رشید امجد اور ان کے معاون فاروق علی اس تمام عرصے میں اس انتخابی منصوبے میں شامل رہے۔ چنانچہ انتخاب کا جو مزاج ابتدا میں متعین کیا گیا تھا وہ بعد میں بھی قائم رہا اور یوں "سرسیدین" کو پاکستانی ادب کے افق پر وہ مقام مل گیا ہے جو دوسرے متعدد مجلات کو حاصل نہیں۔

"مرغزار" ۔ گوجرانوالہ

گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کے مجلہ "مرغزار" نے اپریل ۱۹۸۰ء میں "اقبال نمبر" شائع کیا۔ اس کی نگرانی پروفیسر عبدالجبار شاکر اور اسلام خان سعید نے کی۔ اس پرچے کو عالمی اقبال کانگریس ۱۹۷۷ء کی تحریروں سے مزین کیا گیا ہے "ارمغان اقبال" کے عنوان سے اقبال کے فکر و فن پر متعدد اہل ادب کے انٹرویو اس کا ایک خاص حصہ ہے۔ اس میں آل احمد سرور ' صباح الدین عبدالرحمن ' عبداللہ جان غفاروف ' اعجاز الحق قدوسی ' آفاق صدیقی ' سلیم اختر ' شمس الدین صدیقی اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے انٹرویو شامل ہیں۔

"اکادمیکا" ۔ اسلام آباد

فیڈرل گورنمنٹ کالج برائے طلبہ اسلام آباد کا ادبی مجلّہ "اکادمیکا" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی ادبی مزاج سازی میں پروفیسر نظیر صدیقی نے قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں، انہوں نے طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے جوش ملیح آبادی، ضمیر جعفری، سید مظفر حسین رزمی، ڈاکٹر صدیق شبلی کے مضامین کے علاوہ فیض احمد فیض، ڈاکٹر محمد اجمل اور ممتاز مفتی جیسے ممتاز ادبا کے انٹرویو چھاپنے کا اہتمام کیا۔ "اکادمیکا" نے طلبہ کی تخلیقی سرگرمیوں کو ایک واضح جہت دینے کی کوشش کی ہے۔

"ہم سخن" کا طنز و مزاح نمبر

جناح گورنمنٹ کالج کراچی کے ادبی مجلّہ "ہم سخن" نے ۸۲ ۔ ۱۹۸۱ء کی اشاعت کو " طنز و مزاح " کا عنوان دیا اور موضوع کے اعتبار سے اسے بھرپور، نمائندہ اور معیاری بنانے کی سعی کی۔ اس پرچے میں مزاح اور اس کے اماثل کے علاوہ مزاح و طنز کے فن پر نظریاتی بحث بھی کی گئی اور مختلف اصناف میں طنز و مزاح کے مثالی نمونے بھی پیش کئے گئے، سید محمد تقی کا مقالہ " طنز نگاری اور معاشرہ " محمد علی صدیقی کا " طنز و مزاح کے دفاع میں " سید تلمیذ احمد کا " مزاح کا اسلامی تصور " ۔ ابو اللیث صدیقی کا "علی گڑھ کا دبستان طنز و مزاح" اور انجم اعظمی کا " طنز و مزاح کا مفہوم اور افادیت " اس موضوع کے نئے زاویوں کو روشن کرتے ہیں۔

"کائنات"، کراچی

"کائنات" وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کراچی کا مجلّہ ہے۔ اس کالج کا دائرہ عمل اگرچہ سائنس کے مضامین تک محدود ہے لیکن اس کا ذریعہ اردو زبان ہے۔ چنانچہ اردو کو بطور زبان و ادب بھی اہمیت حاصل ہے "کائنات" نے ۱۹۸۳ء میں "توانائی نمبر" اور اس کے بعد ایک خصوصی اشاعت "رحمت اللعالمین نمبر" پیش کی۔ موخرالذکر اشاعت میں حضورؐ کی حیات، سیرت اور تعلیمات پر ارباب ادب کے مضامین کے علاوہ "ارمغان نعت" بھی پیش کیا گیا۔

"پیام سحر" - رحیم یار خان

مجلہ "پیام سحر" خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خان کی ادبی پہچان ہے - ۱۹۸۵ء میں اس کا ایک خصوصی شمارہ ایوب ندیم نے پروفیسر شعیب عتیق خان کی نگرانی میں شائع کیا اور اس میں طلبہ کے مضامین نظم و نثر کے علاوہ وزیر آغا، راغب مراد آبادی اختر انصاری، اور بیدل حیدری کی منظومات کو بھی جگہ دی - ایوب ندیم کا سروے "جگنوؤں کی روشنی" طلبہ کے باطن سے ابھرنے والی سوچ کا آئینہ دار ہے -

"سرچشمہ" - لاہور

گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور صدر کا رسالہ "سرچشمہ" طلبہ کے علمی ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں کا مظہر ہے- "سرچشمہ" کی مارچ ۱۹۸۵ء کی اشاعت کی ادارت محمد اجمل خان نیازی نے ادبی زاویوں سے کی اور اس میں مجتبیٰ حسین، ایوب رومانی، عبدالجبار شاکر، اختر امان، بیدار سرمدی، خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر معین الرحمٰن، صابر لودھی اور تحسین فراقی کے مضامین پیش کر کے اسے ایک بلند پایہ ادبی جریدہ بنا دیا - "سرچشمہ" کے اس پرچے میں "لاہور کے علمی ادارے" اور "لاہور کے ادبی رسائل" پر چند سیر حاصل جائزے بھی شامل ہیں - ان کی ترتیب میں طلبہ کے علاوہ اساتذہ کی معاونت بھی حاصل کی گئی - "سرچشمہ" اس کی ایک یادگار پرچے کی وجہ سے علمی حلقوں میں اب تک معروف ہے-

○

حوالہ جات

۱- ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری "علم و آگہی" خصوصی شمارہ ۷۲- ۱۹۷۳ء - ص ۹

۲- بحوالہ اشاریہ "راوی" مرتبہ بدر منیر- لاہور ۱۹۸۹ء

گیارھواں باب

اردو ادب کے ڈائجسٹ رسائل

مغرب میں ڈائجسٹ رسائل کے فروغ میں بنیادی طور پر یہ حقیقت کار فرما تھی کہ آج کا مصروف انسان دنیا کے وسیع ذخیرۂ علوم ' ادب ' ایجادات ' مسائل ' رجحانات اور تحریکوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کا آرزو مند ہے لیکن یہ سب معلومات اور علوم اس کے وسائل کی دسترس سے باہر ہیں ۔ چنانچہ اس قسم کی منتخب معلومات کو ڈائجسٹ رسائل کی صورت میں پیش کرنے کا رجحان پیدا ہوا اور اس کی کامیاب ترین مثال انگریزی زبان کا ماہانہ جریدہ " ریڈرز ڈائجسٹ " ہے جو کثیر الاشاعت ہے ۔ پوری دنیا میں پڑھا جاتا ہے اور متعدد زبانوں میں غیر افسانوی تحریریں پیش کرتا ہے ۔ اس قسم کے رسالے کی ضرورت اردو زبان میں بھی محسوس کی جاتی تھی آزادی سے قبل ماہ نامہ " ادبی دنیا " کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد اور " ہمایوں " کے مدیر مولانا حامد علی خان کو خیال آیا کہ اردو زبان و ادب کے قارئین کی رسائی برصغیر میں شائع ہونے والے سب ادبی رسائل تک نہیں ہے اور اکثر اوقات ان رسائل میں چھپنے والے اعلیٰ پائے کے مضامین قارئین کی پوری توجہ حاصل نہیں کرسکتے ۔ چنانچہ " ادبی دنیا " اور " ہمایوں " نے ہر ماہ اعلیٰ پائے کے منتخب ادبی مضامین کی مکرر اشاعت کا اہتمام کیا اور نسبتاً طویل مضامین کو مختصر صورت میں پیش کرنے کی روش اختیار کی ۔ علمی و ادبی مضامین کو اردو میں " ڈائجسٹ " کرنے کی یہ اولیں کاوشیں ہیں ' جنہیں نہ صرف پسند کیا گیا بلکہ انہیں مقبولیت بھی حاصل ہوئی ۔

آزادی کے بعد "مخزن" "الحمرا" "المعارف" "صحیفہ" "مہر نیمروز" جیسے رسالہ جاری ہوئے تو ان سب میں انتخابی ادب پیش کئے جانے کا رجحان غالب نظر آتا ہے ۔ محمد طفیل مدیر "نقوش نے" کراچی سے " روح ادب " کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں دوسرے رسائل کے منتخب مضامین افسانوں اور نظموں کا انتخاب پیش کیا جاتا تھا ۔ " روح ادب " کو طویل عرصۂ اشاعت نصیب نہ ہو سکا ۔ تاہم یہ تجربہ کامیابی سے ہم کنار ہوا اور پاکستان سے " نقش " اور "جائزہ" جیسے رسالے جاری ہوئے جو طویل عرصے تک خالصتاً اردو ادب کے انتخابات پیش کرتے رہے ۔ الہ آباد (ہند) سے

محمود احمد ہنر نے اس نوع کا پرچہ "شاہکار" جاری کیا جس میں پورے برصغیر کے ادبی رسائل کا عطر پیش کیا جاتا تھا۔ اردو میں ڈائجسٹ جریدہ نگاری کی دلکش نوعیت کو نومبر ۱۹۶۰ء میں قریشی برادران نے متعارف کرانے کی کوشش کی اور یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ پورے برصغیر میں آہستہ آہستہ ڈائجسٹ پرچوں کا سیلاب آگیا۔ "اردو ڈائجسٹ" کی تقلید میں متعدد نئے ڈائجسٹ رسالے منظر عام پر آئے اور وسیع حلقہ قرات پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان رسائل کی زبان اردو تھی ' ان میں سے بیشتر رسائل کا اسلوب خالصتاً ادبی تھا۔ غیر ملکی ڈائجسٹ رسالوں کے برعکس اردو کے ڈائجسٹ پرچوں نے عالمی ' سائنسی اور فنی معلومات و موضوعات کے ساتھ ساتھ تخلیقی اصناف ادب کو بھی اہمیت دی اور نہ صرف اردو کے ممتاز ادبا کے ادب پارے شائع کیئے بلکہ بہت سے غیر ملکی ادب بھی تراجم کے ذریعے اردو زبان اور مقامی قارئین کو پیش کیا اور چند ایک ڈائجسٹ رسائل نے تو اپنا مخصوص تشخص بھی پیدا کیا اور بعض موضوعات پر ایسی ضخیم مثالی اشاعتیں پیش کیں جن کو اردو ادب میں مستقل حیثیت حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قارئین کا وسیع حلقہ جو ڈائجسٹ پڑھتا ہے۔ علمی لحاظ سے بہت زیادہ بلند پایہ نہیں اور ڈائجسٹ رسالے بھی ادب کی جہت نمائی کرنے اور ہیت و معنی کو منقلب کرنے کے بجائے انہیں تفریحی اور معلوماتی مواد ہی فراہم کرتے ہیں۔ تاہم ان رسائل نے ادب کی بنیادی سیڑھی کا کام ضرور دیا ہے اور چند ایک ڈائجسٹوں نے اپنی شخصیت کو ادب سے ہی روشن کیا ہے۔ چنانچہ ان کی خدمات ادب کا اعتراف ضروری محسوس ہوتا ہے۔ زیر نظر باب میں چند ایسے ڈائجسٹ رسالوں کا ذکر مقصود ہے جو ادبی زاویوں کو اجاگر کرتے اور قاری کی ذہنی اور ادبی ضرورتوں کو پورا کرنے میں پیش پیش ہیں۔

(الف) پس منظر

دوسرے ادبی رسائل سے منتخب مضامین کو اپنے دامن میں جگہ دینے کی اولیں روایت ہمیں "رسالہ انجمن مفید عام قصور" میں ملتی ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۷۴ء میں جاری ہوا اور ۱۸۸۹ء تک چھپتا رہا۔ اس رسالہ میں سرسید احمد خان ' مولانا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے مضامین دوسرے رسائل سے مکرر پیش کئے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے "رسالہ انجمن مفید عام" کو اردو زبان کے پہلے ادبی ڈائجسٹ کی حیثیت حاصل ہے۔ مولوی محبوب عالم کا رسالہ "انتخاب لاجواب" جو ۱۸۹۸ء میں لاہور سے جاری ہوا اور ۱۹۳۳ء تک چھپتا رہا اس سلسلے کی توسیع ہے۔ اس ہفتہ وار پرچے کی پیشانی پر یہ عبارت رقم ہوتی تھی۔

"دنیا کی تمام دلچسپ اور نہایت مفید کتابوں، اخباروں، تحریروں اور رسالوں سے ہفتہ وار "انتخاب لاجواب۔"

اس پرچے میں ادبی مقالات تاریخی مضامین، افسانے، شاعری اور فکاہات و طنزیات کو نمایاں طور پر پیش کیا جاتا تھا لیکن کتاب و طباعت معیاری نہیں تھی، یہ ایک بے حد کم قیمت رسالہ تھا اور عوام اسے آسانی سے خرید سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ "انتخاب لاجواب" کو قبول عام حاصل ہوا اور یہ تادیر چھپتا رہا۔

"روح ادب" ۔ کراچی

ماہ نامہ "روح ادب" کراچی سے محمد طفیل نے ۱۹۵۲ء میں جاری کیا۔ خدیجہ مستور اس پرچے میں ان کی شریک ادارت تھیں، "روح ادب" بنیادی طور پر ایک ڈائجسٹ پرچہ تھا جو دوسرے ادبی رسائل کی منتخب تخلیقات کی مکرر اشاعت کرتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ قاری کو اچھی تخلیقات ایک ہی جگہ میسر آجائیں، لیکن اس سلسلے کو باقاعدگی نہ مل سکی، تاہم بے قاعدہ صورت میں یہ تادیر چھپتا رہا۔ ممتاز حسین، شوکت صدیقی اور انتصار حسین نیوتنوی کو اس کی ادارت کا شرف حاصل ہوا۔ "روح ادب" کی خاص اشاعتوں میں سالنامہ ۱۹۵۴ء اور "مثنوی نمبر" شامل ہیں۔ "روح ادب" کے پس پردہ مدیر محمود عالم قریشی تھے، آخری دور میں اس پرچے کے حقوق اشاعت بھی ان کے پاس ہی تھے ۔ دیگر منصبی فرائض نے انہیں " روح ادب " کو چھاپنے کی مہلت نہ دی روح ادب نے انتخابی ادب چھاپنے کی جو روش اختیار کی تھی بعد میں اس کی تقلید "نقش" اور "جائزہ" جیسے رسائل نے کی اور ہندوستان میں محمود احمد ہنرنے الہ آباد سے اس طرز کا رسالہ "شاہکار" نکالتے رہے۔

"جائزہ" ۔ کراچی

ماہ نامہ "جائزہ" کراچی اگست ۱۹۵۸ء میں جاری ہوا تھا، اس کے ایڈیٹر محمد یعقوب خان تھے اور صلاح کاروں میں ابوالخیر کشفی، میجر آفتاب حسن، ابواللیث صدیقی، شفیع عقیل کے نام شائع ہوتے تھے، "جائزہ" میں دوسرے رسائل کی منتخب ادبی تحریریں پیش کی جاتی تھیں اور اس کی حیثیت ایک ڈائجسٹ ادبی پرچے کی تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں وسیم فاضلی کی اعانت سے "جائزہ" کا ایک ضخیم سالنامہ شائع ہوا۔ لیکن اسی دوران میں شاہد احمد دہلوی مدیر "ساقی" اور محمد طفیل مدیر "نقوش" نے اس قسم کی تازہ ادبی

تحریروں کی مکرّر اشاعت پر مخالفت کی مہم جاری کر دی۔ "جائزہ" نے ادیبوں کا تعاون براہ راست حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسے جزوی کامیابی بھی ہوئی لیکن اب عدالتی کارروائیوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ اس لئے "جائزہ" "نقش" کے ساتھ معدوم ہوگیا۔ اس پرچے نے ذوق کی آبیاری تو کی لیکن جریدہ نگاری میں کسی نئی جہت کا اضافہ نہیں کیا۔

"نقش"۔ کراچی

۱۹۶۰ء میں کراچی سے شمس زبیری نے ماہ نامہ "نقش" اردو ادب کے ڈائجسٹ کی صورت میں نکالا۔ اس مجلّے میں برّصغیر کے تمام ادبی رسائل کی منتخب تخلیقات کو پیش کیا جاتا تھا، تاہم اس کا غالب رجحان افسانے کی طرف تھا، نظموں اور غزلوں کی تعداد کم رکھی جاتی تھی، تفنن طبع کے لئے طنزو مزاح کے مضامین کو بھی فوقیت دی جاتی تھی، "نقش" کے خصوصی کارناموں میں "مصطفیٰ زیدی نمبر ہے" جو ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ اس پرچے میں نظیر صدیقی کا مقالہ "مصطفیٰ زیدی کی شاعری" سجاد باقر رضوی کا "قطرے سے گہر ہونے تک" ڈاکٹر احسن فاروقی کا "ایک ذہین انسان، ایک بڑا شاعر" کے علاوہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر ممتاز حسن، ویرا زیدی، میرزا ادیب کے تاثراتی مضامین شامل کئے گئے تھے۔ جنگ ۱۹۶۵ء کے بعد "نقش" نے ایک وقیع "جنگ نمبر" شاہد احمد دہلوی کے اشتراک سے پیش کیا۔ "نقش" کا "خواتین افسانہ نمبر" بھی انہی دنوں کی یادگار ہے۔ "نقش" چونکہ نامور ادبی رسائل سے اچھے افسانوں کا انتخاب بہ تعجیل چھاپ دیتا تھا۔ اسلئے اس روش کے خلاف ادبی رسائل نے جن میں محمد طفیل کا رسالہ "نقوش" پیش پیش تھا شدید احتجاج کیا اور متعدد ادبا کے دستخطوں سے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ "نقش" ان کے مضامین بلا اجازت چھاپ رہا ہے۔ شمس زبیری نے کچھ عرصہ تو اس احتجاج کا سامنا کیا لیکن پھر "نقش" کی اشاعت منقطع کر دی۔

(ب) پیش منظر

"اردو ڈائجسٹ"۔ لاہور

اردو میں "ڈائجسٹ" کا لفظ لغوی معانی میں استعمال ہونے کے بجائے خلاصہ نگاری کے لئے استعمال ہوا ہے۔ قانون کی کتب کے جو ملخصات مرتب ہوتے تھے انہیں "ڈائجسٹ" کہا جاتا تھا "اینگلو محمڈن لا ڈائجسٹ" مطبوعہ ۱۸۹۰ء اس کی ایک قدیم ترین مثال ہے۔ اردو میں اس لفظ کو رسالے کا سر

عنوان بنانے کی ایک کاوش ۱۹۵۹ء میں "ریڈرز ڈائجسٹ" کی صورت میں ہوئی' لیکن یہ پرچہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکا۔ چنانچہ الطاف حسن قریشی کا رسالہ "اردو ڈائجسٹ" اس نوع کا پہلا باقاعدہ اور پابندی اوقات سے شائع ہونے والا ڈائجسٹ رسالہ ہے۔

"اردو ڈائجسٹ" نومبر ۱۹۶۰ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ مجلس ادارت میں اعجاز حسن قریشی' امین اللہ وثیر' الطاف حسن قریشی' ظفر اللہ خان اور طاہر قادری شامل تھے' پیرایۂ آغاز میں مقصد اشاعت کے تحت لکھا گیا کہ:

" جب ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری زبانوں سے واقف لوگ بڑی آسانی کے ساتھ ایک ڈائجسٹ کے ذریعے وسیع معلومات حاصل کر لیتے ہیں' اس کا باقاعدہ مطالعہ کرتے رہنے سے وہ ایک باخبر شہری بن رہے ہیں اور ہمارا اردو دان طبقہ بھی اس مقصد کے لئے غیر ملکی زبانوں کے ڈائجسٹ مطالعہ کرنے پر مجبور ہیں تو ہم اپنی کم مائیگی اور وسائل کی کمی کے باوجود اردو زبان میں ایک اعلیٰ معیاری ڈائجسٹ نکالنے کی ہمت کر لیتے ہیں"۔ (۲)

مدیران "اردو ڈائجسٹ" نے اس پرچے کے ذریعے ایک مختصر سی لائبریری کا مواد ایک اشاعت میں پیش کرنے کی کاوش کی اور من جملہ دیگر معلوماتی مضامین کے' پہلے پرچے میں جگر مراد آبادی کے بارے میں مولانا نصراللہ خان عزیز کی یادیں' چیخوف کے ایک افسانے کی تلخیص' الف لیلہ پر امین اللہ وثیر کا مقالہ' اور بہادر شاہ ظفر کی غزل پیش کی۔ چند پرچوں کے بعد "اردو ڈائجسٹ" نے مشاہیر سے انٹرویو لینے کا سلسلہ شروع کیا اور یوں کئی ادبی شخصیات کو ان کے داخل سے بازیافت کرنے کی سعی' اس ضمن میں مولانا صلاح الدین احمد' جسٹس ایس اے رحمٰن' مولانا مودودی' اے کے بروہی' شاہد احمد دہلوی' کے انٹرویوز کو یہاں حوالے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے "ارودو ڈائجسٹ" نے تخلیقی اصناف میں سے شاعری' افسانہ' سفرنامہ اور یاد نگاری کو نمایاں طور پر پیش کیا۔ اور ان اصناف میں عوامی دلچسپی پیدا کی۔ اس پرچے نے ابتدا ہی میں اتنی اہمیت حاصل کر لی کہ اس عہد کے نامور ادبا اس میں اشاعت کے لئے اپنی تخلیقات ارسال کرنے لگے۔ "اردو ڈائجسٹ" میں جن ادبا کے تخلیق پارے محفوظ ہیں ان میں علی عباس حسینی' امتیاز علی تاج' ممتاز مفتی' وزیر آغا' غلام الثقلین نقوی' نواب مشتاق احمد' ابوالحسن علی ندوی' فرخندہ لودھی' شفیق الرحمٰن' فضل احمد کریم فضلی' عشرت رحمانی' منظر علی خان منظر' مرزا ادیب' ضمیر جعفری اور حفیظ جالندھری کے نام اہم ہیں اس پرچے نے تلخیص کتاب کا زاویہ بھی اختیار کیا اور دنیا کی متعدد ممتاز ادبی کتب کو اردو میں منتقل کر دیا۔ "اردو ڈائجسٹ" کے سال نامے' رسول نمبر' اور آزادی نمبر اس کی خصوصی اشاعتوں کے مظہر ہیں۔ اردو ڈائجسٹ کے صفحات سے مقبول جہانگیر مجیب الرحمٰن شامی' ضیا شاہد' آباد شاہ پوری اور تنویر قیصر شاہد جیسے مدیران ادبی

جرائد ابھرے ۔ اردو ڈائجسٹ نے سہل سادہ لیکن جمالیاتی اسلوب کی پرورش کی ۔ یہ اسلوب داخلی طور پر توانا ہے اور قاری کو اپنا ہم نوا بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ ڈائجسٹ جرنلزم کو آداب سے منور کرنے میں اردو ڈائجسٹ اور الطاف حسن قریشی کی خدمات بنیادی نوعیت کی ہیں ۔ اردو ڈائجسٹ نے اہل ذوق کی عمدہ ذہنی آبیاری کی اور شائستہ مزاج قارئین کا راست فکر حلقہ پیدا کیا ۔

"سب رنگ ڈائجسٹ" ۔ کراچی

"سب رنگ ڈائجسٹ" شکیل عادل زادہ کی ادارت میں کراچی سے جاری ہوا ۔ اس پرچے نے جاسوسی ادب کو پروان چڑھانے اور ہندو دیومالا کو سنسنی خیز کہانیوں کی صورت میں پیش کرنے میں کمال حاصل کیا۔ اس کی ایک مثال "سومنات کی قتالہ" ہے شوکت صدیقی نے ایک طویل عرصے تک اس پرچے میں سلسلہ وار ناول پیش کیا ۔ " انکا " اس کا ایک اور محیر العقل سلسلہ تھا۔ "سب رنگ ڈائجسٹ" کے ہر پرچے میں اردو ادب کی چند ممتاز کہانیوں کا انتخاب بھی پیش کیا جاتا ہے کرشن چندر' بیدی' بلونت سنگھ' اشفاق احمد' اوپندر ناتھ اشک' احمد عباس اور غلام عباس کی کہانیوں کو اس پرچے میں اشاعت مکرر حاصل ہو چکی ہے۔ "سب رنگ" نے یورپ کی کہانیوں کے تراجم پیش کرنے میں بھی امتیازی حیثیت حاصل کی ۔ اس پرچے کا حلقہ اثر بہت زیادہ ہے ۔ اس کے پڑھنے والے اس کے عادی نظر آتے ہیں ۔

"سیارہ ڈائجسٹ"

لاہور سے "سیارہ ڈائجسٹ" فروری ۱۹۶۳ء میں جاری ہوا۔ یہ پرچہ در حقیقت "ماہ نامہ سیارہ" ہی کی توسیع تھا اور اس کی ادارت مولانا نعیم صدیقی سرانجام دیتے تھے۔ " دستک " کے زیر عنوان اداریہ میں لکھا گیا کہ

" زندگی کو صحت مند بنانے اور زندگی سے پورا پورا حصہ پانے کے لئے آج انسان کو بے شمار معلومات کی ضرورت ہے ۔ سیارہ ڈائجسٹ ان ضروری معلومات کو ایسے لطیف پیرائے میں پیش کرنا چاہتا ہے کہ بوڑھے اور بچے ' خواص اور عام ' شہری اور دیہاتی سب کے سب ان کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور دماغ پر زور ڈالے بغیر انہیں جذب کر سکیں "

"سیارہ ڈائجسٹ" کو جن مختلف حصوں میں منقسم کیا گیا' ان میں کلاسیکی ادب ' افسانہ ' طنز و

مزاح، سیاحت اور تاریخ اسلام کو اہمیت حاصل ہے اور مقصد اسلامی اقدار کا فروغ نظر آتا ہے۔ اس کے مرتبین کے لئے لکھنے والوں کی جو جماعت منتخب کی گئی اس میں سلیم کیانی، آباد شاہ پوری، غلام حسین اظہر، نہال لاہوری عزیز احمد اور نوید الاسلام شامل تھے، ۱۹۶۴ء میں "سیارہ ڈائجسٹ" کے ادارے میں قاسم محمود شامل ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کی معاونت انور محمود خالد نے کی۔ تاہم اس میں بنیادی تبدیلی اگست ۱۹۶۵ء میں عمل میں آئی۔ اب اس پرچے سے نعیم صدیقی صاحب کا عمل دخل ختم ہو گیا اور انتظامی امور شیخ حامد محمود نے سنبھال لیے۔ ادارتی حلقے میں خورشید عالم، سراج نظامی اور صفدر ادیب شامل ہو گئے۔ اس دور میں "سیارہ ڈائجسٹ" ایک مقبول عام ماہ نامہ بن گیا۔ اس کے سال ناموں اور خاص نمبروں کو وقعت کی نظر سے دیکھا گیا اور اس کی ادبی جہت پسند کی جانے لگی۔ اس جہت کو جن ادیبوں نے ادارتی ارکان کی حیثیت میں مضبوط بنانے کی کوشش کی ان میں مقبول جہانگیر، اظہر جاوید، ستار طاہر اور حفیظ الرحمن احسن، انور محمود خالد، ابوسفیان آفاقی، تنویر قیصر شاہد کو اہمیت حاصل ہے۔

"ڈائجسٹ" عوامی مزاج کا ماہ نامہ ہے، متعدد ادارتی تبدیلیوں کے باوجود اس نے ہلکا پھلکا، تفریحی اور معلوماتی ادب پیش کرنے کی روش کو قائم رکھا ہے۔ اس پرچے نے ۱۹۶۹ء میں قرآن نمبر اور ۱۹۷۳ء میں "رسول نمبر" پیش کیا اور ان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، عبدالماجد دریا آبادی، مولانا افتخار احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، عبدالحمید صدیقی، محمود فاروقی، مفتی محمد شفیع، امین احسن اصلاحی، نعیم صدیقی اور ماہر القادری کے علاوہ متعدد دوسرے علماء، محققین اور ادبا کے مضامین شائع کئے۔ "ڈائجسٹ" میں عابد علی عابد، ناصر کاظمی، عبدالعزیز فطرت، سراج نظامی، عبدالحمید عدم، شفیق الرحمٰن، وزیر آغا، فرخندہ لودھی، مسعود مفتی، اظہر جاوید، ارشد میر اور آثم میرزا کی تخلیقات کا ذخیرہ محفوظ ہے اس پرچے نے مستقل اہمیت کی معیاری اور شگفتہ تحریریں پیش کیں، سفرنامہ، یاد نگاری، تبصرہ کتب کے علاوہ افسانوں اور شاعری کے اعلیٰ نمونے بھی پیش کئے۔ "سیار ڈائجسٹ" کا ایک مقبول سلسلہ پاکستانی معاشرے کی حقیقی کہانیوں کو افسانے کے انداز میں پیش کرنا تھا۔ "سیارہ ڈائجسٹ" میں مقبول جہانگیر کے تراجم کو گہری دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ "سیارہ ڈائجسٹ" نے سنسنی خیز قصوں اور مہم جوئی کی کہانیوں سے عام قاری کو ذہنی آسودگی فراہم کی اور کتابت و طباعت کے اعلیٰ معیار سے اس کی صوری حیثیت کو جاذب نظر بنا دیا۔ "سیارہ ڈائجسٹ" نے بلاشبہ زیادہ تر تفریحی مواد پیش کیا لیکن ذہنوں کو منقلب کرنے کے لئے اس نے اسلامی تعلیمات کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا۔ "سیارہ ڈائجسٹ" کے بیشتر مقاصد بلا واسطہ طور پر سرانجام پاتے رہے اور اسے اردو زبان کا ایک مقبول ماہ نامہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

"انشاء عالمی ڈائجسٹ"

"ماہ نامہ" "انشاء" کراچی سے جون ایلیا اور زاہدہ حنا کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس ادبی پرچے پر زوال کے آثار ظاہر ہونے لگے تو مارچ ۱۹۵۸ء میں اسے "انشا ادبی ڈائجسٹ" کی صورت دے دی گئی اور اس میں وہ تمام چیزیں شامل کر لی گئیں جنہیں ادب کا عام قاری پسند کرتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا نام "عالمی ڈائجسٹ" کر دیا گیا اور اب یہ ماہ نامہ اسی نام سے شائع ہو رہا ہے۔ "عالمی ڈائجسٹ" بنیادی طور پر ادبی مزاج کا پرچہ ہے لیکن اس نے جرم، جنس، سزا کے موضوعات کو اور دیو مالائی کہانیوں کو زیادہ اہمیت دی۔ طنز و مزاح کے مضامین کے ساتھ کارٹون اور لطیفے سے بھی ستا مزاح پیدا کیا اور یوں تھوڑے سے عرصے میں قبول عام حاصل کر لیا۔ "عالمی ڈائجسٹ" میں اردو کی عظیم اور مقبول کہانیوں کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے اور یہ اس کی منفرد خصوصیت ہے۔

"ویمن ڈائجسٹ"۔ لاہور

جنوری ۱۹۶۵ء میں لاہور سے "ویمن ڈائجسٹ" مسرت عزیز نے جاری کیا۔ ان کے معاون مدیر شرقی بن شائق تھے، ایک سال کے بعد ان کی معاونت عبدالحق شہباز اور سلمیٰ جبین نے کی اس پرچے نے عام گھریلو خواتین کے ادبی اور معلوماتی ذوق کی تسکین کرنے کی کوشش کی، لیکن حیرت انگیز بات یہ کہ اس میں دستر خوان اور کشیدہ کاری کے امور کو اہمیت نہیں دی۔ مسرت عزیز نے خواتین کو اسلامی قدروں سے آشنا کیا۔ ان کا اداریہ اس اخلاقی جہت کو بالخصوص نمایاں کرتا ہے۔ "ارم" کے نام سے ایک قسط وار ناول اس کا ایک مقبول سلسلہ تھا۔ جسے سرور جہاں نے لکھا۔ "ویمن ڈائجسٹ" خواتین میں خاصہ مقبول ماہ نامہ تھا۔ اس کو مقبول پرچہ بنانے میں ستار طاہر نے بھی خدمات سرانجام دی ہیں۔

"انتخاب نو ڈائجسٹ"

ماہ نامہ "انتخاب نو" کراچی سے ایک علمی اور ادبی ماہ نامے کی صورت میں شائع ہوتا تھا۔ مارچ ۱۹۶۳ء میں اس پرچے کا ضخیم سال نامہ اختر رحمانی، خالد جمال اور ثریا جبیں کی ادارت میں شائع

ہوا اور اس کے بعد اسے ڈائجسٹ کی صورت دے دی گئی جس میں نفسیاتی مضامین ، سفرنامے ، شعرائے کرام کے رشحات قلم، تاریخی واقعات ، تعمیری افسانے ، طنز و مزاح ، بین الاقوامی احوال ، اقوال زریں اور لطیفے وغیرہ سب کچھ پیش کیا گیا ۔ اس ڈائجسٹ میں شریک ہونے والوں میں سید محمد جعفری ، ماہر القادری ، انور رومان ، عبدالعزیز خالد ، دلاور فگار ، احمد جمال پاشا ، انصار ناصری ، ظریف جبل پوری شامل تھے۔ "انتخاب نو ڈائجسٹ" زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکا۔

"حکایت" ۔ لاہور

"حکایت" ایک ڈائجسٹ ماہ نامے کی صورت میں ستمبر ۱۹۶۸ء میں لاہور سے جاری ہوا ۔ اس کے نگران خورشید عالم تھے اور ادارت عنایت اللہ سرانجام دیتے ہیں ۔ "اوراق حکایت" میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اس کا مقصد نوجوانوں کو صاف ستھرا ادب فراہم کرنا اور انہیں ایسی ذہنی پراگندگی سے بچانا ہے جو انہیں سیاسی اور اخلاقی قدروں سے منحرف کر رہا ہے۔ "حکایت" نے فحاشی کے خلاف محاذ کھڑا کرنے کا دعویٰ بھی کیا اور اس محاذ پر اپنی جنگ ادب کے وسیلے سے لڑی "اردو ڈائجسٹ" اور "سیارہ ڈائجسٹ" کی ادبی جہت کو "حکایت" نے بھی قائم رکھنے کی کوشش کی ، چنانچہ "حکایت" میں ایسا ادب پیش کیا گیا جس میں افسانے جیسی چاشنی موجود تھی "حکایت" نے عام آدمیوں کی سچی کہانیوں کو سادہ اور عام فہم اسلوب میں پیش کیا ، تاریخ کے اوراق کو افسانوی صورت دی ، سفرنامے اور رپور تاژ میں دلچسپی پیدا کی اور بڑے لوگوں کی خود نوشت سوانح عمریوں کو مثالی صورت میں پیش کیا۔ اس ڈائجسٹ پرچے کے لکھنے والوں میں خود عنایت اللہ پیش پیش تھے ، ستار طاہر ، مقبول جہانگیر ، منیر نیازی ، ضمیر جعفری ، عبدالعزیز خالد ، شوکت صدیقی ، شاہد جمیل ، ذوالفقار احمد تابش ، سرور مجاز کے مضامین عرصے تک اس کے صفحات پر رونما ہوتے رہے ۔حکایت نے جرم و سزا کے قصوں کو اور تاریخ اسلام کے مثالی کرداروں کو بیک وقت پیش کرنے کی سعی کی اور اپنا ایک مخصوص حلقہ اثر پیدا کر لیا جو اب تک قائم ہے ۔

"پاک ڈائجسٹ" ۔ لاہور

حکیم عبدالکریم ثمر اور فضل من اللہ نے "پاک ڈائجسٹ" کے نام سے ایک علمی اور معلوماتی ماہ نامہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں جاری کیا ۔ اس کی ادبی پالیسی میں مادی نظریات کے استیصال کے علاوہ فکر و فن

کی پاکیزہ قدروں کا فروغ شامل تھا۔ اس ڈائجسٹ نے اردو شاعری کے اچھے نمونے جمع کرنے کی سعی بھی کی لیکن یہ دوسرے ڈائجسٹ رسائل کی طرح مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ آخری دور میں فضل من اللہ نے "پاک ڈائجسٹ" کا "عبدالکریم ثمر نمبر" شائع کیا۔ اس نے اٹھارہ سال تک معمول کے پرچے کی خدمات سرانجام دیں اور آخر ۱۹۸۸ میں بند ہو گیا۔

"قومی ڈائجسٹ" ۔ لاہور

لاہور سے "قومی ڈائجسٹ" جون ۱۹۷۷ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر مسئول مجیب الرحمٰن شامی ہیں۔ شامی صاحب کو بنیادی طور پر ایک زیرک نظر اور داخل بین سیاسی تجزیہ نگار کا درجہ حاصل ہے ۔ انہوں نے ہفت روزہ "زندگی" اور "اردو ڈائجسٹ" سے جو تجربہ حاصل کیا تھا اسے زیادہ مئوثر انداز میں " قومی ڈائجسٹ " میں استعمال کیا اور پرچے کو بارہ مصالحوں کی چاٹ بنانے کے بجائے اس سے سماجی ' سیاسی اور ادبی راہ نمائی کے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ "قومی ڈائجسٹ " نے ایک ایسے اسلوب کو پروان چڑھایا جس میں سامنے کی بات کو بھی تہہ دار اور کاٹ دار بنا دیا جاتا ہے۔ قومی اور مذہبی مقاصد کے حصول کے لئے اس پرچے نے حضرت صدیق ' عثمان ' علی ' فاروق اعظم نمبر اور حج نمبر شائع کئے۔ سیاسی شخصیات میں سے "ظہور الٰہی نمبر" اور "ضیاء الحق نمبر" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ۔ تنویر قیصر شاہد نے معاون مدیر کی حیثیت میں "قومی ڈائجسٹ" کی ادبی جہت کو مزید نمایاں کرنے میں قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں ۔ انہوں نے اس میں شخصیات نگاری کے ساتھ خود نوشت سوانح اور تراجم کے علاوہ تاریخی افسانوں اور ناولوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا ۔ "قومی ڈائجسٹ" اردو کے چند مقبول ادبی ڈائجسٹ ماہ ناموں میں شمار ہوتا ہے جس کی اخلاقی جہت اور پاکیزہ خیالی متاثر کرتی ہے۔ "قومی ڈائجسٹ" کے افق سے شعیب بن عزیز' محمد اسلم ڈوگر' تنویر قیصر شاہد اور خالدہ ہمایوں جیسے ممتاز ادبا مدیر کی حیثیت میں نمایاں ہوئے۔ مقبول جہانگیر نے اس کی ابتدائی جہت سازی میں حصہ لیا۔ تا ہم اس پرچے پر مجیب الرحمٰن شامی کی چھاپ بہت پختہ ہے۔ "قومی ڈائجسٹ" اردو کا ایک اہم ڈائجسٹ ہے جو قومی مزاج سازی میں پیش پیش رہتا ہے اور قومی انقلاب کے ایک خاموش داعی کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ چنانچہ اس کا تفریحی عنصر بھی بامعنی اور بامقصد ہوتا ہے اور اس کے پس پردہ خیال کی مثبت اور متحرک نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ الطاف حسین قریشی۔ اعجاز حسن قریشی

۲۔ اداریہ "اردو ڈائجسٹ" نومبر ۱۹۶۰ء

بارھواں باب

پاکستان میں روزنامہ اخبارات کے ادبی ایڈیشن

گذشتہ اوراق میں لکھا جا چکا ہے کہ مغرب میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ادب کو صحافت کے وسیلے سے فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں ادبا محض ادیب اور صحافی محض صحافی نہیں تھے بلکہ وہ تہذیب کے پیغمبر شمار ہوتے تھے اور عوام الناس ان کی تقلید بڑے پیمانے پر کرتے تھے۔ یہ ادبی روّیہ برّصغیر کی صحافت میں بھی فروغ پذیر نظر آتا ہے۔ انیسویں صدی میں ماسٹر رام چندر نے "فوائد الناظرین" اور "محب ہند" جیسے رسائل جاری کیے تو ان کا بنیادی مقصد صحافت کے ذریعے ہندوستانی عوام میں ذہنی فکری اور تہذیبی انقلاب برپا کرنا تھا۔ سر سید احمد خان نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا تو ان کے پیش نظر یورپ کے اخبارات "سپکٹیٹر" اور "ٹیٹلر" ہی کا نمونہ تھا۔ بیسویں صدی میں صحافت کے افق پر مولانا ابوالکلام آزاد (الہلال)، ظفر علی خان (زمیندار)، محمد علی جوہر (کامریڈ اور ہمدرد)، عبدالمجید سالک، اور غلام رسول مہر (انقلاب) جیسے صحافی نمایاں ہوئے۔ یہ سب لوگ بھی بنیادی طور پر ادیب اور قوم کے مصلح تھے۔ چنانچہ اس دور میں صحافت کا اسلوب خالصتاً ادبی نظر آتا ہے۔ اخبار خبر رسانی کا فریضہ بھی سر انجام دیتا تھا اور عوام کی ذہنی اور فکری آبیاری بھی کرتا تھا۔ ان اخبارات کے ساتھ جو عملہ وابستہ ہوتا تھا وہ عامل صحافی ہونے کے بجائے بنیادی طور پر ادیب ہوتا تھا اور زبان پر قدرت رکھنے کے علاوہ بیان کی ندرت سے قومی، ملکی اور سماجی مسائل پر رائے دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اس دور کی صحافت سے جو نام نمایاں ہوئے ان میں وحید الدین سلیم، نیاز فتح پوری، جالب دہلوی، اظہر امرتسری، چراغ حسن حسرت، میلا رام وفا، حاجی لق لق، مظفر احسانی، وقار انبالوی، ظہور عالم شہید، باری علیگ، گوپال متل، حمید نظامی، مرتضیٰ احمد خان میکش اور متعدد ایسے ادبا شامل ہیں جنھوں نے صحافت کے افق کو ادب کی روشنی سے تابناک بنایا۔ اس دور کے اخبارات میں طنز و مزاح کو ادبی زاویوں سے ابھارنے کی سعی کی گئی، فکری مضامین کے علاوہ سماجی حالات و واقعات پر منظوم تاثر پیش کرنے کا رواج بھی عام نظر آتا ہے۔ بعض اخبارات غزلیں شائع کرنے کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ مشاعروں کی روودادیں نمایاں طور پر پیش کی جاتی تھیں اور یہ کہنا درست ہے کہ اس دور

کی صحافت میں ادب کی خدمت کا جذبہ موجود تھا اور اس نے اپنے قارئین کے ذوق کی جزوی آبیاری بھی کی۔ اس حقیقت کو تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اردو ادب کے بیشتر مزاح نگار مثلاً سجاد حسین، مچھو بیگ ستم ظریف، اکبر الہ آبادی، حاجی لق لق، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، حمید نظامی، مجید لاہوری، اخبارات کے صفحات ہی سے ابھرے اور ان کے کالم "مطائبات" "حرف و حکایت" "افکار و حوادث" اور "سرراہے" کو تاریخی حیثیت حاصل ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا تو سماجی معاشرتی اور سیاسی مسائل کی نوعیت میں معتدبہ تبدیلی آئی۔ اس تبدیلی نے صحافتی اور ادبی تقاضوں کو بھی متاثر کیا، ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا تو اردو ادب کے قارئین بھی تقسیم ہو گئے اور دونوں نئے ملکوں میں ادبی رسائل کا حلقہ قرأت محدود ہو گیا۔ المیہ یہ ہوا کہ "ساقی" اور "نگار" جیسے رسائل دہلی اور لکھنؤ سے نقل مکانی کر کے پاکستان آئے تو کراچی میں اپنے قدم جما نہ سکے۔ پاکستان کے ادبی رسائل میں سے "ہمایوں" "شاہکار" "عالمگیر" اور "خیام" جیسے رسائل زیادہ لمبے عرصے تک اپنی اشاعت برقرار نہ رکھ سکے۔ "ادبی دنیا" اور "نیرنگ خیال" بھی سسک سسک کر زندگی کا سانس لے رہے تھے۔ ادب کی اس زبوں حالی کو مولانا چراغ حسن حسرت جو بنیادی طور پر ادیب تھے۔ دیکھ نہ سکے اور پروگریسو پیپرز کے زیر اہتمام میاں افتخار الدین نے "امروز" جاری کیا تو حسرت صاحب نے اس اخبار کے ذریعے ادب کو عوام تک پہنچانے کا بیڑا اٹھا لیا۔ اخبار "امروز" کے ساتھ فیض احمد فیض، ایوب کرمانی اور محمد سرور جامعی جیسے ادبا وابستہ تھے، اس لئے چراغ حسن حسرت کی تحریک رنگ لائی اور "امروز" میں ہفت روزہ ادبی صفحہ مستقل بنیادوں پر شائع ہونے لگا۔ اس کی الگ ادبی حیثیت قائم کرنے کے لئے اس کا نام "قسمت علمی و ادبی" قرار پایا۔ مولانا حسرت کو پاکستان کے اردو روز ناموں میں ادبی ایڈیشن کا بانی قرار دیا جانا مناسب ہے اور اس کے ساتھ ہی انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اخبار کے اس حصے کو ادبی معیار کے مطابق مرتب کیا اور اس صفحے پر خبر کو ادب پر غالب آنے کی اجازت نہیں دی، ان کے بعد مختلف اخبارات میں جتنے بھی ادبی ایڈیشن جاری کئے گئے ان سب میں "امروز" اور مولانا چراغ حسن حسرت ہی کی تقلید کی گئی۔

ان معروضات کے بعد اب آیئے اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں۔ سب سے پہلے "امروز" لیجئے۔

"امروز"

"امروز" کے ادبی ایڈیشن (قسمت علمی و ادبی) کی روایت مولانا چراغ حسن حسرت نے ہفت

روزہ ادبی صحافت کے اسلوب پر تشکیل دی تھی' چنانچہ اس پر ابتدا سے لے کر اب تک ایک مکمل ادبی پرچے کا گمان ہوتا ہے اس ایڈیشن میں ہمیشہ ایسے ادبی مضامین کو جگہ دی جاتی ہے جو بحث کو صحت مند انداز میں ابھاریں' نیا نکتہ اٹھائیں اور موضوع کو بالعموم ایک ہی قسط میں سمیٹ ڈالیں۔ تخلیقی ادب میں سے نظم' غزل' افسانہ' انشائیہ اور مختصر سفر ناموں کو بھی "امروز" میں پیش کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ "امروز" کو بیشتر نامور ادیبوں کا تعاون حاصل رہا ہے اور ابتدائی دور میں سعادت حسن منٹو' ابن انشا' ابراہیم جلیس جیسے ادبا کی نئی تخلیقات ادبی ایڈیشن میں شائع ہو چکی ہیں۔ ادارہ "امروز" سے ہفت روزہ رسالہ "لیل و نہار" شائع ہونا شروع ہوا تو "امروز" کا ادبی ایڈیشن کچھ عرصے کے لئے بند کر دیا گیا۔ اس دور کے آخری مدیر ظہیر بابر تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد جب "نوائے وقت" لاہور نے ادبی ایڈیشن کی اشاعت جاری کی تو "امروز" نے بھی اس ایڈیشن کی تجدید کی اور یہ نہ صرف تاحال جاری ہے بلکہ "امروز" ملتان کا ایک ادبی ایڈیشن الگ بھی شائع ہوتا ہے۔

"امروز" کے ادبی ایڈیشن کا مزاج ترقی پسندانہ ہے' یہ نئے تجربات کا خیر مقدم کرتا اور بحث کو صحت مند خطوط پر استوار کرتا ہے۔ نئے دور میں "امروز" کی ترتیب و تدوین کے فرائض عزیز اثری' مسعود اشعر' اظہر جاوید' سعید بدر اور سلمان بٹ نے سرانجام دئے۔ ان میں سے ہر ایک نے ادبی ایڈیشن کو اپنی تخلیقی افتاد کے مطابق مرتب کرنے اور اسے نئی جہت دینے کی کوشش کی' اظہر جاوید نے تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ چھوٹے شہروں کی مقامی ادبی سرگرمیوں کو اہتمام سے پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا' ان کے عہد ادارت میں ملتان' سرگودھا' کراچی' راولپنڈی اور پشاور کی ادبی رپورٹیں اس باقاعدگی سے چھپتی تھیں کہ "امروز" پر ایک ادبی ترجمان کا گمان ہونے لگا۔ جہاں ملک بھر کے ادیب جمع ہوتے تھے۔ اظہر جاوید نے "امروز" میں سالانہ ادبی جائزوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا "امروز" میں چونکہ تخلیقی ادب کو نمایاں مقام حاصل رہا ہے اس لئے متعدد نئے ادیب "امروز" کے صفحات سے ابھرے۔ اظہر جاوید کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے خواتین میں لکھنے کا ذوق پیدا کیا اور متعدد نئی خواتین کو "امروز" کے نردبان سے ادب کے بام بلند پر پہنچا دیا۔ سلمان بٹ نے کم و بیش اظہر جاوید کی ادبی حکمت عملی پر ہی کام کیا تاہم ان کو اس بات کا کریڈٹ ملنا چاہئے کہ وہ "امروز" کے صفحات سے ایک اچھے کالم نگار کی صورت میں سامنے آئے' انہوں نے " الف شاہ " اور " کالی داس " نام کے دو کالم نگاروں کو بھی روشناس کرایا۔ مباحث کو ابھارنے میں سرگرم حصہ لیا اور "امروز" کا ایک معرکہ آرا "انشائیہ نمبر" چھاپ کر انشائیہ کی تحریک کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ سلمان بٹ ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے اس لئے ان کا دور ادارت زیادہ طویل نہیں' اس مختصر سے عرصے میں انہوں نے ادبی ڈائریوں کی اشاعت کا سلسلہ چونکہ بند کر دیا تھا اس لئے ان کو منفی تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ عزیز

اثری کا عہد ادارت میں "امروز" مثبت انداز میں چراغ حسن حسرت کی صحت مند روایت کے مطابق ادب کی طرف پیش قدمی کرتا رہا۔ حالیہ دور میں اصناف ادب کی نظری بحث کو زیادہ فوقیت ملی ہے۔ ادبی ڈائریوں کا سلسلہ پھر جاری کر دیا گیا ہے۔ "امروز" کا سب سے ہنگامہ خیز جزو اس کا کالم "کچھ تو کہئے" ہے جس میں سابقہ مندرجات پر بحث و نظر کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ "امروز" کے ادبی ایڈیشن پر عزیز اثری کی چھاپ خاصی پختہ ہے اور یہ ہنگامی موضوعات کو ہوا دینے کے بجائے مستقل نوعیت کے مضامین شائع کرنے میں پیش پیش ہے۔ چنانچہ اس کی آواز اب بھی ادب کے اونچے ایوانوں میں سنی جاتی ہے۔ اب کچھ عرصے سے "امروز" کے ادبی صفحہ کی ادارت سعید کے سپرد ہے اور وہ اسے چراغ حسن حسرت کے معیار پر لانے میں کوشاں ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہنا شائد درست ہو کہ "امروز" کے ادبی ایڈیشن میں ادب کو غالب حیثیت حاصل ہے۔ اس کی نوعیت اب بھی ایک مکمل ادبی رسالے کی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے مدیران نے ادبی ایڈیشن سے اپنی ذات کی تجلیل و تزئین نہیں کی اور ادنیٰ مفادات کے لئے "امروز" کے ادبی معیار کو گرنے نہیں دیا۔ "امروز" کا ادبی مدیر اپنی ادبی حیثیت پر قناعت کرتا ہے لیکن اپنے لکھنے والوں کو آہستہ آہستہ شہرت و عظمت کے بلند مقام پر لے جانے میں کوشاں رہتا ہے۔

"ملّت"۔ "آفاق"۔ "حریّت"

"امروز" میں ادبی ایڈیشن کو جو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کی تقلید میں اخبار "ملّت" اور "آفاق" نے لاہور میں' اور اخبار "حریّت" نے کراچی میں ادبی ایڈیشن جاری کیا۔ ملّت کے ادبی ایڈیشن کے نگران عبدالرحیم شبلی اور "حریّت" کے انچارج عبدالرؤف عروج تھے' شبلی بی کام اس سے قبل "عالمگیر" اور "خیام" جیسے ادبی پرچوں کے مدیر رہ چکے تھے اس لئے انہوں نے "ملّت" کو بھی ادبی پرچے کا ہی نعم البدل بنانے کی کوشش کی۔ روزنامہ "آفاق" کے ادبی ایڈیشن نے مجموعی طور پر "امروز" ہی کی شکل و صورت اختیار کی ان دونوں پرچوں نے اس دور کے بڑے ادبا کا تعاون حاصل کیا اور اپنے صفحات پر اعلیٰ درجے کا ادب پیش کرنے کی کاوش کی۔ "حریّت" کی منفرد عطا اس کے انٹرویوز ہیں۔ اس پرچے نے شائد پہلی دفعہ ادیبوں سے طویل انٹرویو حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا جسے پہلے حیرت کی نظر سے دیکھا گیا پھر اس میں قارئین کی دلچسپی پیدا ہو گئی "حریّت" کا ایک خاص سلسلہ یہ تھا کہ اس کا نامہ نگار کسی بڑے ادیب کے ساتھ پورا ایک دن گزارتا۔ پھر اس کی پوری روداد ادبی ایڈیشن میں شائع ہوتی۔ اس قسم کے مضامین سے ادیب کے عادات و خصائل کے بارے میں بعض

اوقات نادر معلومات حاصل ہو جاتی تھیں جو بعد میں ادب کے طالب علموں کے کام آتیں اور انہیں تحقیق و تنقید میں مدد دیتیں۔ "ملت" اور "آفاق" تو کچھ عرصے کے بعد بند ہو گئے اور ان کے ساتھ ہی ادبی ایڈیشن کی اشاعت بھی ختم ہو گئی تاہم "حریت" کی اشاعت جاری رہی لیکن کچھ عرصے کے بعد اس اخبار کے ادبی ایڈیشن کا سلسلہ بھی جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۷۶ء کے لگ بھگ لاہور کے اخبارات میں ادبی ایڈیشن کی نشاۃ ثانیہ برپا ہوئی تو اخبار "حریت" کراچی میں بھی ادبی ایڈیشن بحال کر دیا گیا لیکن اب اس ایڈیشن کی ہیئت ترتیبی میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ "حریت" کا ادبی ایڈیشن جمعہ کے دن چھپتا ہے اور اس کے مدیر ممتاز شاعر اور ادیب عبدالرؤف عروج ہیں۔

تنقیدی نظر سے دیکھئے تو "حریت" کو ایک آزاد اخبار کی حیثیت حاصل ہے۔ عبدالرؤف عروج اچھی تحریریں تلاش کرنے میں ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں اور وہ اردو زبان و ادب کے نادر شاہ پارے "حریت" کے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔ "حریت" نے اپنے ابتدائی دور میں انٹرویو کی جو طرح ڈالی تھی، اسے نئے دور میں بھی جاری رکھا۔ "حریت" کے صفحات سے شمع زیدی اور شکیلہ خان جیسی کامیاب انٹرویو لینے والی خواتین ابھریں۔ "حریت" میں ادیب کو اس کی ادبی حیثیت کی اساس پر اہمیت دی جاتی ہے۔ اس پرچے کے صفحات پر مرحوم ادیبوں کی سالانہ برسیوں پر ان کی مجموعی ادبی خدمات کا جائزہ لینے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کی کاوش بڑے اہتمام سے کی جاتی ہے۔ پرچے کا متعدبہ حصہ شعری تخلیقات کے لئے وقف ہوتا ہے، لیکن اصناف نثر میں سے افسانہ جیسی صنف کو شاذو نادر ہی جگہ ملتی ہے۔ "حریت" نے انشائیہ کی صنف کو مقبول بنانے میں بھی قابل قدر کام کیا ہے۔ کراچی کی ادبی سرگرمیوں کا احاطہ ایک عرصے تک محترمہ نوشین کرتی رہیں۔ لاہور کی ادبی سرگرمیوں کے لئے "لاہوریات" کا کالم وقف رہا۔ جسے پہلے محمد یاسین بسمل اور بعد میں فار قلیط لکھتے رہے۔ اب یہ کالم "سدیدیات" کے عنوان سے شائع ہوتا ہے "حریت" میں کتابوں کے تبصروں کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مختصر مگر جامع اور غیر جانبدارانہ تبصرے "حریت" کی انفرادیت شمار ہوتی ہے۔ عبدالرؤف عروج ایک قادر الکلام ادیب اور شاعر ہیں۔ بعض اہم مواقع پر اگر انہیں بر وقت مواد دستیاب نہ ہو تو پورا ادبی ایڈیشن وہ خود لکھ ڈالتے ہیں۔ "حریت" متوازن اور پر سکون ادبی ایڈیشن پیش کرتا ہے اس لئے ادبی حلقوں میں ہمیشہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

"نوائے وقت" ۔ لاہور

لاہور کے اخبارات میں ادبی ایڈیشن کی نشاۃ ثانیہ برپا کرنے کی خدمت ۱۹۷۶ء کے لگ بھگ اخبار "نوائے وقت" نے سرانجام دی اور اس کے پس منظر میں چند ایسے نوجوانوں کی مساعی کار فرما تھیں جو ادب میں تازہ وارد تھے' بطور صحافی معروف ہو چکے تھے اور ادب میں مقام اور نام پیدا کرنے کے آرزو مند تھے۔ "نوائے وقت" کے بانی جناب حمید نظامی تحریک پاکستان کے ایک سرگرم کارکن اور ادب کو زندگی کی بامعنی سرگرمی سمجھنے والے ادیب تھے' وہ ادیبوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جن کے لئے صحافت قومی نصب العین کا درجہ رکھتا تھا' ان کا ایقان تھا کہ اخبار کو حصول آزادی کی تحریک میں ایک مؤثر آلہ عمل کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں "نوائے وقت" نے روزانہ اخبار کی صورت اختیار کی تو اس کی ادبی جہت برقرار رکھی گئی اور زبان و بیان کی صحت کو فوقیت دی گئی' اس کی ادبی جہت سازی میں حمید نظامی کے اداریے اور "سرراہے" کے کالموں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ آزادی کے بعد قوم کی ادبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اسی ادارے سے رسالہ "مخزن" اور ہفتہ وار "قندیل" جاری کئے گئے جن کی ادارت علی الترتیب مولانا حامد علی خان اور جناب شیر محمد اختر نے سرانجام دی۔ یہ دونوں پرچے اب بند ہو چکے ہیں لیکن ان کی ادبی خدمات اور ادارہ نوائے وقت کے ادبی مزاج سے انکار ممکن نہیں۔ گمان غالب ہے کہ "نوائے وقت" میں ۱۹۷۶ء کے لگ بھگ ادبی ایڈیشن کا اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو اس فیصلے پر اس کے سابقہ ادبی مزاج کے اثرات ضرور ثبت ہوئے ہوں گے۔ لیکن اب اس ایڈیشن کو چونکہ ادارت کے لئے نوجوان ادبا کا تعاون حاصل ہوا اس لیے اس کی ایک نئی جہت سامنے آئی جو اس کے سابقہ ادبی مزاج سے مختلف تھی۔

"نوائے وقت" کے ادبی ایڈیشن نے اپنے دامن میں تخلیقی اصناف کے ادب پاروں کو سمیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ ابتدا میں اس کے صفحات پر ایسے مضامین کو جگہ دی گئی جو ادب کے ساکن سمندر میں طغیان پیدا کر دیں اور ہر جگہ موضوع بحث بن جائیں' "نوائے وقت" کی فکری جہت پاکستان اور پاکستانیت سے عبارت ہے اس لئے اس میں نظریاتی مباحث زیادہ پیدا کئے گئے' پاکستان اور ادب اسلامی' اقبالیات' ادب میں نظریے کی اہمیت' جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا اور بحث و نظر کا سلسلہ عرصے تک جاری رہا۔ بحث و نظر کا یہ انداز اصناف کی تنقید میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ اردو سفرنامہ' انشائیہ' نثری نظم' ادب میں دھرتی پوجا کا مسئلہ' یوسف خان کمبل پوش کا سفرنامہ عجائبات فرنگ' پر "نوائے وقت" میں خاصی ہنگامہ خیز بحث ہوئی اور یہ کئی ہفتوں تک جاری رہی۔ "نوائے وقت" کے ادبی ایڈیشن کے اس دور کو اس کا سنہری دور قرار دیا جائے تو یہ درست ہو گا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد

ادب پر خبر غالب آ گئی اور ادبی ایڈیشن کے مدیر نے شخصیت سازی سے ثمرات سمیٹنے کی کوشش شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "نوائے وقت" لاہور کا ادبی ایڈیشن زوال کا شکار ہو گیا اور اب اگر اس کا نقش قائم ہے تو اس میں میرزا ادیب کا کالم "اذکار و افکار" اور بیدار سرمدی کا کالم "صبح و شام" اساسی کردار ادا کر رہے ہیں۔

"نوائے وقت" پاکستان کا کثیر الاشاعت اور نظریہ ساز اخبار ہے۔ ملتان' کراچی اور راولپنڈی سے اس کے الگ الگ ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ متذکرہ شہروں کے ادبی ایڈیشنوں کا مزاج' لاہور کے ادبی ایڈیشن کے مزاج سے یکسر مختلف اور "نوائے وقت" کے صحافتی مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ ملتان کے ادبی ایڈیشن کو تنقیدی نظر سے دیکھیں' تو اس میں لاہور جیسی طغیانی کیفیت نظر نہیں آتی۔ اس ایڈیشن کو ایک طویل عرصے تک عبدالطیف اختر مرتب کرتے رہے ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ خود پس پردہ رہ کر ادب کی خدمت کرتے تھے اور "نوائے وقت" کے صفحات میں ملتان کے گرد و پیش کے ادبا کی تخلیقات کو زیادہ جگہ دیتے۔ اس پرچے میں لطیف اختر کا ذاتی کالم بھی خاصے کی چیز ہوتا تھا اور اس میں ان کی وضعداری اور شائستگی ہمیشہ قائم رہتی۔ "نوائے وقت" ملتان کے ادبی ایڈیشن کی ادارت اب عارف معین بلے سر انجام دیتے ہیں۔ انہوں نے اسے ایک با معنی اور با وقار ادبی پرچے کی حیثیت دے دی ہے اور اب اس میں مختلف اصناف کے نمائندہ ادب پارے چھپتے ہیں۔ عارف معین کا مزاج کلاسیکی ہے' وہ ادبی ایڈیشن میں بھی ادب کی تہذیبی قدروں کو ہی سر بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے ادیبوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو ادب کے جمالیاتی زاویئے اجاگر کرتے ہیں۔ خطہ ملتان کے ادیبوں کی آواز بیرونی حلقوں میں بہت کم سنی جاتی ہے۔ عارف معین نے "نوائے وقت" کے ذریعے ملتانی ادب کو دساور پہنچانے کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے اور لاہور میں بھی کئی ایسے قاری پیدا کئے ہیں جو ملتان کا ادبی ایڈیشن باقاعدگی سے خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ اس ایڈیشن سے عارف معین ایک ادبی رپورتاژ نگار کے طور پر بھی ابھرے' عارف معین ادبی محفلوں کا مشاہدہ زیرک نگہی سے کرتے ہیں اور پھر جزئیات کو حقیقت بیانی سے پیش کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالم ایک بڑے ادبی طبقے میں پسند کئے جاتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی صاف گوئی بعض اوقات ردِ عمل بھی پیدا کرتی ہے' لیکن عارف معین کا دل چونکہ صاف ہے اس لئے ان کے خلوص پر کبھی آنچ نہیں آئی' اور وہ ایسے ادبی صحافی کے طور پر ابھرے ہیں جو قلم کی عصمت کا تحفظ کرتے ہیں اور اسے کسی قیمت پر فروخت نہیں کرتے۔

"نوائے وقت" راولپنڈی کے ادبی ایڈیشن کی مزاج سازی میں اختر امان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اختر امان ادب کے زیرک طالب علم اور ادب کی سماجیات کے بطون میں جھانکنے والے صحافی

ہیں۔ ان کا کالم "سات رنگ" ادب کے علاوہ ادبی سیاست کو بھی موضوع بناتا رہا ہے اس لئے اس میں اکثر اوقات بے حد شوخ رنگ ابھر آتے تھے اور گھن گرج کا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔ اختر امان نے راولپنڈی ایڈیشن کو ادبی دنیا کا ایک نمائندہ اخبار بنانے اور ادب کے ساتھ ادیب کو بھی اہمیت دینے کی سعی کی' راولپنڈی میں ظہور میں آنے والا ہر اہم ادبی واقعہ "نوائے وقت" کے صفحات پر رپورٹ ہونے سے رہ نہ سکتا تھا۔ اختر امان نے کہنہ مشق ادیبوں کے ساتھ ساتھ نئے جوہر کو نکھارنے میں بھی قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ راولپنڈی کے گرد نواح کے بہت سے ادیبوں کی اولین رونمائی نوائے وقت سے ہوئی اور اب یہ ادب کے آسمان پر ستاروں کی طرح روشن ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں اس ایڈیشن میں ادارتی تبدیلیاں آئی ہیں' راولپنڈی ایڈیشن کے نئے مدیر انوار فیروز ہیں جو سنجیدہ فکر صحافی اور خوش نظر شاعر ہیں۔ انہوں نے ادارت سنبھالتے ہی اس ایڈیشن کے شوخ رنگوں کو مدہم کرنے اور سنجیدگی کا ہلکا آسمانی رنگ غالب کرنے کی سعی کی ہے' دوسری بڑی تبدیلی یہ ہے کہ ان صفحات پر اب دور دراز کے علاقوں کے ادیبوں کی تخلیقات کو بھی جگہ ملنے لگی ہے۔ انوار فیروز راولپنڈی ایڈیشن کی کلاسیکی جہت آشکار کرنے اور اسے ایک مکمل ادبی پرچہ بنانے میں کوشاں ہیں' کراچی ایڈیشن کی ادارت راشد نور کرتے ہیں اور یہ توازن و اعتدال کی مثال ہے۔

"جنگ"

اخبار "جنگ" لاہور کا ادبی ایڈیشن حسن رضوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ حسن رضوی کے مزاج کا تمام تنوع اس ایڈیشن سے منعکس ہوتا ہے۔ اس ایڈیشن کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ادب کے سماجی امور کو نمایاں اہمیت دی جاتی ہے' ادبی معاشرہ' ادب کے مسائل اور ادبی کی شخصیت بحث فراواں کا موضوع بنتی ہے لیکن اس ایڈیشن نے کبھی ادبی رسالے کی جگہ لینے کی کوشش نہیں کی' دوسری بات یہ کہ "جنگ" نے ادبی فیچروں کو مرتب کرنے میں گہری دلچسپی لی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں بھی پیدا کی ہیں۔ یہی وجہ ہے اس ادبی ایڈیشن کا کوئی پختہ رنگ نہیں بنا لیکن اس میں دلچسپی کے عناصر کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ ادبی ایڈیشن کی ابتدا میں متعدد نامور ادیبوں مثلاً سہیل احمد خان' مشکور حسین یاد' مرتضیٰ زیدی' میر جملہ لاہوری' اجمل نیازی اور سعادت سعید نے مختلف النوع کالموں کے سلسلے شروع کئے لیکن آہستہ آہستہ سب پس منظر میں چلے گئے اور اب صرف "باتیں ہماریاں" از آغا سہیل اور حسن رضوی کا ادبی و ثقافتی کالم ہی اس ایڈیشن کی پہچان رہ گیا ہے۔ اخبار "جنگ" کی منفرد عطا اس کے پینل انٹرویوز ہیں۔ یہ ایسا سلسلہ ہے جس کی تقلید دوسرے

اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں میں بھی ہوئی ۔ لیکن جنگ کے انٹرویوز میں چونکہ ادب کے بجائے ادبی شخصیت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور معاصر ادب اور ادیب کے بارے میں آرا کو فوقیت ملتی ہے اس لئے یہ زیادہ دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور اکثر اوقات شدید رد عمل بھی پیدا کرتے ہیں ' اس اخبار کے بعض انٹرویوز کی صدائے بازگشت تو بر صغیر ہند میں بھی سنی گئی ہے ۔ "جنگ" چونکہ آزاد اخبار ہے اس لئے اس کی ادبی ایڈیشن میں بھی ہر قسم کے نظریات کو جگہ مل جاتی ہے ۔ اس ایڈیشن نے مرتّب کا سماجی مرتبہ بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حسن رضوی کے بغیر "جنگ" کا ادبی ایڈیشن پھیکا نظر آنے لگتا ہے۔ صحافتی زاویے سے "جنگ" کا مستقل کالم " ہے خبر گرم .... " اردو ادب کی نیوز سروس کا درجہ رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن نے ادب کی خدمت بالواسطہ طور پر کی ہے لیکن ادیب کو معاشرے کے وسیع طبقے میں متعارف کرانے ' پیش کش کے خوبصورت انداز اور ادبی ایڈیشن کو ہمہ رنگ تصویروں کا مرقع بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ' چنانچہ اگر کہا جائے کہ "جنگ" کا ادبی ایڈیشن ادیب کی انا کو اچھے ادبی پرچے میں اشاعت کی بہ نسبت زیادہ تسکین دیتا ہے تو یہ غلط نہیں ہو گا۔ حسن رضوی اردو ادب کا سب سے با خبر رپورٹر اور عامل صحافی ہے وہ ادبی ایڈیشن میں ادیب کی دکھتی رگ پر بھی انگلی رکھ دیتا ہے اور پھر اسے تصویر کے خوبصورت چوکھٹے میں سجا کر اس کا دل بھی جیت لیتا ہے۔ حسن رضوی ہر ادیب کو اس کے ظرف کے مطابق مقام دیتا ہے' یعنی تصویر کی اشاعت سے خوش ہونے والے عظیم ادیب کو ایک زرنگار مرصّع کرسی پر بٹھا کر اور بڑی تصویر چھاپ کر' تو دوسری طرف نظریات کے فروغ میں دلچسپی لینے والے ادیب کے افکار کو اشاعت دے کر حسن رضوی نے اس ایڈیشن کو اپنی رگ جان بنایا ہے تو اس سے اپنی شخصیت کا ایک مخصوص نقش بھی قائم کیا ہے۔

"جنگ" راولپنڈی کا ادبی ایڈیشن ممتاز افسانہ نگار مظہر الاسلام مرتّب کرتے ہیں ۔ اس ایڈیشن کا مزاج لاہور ایڈیشن سے بالکل مختلف ہے ۔ محدود ضخامت کے تخلیقی مضامین افسانے اور انشائیے بھی اس میں جگہ پا جاتے ہیں اور اکثر اوقات عظیم کتابوں اور مصنفوں کے اقتباسات بھی شریک اشاعت کر لئے جاتے ہیں مظہر الاسلام نے اس ایڈیشن کو عالمی ادب کا ڈائجسٹ بنانے کی زیادہ کاوش کی ہے ۔ انہوں نے ادبی زاویوں کی پاسداری خلوص اور محبت سے کی ہے ۔ "جنگ" کراچی کا ایڈیشن صنعتی شہر کی کاروباری ذہنیت کا شکار نظر آتا ہے ۔ یہ ایڈیشن ضابطے کی کارروائی تو پوری کر دیتا ہے لیکن ادب پر کوئی امٹ اثر پیدا نہیں کر سکا ۔ "جنگ" کراچی کے ادبی ایڈیشن کو ادیب اور ادب کے درمیان ایک رابطہ پل کی حیثیت دی جا سکتی ہے ۔

"مشرق"

لاہور کے اخبارات میں سے "مشرق" کے ادبی ایڈیشن نے ایک طویل عرصے تک رنگا رنگی پیدا کی، اس ایڈیشن کو مختلف اوقات میں مختلف ادیب مرتب کرتے رہے ہیں۔ مثلاً سرفراز سید نے اسی ہمہ جہت سماجی فورم بنانے کی کوشش کی، مختلف زاویہ نظر کے ادیبوں کا تعاون حاصل کیا اور کئی ادبی سلسلے شروع کیے۔ سرور مجاز نے "مشرق" کے ادبی ایڈیشن کو کلاسیکی جہت دی اور چھوٹے شہروں کے ادیبوں کو بالخصوص نمایاں کیا۔ اس ایڈیشن کی شناخت طویل عرصے تک انتظار حسین کے کالم "باتیں اور ملاقاتیں" سے ہوتی رہی انتظار حسین اپنے رواں دواں انداز اور مخصوص زاویہ نظر سے ادب اور ادیب کو موضوع بناتے اور چند ایسے انوکھے نکات اٹھا دیتے کہ ان کا کالم ادبی حلقوں کا سرگرم موضوع بن جاتا۔ یہ ایڈیشن اب بھی شائع ہوتا ہے لیکن اس میں انتظار حسین کا شوخ و شنگ کالم موجود نہیں۔ اس کمی کو سرفراز احمد سید پورا کرتے ہیں' اور بحث و نظر کے ہنگامی زاویے ابھارتے ہیں سرفراز سید "مشرق" سے علیحدہ ہوئے تو ادبی ایڈیشن کی ادارت کی تسلیم احمد تصور کو تفویض ہوئی۔ انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں اس کے شوخ رنگ ابھار دیئے ہیں۔

"جسارت"

کراچی کے اخبارات میں سے "جسارت" کا ادبی ایڈیشن ایک طویل عرصے سے ادبا کی توجہ کا مرکز ہے۔ محمد صلاح الدین کے زمانہ ادارت میں اس ایڈیشن کے مندرجات میں سے خامہ بگوش کا کالم "سخن در سخن" پورے برّصغیر میں دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ادبی ایڈیشن کے پس پردہ انچارج ڈاکٹر معین الدین عقیل تھے۔ انہوں نے "جسارت" کو علم و ادب کا مرقّع بنانے کی کاوش کی اور اسے ایک بلند معیار ہفت روزہ بنا دیا۔ ان کے بعد سعید قریشی اور راشد عزیز نے اس کی ادبی جہت کو برقرار رکھا اور خیال انگیز مباحث ابھارے۔ ان دو اصحاب کے دور ادارت میں "سخن در سخن" کا کالم ہفت روزہ "تکبیر" میں منتقل ہو گیا اور اس کی جگہ زود اندیش کے کالم "دید و باز دید" نے لے لی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کالم نے شدید طغیان پیدا کیا۔ "جسارت" چونکہ نظریاتی اخبار ہے اس لئے ادبی ایڈیشن میں بھی اس اخبار نے اپنے نظریاتی مخالفین کی خبر لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور "دید و باز دید" کے عمل سے بہت سی پس پردہ کہانیاں صفحہ اخبار پر پیش کر دیں۔ اس اخبار سے راغب شکیب بطور کالم نگار متعارف ہوئے اور "شاہینوں کے شہر" کے نام سے ڈائری لکھتے رہے۔ اسلام آباد کی

ڈائری "کوہ کن" اور ملتان کی رپورٹ "ملتانی صاحب" لکھتے ہیں۔ ان سب رپورٹوں میں جسارت کی نظریاتی حکمت عملی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے' چنانچہ یہ اخبار ادبی حلقوں میں سب سے زیادہ رد عمل پیدا کرتا ہے۔ اس کی جہت دوسرے تمام اخباروں سے مختلف ہے "جسارت" کے ادبی ایڈیشن کی ادارت کچھ عرصہ راشد عزیز نے کی اور اب یہ عامر صدیقی صاحب کو تفویض ہوئی ہے اور وہ اس کا نیا مزاج بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بعض کالم جو کبھی طغیان فکر پیدا کرتے تھے اب یا تو بند کر دئے گئے ہیں یا ان کے لکھنے والے منقار زیر پر ہیں۔

میں نے اس تنقیدی جائزے میں ملک کے چند بڑے روزانہ اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں کا جائزہ پیش کیا ہے ۔ ادبی ایڈیشن اگرچہ روزانہ اخبار کی ضرورت نہیں تاہم اردو صحافت میں اسے اب نمایاں اہمیت ملنے لگی ہے اور متعدد اخبارات اس قسم کے ایڈیشن شائع کر رہے ہیں' چنانچہ " وفاق " لاہور نے خاصے لمبے عرصے تک اشرف قدسی کی ادارت میں ادبی ایڈیشن شائع کیا " قومی آواز " ملتان میں ادبی ایڈیشن " دبستان " کے نام سے شائع ہوتا رہا اور اسے جاوید اختر بھٹی مرتب کرتے تھے ۔ گذشتہ دنوں اس اخبار نے "قدرت اللہ شہاب نمبر" شائع کیا تھا ۔ اخبار " مرکز " راولپنڈی " امن " کراچی " آفتاب " لاہور ۔ "اخبار" " حیدر " "راولپنڈی" "مغربی پاکستان" لاہور ' " عوام " فیصل آباد کے ادبی ایڈیشنوں کی صدائے باز گشت بھی دور دور تک سنی جاتی ہے ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا روزانہ اخبارات کے ادبی ایڈیشن فروغ ادب میں کچھ معاونت کر رہے ہیں ؟

جواب عرض ہے کہ ' اب چراغ حسن حسرت جیسے ادبا چونکہ اخبارات کو میتر نہیں ہیں اس لئے اخبارات میں ادب کی خدمت پس پشت ڈال دی گئی ہے ' معدودے چند اخبارات ایسے ہیں جو ادب کے فروغ کی خدمت خلوص اور جذبے سے سر انجام دے رہے ہیں اخبارات کے ادبی صفحے کی ادارت چونکہ نوجوانوں کے ہاتھ میں آگئی ہے اس لیے وہ ادب کے بجائے خبر کو زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں ' ادبی صفحے پر مقالہ ' نظم ' افسانہ ' یا انشائیہ کی اشاعت کے بر عکس ' ادیب کی تصویر کو زیادہ توجہ حاصل ہے ' اس صفحے پر ادیب کی ذات پر جملہ اچھالنے اور کردار شکنی کا رجحان بھی فروغ پانے لگا ہے جس سے ادیب کا معاشرتی امیج مجروح ہو رہا ہے ' عمل اور رد عمل سے اکثر اوقات شدید ترین گرد اڑتی ہے ' جس سے ادیب کا چہرہ گرد آلود ہو جاتا ہے اور پھر اسے صاف کرنے کے مواقع میسر نہیں آتے ۔ نئے لکھنے والوں پر ادبی ایڈیشنوں نے صحت مند اثرات مرتب نہیں کئے وہ ادبی ایڈیشن کی نظر گردانی کو ہی ادبی مطالعہ تصور کرنے لگے ہیں ' ادب کی سیاست کے علاوہ تیکھے کردار شکن جملے میں ان کی دلچسپی بڑھ گئی ہے ' چنانچہ میں نے ایک دفعہ عرض کیا تھا کہ اخبار کے فلمی صفحے پر کوئی ایکٹر دوسرے ایکٹر کی توہین نہیں کرتا لیکن ادبی صفحے پر کسی ادیب کی عزت محفوظ نہیں ۔ اہم بات یہ ہے کہ مالکان

اخبار بھی ادبی ایڈیشن کو اخبار کی ضرورت تصور نہیں کرتے اور وہ اسے فرض کفایہ کے طور پر ہی ادا کر رہے ہیں چنانچہ جب بیش قیمت اشتہار میسر آجاتا ہے تو ادبی ایڈیشن شائع ہی نہیں کیا جاتا۔ متعدد اخبارات نے یا تو ادبی ایڈیشن بند کر دیا ہے یا اس کی ضخامت محدود کر دی ہے۔ اس بحث کی روشنی میں یہ کہنا درست ہے کہ ادبی ایڈیشن سے ادبی خدمات کا کام لیا جا سکتا ہے لیکن فی الوقت ادب کی خدمت بہت کم اور بالواسطہ انداز میں ہو رہی ہے۔
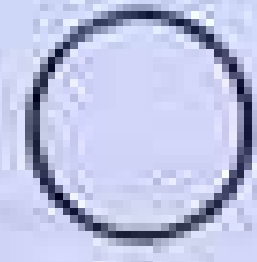
حاصل مطالعہ

پاکستان میں ادبی رسائل کے زیر نظر تاریخی ، تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے میں اب ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ حاصل مطالعہ اخذ کر سکیں ۔ یہ حقیقت دلچسپ ہے کہ مغرب میں ادبی جریدہ نگاری نے صحافت کے بطن سے جنم لیا تھا لیکن انیسویں صدی میں جب ماسٹر رام چندر ، اور سر سید احمد خان نے عوام کے ذہنی افق کو وسیع کرنے اور انہیں تہذیب کے نئے اسباق پڑھانے کا عہد کیا تو اسکے لئے ادب کو وسیلہ بنایا اور اپنی آواز وسیع طبقے تک پہنچانے کے لئے "فوائد الناظرین" اور "تہذیب الاخلاق" جیسے رسالے جاری کئے ۔ ماسٹر رام چندر اور سر سید احمد خان کا یہ اقدام خیر کثیر کی تقسیم عام کا اقدام تھا اور اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ برصغیر میں ادبی جریدہ نگاری کو منافع بخش کاروبار تصور نہیں کیا گیا ۔ اسے ایک مشن کی حیثیت حاصل رہی اور حسرت موہانی سے لے کر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی تک جو لوگ بھی اس میدان میں آئے ، ان سب نے اسے ایک تہذیبی اور نظریاتی مشن کے طور پر ہی اختیار کیا ۔ چنانچہ پاکستان کی ادبی جریدہ نگاری میں ایک یہ بات بالخصوص نمایاں نظر آتی ہے کہ ادب کو تحرک اور تازگی عطا کرنے میں ان رسائل کا حصہ زیادہ ہے جن کی ادارت کسی ممتاز صاحب نظر اور نامور ادبی شخصیت نے سنبھال رکھی تھی "ادبی دنیا" "ساقی" "نیا دور" "فنون" "سیپ" "اوراق" جیسے رسائل کو عہد ساز کہنا اس لئے مناسب ہے کہ ان کے مدیران نے اردو ادب کو ایک مخصوص جہت دینے کی کوشش کی ، اپنے رسالے کو فکر و نظر کا نقیب بنایا ۔ ادب کے اہم موضوعات پر مباحث پیدا کئے ، نئے سوال اور نئے تجربے کو اہمیت دی ۔ چنانچہ ادب کی جوئے نرم رو میں ایک طغیان کی کیفیت پیدا ہو گئی اور اس سے پورے ادب کی قلب ماہیت کے آثار پیدا ہوئے ، یہ کیفیت ہمیں ان رسائل میں نظر نہیں آتی جن کے ناشرین محض مدیر بننے کے شوق میں ادبی دنیا میں آئے اور مضامین نظم و نثر کے روایتی مجموعے پیش کرتے رہے ۔

آزادی سے قبل کم ضخامت کے ماہانہ رسالے کو فروغ حاصل تھا ، رسالہ پابندی وقت سے شائع ہوتا ، طغیان فکر و نظر پیدا کرتا اور پھر مہینہ بھر تک اس کے مضامین پر سرگرم بحث کی جاتی ،

آزادی کے بعد ضخیم ادبی پرچوں نے فروغ حاصل کر لیا " سویرا " نے رسالے کو کتاب کا متبادل بنا دیا تھا۔ " نقوش " کے خاص نمبروں نے اسے پوری ایک لائبریری کی حیثیت دے دی۔ فائدہ یہ ہوا کہ ضخیم مضامین جو پہلے کتابی صورت میں چھپا کرتے تھے اب دبیز ادبی پرچے میں شائع ہونے لگے۔ دوم یہ کہ قاری کو ایک ہی وقت میں مطالعے کا بہت سا مواد میسر آنے لگا۔ نقصان یہ ہوا کہ باقاعدہ مطالعے کی عادت اثر انداز ہوئی اور قاری پورا رسالہ پڑھنے کے بجائے چند منتخب تحریروں کے مطالعے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اب ضخیم ادبی پرچے کے چھپنے کی اطلاع چونکہ اخبارات سے ملتی تھی اس لئے رسالے کی براہ راست خریداری کا نظام متاثر ہوا اور ضخیم پرچہ ادب کی تحریک پیدا کرنے اور عمل اور رد عمل کی چکا چوند کو منظر پر ابھارنے سے قاصر ہو گیا۔

اس مطالعے کے دوران ایک یہ المناک حقیقت بھی سامنے آئی کہ ادبی رسائل کی اشاعت کا نظام خاصہ بے قاعدہ ہے آزادی سے پہلے ادبی پرچے کی خریداری کو ایک تہذیبی عمل سمجھا جاتا تھا۔ "ادبی دنیا" "ساقی" "ہمایوں" اور "نگار" جیسے رسائل کا سالانہ خریدار بننا ایک سماجی اعزاز تصور ہوتا تھا پرچہ بک سٹال پر فروخت ہونے کے بجائے ہر ماہ باقاعدگی سے قاری کے گھر پر ایک معزز مہمان کی طرح آتا اور مہینہ بھر تک عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا۔ آزادی کے بعد قاری اور مدیر کا یہ محبت کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اب رسالہ سٹال پر فروخت ہونے لگا' اور قاری کی توجہ کھینچنے کے لئے معنوی خوبیوں کے بجائے صوری آرائش پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ ڈائجسٹ رسالوں کا فروغ بھی اس عدم دلچسپی کا ہی زائیدہ ہے۔ ادبی رسالہ قاری کو اپنی بلند نظر سطح پر لانے اور اس کے ذہن و فکر کو منعکس کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ڈائجسٹ رسائل نے قاری کی ضرورت کو اہمیت دی اور اس کی طلب کے مطابق مواد فراہم کیا' نتیجہ یہ نکلا کہ ادبی پرچے کی اشاعت جو پہلے ہی محدود تھی مزید کم ہو گئی اور اس طرح جذبے کی تطہیر کا عمل بھی زوال آمادہ ہو گیا۔ اس سب کے باوجود بعض ادبا نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھا کہ ادبی جریدہ محض حال کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ یہ مستقبل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور آج کا ادب جب ماضی کا حصہ بن جاتا ہے تو ادبی جریدہ ہی اس اثاثے کا خزینہ ثابت ہوتا ہے۔ اس خدمت کو ممتاز ادبی رسائل کے علاوہ رہ نوردان شوق بھی سر انجام دے رہے ہیں اور ادبی رسائل کی اتنی بڑی تعداد کو دیکھ کر ہمارے تن بدن میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

اس مطالعے کے دوران ایک یہ بات بھی طمانیت بخش نظر آئی ہے۔ کہ تعلیمی اداروں کے مجلوں کا رجحان اب اشاعت ادب کی طرف زیادہ ہو گیا ہے۔ بیشتر رسائل اگرچہ سال میں ایک آدھ مرتبہ ہی چھپتے ہیں تاہم ان میں نامور اور ممتاز ادبا کی تخلیقات حاصل کر کے پیش کی جاتی ہیں اور یوں طلبہ کی تربیت کا موقعہ پیدا کر لیا جاتا ہے۔ "راوی" "فاران" "محور" اور" علم و آگہی" کو یہ اعزاز

حاصل ہے کہ ان کے بعض شمارے خصوصی موضوعات پر شائع ہوئے اور اب انہیں حوالے کی کتابوں کا درجہ حاصل ہے۔

طنز و مزاح زندگی کو بہجت و مسرت عطا کرتے ہیں آزادی کے بعد اس نوع کے معدودے چند رسالے منظر عام پر تو آئے لیکن ان کا معیار بلند نہیں تھا اور یہ مزاح کا شائستہ زاویہ پیدا کرنے کے بجائے مضحک جملے او رلطیفوں اور پھبتیوں کو فروغ عام دیتے تھے' اس کمی کو " اردو پنچ " نے پورا کرنے کی کوشش کی لیکن یہ پرچہ بھی اب قحط تخلیق مزاح کا شکار نظر آتا ہے۔ خواتین کے رسائل پر ایک طویل عرصے تک مرد مدیران کا قبضہ رہا' آزادی کے بعد ہمیں ادارتی میدان میں خواتین کی تعداد میں اضافہ نظر آتا ہے لیکن "آنگن" "چلمن" "حور" "تہذیب" "زیب النساء" "زینت" "خاتون مشرق" جیسے رسائل دیکھ کر کسی موضوعی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے۔ ان پرچوں میں عورتوں کے گھریلو مسائل اور آرائشی موضوعات کو ہی زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور ادب کا زاویہ خاصہ کمزور ہے۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہو گا کہ پاکستان میں ادبی جریدہ نگاری اب بھی شخصی نوعیت کی ہے اور ادبی رسالہ کو چند با ذوق اور ایثار پیشہ ادبا ہی اپنے ذاتی وسائل سے پیش کر رہے ہیں' یہی وجہ ہے کہ بہت سے ادبی رسائل اعلیٰ معیار اور عمدہ اٹھان کے باوجود زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہتے اور اپنے بنیادی نصب العین کی تکمیل سے پہلے ہی منظر عام سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ طمانیت کی بات یہ ہے کہ دنیا سے ایسے جنونیوں کی تعداد کبھی ختم نہیں ہوتی جو ادب کو اپنی زندگی کی با معنی سرگرمی کے طور پر قبول کرتے ہیں اور پھر اس کی اشاعت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اردو کی ادبی صحافت میں جتنی بھی رونق ہے وہ انہیں "دیوانے لوگوں" کے ایثار کا نتیجہ ہے۔

○

کتابیات

ابواللیث صدیقی	انیسویں صدی میں اردو صحافت	نظامی پریس بدیوں۔ ۱۹۳۵ء
ابو سلمان شاہجہان پوری (ڈاکٹر)	کتابیات پاکستان۔ کے اخبارات و رسائل ۱۹۴۷ء تک	مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد ۱۹۸۷ء
امداد صابری (مولانا)	پاکستان کے اخبارات و رسائل (جلد دوئم)	مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد ۱۹۸۵ء
	تاریخ صحافت اردو۔ جلد اول (۱۸۵۷ء تک)	دہلی ۱۹۵۳ء
	تاریخ صحافت اردو۔ جلد دوم (۱۸۵۷ء تا ۱۸۷۵ء)	دہلی ۱۹۶۲ء
	تاریخ صحافت اردو۔ جلد سوم (۱۸۷۵ء تا ۱۹۰۰ء)	دہلی ۱۹۶۳ء
	تاریخ صحافت اردو۔ جلد چہارم (۱۹۰۰ء تا ۱۹۱۰ء)	دہلی ۱۹۷۲ء
	تاریخ صحافت اردو۔ جلد پنجم (۱۹۱۰ء تا ۱۹۳۰ء)	دہلی ۱۹۸۳ء
اشرف نقوی (محمد)	اختر شہنشاہی	لکھنؤ ۱۸۸۸ء
ایم۔ ایس۔ ناز	اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ	سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور ۱۹۸۰ء
امیر عارفی (ڈاکٹر)	نیاز فتح پوری	لکھنؤ ۱۹۸۵ء
انور سدید	انشائیہ اردو ادب میں	مکتبہ فکر و خیال' لاہور ۱۹۸۵ء
	اردو ادب کی تحریکیں	انجمن ترقی اردو' کراچی ۱۹۸۵ء
	اقبال کے کلاسیکی نقوش	مکتبہ عالیہ' لاہور ۱۹۷۷ء
بدر شکیب	اردو صحافت	کراچی ۱۹۵۲ء
برج موہن و تاتریہ کیفی	اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبارات	سہ ماہی "اردو اورنگ آباد" اپریل ۱۹۳۵ء
جمیل جالبی (ڈاکٹر)	ٹی ایس ایلیٹ کے مضامین	کراچی ۱۹۷۱ء
حامد حسن قادری (مولانا)	داستان تاریخ اردو	اردو اکادمی سندھ' کراچی۔ بار سوم
حبیب اللہ اوج	پاکستانی صحافت	المعارف' لاہور۔ جنوری ۱۹۴۸ء
حسن اختر ملک (ڈاکٹر)	تاریخ ادب اردو	یونیورسٹی ایجنسی' لاہور۔ ۱۹۷۹ء

مصنف	کتاب	ناشر
خواجہ حسن نظامی	غدر کے اخبارات	دہلی ۱۹۱۹ء
رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو (ترجمہ عسکری)	کتب خانہ ملیہ 'لاہور۔ (ت۔ن)
رحم علی ہاشمی	فن صحافت	دہلی ۱۹۴۳ء
روشن آرا راؤ (ڈاکٹر)	ادبیات اردو کے ارتقاء میں رسائل کا کردار	مقالہ: پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی 'لاہور
ساحل احمد	اردو میں گل دستوں کی روایت	رائٹرز گلڈ 'الہ آباد۔ ۱۹۸۸ء
عابد رضا بیدار (ڈاکٹر)	اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار	انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز' رام پور ۱۹۶۹ء
عبدالسلام خورشید (ڈاکٹر)	کاروان صحافت	انجمن ترقی اردو 'کراچی ۱۹۶۴ء
	صحافت پاکستان و ہند میں	مکتبہ کاروان' لاہور۔ ت۔ن
عبدالرزاق راشد	اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبارات	سہ ماہی اردو۔ اورنگ آباد' اکتوبر ۱۹۳۵ء
عبداللہ قریشی (محمد)	تذکار اقبال (محمد دین فوق)	بزم اقبال' لاہور ۱۹۸۵ء
عفیرہ حامد علی	اردو زبان و ادب کی ترقی میں صحافت کا حصہ	مقالہ پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی 'لاہور
علی احمد فاطمی	عبدالحلیم شرر۔ (بحیثیت ناول نگار)	نصرت پبلشرز' لکھنؤ ۱۹۸۲ء
فیاض محمود	تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (اردو ادب۔ جلد چہارم)	پنجاب یونیورسٹی 'لاہور
گارساں دتاسی	خطبات و مقالات (چار جلدیں)	انجمن ترقی اردو پاکستان 'کراچی
محمد اکرام چغتائی	ایک نادر مجموعہ مکاتب	سہ ماہی اردو' کراچی ۱۹۸۸ء
محمود الحسن	پاکستان کے اردو اخبارات و رسائل (کتابیات) جلد اول	مقدرہ قومی زبان' اسلام آباد۔ ۱۹۸۵ء
محمد عتیق صدیقی	ہندوستانی اخبار نویسی۔ کمپنی کے عہد میں	انڈس پبلی کیشنز' کراچی ۱۹۸۰ء
	صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات	انجمن ترقی اردو ہند' علی گڑھ ۱۹۶۲ء
	اٹھارہ سو ستاون' اخبار اور دستاویزیں	مکتبہ شاہ راہ' دہلی۔ ۱۹۶۶ء
	گل کرسٹ اور اس کا عہد	انجمن ترقی اردو' علی گڑھ۔
محمد سلیم	اردو رسم الخط	مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد۔ ۱۹۸۵ء
محمد طاہر فاروقی	پاکستان میں اردو	یونیورسٹی بک ایجنسی' پشاور ۱۹۶۵ء
مسکین علی حجازی (ڈاکٹر)	پنجاب میں اردو اخبار نویسی	مقالہ پی ایچ ڈی' پنجاب یونیورسٹی' لاہور
معین الدین عقیل (ڈاکٹر)	اردو صحافت کی تاریخ نویسی	ابلاغیات' کراچی یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

نظیر حسنین زیدی (ڈاکٹر) — ظفر علی خان ۔ بطور صحافی — مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۵ء

وزیر آغا (ڈاکٹر) — اردو ادب و طنز و مزاح — مکتبہ عالیہ، لاہور

تنقید اور احتساب — جدید ناشرین، لاہور ۱۹۶۸ء

ہمایوں ادیب — صحافت ۔ پاکستان میں — عزیز پبلشرز لاہور، ۱۹۸۴ء

Albert Bull	Anthorship and Journalism	London 1924
John B. Machil	Modern Journalism	London 1984
The Pen and the Book	Walter Besant	London 1899
Nut Rajan	History of Indian Journalism	London 1962
Qasim Ali Sajjan Ali	A Short History of Urdu Newspaper	Deccan 1962
S. M. Feroz	Press in Pakistan	Lahore 1957
Majid Nizami	Press in Pakistan	Lahore 1958

ادبی رسائل اپنے عہد کے تخلیقی سفر کے اہم ترین دستاویزات شمار ہوتے ہیں۔ جہاں وہ ایک طرف اہل قلم کے متنوع نگارشات سے قارئین کو استفادہ کا موقع دیتے ہیں وہاں ناقدین' مورخین اور محققین کے لئے بھی ایسا مواد فراہم کرتے ہیں جس سے کسی مخصوص عہد کے ادبی رجحانات و میلانات کا اندازہ اور احساسات و جذبات کی تفہیم کی جا سکتی ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان نے اس کمی کو محسوس کیا اور اس موضوع پر ایک جامع کتاب مرتب کرانے کا منصوبہ بنایا۔ اردو کے ممتاز نقاد اور محقق جناب انور سدید نے اس منصوبے کو محنت اور لگن سے عملی جامہ پہنایا ہے۔ یہ کتاب ادبی رسائل کی ایک تاریخ ہی نہیں بلکہ اس کتاب سے ادب کے ارتقاء کی مختلف منازل اور مدارج بھی ہمارے سامنے آ جاتے ہیں اور یہ اس موضوع پر پہلی قابل قدر کاوش ہے جو اہل علم کے علاوہ ابلاغیات کے طلبہ کے لئے بھی انتہائی ممد و معاون ثابت ہوگی۔

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
اکادمی ادبیات پاکستان